مولانا ابو الکلام آزادؒ

ایک سیاسی مُطالعہ

مولانا آزاد کی ۵۴ویں سالِ وفات کے موقع پر
مرحوم کی سیرت و فکر اور خدمات و خصوصیات
کے تعارف میں ایک یادگار تحفہ

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

جمعیۃ پبلیکیشنز

رحمان پلازہ مچھلی منڈی اُردو بازار، لاہور فون : 042-37361339
E-Mail: jamiatbooks@gmail.com

Maulana Abual kalam Azad
aur un ka syasi mutalea
By
Dr. Abu Salman Shahjhan Puri
ISBN: 978-969-8793-92-0

قانونی مشیر سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

ضابطہ

نام کتاب	مولانا ابوالکلام آزاد......ایک سیاسی مطالعہ
ترتیب وتدوین	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری،
سال اشاعت	مارچ ۲۰۱۲ء
ناشر	محمد ریاض درانی
بہ اہتمام	محمد بلال درانی
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس' لاہور
قیمت	-/600 روپے

انتساب

ڈاکٹر عابد رضا بیدار (رام پور)

خاک سار کو اپنی تصنیف و تالیف کے بالکل ابتدائی دور میں جن اہل علم اور اصحابِ قلم سے رہنمائی اور تربیت ملی اور جس محسن و کرم فرما نے ہمت افزائی فرمائی اور مجھ میں اعتماد پیدا ہوا، وہ محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار (رام پور) کی ذاتِ گرامی کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں!

آں محترم سے میری پہلی ملاقات جولائی ۱۹۶۲ء میں پٹودی ہاؤس میں دہلی میں ہوئی تھی، جہاں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی لائبریری کی ترتیب میں مصروف تھے اور دوسری آخری ملاقات اگست ۱۹۸۸ء میں بہ مقام دہلی ہوئی۔ وہ پٹنہ (بہار) سے تشریف لائے تھے، جہاں وہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈایریکٹر اور لائبریری جرنل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔

آں موصوف کی توجہ سے مجھے لائبریری کی نہایت قیمتی اور مفید مطبوعات اور جرنل سے استفادے کا موقع ملا۔ میری زندگی پر اس دور کے مطالعے کا بہت گہرا اثر ہوا۔ میں اس کے لیے محترم بیدار صاحب کا بہت ممنون اور دعا گو ہوں!

اللہ تعالیٰ انھیں صحت و عافیت اور اطمینان کی زندگی عطا فرمائے اور ان کے خانوادۂ معظم کے خرد و کلاں کے سروں پر ان کا سایۂ عاطفت قایم رکھے اور نزدیک و دور کے نیازمندوں کو تادیر ان کی سرپرستی اور فیضانِ علمی سے مستفیض ہونے کی خوش وقتی نصیب کرے!

خاک سار

ابوسلمان

عرضِ ناشر

الحمدللہ! ''مولانا ابوالکلام آزاد......ایک سیاسی مطالعہ'' ایک اہم مرحلے سے گزر گئی۔ آج طباعت کے لیے پریس کے حوالے کرتے ہوئے نہایت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں جب یہ کتاب چھپ جائے گی اور میں اسے قارئین اور شائقین محترم کی خدمت میں پیش کرنے کی مسرت حاصل کروں گا۔

جمعیت علمائے ہند کے قیام کا واقعہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تاریخ سیاسی کا ایک اہم واقعہ تھا جو نومبر ۱۹۱۹ء میں پیش آیا تھا، جس کا سرا جدید دور سے ملا ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے دور میں مسلمانوں کی اصلاح اور وقت کے نظام حکومت اور اس کے استحکام کے لیے انتہائی کوششیں کی تھیں۔ ان کا اصل کارنامہ جس نے مستقبل کی تعمیر کے لیے سروسامان فراہم کیا، یہ تھا کہ انھوں نے اپنے افکار، تجربات اور تدبر و بصیرت کے حاصلات کو کتابوں میں مرتب کر کے آیندہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ تحریک ولی اللہی کا دوسرا دور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے درس و تدریس کی مسند نشینی کی تاریخ سے شروع تھا اور جب وہ دنیا سے رُخصت ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے باپ کے افکار کی روشنی سے براعظم ہند پاکستان سے لے کر بیرون ہند کے دور دراز ممالک تک کو جگمگا دیا تھا اور کم از کم ہندستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں کوئی چھوٹے مدرسے کا مدرس اور مسجد کا امام اور وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی انقلابی فکر سے ناآشنا ہو۔ ان کا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ولی اللہی تحریک کو میدانِ عمل کے کنارے تک پہنچا دیا تھا۔

ولی اللہی تحریک کا تیسرا دور وہاں سے شروع ہوتا ہے جب حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور ان کے بھائی حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی اپنے ایک تربیت یافتہ کو اہل دیکھ کر اپنے نہایت فاضل بھتیجے اور داماد کو ان کے ساتھ لگا کر ایک جماعت منظم کی اور اسے سعی و عمل کے لیے میدان

میں دوڑا دیا۔

میرا اشارہ حضرت سیّد احمد شہید رائے بریلوی اور ان کے دو بازوؤں یعنی حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید اور مولوی عبدالحی کی طرف ہے۔ ان دونوں بزرگوں میں حضرت شہید حضرت شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور مولوی حضرت شاہ صاحب کے داماد تھے۔ حضرت شاہ صاحب کو دونوں کی علمی، دینی قابلیت پر پورا اعتماد تھا۔ اگرچہ یہ حضرات اور ان کی جماعت کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکی تھی لیکن اپنی جان دے کر سعی وجہد کا حق تو ادا کر ہی دیا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں یہ حادثہ پیش آیا کہ عہد سعی وجہد کے پہلے دور میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس کی راکھ ابھی بجھنے نہ پائی تھی کہ ۱۸۵۷ء میں یورپ سے چلنے والی ہواؤں نے دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا دیا جنھوں نے شولہ جوالہ بن کر شمال مغربی فضا کو بالخصوص شمالی جنوبی آبادیوں کو اور وسط ہند سے مشرق میں بنگال کے حدود تک موسم اور فضا یکسر بدل گئی اور اہل وطن کو ایک نئے تجربے سے آشنا کیا۔ معرکہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کے بقیۃ السیف نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ہوا کا رُخ بدل چکا تھا۔ حالت نے سمجھایا یہ اولوالعزمی کی بات تھی کہ دورِ آخر کے اصحاب عزائم نے یہ چاہا تھا کہ ملک کو مغربی تاجروں اور لٹیروں سے نجات پر حکومت کرنے کے اہلوں کو دے کر، وہ اللہ کی یاد اور اس کے ذکر وفکر میں مشغول ہو جائیں گے۔

تحریک ولی اللہی کا تیسرا دور حضرت سیّد احمد اور مولانا شاہ اسمٰعیل کی شہادت پر ختم ہوا تھا اور چوتھے دور کا میدان عمل ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء کے اختتام تک پھیلا ہوا تھا۔ اس معرکے کے بقیۃ السیف میں دیوبند کے بزرگوں میں حضرت مولانا امداداللہ، حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (رحمہم اللہ تعالیٰ) یادگار تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں میں انھیں کا نام آتا ہے۔ ہندستان کی دوسری قوموں سے اتحاد کے بغیر مغرب کے غاصبوں سے براعظم مشرقی ایشیا کی نجات اور آزادی ممکن نہیں! ان بزرگوں کے تربیت یافتہ اور جانشین صادق مولانا محمود حسن محدث دیوبند اور ان کے معاصرین نے نیشنلسٹ فکر کو وقت کی سب سے بڑی اور اہم سیاسی سمجھا، جو آیندہ ایک سیاسی مکتب فکر کی صورت میں ڈھل گیا۔ حضرت مولانا محمود حسن اس مکتب فکر کے سب سے بڑے مفکر و رہنما اور

پختہ کار شخصیت تھے۔

بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دو دھائیوں میں مولانا محمود حسن ولی اللہی مکتب فکر کی سب سے بڑی رہنما شخصیت تھے۔ وہ براعظم ہند پاکستان کی سیاسیات میں بہت بلند مرتبہ تھے۔ وہ وقت کے بہت بڑے مدبر تھے۔ ملک اور بیرونِ ملک کی سیاسیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ استعمار کے بہت بڑے دشمن تھے۔ ان کے گرد بلاتفریق قوم و مذہب ان کے جاں نثاروں اور پرستاروں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ قوم و ملک کے لیے ان کے ایثار اور عزیمت و استقامت کے سب معترف تھے۔ ہندستان کی سیاست میں حضرت کی بلندی شخصیت کے اعتراف اور اتفاق کا سب سے بڑا ثبوت ان کے لیے ''شیخ الہند'' کا خطاب تھا۔

حضرت کے تلامذہ میں مولانا عبیداللہ سندھی اور مفتی کفایت اللہ دہلوی بہت بڑے مدبر اور تاریخ و سیاست میں بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد حضرت شیخ الہند کی سیاسی فکر، ان کی سیرت، اخلاص، سیرت و استقامت کے بہت قایل تھے لیکن حضرت کی جانشینی کا فخر و شرف مذہب و سیاست کے دونوں دایروں میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی کے ناصیہ مبارک میں لکھا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اگرچہ ایک دوسرے ذوق و دایرے کی شخصیت تھے لیکن حضرت شیخ الہند کے بہت گرویدہ اور معترف تھے، ایک خدارسیدہ بزرگ اور بلند پایہ مدبر کی شان کے درجے میں ان کا احترام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند بھی جو ابوالکلام سے عمر میں ۳۷ برس بڑے تھے ایک معاصر اور مدبر کے درجے کے مطابق ان کے ساتھ عزت واحترام کا برتاؤ فرماتے تھے۔

اس دایرۂ فکر میں مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد...... دونوں کی شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم و افکار پر گہری نظر تھی۔ دونوں شاہ صاحب کے معتقد و معترف اور ان کے مقام کے صحیح اندازہ شناس تھے۔ دونوں کے نزدیک وہ جدید زمانے کے فاتح باب اور حجۃ اللہ البالغہ تھے لیکن دونوں میں ایک امتیاز بھی تھا۔ ابوالکلام آزاد نے شاہ ولی اللہ کے افکار و افادات کو گھول کر پی لیا۔ مذہب و سیاست میں وہ ان کے اجتہادات و افادات کو سند مانتے تھے اور اسی کے مطابق وہ مذہب، سماج اور سیاست میں قدم اُٹھاتے تھے لیکن کسی بحث میں ان کا نام لے کر

ان کا حوالہ دینا، تحریرات تک محدود تھا۔ وقت کے کسی سیاسی یا سماجی مسئلے پر گفتگو یا تقریر میں وہ تاریخ، حالات کے جبر اور وقت کے تقاضوں کی سند پیش کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے سیاست کے کسی مسئلے اور ضرورت میں کبھی مذہب کو استعمال نہیں کیا۔ یہی خصوصیت دیوبند کے بزرگان سیاست کی تھی کہ انھوں نے پالا مارنے کے لیے کبھی عقیدہ مذہب کی دلیل پیش نہیں کی۔ ورنہ اس میدان میں ان سے کون بازی لے جاسکتا تھا۔ مولانا ابوالکلام کے مقابلے میں مولانا سندھی کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کی تحریر کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا اور کوئی بات بھی حضرت دہلوی کی سند کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھی۔

حضرت شیخ الہند کے انتقال کے بعد مولانا سیّد حسین احمد مدنی اپنے اُستاد و مربی دین و سیاست کے جانشین تھے۔ یہ نسبت بڑی بابرکت تھی۔ اس نے انھیں دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت پر بٹھایا تھا۔ وہ صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث تھے۔ تعلیمی مجلس کے سربراہ تھے۔ مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے رُکن تھے۔ ان رشتوں اور منصبوں کی بنا پر ملک کے سیکڑوں مدرسوں سے ان کا تعلق تھا۔ دیوبند ایک دینی مکتب فکر کا مرکز تھا اور اس تعلق نے بے شمار ذمے داریوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈالا تھا اور یہی زمانہ تھا جب مولانا حسین احمد مدنی کو شیخ الاسلام کے منصب سے نوازا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ پورے ملک کی وہ ایک مرکزی شخصیت بن گئے تھے۔

دیوبند کے بزرگ ایک سیاسی فکر رکھتے تھے اور سیاست میں حصہ لینے، مسائل پر غور وفکر کرنے اور ایک مدت سے انسانیت کی فلاح و بہبود اور سماجی سیاسی کاموں کے شغل نے ان میں ایک بصیرت پیدا کردی تھی۔ ان کے مطالعے، مشاہدے اور تجربات نے ان کے فکر میں استحکام پیدا کردیا تھا۔ اسی پختہ فکر نے ایک سیاسی مکتب فکر کی خصوصیات پیدا کردی تھیں۔

اور چوں کہ علمائے دیوبند شروع ہی سے جمعیت علمائے ہند پر چھائے رہے تھے۔ شیخ الاسلام مولانا مدنی چوں کہ حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید، ساڑھے تین سال مالٹا میں اپنے اُستاد کے ساتھ سخت آزمایش کی زندگی گزار چکے تھے حضرت کے چہیتے اور خدمت گزار تھے۔ مالٹا سے ہندستان پہنچنے کے بعد شروع ہی سے سیاسی خدمات انجام دینے آ لگے تھے۔ ۱۹۴۱ء

کے آغاز سے انھیں جمعیت علمائے ہند کا صدر بھی بنا دیا گیا تھا۔ حضرت کی ذمے داریاں اور مصروفیتیں پہلے ہی کیا کم تھیں، جمعیت علما کی صدارت قبول کرنے کے بعد حضرت کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔

دیوبند کا نام زبان پر آتا تو اس کی تین خصوصیات فوراً ہمارے ذہن کے آئینے میں نمایاں ہو جاتی ہیں:

۱-دیوبند بحیثیت ایک دارالعلوم...... اسلامی علوم وفنون کی ایک درس گاہ اور ابلاغ واشاعت کا مرکز

۲-دیوبند...... بحیثیت ایک دینی مکتب فکر...... اصلاح عقاید، تربیت ذوق دینی اور تعمیر سیرت

۳-دیوبند ایک سیاسی مکتب فکر...... ملک کی آزادی، اب دفاع واستحکام، قوم کی فلاح و بہبود اور وحدت انسانیت (الخلق عیال اللہ) کے اصول پر سوسایٹی کی تعمیر!

دیوبند کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے جب بھی قلم اُٹھایا جائے گا شخصیات کے حوالے ہی کو ذریعہ بنایا جائے گا۔ ہم دیوبند کے بزرگوں سے لے کر اس کے پروردہ وتعلیم و تربیت یافتگان کے سوانح حیات، ان کے علمی ودینی فضایل، مختلف دایروں، درس وتدریس، تبلیغ دین، اصلاح عقاید، تصنیف وتصانیف، سلوک وتصوف، وطن کی آزادی کی جدوجہد، سیرت کے محاسن، خصایص وخصایل وغیرہ) میں ان کی خصوصیات وکمالات اور ہر جہت سے ان کے امتیازات ہی تعارف کا ذریعہ بنیں گے اور اسی روشنی میں ہم دیوبند اور اس کے متعلقات کا فیصلہ کر سکیں گے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۲۸۲ء/ ۱۸۶۶ء میں ۱۸۵۷ء کے صرف ۹ سال کے بعد عمل میں آ گیا تھا۔ اس کی تاریخ، اس کی خصوصیات اور اس کی خدمات اور کارناموں کا جب تذکرہ کیا جائے گا تو اس کا اسی مقام سے کیا جائے لیکن اس کا پس منظر اس کے عہد عروج سے بھی کچھ کم شاندار نہیں۔ اس کی ایک عظیم الشان تاریخ ہے۔ اس دور میں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت شاہ اسماعیل، حضرت سیّد احمد رائے بریلوی، حضرت امداد اللہ، حضرت رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی نامور شخصیات، ان مقدس شخصیات کی پاکیزہ سیرتیں، ان کے بے مثال کارنامے ہم تاریخ میں

دیکھ سکتے ہیں لیکن ان جیسے اصحاب، ان جیسی سیرتیں ان جیسی اعلیٰ مقام شخصیات، دین وملت کے خدمت گزار، اخلاص وللّٰہیت کے پیکر اب ہمیں اپنی زندگی میں نظر نہیں آتے۔

تاریخ اسلامیان ہند میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے شروع ہونے والے دور کے اوّلین رہنماؤں میں سب سے اہم شخصیت قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تھی۔ دارالعلوم کے ابتدائی دور کے خدمت گزاروں کی سب سے اہم، صاحب بصیرت، وقت کے نباض اور مستقبل کو بھانپ لینے والی شخصیت وہی تھے جن کے مقام کی بلندی اور خصوصیات علم و فکر کو ان کے معاصرین میں کوئی نہ پہنچا۔ ۱۸۸۰ء میں جب انھوں نے اعلیٰ علیین کا سفر اختیار کیا تو اس سے پہلے وہ اپنے فکر کی میراث کو اپنے ایک شاگرد کو سپرد کر کے اور اسے تعلیم وتربیت سے آراستہ کر کے آنے والے دور کی رہنمائی کے لیے تیار کر دیا تھا۔ میرا اشارہ حضرت قاسم العلوم کے شاگرد رشید مولانا محمود حسن دیوبندی کی طرف ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین، دیوبندی مکتب فکر کے بانی مبانی، وقت کے محدث، نئے دور میں بالاکوٹ کے بقیۃ السیف کے آثار وسیرت کے حاملین اور وقت کے مجاہدین کو منظم کرنے والے اور وطن کی آزادی کی تحریک کو نئی زندگی دینے والے، زمانے کے تقاضوں اور وقت کی نفسیات اور ضرورتوں کا شعور رکھنے والے اور اسی کے مطابق دین کے مذاکروں اور وطن کے خدمت گزاروں کی ایک جماعت منظم کر دینے والے تھے جو ''شیخ الہند'' کے خطاب سے اس طرح ملقب ہوئے کہ گویا ان کا اسم سامی ہی یہ تھا۔ قدما کے سجادہ نشین بزرگوں میں وہ واحد شخصیت تھے جن کے گرد کسی دینی مکتب فکر کے سجادے کے لیے نہیں وطن کی آزادی کے حصول کے لیے مختلف مکاتب فکر، حنفی، سلفی، ندوی، فرنگی محلی اور خانوادہ ہائے علمی ودینی، دہلی، لکھنو، بدایوں اور سرفروشانِ بنگال، بہار، ممالک متحدہ و (آگرہ واودھ)، پنجاب، سرحد، سندھ وغیرہا کے ساتھ غیر مسلم بھی اسی عزم وعقیدت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

حضرت شیخ الہند نے جس سفر کا آغاز کیا تھا، وہی اس کے قافلہ سالار بھی تھے۔ حضرت قاسم العلوم کے تلامذہ میں وہی ایک شخصیت تھے جو ان کے ذوق وفلسفہ سیاست سے آشنا اور اس کے امین، اس کے مبلغ اور اس کے رہنما تھے۔ حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں ان کے

سیاسی ذوق، فکر اور طرز سیاست کے آشنا اور پیروان کرام میں، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی ہی نامور اور لایق اعتماد ہوئے۔ بیرونی شخصیات و رجال کار مولانا محمد علی (رام پوری) اور مولانا ابوالکلام آزاد ہوئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے حضرت شیخ الہند کی سیاسی تحریک میں ان کی زندگی میں ساتھ دیا لیکن حضرت کے انتقال کے بعد مولانا محمد علی حضرت کی جماعت اور ان کے جانشین مولانا سیّد حسین احمد مدنی کا ساتھ نہ دے سکے۔ حال آں کہ انھوں نے قرآن حضرت مدنی سے پڑھا تھا، وہ ان کے علم و فکر و تقویٰ کے معترف تھے اور ان سے محبت کے مدعی تھے۔ یہ شاید اس لیے ہوا کہ ان کی تعلیم دینی اور تربیت کی جڑیں مضبوط نہ تھیں اور وہ بصیرت و تدبر اور اصول پسندی سے زیادہ جوش و جذبات کی مخلوق تھے۔

مولانا ابوالکلام کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ان کا پس منظر دینی تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے مقام، ان کے فلسفہ و علوم و فنون، ان کے خاندان کی علمی اور عملی دینی و تاریخی خدمات، ان کے مختلف پہلوؤں، دیوبند سے ان کے رشتوں دیوبند کے بزرگوں، بانیوں، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ، اس کے قیام کے مقاصد، پچھلی ڈیڑھ صدی میں پیش آنے والا کوئی واقعہ، حادثہ اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات سے وہ واقف تھے۔ مولانا آزاد کے الہلال نے حضرت شیخ الہند متاثر کیا تھا اور حضرت نے فرمایا تھا۔ ہم اپنا اصلی کام (اصلاح و جہاد) بھولے ہوئے تھے۔ الہلال نے یاد دلایا ابوالکلام حضرت شیخ سے پہلے ہی سے واقف تھے۔ ان کے بزرگوں سے آشنا تھے اور جانتے تھے کہ مولانا محمود حسن کس شجر طیبہ کا پھل ہیں۔ اسلام کی کس خانقاہ عظمت و جلال کے تربیت یافتہ ہیں اور ٹیکسال کا ڈھلا ہوا سکہ ہیں اور زور بازار علم و عمل میں اس سکے کی قیمت کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صرف حضرت شیخ الہند کے عقیدت مند ہی نہیں تھے بلکہ انھیں حضرت شیخ الہند کے خانوادہ علمی، ان کی جماعت، ان کی تحریک اور ان کی سیاست سے دلچسپی تھی۔ حضرت شیخ کے انتقال کے بعد وہ مولانا انور شاہ کشمیری کے مقام علمی کے معترف تھے، لیکن وہ سیاسی شخصیت نہیں تھے۔ سیاسی ذوق سے محض نا آشنا تھے۔ حضرت کے دوسرے تلامذہ

میں سے مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا سیّد حسین احمد مدنی سے بہت گہرے اور قریبی تعلقات تھے۔ وہ حضرت مدنی کو صاحب عزم واستقامت سمجھتے تھے، نیز ان کے تلامذہ و مثل تلامذہ سے تعلق اور محبت وشفقت کا برتاؤ تھا۔ ان کے دائرۂ احباب میں جواہر لعل نہرو سے قربت ومحبت کا تعلق تھا لیکن اطلاع وتعین وقت کے بغیر انھیں بھی چلے آنے کی اجازت نہ تھی لیکن جمعیت علمائے ہند کے کارکنان، مثل مولانا حفظ الرحمٰن، عبدالوحید صدیقی و دیگر کو اجازت تھی کہ وہ اجازت لیے اور اطلاع دیے بغیر، رات دن میں کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔ اس امتیاز میں ان کا شریک کوئی دوسرا نہ تھا۔

رانچی کی نظر بندی سے مولانا ابوالکلام آزاد کی رہائی کی کارروائی دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری چند دنوں میں عمل میں آئی تھی۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو وہ رانچی چھوڑ سکتے تھے لیکن نظر بندی کے پونے چار سال میں گھر بار کا جو سروسامان جمع ہو گیا تھا اس کو سمیٹنے اور اسی طرح اس مدت میں جو ہزاروں کتابیں جمع ہو گئی تھیں اور کچھ ضرورتاً ذاتی کتب خانہ کلکتہ سے منگوائی تھیں ان کے بنڈل بنانے، سامان وکتب کی روانگی کے انتظام میں کئی لگ گئے۔ تب وہ کلکتہ کو روانہ ہوئے اور کلکتہ کے بکھرے ہوئے سامان اور رانچی کے سامان کی درستگی میں تقریباً دو ہفتے لگ گئے۔ تب وہ کلکتہ سے نکل سکے اور دہلی پہنچے جو اس وقت قومی وملی رہنما کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ یہیں گاندھی جی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔

اسی سفر کے موقعے پر مولانا ابوالکلام نے جمعیت علمائے ہند کے ممبر شپ قبول کی۔ انھیں مجلس عاملہ ومجلس اعلیٰ کا رُکن بنایا گیا۔ جمعیت سے ان کا یہ تعلق زندگی کے آخری دور تک رہا۔ جمعیت علمائے ہند اور اس کے بزرگوں سے مولانا کا تعلق ہمیشہ رہا۔ مولانا کو ہمیشہ جمعیت علما کا رہنما سمجھا جاتا رہا۔ مولانا اس کی عاملہ اور مجلس اعلیٰ کے اجلاسوں میں ہمیشہ شرکت کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے اور اگر کبھی شریک نہ بھی ہوتے تو پیش نظر مسایل کے بارے میں اپنی رائے ومشورے سے تحریراً مطلع فرما دیتے تھے۔ (۱)

جب میں نے جمعیت علمائے ہند کے صدور بہ شمول سیکرٹری جنرل مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پر کام کرنے کا ارادہ کیا اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری سے مشورہ کیا تو اس

وقت تک ان کی دو کتابیں ''شیخ الہند......ایک سیاسی مطالعہ'' اور ''شیخ الاسلام......ایک سیاسی مطالعہ'' شایع ہو چکی تھیں۔ ان دونوں کے سوا میں نے ایک منصوبہ بنایا اس سلسلے میں جمعیت پبلی کیشنز کی تین کتابیں:

۱- مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ: ۲۰۰۱ء، صفحات ۵۱۰

۲- مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ دہلوی......ایک سیاسی مطالعہ: ۲۰۰۴ء، صفحات ۴۳۲

۳- سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی......ایک سیاسی مطالعہ: ۲۰۰۷ء، صفحات ۳۴۸

اس سلسلۂ مطبوعات میں ابھی کئی اور کتابیں پیش نظر ہیں جو انشاء اللہ جلد منصۂ شہود پر آ جائیں گی لیکن اس وقت جو کتاب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے وہ

۴- مولانا ابوالکلام آزاد......ایک سیاسی مطالعہ

پیش کی جا رہی ہے۔ شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ مولانا آزاد کا تعلق تو جمعیت علماے ہند کے منصب صدارت سے کبھی نہ رہا تھا اور وہ دایرۂ جمعیت کے رجال کار نہ تھے لیکن جمعیت علما سے ان کا اتنا قریبی اور مشاورت و رہنمائی دائمی تعلق ایسا تھا کہ انھیں اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اس سے بھی کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ جمعیت کے صدر تھے۔ وہ ۱۹۲۱ء میں جمعیت کے تیسرے سالانہ اجلاس لاہور کے صدر وہی تھے۔ ان پر کتاب لانے کے لیے یہ استحقاق کافی ہے۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ وہ پوری استقامت کے ساتھ ۱۹۲۰ء سے اپنی وفات (۲۲/فروری ۱۹۵۷ء) تک تقریباً ۳۷ برس نہ صرف جمعیت سے وابستہ رہے بلکہ ہمیشہ اس کے معاون، مشیر اور صف اوّل کے رہنما رہے۔ وہ حضرت شیخ الہند کے محبوب و معتمد شخصیت تھے اور حلقۂ دیو بند اور اس کے باہر حضرت شیخ الہند ک عقیدت کیشوں اور ارادت مندوں کی محبوب شخصیت تھے۔ جمعیت علماے ہند اوّلین رہنماؤں کارکنوں بلکہ اس کے بانیوں اور ابتدائی ممبران میں سے برادران رام پور، خانوادۂ فرنگی محل، خاندان بدایوں کے علماء وغیرہ نے تو جمعیت علماے ہند کو بالکل چھوڑ دیا تھا اور اس کے مقابل ''جمعیت علماے کانپور'' قایم کر لی تھی۔ رہ گئے علماے اہل حدیث جو اوّل روز سے نہ صرف جمعیت علماے ہند میں شامل تھے بلکہ اس کے بانیوں میں سے تھے، جمعیت کے تین چار سالانہ جلسوں کے میزبان وہی تھے۔

جمعیت کی مجلس عاملہ واعلیٰ میں ان کی حیثیت انسانی جسم کی رگوں میں خون کی سی تھی اور اگرچہ ۱۹۳۰ء کے بعد ان میں سیاسی فکر کی نشست ثانیہ شروع ہو چکی تھی اور ان کی اپنی سالانہ کانفرنسوں نے اس کے زندہ دلوں اور ایثار پیشہ وخدمت گزاران قوم وملت کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا، اور ۱۹۴۰ء کے بعد مسلم لیگ کے سیاسی فساد سے بھی بعض ذہن متاثر ہو گئے تھے لیکن بہ حیثیت کل اور بہ حیثیت جماعت، اہلِ حیثیت نہ تو جمعیت علمائے ہند کے مخالف ہوئے اور نہ اس کے پلیٹ فارم کو چھوڑا۔ انھوں نے پوری شان کے ساتھ اپنے اوّلین و سابقین بزرگوں کی روایت کو زندہ رکھا تھا۔

نشیب وفراز بہت سے آئے۔ ہوائیں اپنا رُخ بدلتی رہیں۔ موسم آتے اور جاتے رہے لیکن مولانا ابوالکلام کی عزیمت واستقامت، ان کی فکر ورائے کی محکمی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور حضرت شیخ الہند کی جماعت سے تعلق کی استواری اور وفا کی روایت کو نہ توڑا نہ چھوڑا دیوبند کے مکتب فکر اور حضرت شیخ الہند اور حضرت شیخ الاسلام کے فکر دینی و سیاسی کے معتقدین و مریدین اور ایک اعلیٰ دماغ و بلند خیال اصحاب کی ایک جماعت ایسی ہے، جو ابوالکلام کو اسی عقیدت واحترام سے دیکھتی ہے۔

حاصل کلام اور حق یہ ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے رہنما، اس کے بانی اور اس کے رجالِ کار، میدانِ جنگ کے آخری مجاہد اور فاتح باب آزادی اور جمعیت علمائے ہند جس فلفہ سیاست کے پیرو تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس فلسفہ سیاست کے سب سے بڑے مفکر اور مدبر تھے، ان کا حق تھا کہ ''جمعیت پبلی کیشنز'' جیسے دیوبندی سیاست کے معتقد اور خدمت گزار اشاعتی ادارے سے ان کی یاد میں ایک نہیں کئی کتابیں مرتب اور شایع کی جائیں۔

امید ہے شائقین مطالعہ اس مجموعے میں بہت سی نئی باتیں، بلند خیالات اور نادر معلومات سے مستفیض ہوں گے اور کئی جگہوں سے پردے اُٹھتے اور حقایق سربستہ کے راز ظاہر ہوتے نظر آئیں گے۔

محمد ریاض درانی

۱۴/ اکتوبر ۲۰۱۱ء

حاشیہ

۱۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے مجھے بتایا کہ وہ پہلی مرتبہ ہندوستان گئے تو ابھی وہیں تھے کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا انتقال (۲/اگست ۱۹۶۲ء) ہوا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ دہلی پہنچا اور جمعیت علماے ہند کے دفتر گیا تو مولانا وحیدالدین قاسمی سے حادثے کا علم ہوا۔ دفتر کے کئی حضرات دیوبند گئے ہوئے تھے۔ مولانا وحیدالدین قاسمی منیجنگ ایڈیٹر ڈیلی ایڈیٹر الجمعیت سے ملاقات ہوئی۔ بہت شفقت سے پیش آئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں ۴۹-۱۹۴۷ء میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں پڑھتا تھا اور جمعیت علماے ہند کا ممبر بنا تھا۔ حضرت شیخ اسلام اور امام الہند کی وفات کے موقعے پر میں نے کئی مضامین لکھے ہیں اور مولانا آزاد پر ''امام الہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور چھاپی ہے تو بہت خوش ہوئے۔ میں نے مولانا آزاد کے سیکرٹری محمد اجمل خاں سے ملنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں اور ہسپتال میں داخل، تو وہ مجھے ان سے ملاقات کرانے کے لیے لے گئے۔

ابوسلمان کا بیان ہے کہ قاسمی صاحب نے بتایا تھا کہ مولانا کے بیسیوں خطوط ہیں جو انھوں نے وقت کے مسایل کے بارے میں حضرت مفتی صاحب اور حضرت مدنی رحمہما اللہ تعالیٰ کو مشورتاً لکھے تھے، جمعیت کے کاغذات کے بستوں بندھے پڑے ہیں۔ اس سفر میں تو ابوسلمان صاحب کے پاس وقت نہ تھا، جب ۱۹۸۸ء اور ۲۰۰۵ء میں دوسری اور تیسری مرتبہ دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا تو ان کے بقول وقت بہت گزر چکا تھا اور سب سے بڑی بات مانع یہ تھی کہ کسی کو اس سے دل چسپی نہ تھی۔ اس لیے ان کی درخواست کو پذیرائی نہ ملی۔

ریاض

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک سیاسی مطالعہ

فہرست ابواب

باب ۱

سوانح، شخصیت اور سیرت

فہرست مضامین

ابوالکلام آزاد

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی

محترم ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی دام لطفکم نے یہ مقالہ ۱۹۹۸ء یا ۱۹۹۹ء میں کسی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور انھیں بھیج دیا گیا تھا اور ازراہِ عنایت استفادے کے لیے خاکسار کو بھی بھیج دیا تھا۔ مسودہ چوں کہ بہت کٹا پھٹا تھا اور ترمیم واصلاح کا عمل جلی وخفی قلم سے ہر صفحے کے انتہائی کناروں تک پھیلا ہوا تھا اس لیے مسودہ تو میں نے بہ طورِ تبرک محفوظ کر لیا اور استفادے کے لیے مقالے کو کمپوز کروالیا ہے، تاکہ اس سے رجوع اور استفادے میں سہولت رہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف موجودہ دور کے بلند پایہ سیاسی مبصر ونقاد ہیں اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے علوم اور افکار وسوانح کے بہت بڑے محقق ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مختصر مقالے میں مولانا مرحوم کی شخصیت وسوانح اور افکار وخدمات کو ایسی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ اگر اس کے مباحث کو پھیلا دیا جائے تو ایک جامع الاطراف سوانح حیات وجود میں آ جائے گی۔ اصل مخطوطہ اور کتابت شدہ صفحات بہ شکل کتابچہ، ''ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لائبریری'' میں شامل کر رہا ہوں۔ یقین ہے کہ ۱۲، ۱۳ برس کی مدت میں اسے استعمال میں لے آیا گیا ہوں۔ اگر اس کے محرک اور صاحب ذوق کا مجھے علم ہوتا تو اسے ان کی اجازت ہی سے چھاپتا۔ اب بھی ان کے شکریے کے ساتھ اصحابِ ذوق کے مطالعے اور فروغ علم کی غرض سے زیرِ نظر مجموعے میں اسے شامل کیا جا رہا ہے۔

اس مقالے سے استفادے میں سہولت کے لیے میں صاحب مقالہ اور محرک شخص یا ادارے کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔ ساتھ ہی معذرت خواہ ہوں کہ مقالے کی اشاعت کے لیے میں آں موصوف سے خاکسار اجازت نہیں لے سکا!

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

۲۵/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

نام محی الدین احمد، تاریخی نام فیروز بخت، کنیت ابوالکلام، تخلص آزاد (۱۳۰۵ھ-۱۳۷۷ھ/ اگست ۱۸۸۸ء- فروری ۱۹۵۸ء)، آباؤ اجداد عہد بابر میں ہرات سے ہجرت کر کے ہندستان آئے۔ پہلے آگرہ میں مقیم ہوئے اور پھر غالباً عہد اکبری میں دہلی منتقل ہو گئے (Azad: India wins Freedom. Madras, 1988:1) مولانا آزاد کے دادا مولانا محمد ہادی دہلی کے ایک مشہور علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آزاد کے والد مولانا خیرالدین کے نانا مولانا منورالدین، شاہ عبدالعزیز (دہلوی) کے نامور شاگرد تھے اور رُکن المدرسین کے منصب پر فائز تھے۔ مولانا خیرالدین کے دادا شاہ محمد افضل علم وطریقت دونوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ شاہ محمد افضل کے مادری سلسلے کے ایک بزرگ مولانا جمال الدین عہد اکبری میں تھے۔ جب اکبر نے دین الٰہی کا اعلان کیا اور علمائے وقت سے اس کی تائید میں دستخط طلب کیے تو مولانا جمال الدین نے نتائج کی پروا کیے بغیر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے (ابوالکلام آزاد: تذکرہ، ساہتیہ اکادی ایڈیشن (نئی دلی)، ۱۹۶۸ء، ص ۳۳-۳۱) ۱۸۵۷ء کے المیے کے بعد مولانا خیرالدین نے بھی ان کی پیروی کی اور مکہ معظمہ کو ہجرت کی۔ وہاں کے دورانِ قیام انھوں نے محلہ قدوہ متصل باب السلام میں اقامت اختیار کی (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: دہلی، ۱۹۵۸ء، ص ۱۷) اور شیخ محمد بن ظاہر وتری کی بھانجی عالیہ سے شادی کر لی۔

مولانا آزاد کی ولادت وہاں ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ (تذکرہ: ص ۳۱۰) ان کی ولادت سے انگریزی مہینے کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ غلام رسول مہر اور مالک رام کی تحقیق کے مطابق اگست کو ترجیح حاصل ہے۔ مولانا خیرالدین ۱۸۹۸ء میں اپنے خاندان کے ساتھ ہندستان واپس آ گئے اور کلکتہ میں مقیم ہوئے۔ آزاد کی کہانی...... ص ۱۸۹) مولانا آزاد کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ مولانا اپنے والدین کی آخری اولاد تھے۔ ان کی ساری تعلیم گھر پر لائق اساتذہ سے ہوئی۔ ان کے والد نہایت قدیم الخیال بزرگ تھے اور وقت کا کوئی مدرسہ ان کے معیار پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ مولانا آزاد سولہ برس کی عمر میں درسِ نظامی کی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور خود درس دینے لگے۔ ۱۹۰۳ء میں چودہ پندرہ برس کی عمر میں زلیخا بیگم سے عقد ہو گیا۔

مولانا آزاد کو شروع ہی سے صحافت سے شغف تھا۔ ابھی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۹۹ء میں ایک گل دستہ "نیرنگِ عالم" کا اجرا کیا۔ تھوڑے وقفے سے انھوں نے کئی گل دستے شائع کیے یا ان کی اِدارت کی۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، ان کی پہلی غزل ایک گل دستے "ارمغانِ فرخ" (بمبئی) میں چھپی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۰/۱۱ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۹۰۲ء میں "احسن الاخبار" کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو گئے اور ۱۹۰۳ء میں "خدنگِ نظر" (لکھنؤ) کے حصہ نثر کی اِدارت کے فرائض انجام دیے۔ ان کے ابتدائی مضامین "مخزن" (لاہور)، "احسن الاخبار" (کلکتہ)، "مرقع عالم" (ہردوئی)، "تحفہ احمدیہ" (کلکتہ) میں شائع ہوئے۔ (مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت: ابوسلمان شاہ جہان پوری، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۰-۲۰)

نومبر ۱۹۰۳ء میں انھوں نے لسان الصدق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو مئی ۱۹۰۵ء میں بند ہوا۔ لسان الصدق ایک اہم تاریخی مجلہ ثابت ہوا۔ (لسان الصدق (عکسی اشاعت)، ۱۹۹۲ء، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان۔ کراچی)

اسی زمانے میں انھوں نے سرسیّد کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔ انھیں انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ مولوی محمد یوسف جعفری کی مدد سے ان کی رسائی انگریزی کی ابتدائی کتابوں تک ہوئی اور جیسے ہی انھوں نے تھوڑی انگریزی سیکھ لی، بائبل کا مطالعہ اس کے اُردو اور فارسی ترجموں کی مدد سے شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ ان کی انگریزی کی استعداد میں کافی اضافہ ہو گیا اور وہ خاص طور سے تاریخ اور فلسفے کی کتابیں پڑھنے لگے۔

مسلمان فرقوں کے باہمی اختلافات نے ان کے پہلو میں شک کا کانٹا چبھو دیا اور مذہبی اعتبار سے وہ بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔ دو، تین سال ان کی یہی کیفیت رہی۔ اسی زمانے میں ان کے سیاسی خیالات میں بھی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ ۱۹۰۵ء میں گورنر جنرل ہند لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا۔ اس سے اس کا مقصد بنگال سے اُٹھنے والی تحریکِ آزادی کو کچلنا تھا۔ انگریزوں کی اس حکمت عملی نے ہندو، مسلمانوں کے درمیان خلیج حائل کر دی۔ مولانا آزاد اس خلیج کو پاٹنا چاہتے تھے۔ اس مقصد سے انھوں نے بنگال کے ہندو انقلابیوں، شیام سندر چکرورتی اور آربندو گھوش سے رابطہ قائم کیا، تا کہ ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو غلط فہمیاں تھیں رفع کر سکیں۔

۱۹۰۴ء میں مولانا آزاد نے بمبئی کا سفر کیا (لسان الصدق، جون، جولائی ۱۹۰۴ء، ص ۳۰)۔ یہاں انھوں نے آغا حشر کاشمیری کے ساتھ عیسائی اور آریہ سماجی مبلغین سے مذہبی مناظرے کیے۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں لاہور کا سفر کیا اور ''انجمن حمایت اسلام'' کے سالانہ جلسے میں شرکت فرمائی (لسان الصدق، مئی ۱۹۰۴ء، ص ۵-۲) ۱۹۰۵ء کے آغاز میں بمبئی میں مولانا آزاد کی مولانا شبلی نعمانی سے ملاقات ہوئی۔ شبلی کی دعوت پر آزاد لکھنؤ گئے، الندوہ کے نائب مدیر ہو گئے اور مولانا شبلی کے زیر اثر آئے۔ لکھنؤ میں ان کا قیام ۸، ۹ مہینے رہا (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۴)۔ ۱۹۰۶ء میں وہاں سے امرتسر جا کر انھوں نے ''وکیل'' کی اِدارت سنبھال لی۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد ان کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ کا انتقال ہو گیا اور والد نے انھیں کلکتہ بلا لیا۔ (ایضاً: ص ۳۱۹) کلکتہ میں ہفت روزہ ''دار السلطنت'' کے اِدارۂ تحریر سے وابستہ رہے۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے پھر امرتسر جا کر ''وکیل'' سے دوبارہ رشتہ استوار کر لیا۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا خیر الدین کا انتقال ہو گیا اور مولانا آزاد مشرق وسطیٰ اور فرانس کے سفر پر نکل گئے۔ مشرق وسطیٰ میں عراق، مصر، شام اور ترکی میں وقت گزارا۔ وہاں سے ۱۹۰۹ء میں واپس آئے۔ اس سفر کے دوران بالخصوص عراق میں بعض ایرانی انقلاب پسندوں اور مصر میں مفتی محمد عبدہ اور مصطفیٰ کامل پاشا کے شاگردوں اور پیروؤں سے مل کر تبادلہ خیال کیا اور مذہب اور سیاست دونوں میں ان کے آراء و افکار سے متاثر ہوئے۔ اس سفر سے انھیں اپنے اس نظریے کو تقویت حاصل ہوئی کہ ہندستانی مسلمانوں کو پوری دلچسپی اور انہماک سے ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے اور برطانوی حکومت کے پھیلائے ہوئے جال میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ (India Wins Freedom:p.7)، مشرقِ وسطیٰ اور فرانس کے سفر میں انھوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھ لی تھی اور اس قدر سیکھ لی تھی کہ سفر میں ان کا کام چل جاتا تھا اور بعد میں اس قدر عبور حاصل کر لیا تھا کہ وہ تاریخ، ادب اور فلسفے کی کتابوں کے مطالب بخوبی سمجھ لیتے تھے۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار الہلال جاری کیا۔ یہ مولانا آزاد کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اب تک وہ جس کام کی تیاری میں مصروف تھے، اب اس کا آغاز ہوا۔ الہلال میں ایک طرف مولانا آزاد نے مسلمانوں کو صحیح تعلیمات اسلامی سے آشنا کیا اور دوسری

طرف ان میں جذبہ حریت کی آب یاری کی۔ الہلال کے نہ صرف مضامین بلکہ اس کی زبان بھی اُردو میں ایک نئی چیز تھی۔ یہ زبان پر جوش، خطیبانہ اور اثر انگیز تھی۔ اس اخبار کے ذریعے آزاد نے ہندستانی مسلمانوں کا دینی اور سماجی رشتہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے بھی استوار کیا۔ بالخصوص جنگ بلقان اور جنگ طرابلس میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ساتھ ہی جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کی پرامن تحریک کا ساتھ دیا۔ الہلال کے ذریعے مولانا آزاد نے ''حزب اللہ'' کی تحریک کی بنیاد ڈالنی چاہی، جس کا مقصد وہی تھا جو خود الہلال کا مقصد تھا۔ البتہ اس طرح مولانا ایک جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائے۔ الہلال کی مختلف اشاعتوں میں اس تنظیم کے اغراض و مقاصد شائع ہوتے رہے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ الہلال حکومت برطانیہ کے عتاب کا شکار بنا اور اس سے پے بہ پے ضمانتیں طلب کی جانے لگیں تا آں کہ نومبر ۱۹۰۴ء میں الہلال بند ہو گیا۔ جولائی ۱۹۱۵ء میں آزاد نے کلکتہ میں دارالارشاد کی بنیاد رکھی اور قرآن کا درس شروع کیا۔ اسی سال نومبر میں کلکتہ سے ہفتہ وار البلاغ جاری کیا۔ یہ اخبار بھی مارچ ۱۹۱۶ء میں بند ہو گیا۔ اس کا رنگ مذہبی زیادہ تھا، سیاسی کم! اس کے بند ہونے کا سبب یہ ہوا کہ حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت مولانا آزاد کے حدودِ بنگال سے انخلاء کا حکم صادر کر دیا۔ برطانوی ہند کے بعض صوبے پہلے ہی اپنی حدود میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے چکے تھے۔ آزاد کلکتہ سے اپریل ۱۹۱۶ء میں صوبہ بہار کے مقام رانچی کو منتقل ہو گئے۔ وہاں انھیں مورابادی میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد وہ وہاں سے جامع مسجد کے قریب ایک مکان میں منتقل ہو گئے وہاں کے دوران قیام انھوں نے ایک مدرسے کی عمارت کچھ اپنے مصارف اور کچھ چندے سے تعمیر کرائی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک انجمن کی بنیاد بھی ڈالی اور اس کا نام ''انجمن اسلامیہ رانچی'' رکھا۔ (جمشید قمر: مولانا آزاد کا قیام رانچی ــ احوال و آثار، رانچی، ۱۹۹۴ء، ص ۵۲-۵۱)

رانچی کی نظر بندی کے دوران مولانا آزاد نے اپنے اجداد بالخصوص مولانا جمال الدین کے حالات میں اپنی مشہور تصنیف ''تذکرہ'' لکھی جس کے آخر میں مختصراً اپنے حالات کا اضافہ کیا۔ نیز غیر مسلموں کے مساجد میں داخلے کے جواز میں ''جامع الشواھد فی دخول غیر المسلم فی المساجد'' تالیف کی جو پہلے رسالہ معارف، اعظم گڑھ میں شائع ہوئی اور پھر رسالے کی شکل میں

متعدد بار چھپی۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا آزاد کو رانچی کی نظر بندی سے رہائی ملی۔ اس دوران گاندھی جی ہندستان کے سیاسی اسٹیج پر نمودار ہو چکے تھے۔ انھوں نے رانچی میں مولانا آزاد سے ملاقات کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا، لیکن حکومت بہار نے انھیں اس کی اجازت نہیں دی۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں دہلی میں گاندھی جی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ہوئی اور انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ ۲۰ رجنوری کو ایک جلسے میں شرکت کی جس میں خلافت کا مسئلہ زیر بحث آیا اور جملہ حاضرین جلسہ نے مسئلہ خلافت کی حمایت کی۔ کانگریسی خلافتی لیڈروں کا ایک وفد بھی اس سلسلے میں وائسرائے سے ملا، لیکن اس میں مولانا آزاد شریک نہیں ہوئے۔ وائسرائے سے یہ ملاقات ناکام رہی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے لکھنؤ میں بعض مسلم علماء کے ساتھ ایک اور میٹنگ کی، جس میں اپنا عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔ بعض حاضرین کو اس پروگرام کے ماننے میں کسی قدر تامل تھا، لیکن آزاد کا ذہن اس بارے میں صاف تھا۔ انھوں نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ اس طرح تحریک عدم تعاون کا آغاز ہوا (India Wins Freedom:P.9-10)

یہ مولانا آزاد کی زندگی میں دوسرا اہم موڑ ہے، جس کے نتیجے میں وہ ملک کی تحریک آزادی میں گاندھی جی کی قیادت میں باقاعدہ شریک ہو گئے اور انڈین نیشنل کانگریس کی رُکنیت قبول کر لی۔ ساتھ ہی وہ تحریک خلافت سے بھی پوری طرح وابستہ رہے۔ اسی سال فروری میں انھوں نے خلافت کانفرنس (کلکتہ) کی صدارت کرتے ہوئے مسئلہ خلافت پر جو صدارتی خطبہ دیا اور جو بعد میں ''مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب'' کے زیر عنوان شائع ہوا وہ خطبہ اس موضوع پر حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔ اپریل میں انھوں نے ''حزب اللہ'' کا باقاعدہ آغاز کیا اور امام الہند کی حیثیت سے اپنے ہاتھ پر بیعت امامت لینے کا فیصلہ کیا۔ اس تحریک کا مقصد مسلمانانِ ہند کو ہندستان کی تحریک آزادی میں شریک کرنا تھا، لیکن بیشتر علماء کی مخالفت کی بنا پر یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ (ایوان اُردو، دہلی، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۴-۹)

سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ مولانا آزاد کی صحافتی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''پیغام'' جاری کیا۔ یہ اخبار تین مہینے سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا اور دسمبر میں بند ہو گیا۔ اس کے بند ہونے سے قبل مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی دونوں کو گرفتار کر کے محبوس کر دیا گیا تھا۔ (آج

کل- نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۰)

۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۲ء تک مولانا آزاد آزادیِ ہند کی مختلف تحریکوں کے سلسلے میں چھ مرتبہ گرفتار اور نظر بند یا محبوس ہوئے اور کل ملا کر دس برس سات ماہ قید و بند میں رہے (غبارِ خاطر، مولانا آزاد، ساہتیہ اکادمی (نئی دہلی) ایڈیشن، ۱۹۶۷ء، ص ۳۳)۔ ۱۹۲۱ء میں جس گرفتاری کا ذکر ہو رہا ہے، وہ مقدمہ ہندستانی فوجیوں کو حکومت برطانیہ کی طرف سے فوجی خدمت انجام نہ دینے پر اُکسانے کے سلسلے میں قائم ہوا تھا۔ اس موقع پر عدالت کے سامنے انھوں نے جو تحریری بیان پیش کیا تھا۔ وہ مولانا آزاد کے عزمِ مستحکم اور حسن بیان دونوں کا شاہکار ہے۔ بعد میں وہ ''قول فیصل'' کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۲۳ء میں وہ کانگریس کے خصوصی اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک دھڑا جس کے قائد راج گوپال اچاری تھے اور ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرشاد ان کا ساتھ دے رہے تھے، کانگریسیوں کے مجالس قانون ساز میں داخلے کا مخالف تھا۔ دوسرا دھڑا جس کی قیادت سی- آر- داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں کر رہے تھے، اس کے حق میں تھا اور اس غرض سے کانگریس کے اندر انھوں نے ''سوراج پارٹی'' قائم کر لی تھی۔ گاندھی جی ان دنوں جیل میں تھے۔ مولانا آزاد کی عمر اس وقت صرف ۳۵ برس تھی۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں تجویز پیش کی کہ دونوں دھڑوں کو اپنی اپنی صواب دید کے مطابق کام کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے، بشرطے کہ دونوں کا مطمحِ نظر حصولِ آزادی ہو۔ آزاد کی یہ تجویز مان لی گئی اور اس پر فیصلہ ہو گیا۔ اپنے اس خطبۂ صدارت میں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر بھی نہایت بلیغ انداز میں زور دیا تھا۔

(Indian Wins Freedom: p.22-23)

اپریل ۱۹۲۳ء، میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے عربی زبان میں ایک رسالہ ''الجامعہ'' کے نام سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری کیا۔ اس کا اصلی مقصد شریف مکہ کی مخالفت اور ابن سعود کی حمایت تھا۔ یہ رسالہ مارچ ۱۹۲۴ء میں بند ہو گیا۔ (الجامعہ کلکتہ (مقالہ): ابوسلمان شاہ جہان پوری، آج کل- نئی دہلی، نومبر ۱۹۸۸ء ص ۹۸-۸۸) ۱۹۲۴ء لغایت ۱۹۳۰ء مولانا آزاد کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کے کاموں میں پورے

انہماک سے مصروف رہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی مساعی جاری رکھیں۔ جون ۱۹۲۷ء میں انھوں نے الہلال دوبارہ جاری کیا لیکن یہ اسی سال دسمبر میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور اس کے ساتھ مولانا آزاد کی صحافتی زندگی بھی اختتام کو پہنچی۔ ۱۹۳۰ء میں آزاد کچھ عرصے تک کانگریس کے قائم مقام صدر رہے۔

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے نتیجے میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اور ان میں کئی صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی۔ جب کانگریس نے ان صوبوں میں وزارت سازی کا فیصلہ کیا تو ایک پارلیمانی بورڈ تشکیل دیا گیا، جس کے ایک رُکن مولانا آزاد بھی تھے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہو جانے اور اس میں ہندستان کو اس کی مرضی معلوم کیے بغیر ایک فریق قرار دے دینے کی بنا پر کانگریس ان صوبوں میں اقتدار سے دست بردار ہو گئی۔ مسلم لیگ نے اس موقع پر ''یومِ نجات'' منایا، جس سے ہندو مسلم اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو گئی۔ ایسے نازک موقعے پر رام گڑھ کے اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ (Indian Wins Freedom: P.24-29) رام گڑھ کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے، مولانا آزاد نے جو خطبہ دیا، اس میں بالخصوص ہندستانی مسلمانوں کی پوزیشن واضح کی کہ ایک طرف وہ متحدہ ہندستانی قومیت کا جزو لاینفک ہیں اور دوسری جانب اپنی جداگانہ مذہبی اور ثقافتی حیثیت رکھتے ہیں جس سے کسی قیمت پر وہ دست بردار نہیں ہو سکتے۔

اسی سال مارچ میں مسلم لیگ نے ہندستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی صوبوں میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، جداگانہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ جنگی مسائل میں کانگریس ورکنگ کمیٹی میں اختلافات رونما ہوئے۔ گاندھی جی اور ان کے غالی پیرو چاہتے تھے کہ عدم تشدد کے نام پر کانگریس جنگی کوششوں میں کوئی حصہ نہ لے۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد اور ان کے ہم خیال ممبروں کا کہنا تھا کہ اگر حکومت برطانیہ ہندستان کو غیر مشروط آزادی دینے کے لیے تیار ہو تو ہندستان کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ورنہ جنگی خدمات سے علاحدہ رہنا چاہیے۔ جواہر لال نہرو مذبذب تھے۔ اس لیے شروع میں کانگریس میں اس بارے میں کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ تاہم مولانا آزاد نے اپنے خطبہ صدارت میں اپنی پوزیشن واضح کر دی تھی۔ (India Wins Freedon: P.29-30) جب جنگ نے زیادہ خطرناک صورت

اختیار کی تو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے دو ریزولیشن منظور کیے۔ ایک میں عدم تشدد پر اپنے اعتماد کا اعادہ کیا اور دوسرے میں مولانا آزاد کے خیالات کی تائید کی (do.32-33)۔ دو برس تک یہی گومگو کی کیفیت جاری رہی۔ اس دوران کرپس مشن بھی ہندستان آیا اور صدر کانگریس کی حیثیت سے مولانا آزاد نے اس سے مذاکرات کیے، لیکن خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ صدر امریکہ اور چیانگ کائی شیک کی مداخلت بھی بے سود رہی۔ بالآخر ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے حکومت برطانیہ کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کرلیا کہ ہندستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ اس مقصد سے بمبئی میں مولانا آزاد کی صدارت میں ۷ / جولائی ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا۔ ۸/ اگست کی رات کو "ہندستان چھوڑ دو" کی قرارداد منظور ہوگئی۔ ۹ جولائی کو صبح سویرے مولانا آزاد اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دیگر ممبروں کو گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر بھیج دیا گیا۔ (غبارِ خاطر: ص ۳۰-۲۲) گاندھی جی اور ان کے بعض ساتھی پونا میں آغا خان کے محل میں محبوس کر دیے گئے۔ مولانا آزاد اپریل ۱۹۴۵ء تک قلعہ احمد نگر میں قید رکھے گئے پھر بانکوڑہ جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ قلعہ احمد نگر میں مقید ہونے کے دوران ۱۹۴۳ء میں انھیں دو بڑے حادثے پیش آئے۔ کلکتہ میں ان کی اہلیہ زلیخا بیگم اور بھوپال میں ہمشیرہ آبرو بیگم کا انتقال ہوا۔ بالخصوص اہلیہ کے انتقال سے آزاد بہت متاثر ہوئے (غبارِ خاطر: ص ۴۲-۲۳۴) جون ۱۹۴۵ء میں انھیں بانکوڑا جیل سے رہا کر دیا گیا اور آخری قید و بند سے رہائی ملی۔

(India Wins Freedom: P.105)

مولانا آزاد قلعہ احمد نگر سے اپنے ساتھ ایک بہت قیمتی تحفہ لائے۔ یہ خطوط کا مجموعہ تھا جو ۱۹۴۶ء میں غبارِ خاطر کے نام سے شائع ہوا۔ ان خطوط کے مخاطب ان کے صدیق مکرم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۷ء-۱۹۵۰ء) تھے۔ یہ خطوط احمد نگر سے مولانا شروانی کو نہیں بھیجے جا سکے تھے بلکہ انھوں نے بھی انھیں مطبوعہ شکل ہی میں دیکھا۔ اگرچہ ان خطوط کے مخاطب مولانا شروانی تھے، لیکن دراصل ہم انھیں خود کلامی سے تعبیر کر سکتے ہیں یا پھر انشایئے کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔ ان کے موضوعات بہت متنوع ہیں۔ مذہب تاریخ، فلسفہ، ادب، موسیقی مولانا آزاد کے ذاتی حالات و تاثرات سب کچھ ان کے دائرے میں داخل ہے۔ "غبارِ خاطر" میں مولانا آزاد کا اسلوبِ نگارش اتنا لطیف، پرکشش اور دل نشیں ہے کہ اس نے

اسے ان کا ادبی شاہکار بنا دیا ہے۔

۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ یورپ میں ختم ہو چکی تھی۔ البتہ جاپان سے جاری تھی۔ حکومت برطانیہ چاہتی تھی کہ حکومت کا کاروبار چلانے میں ملک کی جماعتوں کے نمایندے حصہ لیں اور جنگی مساعی میں بھی معاونت کریں۔ اس مقصد سے لارڈ ویول وائسرائے ہند نے جون میں شملہ میں ایک کانفرنس طلب کی۔ مولانا آزاد اس میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ یہ کانگریس اپنے مقصد میں اس وجہ سے ناکام رہی کہ مسلم لیگ کا اصرار تھا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے سب مسلمان ممبروں کو نامزد کرنے کا حق تنہا اسے حاصل ہونا چاہیے۔ کانگریس اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ چوں کہ وہ ایک قومی تنظیم ہے، اس لیے اپنے کوٹے میں سے جس مذہب کے ماننے والے کو نامزد کرنا چاہے، اسے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔(India Wins Freedom: P.110-19)

۱۹۴۶ء کے آغاز میں سینٹرل اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخابات ہوئے۔ ان کے بعد اسی سال ہندستانی لیڈروں کے ساتھ مزید مذاکرات کے لیے برطانیہ سے ایک کیبنٹ مشن ہندستان آیا۔ اس دوران برطانیہ میں کنزرویٹو پارٹی کی جگہ لیبر پارٹی برسر اقتدار آ چکی تھی اور وہ ہندستان کی آزادی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ تھی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن سے مذاکرات کے لیے مولانا آزاد کو مکمل اختیارات دے دیے تھے۔ بعد میں آزاد کے ساتھ نہرو اور پٹیل بھی کانگریس کے نمایندوں کی حیثیت سے شریک ہو گئے تھے اور اس طرح تین نمایندے مسلم لیگ کے تھے۔ مولانا آزاد نے ہندستان کی آزادی کے لیے جو اسکیم تیار کی تھی وہ وفاقی نوعیت کی تھی۔ اس کے مطابق ہندستان کو اے، بی، سی، تین خطوں میں تقسیم کرنا تھا۔ اے زون میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور بی اور سی زون میں مسلمانوں کی۔ بی زون میں شمال مغربی صوبے آتے تھے اور سی زون میں شمال مشرقی۔ اس اسکیم میں مرکز کے پاس محدود اختیارات رکھنا تجویز کیا گیا تھا۔ لارڈ اٹیلی نے برطانوی دارالعوام میں آزاد ہندستان کی آئینی حیثیت کا جو قرطاس ابیض پیش کیا۔ وہ کم وبیش ان ہی خطوط پر تھا جو مولانا آزاد نے تجویز کیے تھے اور کیبنٹ مشن نے جس کی منظوری دی تھی۔ یہ قرطاس ابیض ''کیبنٹ مشن پلان'' کے نام سے مشہور ہوا۔ شروع میں مسلم لیگ اس پلان کو ماننے کے لیے تیار نہیں

تھی، بالآخر وہ بھی راضی ہوگئی۔ (India Wins Freedom: P.145-58)

۱۹۴۶ء میں مولانا آزاد کی جگہ نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوگئے (do.162) نہرو نے پریس کانفرنس میں ایک ایسا بیان دے دیا، جس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ کانگریس چاہے تو دستور ساز اسمبلی میں ''کیبنٹ مشن پلان'' میں تبدیلی کرسکتی ہے۔ جناح نے اگرچہ یہ پلان منظور کرلیا تھا لیکن وہ زیادہ خوش نہیں تھے۔ انھوں نے نہرو کے بیان سے فائدہ اُٹھا کر اسے مسترد کر دیا۔ (do.164-65)

عبوری دور میں حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے ایک کابینہ تشکیل دی گئی۔ شروع میں مسلم لیگ اس میں شامل نہیں ہوئی۔ مگر بعد میں ہوگئی۔ مولانا آزاد نے عبوری حکومت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو شمولیت اختیار کی۔ (d.174-76)

مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان کے وائسرائے کا چارج لیا۔ انھوں نے ہندستان آتے ہی یہ بات واضح کر دی کہ حکومت برطانیہ ہندستان کو جلد از جلد آزادی دینے کا فیصلہ کر چکی ہے، لیکن اس سے پہلے فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہونا ضروری ہے۔ آزاد کا اب بھی خیال تھا کہ اس کا بہترین حل کیبنٹ مشن پلان ہے، لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ آسام کا مسئلہ تھا۔ آسام ہندو اکثریت کا صوبہ تھا لیکن سی زون میں بنگال کے ساتھ شامل تھا۔ جس میں کل ملا کر مسلمان اکثریت میں تھے مسلم لیگ چاہتی تھی کہ آسام بدستور سی زون میں شامل رہے۔ اس کے برخلاف کانگریس کا کہنا تھا کہ اگر آسام سی زون میں شامل نہ رہنا چاہے تو اسے اس سے باہر رہنے کا حق ہونا چاہیے۔

(India Wins Freedom: P.195-96)

اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ملک کے تصور کو بڑھاوا دینا شروع کیا۔ اُدھر ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بڑے پیمانے پر بھڑک اُٹھی۔ ان حالات میں بالآخر کانگریس کے رہنما بھی یکے بعد دیگرے تقسیم ملک پر آمادہ ہوتے گئے۔ مولانا آزاد آخر وقت تک اس کے مخالف رہے، لیکن اب ان کی مخالفت بے سود ثابت ہوئی اور بالآخر ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں کے نمایندوں نے ماؤنٹ بیٹن کی پیش کی ہوئی تقسیم ملک کی تجویز منظور کرلی۔ یہ تجویز ماؤنٹ بیٹن پلان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے مطابق ہندستان

کے ساتھ پنجاب اور بنگال بھی تقسیم ہو گئے۔ ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان آزاد ہو گیا۔ مولانا آزاد ہندستان کی پہلی وزارت میں بدستور وزیر تعلیم رہے۔ اس منصب پر وہ اپنی وفات ۲۲؍فروری ۱۹۵۸ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں انھوں نے لوک سبھا کے الیکشن لڑے اور کامیابی حاصل ہوئی۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں سردار پٹیل کے انتقال کے بعد وہ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہو گئے تھے اور آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ درمیان میں ان کے پاس تعلیم کے علاوہ قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیق کے محکمے بھی رہے۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۵ء میں انھوں نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کا ہندستان کے نمایندے کی حیثیت سے دورہ کیا۔ بحیثیت وزیر تعلیم انھوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اعلیٰ تعلیم اور ثانوی تعلیم میں ضروری تبدیلیاں کرنے کی غرض سے کمیشن مقرر کیے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی تاسیس کی۔ ادب، فنونِ لطیفہ اور سنگیت اور ناٹک کے فروغ کے لیے اکادمیاں قائم کیں، بیرونی، بالخصوص مسلم ممالک سے ہندستان کے روابط استوار کرنے کی غرض سے ثقافتی روابط کی ہندستانی کونسل (Indian Council for Cultural Relations) کی تاسیس کی اور اس کے عربی رسالے ''الثقافۃ الہند'' کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کر کے فلسفے کی ایسی تاریخ لکھوائی جو مشرقی اور مغربی فلسفے کی جامع تھی اور جس میں ہندستانی فلسفے کو خاص طور سے اُجاگر کیا گیا تھا۔ صنعتی اور سائنٹفک اداروں کے قیام کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ یونیسکو کے کاموں سے خصوصی دلچسپی لی اور اس میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا آزاد کی جن تصانیف کا ذکر اُوپر آیا ہے ان کے علاوہ قرآن مجید کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ان کے تصنیفی کارناموں میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تفسیر مکمل نہیں ہو سکی، بلکہ صرف سورۂ نور (سپارہ ۱۸) تک پہنچ سکی۔ بالخصوص سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں انھوں نے نہایت دیدہ وری اور تعمق نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کو سب سے زیادہ اُجاگر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ربوبیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ قرآن کے پیغام کی آفاقیت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدالت سے جوڑا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قہر وغضب صفت عدالت ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ بعض اور سورتوں کی تفسیر میں

بھی انھوں نے حق تحقیق اس طرح ادا کیا ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس کی پیروی کی ہے۔ مثلاً ذوالقرنین کو عام طور سے سکندرِ اعظم سمجھا جاتا تھا، مولانا آزاد نے ثابت کیا کہ وہ فارس کا بادشاہ سائرس تھا۔

انڈیا ونس فریڈم ان کی سیاسی یادداشتوں کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے پہلے باب میں انھوں نے مختصراً اپنے خاندانی حالات اور ۱۹۳۶ء سے پہلے کے اپنے ذاتی کوائف بیان کردیے ہیں۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ مولانا آزاد اُسے پروفیسر ہمایوں کبیر کو اُردو میں املا کراتے تھے اور ہمایوں کبیر انگریزی میں منتقل کر دیتے تھے۔ آزاد نظر ثانی کرتے تھے اور جو ردو بدل تجویز کرتے تھے، ہمایوں کبیر اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ کتاب آزاد کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ اس کے کئی اُردو تراجم ہندستان اور پاکستان سے شائع ہوئے۔ اس کا ایک ترجمہ روسی زبان میں اور ''ہند آزاد گرفت'' کے نام سے اس کا فارسی ترجمہ ایران سے شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں اس کے بعض حصے شامل نہیں کیے گئے تھے۔ مولانا آزاد کے انتقال کے تیس سال کے بعد ۱۹۸۸ء میں اس کا جو ایڈیشن شائع ہوا اس میں وہ حصے بھی شامل کرلیے گئے۔

مولانا آزاد کی ایک تصنیف ''البیرونی اور جغرافیۂ عالم'' کا مسودہ ان کی وفات کے بعد ''انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز'' کے کتاب خانے کے آزاد کلیکشن میں دستیاب ہوا اور ۱۹۸۰ء میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور مسیح الحسن کے تقدیم و تحشیہ کے ساتھ ''ذاکر حسین انسی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، دہلی'' سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ادارۂ ''تصنیف و تحقیق پاکستان۔ کراچی'' سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے پیش لفظ کے ساتھ ۱۹۸۹ء میں شائع کیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

غالباً سلیمان بن عبدالملک کا واقعہ ہے کہ اس نے ایک دن جذب و مستی کے عالم میں جاریہ سے پوچھا کہ ''کہو! کیسا ہوں؟'' ''سب سے حسین و جمیل'' جاریہ نے کہا ''تو پھر میری مدح میں کچھ کہو۔'' چنانچہ جاریہ نے کہا

انت خير المتاع لو كنت تبقى
غير أن لا بقاء للانسان
انت خلو من العيوب ومما
يكره الناس غير انك فان

''تم دُنیا کی بہترین متاع ہو، کاش تمھارے لیے بقا ہوتی، تم ہر عیب سے پاک ہو مگر فانی ہو۔''

بے شبہ سلیمان تو اس کلام کا مصداق نہیں تھا، جاریہ چوں کہ کم ظرف شاہ کے مزاج سے واقف تھی، اس نے اس کی مدح میں قصیدہ پڑھ دیا لیکن موجودہ دور میں مدح کا یہ جامہ اگر کسی شخص پر چست آ سکتا ہے تو وہ یقیناً ابوالکلام آزاد کی عظیم شخصیت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج اگر برصغیر ہند و پاک کی تاریخ سے یہ پوچھا جائے کہ تم دورِ حاضر کی کسی ایسی شخصیت کا نام بتلاؤ جو سراپا حسن و جمال ہے، جس کے قلم میں سحر ہے اور لبوں میں اعجاز اور ہنگامہ آرائی سے نفرت، خواہ وہ مذہب کے نام پر ہو یا سیاست کے نام پر، تو تاریخ کا ہاتھ بے اختیار ابوالکلام کی طرف اُٹھ جائے گا۔ لوگوں نے اس شخصیت کو مختلف شکلوں میں

دیکھا ہے۔ کسی نے اسے ''الہلال'' کے آئینے میں دیکھا کہ وہ ہاتھ میں عبرت وتذکیر کا کوڑا لیے کھڑی ہے، جو غفلت ومدہوشی کی پشت پر برس رہا ہے، پھر اسی شخصیت کو ''تذکرہ'' میں دیکھا گیا کہ وہ مقامِ عزیمت پر کھڑی دار ورسن کو چیلنج کر رہی ہے اور کسی نے اسے ''ترجمان القرآن'' میں دیکھا کہ اس کا دل مہبط انوار الٰہی ہے اور وہ لوگوں کے فکر ووجدان کے رشتوں کو مبداء فیاض سے جوڑ رہی ہے۔ غرض کہ لوگوں نے اس شخصیت کو مختلف آئینوں میں دیکھا، لیکن وہ ہر مقام پر کچھ اس رعنائی وقیامت سے جلوہ گر ہوئی کہ اہل نظر جھوم جھوم اُٹھے:

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی دلنواز شخصیت کی تخلیق میں کس کا ہاتھ تھا؟ آخر ان کے عہد میں اور بھی لوگ موجود تھے جنھیں قدرت نے فہم وتدبر کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں لیکن وہ ابوالکلام نہ بن سکے۔ یہی سوال اس تحریر کا محرک ہے، یہاں مولانا کی زندگی یا فضل وکمال پر کوئی تبصرہ کرنا یا قصیدہ لکھنا مقصود نہیں، ان کی زندگی کی صحیح اور مکمل تصویر ''تذکرہ'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں ان کے قلم نے ماضی کے اربابِ صفا اور اصحابِ بے ریا کی تابناک زندگیوں کی تصویریں بنائی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عظمت کے قلعوں کی تعمیر نہ تو سیم وزر سے کی جا سکتی ہے اور نہ ہی جہاں بانی وحکمرانی سے۔ یہاں ہمارے سامنے کتنے ہی ایسے لوگ موجود ہیں جو اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے کے باوجود عظیم انسان نہ بن سکے اور کتنے ہی ایسے مردانِ صفا کیش ہیں جنھوں نے بوریائے فقر پر بیٹھ کر انسانی دلوں پر اپنی عظمت کے تخت بچھائے ہیں۔ اس دُنیا میں حصولِ عظمت کے لیے اگر کوئی چیز معاون ہو سکتی ہے تو وہ صرف حسنِ عمل ہے۔ اگر یہاں کوئی حسنِ عمل کا مالک نہیں تو وہ کچھ بھی نہیں۔ خواہ وہ وقت کا قارون ہو یا افلاطون! آزاد کی عقابی نگاہوں نے اس راز کو بھانپ لیا تھا کہ یہاں کی بڑائی حسنِ عمل کی رہینِ منت ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو ''ترجمان القرآن'' میں قصہ یوسف میں یوں بیان کرتے ہیں:

''بلاشبہ حوادث [جن سے یوسف u کو واسطہ پڑا] کی نوعیت عجیب تھی

اور نتائج بھی عجیب طرح کے نکلے لیکن سنتِ الٰہی کی کرشمہ سازیوں کا تو ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے۔ وہ اپنی کسی بات میں عجیب نہیں، وہ تو سرتاسر معجزہ ہے۔ تم جب چاہو اپنے حسن عمل کی قوت سے ہر طرح کے کرشمے اور اچنبھے پیدا کر سکتے ہو، لیکن مشکل یہ ہے کہ تم چاہتے ہی نہیں اور اسی لیے قانونِ عمل کے کرشمے تم پر کھلتے بھی نہیں۔ دُنیا میں یوسف d کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ گزری، لیکن یوسف کے حسنِ عمل کی سرگزشت ایک ہی مرتبہ کے لیے نہ تھی۔ بلاشبہ مصر کا بازار اب باقی نہیں رہا، لیکن دُنیا کا بازار کس نے بند کیا ہے؟ آج بھی جس کا جی چاہے شانِ یوسفیت پیدا کر کے دیکھے دُنیا کے تختِ عظمت و اجلال اس کا استقبال کرتے ہیں یا نہیں!'' (ترجمان القرآن، ج ۲، ص ۵۳-۲۵۲)

مولانا کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہی کنجی ہے، جس کا پتا اُنھوں نے خود دیا ہے۔ اسی حسنِ عمل کی طرف ڈاکٹر ذاکر حسین نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ گاندھی جی غیر معمولی ذہانت کے مالک نہیں تھے لیکن آج انھیں ہندستان میں جو مقام بلند ملا ہے، وہ ذہانت کا نہیں ان کی ریاضت کا رہین منت ہے۔

حسنِ عمل کی یہی دولت ہے جو مولانا کے حصے میں آئی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی نظر میں جس فکر و رائے کو صحیح جانا اختیار کیا۔ اس راہ میں رنج و محن کی کوئی آزمایش ایسی نہ تھی جو انھیں پیش نہ آئی ہو، لیکن وہ ہر آزمایش میں کامیاب رہے۔ بے شبہ ایک نظریے کے لیے جسے انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں حق سمجھتا ہے، ہر مصیبت کو برداشت کرنا، یقیناً بہت بڑا کام ہے۔ اس کام کے لیے وہی لوگ میدانِ عمل میں اُترتے ہیں جو عظمت کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں۔

یہاں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ''حسنِ عمل'' کی تعلیم کہاں پائی اور کن ہاتھوں نے ان کے لیے حسن عمل کے سانچے تیار کیے؟ بے شبہ مولانا کا خاندان رشد و ہدایت کا خاندان تھا۔ چنانچہ ان کے والد مرحوم نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت

میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور مولانا نے بھی خاندانی روایات کو محفوظ رکھنے میں کوتاہی نہیں کی، لیکن مولانا کے عادات وخصایل اور افکار وآرا کا سانچا خود مولانا نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے، اس بات میں وہ کسی مدرسے کے ممنون ہیں، نہ کسی خانقاہ کے دریوزہ گر! بچپن کی تعلیم و تربیت نے انھیں جو کچھ دیا تھا اس سے وہ آغازِ شباب میں دستبردار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فرماتے ہیں:

> ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک وشبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگ گئے تھے۔'' (غبارِ خاطر: نئی دلی، ۱۹۶۷ء، ص ۹۹)

حقیقت یہ ہے کہ جب مولانا رانچی میں نظر بند کیے گئے تو انھیں پہلی بار اپنے دل کی گہرائیوں میں اُترنے کا موقع ملا۔ جہاں اُنھوں نے اپنے آپ کو پہچانا، اپنی مخفی صلاحیتوں کا سراغ ملا۔ مولانا کی زندگی کے ہر گوشے میں جو توازن، اعتدال، سکون اور گہرائی پائی جاتی ہے وہ انھی تنہائیوں کا نتیجہ ہے جو انھیں رانچی میں میسر آئیں۔ ان تنہائیوں میں اُنھوں نے اپنے افکار وآرا کو قرآن کے آئینے میں دیکھا۔ قلب ونظر کی ہر بیماری کا علاج پایا۔ بے شبہ اپنی گھات میں بیٹھ کر نفس کی خامیوں کی تلاش زندگی کا سب سے دشوار ترین کام ہے۔ عطاء اللہ اسکندری نے کہا تھا کہ بندگی میں ریاکاری کچھ اس طرح دبے پاؤں آتی ہے کہ اس کا پتا نہیں چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ ابو محمد نے کہا تھا کہ میرے نزدیک نفس پر کنٹرول کرنا ہوا میں اُڑنے سے بہتر ہے، (رسالہ قشیریہ) واقعہ یہ ہے کہ مولانا کو اس بات کا علم تھا کہ ''نفس کی چوریاں پکڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے'' اس لیے انھوں نے رانچی میں اپنے آپ کو ''کلیتًا'' قرآن کے سامنے پیش کر دیا۔ تو انھیں پتا چلا کہ جن چیزوں کو وہ عین ایمان سمجھتے تھے، وہ عین کفر تھیں اور وہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ''طاق کو صنم سے خالی کر دیا مگر جیب ودستار کی کبھی خبر نہ لی۔''

یہی کچھ حالت ابن تیمیہ مرحوم کو اُن کے آخری جیل میں پیش آئی تھی۔ فرماتے ہیں:

> ''اس دفعہ مجھ پر علم وفضل کے وہ دروازے کھلے ہیں، جن کی تمنا اہل نظر کیا کرتے ہیں۔ افسوس! کہ میری زندگی کا ایک حصہ دوسرے کاموں

(مناظروں میں) میں بسر ہوا۔"

مولانا نے سچی عظمت کو پانے کے لیے حسنِ عمل کی راہ اختیار کی اور اس راہ میں قرآن مجید ان کا رہنما تھا۔ پھر عزت و رفعت کی کوئی منزل ایسی نہ تھی جس سے مولانا کے قدم آشنا نہ ہوئے ہوں۔ اس لیے آج پورے یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے زندگی کو صحیح معنی میں زندگی بنانے کے لیے نام و نمود کے ہر بت کو توڑا اور مذہب و سیاست میں جس رائے کو صحیح جانا اُسے اختیار کیا، اس پر ثابت قدمی سے چلتے رہے۔

مولانا اور قرآن فہمی:

یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ قرآن مجید وہ مقدس کتاب ہے جس نے اصحابِ فہم و ذکاء کو انسانِ کامل بنایا ہے اور تعصب و جہالت کے بیماروں کو ان کی بیماریوں سے آگاہ کیا ہے۔ ابوالکلام نے بھی اپنی شخصیت کے بناؤ سنگھار کے لیے اسی کتاب سے سب کچھ پایا ہے۔ آج مولانا بزمِ عشق کے دانائے راز شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ مقام مولانا نے اس وقت حاصل کیا جب وہ رانچی جیل میں قرآن کی بارگاہِ عظمت و جلال میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مولانا نے بہت جلد پالیا۔ چنانچہ شیخ علائی کے قصے میں فرماتے ہیں کہ "اب تک قرآن جس قدر پڑھتے پڑھاتے رہے تھے، بیضاوی و بغوی کی ورق گردانی تھی اور محض نقالی و ورق گردانی سے قرآن کی حقیقت کب کھل سکتی ہے۔ اس کے لیے تو جبریلِ عشق کے فیضان اور دلِ دردمند کے الہام کی ضرورت ہے۔" (تذکرہ: نئی دلی، ۱۹۶۸ء، ص ۶۷)

مولانا نے فہم قرآن کے لیے جس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اس سے ایک لمحے کے لیے تغافل برتنا ناممکن ہے۔ "سیّد عطاء اللہ شاہ" نامی کتاب میں مذکور ہے کہ ملتان جیل میں سیّد عطاء اللہ شاہ سے ایک غیر مسلم نے پوچھا کہ قرآن میں مسلمان اور غلامی کہیں اکٹھے نہیں ہوئے تو پھر مسلمان جنگ آزادی میں کیوں آگے نہیں آتے؟

پتا نہیں شاہ جی نے اس سوال کا جواب کیا دیا، لیکن اس کا جواب وہی ہے جو ابوالکلام نے اُوپر دیا ہے، کہ اگر ذاتی فہم و استعداد کی صلاحیتیں معاشرے اور بچپن کی غلط تربیت سے زنگ

آلودنہیں، تو پھر قرآن کے دامن میں ایسے شخص کے لیے سب کچھ موجود ہے اور اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر قرآن سے محروم رہنے والوں کو اپنے فکر ونظر کا ماتم کرنا چاہیے، یہاں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ قاہرہ میں عرب لیگ کے ایک تعلیمی ادارے میں ڈاکٹر رؤف خوری (بیروت کا مشہور عیسائی ادیب) نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج شرق وغرب میں عمر کی حکمرانی کا غلغلہ بلند ہے لیکن کیا عمر کی شخصیت کی تخلیق قرآن مجید کا ہاتھ ہے؟

جواب میں ڈاکٹر موصوف نے خود ہی کہا کہ عمرؓ کو عمرؓ بنانے میں یقیناً قرآن کا ہاتھ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن نے عمرؓ کی فطری صلاحیتوں کو منظم کر دیا تھا اور اُن کی عبقریت کے سامنے ایک راہ کھول دی تھی لیکن اگر ان میں ذاتی استعداد نہ ہوتی تو وہ شاید عمر نہ ہوتے۔ کیونکہ قرآن آج بھی موجود ہے۔ مسلمان اسے پڑھتے بھی ہیں لیکن وہ تڑپ اور سوز وگداز کہاں سے لائیں؟ ایک طرف مولانا کا مزاج ادب وبلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ دوسری طرف مولانا کو قدرت نے دل زندہ عطا کیا تھا جس میں وہ بے تکلف عکس رُخِ یار دیکھا کرتے تھے۔ شیخ رشید رضا نے المنار میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ اصمعی نے ایک دن ایک بچی کو شعر پڑھتے سنا تو حیرت میں رہ گئے، کہ یہ بچی اور ایسے بلند شعر؟ بچی نے اصمعی سے کہا کہ ان شعروں میں کیا دھرا ہے، قرآن مجید کو دیکھیے۔ چنانچہ اس نے سورۂ قصص کی وہ آیات پڑھیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ سے تعلق رکھتی ہیں، جن میں آیا ہے کہ:

> ''ہم نے موسیٰ کی ماں کو حکم دیا کہ وہ بچے کو دودھ پلاتی رہے اور خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے، اس پر ڈریے نہیں، غمگین نہ ہوئیں، ہم بچے کو واپس تیرے پاس لانے والے ہیں اور اسے پیغمبر بنانے والے ہیں۔''

بچی نے آیت کو پڑھنے کے بعد کہا دیکھیے ان آیات کریمہ میں دو امر ہیں، پھر دو نہی ہیں اور پھر دو بشارتیں ہیں۔ بچی قرآن مجید کے ان نکتوں کو بیان کر رہی تھی۔ امامِ وقت اصمعی کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا۔

یہ ہے وہ فطری لطافت جس کے آئینے میں معانی اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہوتے

ہیں۔ چنانچہ جب مولانا اپنی فطری صلاحیتوں کو لے کر قرآن مجید کے پاس پہنچے تو پھر کیمیا بن کر باہر نکلے اور دُنیا نے دیکھا کہ ایک طرف اُنھوں نے اپنے حسنِ عمل سے معجزوں کی تخلیق کی اور دوسری طرف ان کے قلم نے اُردو ادب کے دامن کو قرآنی حقائق و معارف سے بھر دیا۔ یہاں اس واقعے کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے حسنِ عمل کا ایک انمٹ نقش وہ ہے، جسے اُنھوں نے ہندستان کی اجتماعی و سیاسی زندگی کی کتاب میں چھوڑا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء سے جس موقف کو اختیار کیا، اس پر تا دمِ واپسیں قائم رہے اور اپنے مخالفوں کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہا۔ ان کی تحریر و تقریر میں کہیں کسی کے لیے نہ گالی ہے نہ دُشنام، طنز ہے نہ تضحیک، بلکہ اُن کی زندگی سے پتا چلتا ہے کہ اُنھوں نے سب وشتم اور بغض و عناد کے مقابلے میں جو مثالی سکوت اختیار کیا ہے، اس میں انھیں خود لذت آتی تھی اور ان کا سکوت دوسروں کو چیلنج تھا کہ کس میں اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ ان کے صبر و وقار کے دامن پر ہاتھ ڈال سکے اور یہ مقام اسی شخص کو مل سکتا ہے جو فرمودۂ قرآن ''واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاماً'' اور ''واذا مرّوا باللغو مرّوا کراماً'' کی عملی تصویر ہو۔ دوسری طرف ان کے قلم سے ترجمان القرآن جیسا شاہکار نکلا۔ یہ اُردو میں پہلی تفسیر تھی جس میں لوگوں نے قرآن مجید کے پیغام کو اس کی اصلی شکل وصورت میں دیکھا۔ اس تفسیر میں نہ تو منطقیانہ بحث وجدال کی بساط بچھائی گئی ہے اور نہ ہی اسرائیلیات و خرافات کے قافلوں کو یہاں سے گزرنے کی راہ دی گئی، بقول (علامہ رشید رضا) صاحبِ منار:

> ''یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ تفسیر کا اکثر سرمایہ قارئین کو (جو عربی میں ہے) قرآن کے مقاصد عالیہ سے دور رکھتا ہے۔ کہیں اعراب کی بحثیں ہیں اور کہیں بیان و معانی کے نکات و اصطلاحات، کہیں فقہا، مقلدین کے استنباطات ہیں اور کہیں اہل تصوف کی تاویلات اور متکلمین کی جدلیات! غرضے کہ یہ تفسیریں سب کچھ ہیں لیکن قرآن کی تفسیر نہیں ہیں۔ تفسیر تو یہ ہے کہ اس سے عقاید و احکام کی حکمت اور قرآن کے مفہوم و مراد کا پتا چلے جس سے روح میں ایک حرکت ہو اور انسان آمادۂ عمل، تا کہ ''ہدیٰ و رحمۃ'' کا مقصد پورا ہو سکے۔''

ترجمان القرآن:

صاحبِ منار نے جس افسوس ناک امر کی طرف اشارہ کیا ہے، مولانا نے بھی بڑے درد کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرونِ اخیرہ تک جس قدر مفسرین پیدا ہوئے ان کا طریق تفسیر ایک روبہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے، جس کی ہر پچھلی کڑی پہلے سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے...... یہ صورتِ حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے، تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اُتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔''

(ترجمان القرآن: جلد اوّل، دہلی، دفتر ترجمان القرآن، ۱۹۳۱ء، ص ۶۵، ۶۶)

یہ صورتِ حال عربی سرمایہ کی ہے کہ اس کا اکثر سرمایہ فن تفسیر کے ماہرین کی نگاہ میں کھوٹا ہے۔ اُردو کی تہی دامنی کا تو اندازہ لگانا ہی مشکل ہے لیکن جب ابوالکلام نے قرآن مجید کے عمیق مطالب و معانی اور اس کے پرشوکت اسلوب و بیان کو اُردو میں منتقل کیا تو اسلامیانِ ہند کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے اسلوب و بیان کی شوکت اور معانی و مطالب کی عظمت نے مکہ کے اہل فصاحت و بلاغت کو چیلنج کیا تھا کہ اگر انھیں اپنی زباندانی پر ناز ہے تو وہ ذرا سامنے آئیں۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی دن کی روشنی میں آنحضرت ﷺ سے برسر پیکار رہتے لیکن رات کی تاریکی میں قرآن کے اسلوب و معانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے چھپ چھپ کر محمد ﷺ کی تلاوت کو سنتے۔ ابو جہل کی بات تو خیر پرانی ہو چکی آج بھی مصر کے قبطی (مسیحی) قرآن مجید کی فصاحت پر سر دھنتے ہیں اور مکرم عبید جیسے لوگ (مکرم عبید وفد پارٹی کا مشہور مسیحی لیڈر تھا) قرآن کو حفظ کرتے ہیں۔ غرضے کہ ایسی کتاب جس کی فصاحت کا سکہ ہر جگہ چلتا تھا اور چلتا رہے گا، جب اُردو میں منتقل کی گئی تو وہ اپنی اصلی روح کھو بیٹھی اور پڑھنے

والوں کو ایمان وایقان کی گرمی نہ بخش سکی، جن حضرات نے اُردو ترجمے کیے، وہ یقیناً اپنی نیک نیتوں اور حسنِ عمل پر عنداللہ ماجور و مقبول ہوں گے لیکن خدا جانے ان کے ہاتھ میں فقہ وتقشف کی وہ کون سی چھلنی تھی کہ اس میں قرآن مجید کا ترجمہ کچھ یوں چھن چھن کر نکلا کہ اس میں قرآنی بلاغت اور فصاحت کی ادنیٰ سی بھی آمیزش نہ تھی۔ اس سلسلے میں اگر کوئی کامیاب کوشش تھی تو وہ مولانا محمود حسن شیخ الہند اور مولانا شبیر احمد (عثمانی) مرحومین کی تھی۔ یہ ترجمہ دراصل شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمہ کا تازہ ایڈیشن ہے اور اس پر مولانا عثمانی کے کامیاب حواشی ہیں۔ ہزارہا مسلمانوں نے خوب خوب استفادہ کیا۔ خدا نے مولانا (آزاد) کو زورِ قلم سے نوازا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ قرآن مجید جیسی کتاب جو بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین نہ نثر ہے اور نہ ہی نظم، جس کی گل پاشیاں اپنے عہد کے گلستانِ نثر ونظم دونوں ہی سے نکالی ہیں۔ چنانچہ مولانا کے قلم سے ترجمان جیسا شاہکار نکلا، جس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ تبھی ہوسکتا ہے کہ ہم اُردو کے تمام ترجموں کا تقابلی مطالعہ کریں اور قرآن مجید کی مایۂ ناز لغت ''مفردات راغب'' اور عہد حاضر کی مشہور عربی ''تفسیر المنار'' کے ساتھ ساتھ قرطبی کے ''احکام القرآن'' اور زمخشری کی ''کشاف'' سامنے رکھیں، اس تقابلی مطالعے کے بعد پتا چل جائے گا کہ مولانا نے قرآن مجید کے مطالب کو کس خوبصورتی کے ساتھ اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ موجودہ وقت میں تفسیر ''المنار'' کا بڑا شہرہ ہے۔ بے شبہ عربی کی یہ تفسیر ایک کامیاب تفسیر ہے گو کہ یہ بھی ترجمان کی طرح پوری نہیں ہے لیکن دونوں کا تقابلی مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ مولانا نے سورۂ فاتحہ، سورۂ یوسف اور سورۂ کہف میں ذوالقرنین کی تفسیر میں جو انوکھا انداز اختیار کیا ہے اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ مولانا کی تفسیر کے بعض حصے جب ''ثقافۃ الہند'' (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز۔ دہلی کا ترجمان) میں شائع ہوئے تو مصر کے علمی حلقوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ خود مجھ سے عراق کے مشہور عالم شیخ بہجت اثری نے کہا کہ آزاد نے ذوالقرنین کو ایک خدا پرست ایرانی بادشاہ کہا ہے، جس کے سامنے اب اُردو میں کسی دوسرے کا چراغ جلنا مشکل ہے۔ آج اہل ایران نے ذوالقرنین کی آزاد تفسیر کو اپنا لیا ہے۔ بھارت میں ایران کے ایک سابق سفیر نے اپنی کتاب ''کشورِ ہند'' میں ابوالکلام آزاد کو ''ایشیا کا عظیم مدبر'' قرار دیا ہے۔

مسئلۂ وحدتِ دین:

واقعہ یہ ہے کہ وحدتِ ادیان پر مولانا نے وہی کہا ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ تمام ادیان اپنی اصل میں ایک ہی ہیں۔ اسلام کسی نئے دین کا نام نہیں ہے، جو یہود و نصاریٰ کی گروہ بندی کی طرح نئی گروہ بندی کرنے آیا ہو۔ جن پیغمبروں مثلاً حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ، حضرت مسیح اور آنحضرت (علیہم السلام) نے جس زمان و مکان اور زبان میں اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا ہے، اسی پیغام کا نام اسلام ہے:

"شرع لكم من الدين ما وصّى به نوحًا والذي اوحينا اليك وما وصينا به ابراهيم وموسٰى وعيسىٰ ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه" (سورہ الشوریٰ:۱۳)

اس معنی میں مولانا لکھتے ہیں:

"وہ (قرآن) بار بار کہتا ہے، میری تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف بلاتا ہوں۔ میں کسی مذہب کو نہیں جھٹلاتا، میں کسی رہنما سے انکار نہیں کرتا، سب کی یکساں تصدیق اور سب کی مشترکہ اور متفقہ تعلیم میرا دستور العمل ہے۔ پھر میرے خلاف تمام پیروانِ مذہب نے کیوں اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔" (ترجمان القرآن: ج ۱، ص ۱۵۴)

اسی معنی میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"اس نے (قرآن نے) صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں، وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے

نام سے پکارتا ہے۔'' (ایضاً: ص ۱۶۳)

یہ ہے اسلام کا مفہوم جس کو مولانا نے اپنے خاص اسلوب میں اہل ہند کے سامنے پیش کیا، جس پر بعض لوگوں نے کہا کہ وہ اسلام کے جدید مفہوم کو سن رہے ہیں۔ حال آں کہ یہ کوئی جدید مفہوم نہیں تھا بلکہ وہی تھا جسے قرآن نے پیش کیا تھا کہ اسلام تمام ساوی ادیان کی تجدید کا نام ہے۔

مصر کے ڈاکٹر عبداللہ دراز مرحوم اسلام اور دوسرے ادیان کے باہمی تعلق پر اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

''قرآن کی زبان میں اسلام کسی دین کا نام نہیں ہے بلکہ اس مشترک دین کا نام ہے جس کی ہر نبی نے صدا لگائی تھی اور جس کی طرف نبی کے پیرو منسوب تھے جیسا کہ ہم حضرت نوح کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ اپنی قوم سے فرماتے ہیں "امرت ان اکون من المسلمین" یا حضرت یعقوب اپنے بیٹوں کو وصیت کر رہے ہیں "فلا تموتن الا وانتم مسلمون" اور بیٹے جواب میں کہہ رہے ہیں "نعبد الٰهك واله آبائك ابراهيم واسماعيل واسحاق الها واحداً ونحن له مسلمون"

ڈاکٹر موصوف اپنے بیان کے آخر میں لکھتے ہیں کہ

قرآن کی زبان میں ہم نے اسلام کے جو معنی بیان کیے ہیں، اس کے پیش نظر یہ سوال کرنا درست نہ ہوگا کہ اسلام اور دوسرے آسمانی ادیان میں کیا فرق ہے؟ کیوں کہ کسی چیز کے بارے میں یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ اس کا اپنی ذات کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ پس یہاں ایک ایسی وحدت ہے جو نا قابل تقسیم ہے۔'' (المجلہ: قاہرہ، فروری ۱۹۵۸ء)

علامہ فرید وجدی نے ۱۹۰۶ء میں ایک دینی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''اسلام کسی نئی قوم کے لیے کسی نئے دین کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہی دین ہے، جسے اللہ

نے تمام رسولوں کو عطا کیا تھا۔ پھر ان کے پیروؤں نے اس میں ردوبدل کردیا تھا۔ آخر کار خدا نے رسول اللہ ﷺ کو تمام ادیان کی اصلاح کے لیے بھیجا اور یہ قاعدہ ٹھہرایا کہ ہم اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں، بعض کو ہم جانتے ہیں اور بعض کو نہیں! ایسے ہی ہم اس کی تمام کتابوں پر خواہ کسی زبان میں ہوں، یقین رکھتے ہیں۔ (مقدمہ تفسیر الوجدی: ص ۱۱۲)

ان عبارتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ مولانا کے نزدیک وحدتِ ادیان کا مفہوم کیا ہے؟ مقامِ تعجب ہے کہ ان عبارتوں کے ہوتے ہوئے جن میں کسی قسم کا کوئی ابہام ہے نہ پیچیدگی۔ مولانا کے ناقدین نے ''وحدتِ ادیان'' کے مفہوم کو کیوں نہیں سمجھا اور اسے غلط معنی پر کیوں محمول کیا؟

ترجمان القرآن......ایک تاریخی تفسیر:

بے شبہ مولانا مرحوم کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ایک تاریخی تفسیر ہے لیکن مولانا نے عملی زندگی میں جو تاریخی کام کیے ہیں، ان سے بھی رہنمائی ملتی ہے۔ تقسیم کے بعد جب دو بڑی قومیں الگ الگ ہوئیں اگر اس وقت صحیح سیاسی فیصلے نہ کیے جاتے تو اور خون گرتا اور دنیا کے بازار میں دونوں قوموں کی مزید رُسوائی ہوتی، لیکن دونوں سیاسی رہنماؤں محمد علی جناح اور جواہر لال نہرو نے سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے صحیح فیصلے کیے کہ سیاسی میدان میں ملک کے تمام شہری، ان کا کسی بھی مذہب سے تعلق ہو، برابر کے شہری ہیں، یہ اعلان ۱۱/اگست کو مرحوم محمد علی جناح نے گورنر جنرل کی حیثیت سے کیا۔ اسی قسم کا اعلان جواہر لال نہرو نے بھی کیا کہ ملک میں سیکولر جمہوریت ہوگی اور ملک کے تمام شہری سیاسی طور پر برابر ہیں۔ سیکولر جمہوریت میں نہرو کو مولانا آزاد کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

اس موضوع پر مرحوم پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''ابوالکلام آزاد اور ہندستان نے آزادی جیت لی'' کے صفحوں پر تفصیل سے لکھا ہے کہ آزاد نے نہرو سے مل کر سیکولر جمہوریت کو اختیار کر کے صحیح قدم اُٹھایا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد نے وفات پائی تو

ہندستان میں اور خاص طور پر جواہر لال نہرو نے جس انداز سے ماتم کیا اور مولانا کی سیاسی دانشوری کو جو خراج ادا کیا اس سے پتا چلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ پارلیمنٹ میں نہرو سے پوچھا گیا کہ مولانا نے ورثہ میں مال و دولت میں کیا چھوڑا ہے؟ تو نہرو نے جواب میں کہا ''ان کے کمرے سے جو چند فہرستیں دستیاب ہوئی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کی ساری آمدنی دہلی کی غریب بیوہ خواتین (ہندو یا مسلمان) کو چلی جاتی تھی۔ اس بیان پر حزب مخالف کے لیڈر رنگا جی نے کہا تھا'' مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ مولانا کی تنخواہ غریب عورتوں کو چلی جاتی تھی۔'' مولانا بے شبہ اپنے عہد کی منفرد سیاسی، ادبی اور مذہبی شخصیت تھے۔

ایک لافانی شخصیت

شیخ احمد الباقوری

''مردِ حق اور ایسے مردِ حق کم ہی ہوتے ہیں!''

یہ تقریر اس موقع کے لیے لکھی گئی تھی جب ہندستان کے قایدین کے فیصلے کے مطابق مولانا آزاد کی سترویں سالگرہ کی تقریب میں ان کی ان خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کا خیر مقدم کیا جانے والا تھا جو انھوں نے ہندستانی قوم اور عام انسانیت کے لیے انجام دی ہیں، خواہ ان کا تعلق سیاسی یا تمدنی میرے سے ہو یا قومی آزادی کے میدان سے!

لیکن ایک طرف تو اس تقریب کے منانے والے اس کی تاریخ کے تعین میں مصروف تھے دوسری طرف اجل نے مولانا کی تاریخ کا تعین کر دیا تھا، اجل ہی نے سبقت کی اور مولانا نے اپنے خالق کی پکار پر لبیک کہا اور اسی طمانیت کے ساتھ جو ان کی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت تھی اور کون جان سکتا ہے کہ اگر مولانا ابھی زندہ رہتے تو مقررین اور مصنفین کے لیے یہ ممکن بھی ہوتا کہ وہ ان کی شخصیت اور ان کی خدمات کے متعلق اپنے جذبات محبت و احترام کا اظہار بھی کر سکتے؟ اس کا امکان اور بھی کم تھا، کیونکہ مولانا کو مدح و ستائش سے طبعی نفرت تھی۔ ان کے لیے اس سے زیادہ کوئی چیز پریشان کن اور تکلیف دہ نہ ہوتی کہ وہ خود اپنی مدح سنیں، گو یہ مدح بالکل جائز اور صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ اس اعتبار سے انھوں نے اپنے آپ کو عظمت کی سطح سے بھی بلند ثابت کیا تھا۔ ان عظیم صفات سے واقف ہونے کے باوجود، جو خدا نے ان میں ودیعت کی تھیں، انھوں نے کبھی مدح و ستایش کے الفاظ سننا پسند نہیں کیا۔ تاہم اجل نے مولانا کے ساتھ عدل کرنے اور ان کی خواہشات کی تشفی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عدل تو اس طرح کیا

گیا کہ مقررین، اور مصنفین کو موقع دیا گیا کہ تکدر و اضطراب پیدا کیے بغیر وہ ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار تقریر و تحریر میں آزادی کے ساتھ کریں۔ مدح سے جو انھیں کراہت تھی، اس کا لحاظ کیے بغیر اب وہ آزادی سے اس کا اظہار کر سکتے ہیں، اپنے پسندیدہ طریقے سے ان کو پیش کر سکتے ہیں، وران کی تصویر الفاظ میں کھینچ سکتے ہیں۔ مولانا نے انھیں اب تقریر اور تحریر کی آزادی دے دی ہے، کیوں کہ مولانا کے وجود کا تعلق اب تاریخ سے ہو گیا ہے۔ اجل نے ان کی خواہشات کی تکمیل بھی کر دی کیوں کہ اب وہ صرف صداقت ہی کی آواز سن سکتے ہیں جس پر ان کا کامل ایقان تھا اور جس کا وہ انبساط کے ساتھ اظہار کیا کرتے تھے۔ مولانا کی یاد میں اب جو شخص کچھ کہنا یا لکھنا چاہتا ہے وہ صداقت کی آواز بلند کر سکتا ہے۔ مولانا کی زندگی کو اب وہ ایک بالغ نظر مؤرخ کی طرح تحلیلی انداز میں پیش کرے گا۔ جس کا کام صداقت کو واضح کرنا اور آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہو گا۔ مولانا کی زندگی اور ان کی شخصیت کو اُجاگر کرنا میری ناچیز رائے میں ان کے احباب اور رفقاء کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ مولانا کے ہر قول اور فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق و صداقت کے جویا تھے۔

ان کی لوگوں سے ملاقات، خواہ یہ لوگ ان سے اتفاق کریں یا اختلاف ان کا زندگی کے معاملات میں رد یا قبول، غرض ان کی ہر چیز، حق، صداقت اور خیر ہی کے معیار سے جانچی اور پرکھی جاتی تھی۔ وہ صرف اسی چیز کو قبول کرتے تھے، جو سچی اور اچھی ہوتی تھی اور خیر و صداقت ہی کے اصول پر ان کا قیام تھا۔ جو چیز بھی ان اصول کے خلاف ہوتی وہ اس کو رد کر دیتے خواہ ایسا کرنے میں فتنہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہوتا اور ایسے وقت شر کے محرکات اور داعیات کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوتے۔ مولانا زندگی کا تصور بغیر خیر و صداقت کے کر ہی نہیں سکتے تھے۔ قوم کو قوم اسی وقت سمجھا جا سکتا تھا جب اس کا محرک عمل بھی خیر و صداقت ہوتا۔ ان حالات کے پیش نظر ہم یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کی روح کو روح و ریحان قطعاً نصیب ہیں۔ ان کی یاد میں جو کچھ کہا جائے گا اس پر صداقت کا نشان ہو گا اور اس میں خیر کی تجلی ہو گی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا وجود خیر و صداقت کا مادی مظہر تھا۔ ان کی زندگی خیر و صداقت ہی کے لیے وقف تھی۔ مولانا کو احکام قضا سے اور بھی راضی ہونا چاہیے کہ جو دن ان کے اکرام و احترام

کا مقرر کیا گیا تھا اس کو تذکرہ کے موقع سے بدل دیا گیا جو قوم کو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا اور اعمال صالحہ کی طرف مائل کرتا ہے۔

اجل کا یہ بھی فتوی تھا کہ مولانا سے متعلق جو تجربات مجھے ان کی موت کے بعد حاصل ہوں وہ ان تجربات سے کہیں زیادہ ہوں جو ان کی زندگی میں مجھے حاصل ہوئے۔ اپریل سنہ ۱۹۵۵ء میں جب صدر ناصر اور میں بینڈونگ کانفرنس میں شریک ہونے جا رہے تھے میری ان سے دہلی میں صرف چند لمحوں کے لیے ملاقات ہوئی تھی۔ سیّد اسماعیل کامل نے، جو دہلی میں مصر کے سفیر اور ہندستان کے چاہنے والوں میں سے ہیں، میری ان سے ملاقات کروائی۔ میرا تعارف مصر کی انقلابی حکومت کے ایک وزیر اور جامعہ ازہر کے ایک فارغ التحصیل مذہبی آدمی کی حیثیت سے کرایا گیا۔ مجھے اب بھی وہ جملے یاد ہیں جو اس موقع پر ان کی زبان سے نکلے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہدایت والہام کے لیے مذہب پر اعتماد کرنا بنی نوع انسان اور خود مذہب کی خدمت کا بہترین طریقہ ہے۔ ملاقات سے قبل میں نے مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ملنے کے لیے کافی تیاری کر لی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان کا قریب سے مشاہدہ کرنے میں کوئی چیز میری توجہ کو پراگندہ اور میرے عزم کو کمزور نہ کرنے پائے، خصوصاً جب کہ میں نے ان کے علم و فضل، ان کی شرافت نفس کے متعلق بہت کچھ سنا تھا اور جس کا دور دور شہرہ بھی تھا۔ میرے پیش نظر مسئلہ یہ تھا کہ میں ایسی عمیق اور ایسی کثیر الفضائل شخصیت کی گہرائیوں تک کس طرح جا پہنچوں اور اس کی عظمت اور اس کی غیر معمولی ذہانت و طباعی کا کس طرح کامل وقوف حاصل کروں۔ اس مختصر سی ملاقات میں زیادہ سے زیادہ جو چیز مجھے حاصل ہو سکتی تھی وہ نشاط و اہتزاز تھا جو ایک صناع کو فنون لطیفہ کے کسی پیکر کے مشاہدے سے حاصل ہو سکتا ہے یا وہ رفعت ذہنی تھی جو ایک سائنس دان کو کسی محیر العقل دریافت سے نصیب ہوتی ہے۔ مولانا کی شخصیت نے مجھے مغلوب کر لیا، ان کی روح کی لطافت و نورانیت نے مجھے بڑا متاثر کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملاقات کے ان چند لمحوں میں وہ زماں کی تحدید و تقیید سے ماورا ہو گئے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں میں نے محسوس کیا کہ گویا ہم ایک دوسرے کے قدیم دوست ہیں۔

یہ مختصر سی ملاقات میرے شوق کی تسکین کا سامان نہ کر سکی۔ ان کی زندگی کے مختلف اور

متنوع پہلوؤں کو جاننے کی خواہش اور زیادہ تیز ہوگئی۔ میری مثال اس تشنہ مسافر کی سی تھی جس کو بیابان کے بیچ میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ مل جاتا ہے۔ میں نے ان سے ذہنی وروحانی ربط قایم کرنے کا ارادہ کرلیا اور خود ان کی تصنیفات اور جو کچھ ان کے متعلق لکھا گیا ہے ان کا سیر حاصل مطالعہ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ میرا یہ فیصلہ مولانا کے کثیر و وافر خزانہ علم کے پیش نظر، جس کا تعلق اس دنیا سے بھی ہے اور ماورائے دنیا سے بھی، زیادہ تعجب انگیز تو نہ تھا!

مغربی دنیا اپنے عملی و صنعتی ترقیوں اور کامیابیوں کے ذریعے ہمارے ذہنوں سے ہمارے ماضی کی عظمت اور کبرائے ملت کی یاد کو محو کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنے ماضی و حال کی تاریخ کے محاسن کو بھی نظر انداز کر دیا ہے لیکن مشرق کی موجودہ بیداری ہم میں ضرور ایک نیا شعور پیدا کر دے گی جس کی وجہ سے ہم اپنے ماضی و حال کے انمول خزانوں کی قدر کرنے لگیں گے اور ہمیں اس امر کا تحقق ہو جائے گا کہ یہ ان نفائس سے کہیں زیادہ قابل قدر ہیں جن کو ہم نے مغربی تمدن سے مستعار لیا ہے اور اتنے ہی یا شاید ان سے زیادہ نفع بخش بھی ہیں۔

جب میں ان سے مل کر جدا ہوا تو میں نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ ان کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کروں گا، لیکن ایک طرف تو ان کی مصروف زندگی اور دوسری طرف خود میرے اشغال نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہیں دیا اور میں ان کے علمی و تعلیمی کاموں پر غور نہ کرسکا اور نہ ان کی تہذیبی سرگرمیوں کے مطالعے کے لیے کافی وقت نکال سکا!

قضا و قدر کا منشا تھا کہ مولانا کی زندگی کا ایک پرسکون انجام ہو۔ ان کی وفات نے تاریخ کے طلباء کو ایک موقع فراہم کیا ہے کہ وہ مولانا کا صحیح نظر سے مشاہدہ کریں اور ان کی عظمت کے مختلف پہلوؤں کا انکشاف کریں اور ان کو شہرت دیں۔ مولانا اپنی زندگی میں ایک حرکی قوت ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی مثال ایک شہاب ثاقب سے دی جاسکتی ہے جو فضا میں ایک ہولناک رفتار سے سفر کر رہا ہے اور جس کا مشاہدہ اس کی چمک دمک ہی کی وجہ سے کیا جاسکتا ہے، لیکن کوئی یہ جان نہیں سکتا کہ اس نور درخشاں کے اندر کیا ہے!

(۲)

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مولانا سے میرا ذہنی رابطہ ان کی وفات کے بعد بہ نسبت اس ربط وضبط کے جو مجھے ان کی زندگی میں حاصل ہوا زیادہ عمیق ہو گیا ہے۔

وفات پا کر وہ میرے حافظہ میں زندہ ہو گئے ہیں۔ اپنی زندگی میں انھوں نے ایک عظیم خلا کو پر کیا تھا، لیکن جب انھوں نے اس دار فانی سے رحلت کی اور ان کے قلم کا تازہ چشمہ خشک ہو گیا تو ہم نے اس حادثۂ فاجعہ کے وزن کو محسوس کیا اور جس نعمت عظمیٰ سے محروم ہو گئے ہیں اس کا ہمیں شعور ہوا۔ ہر آفت کے نزول کے وقت ہم انہیں یاد کرتے ہیں، کیونکہ ہدایت ومشورہ کے لیے ہمیں ان کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ جن نعمتوں سے وہ فیض یاب ہو رہا ہوتا ہے ان کو بھول جاتا ہے لیکن جب یہ نعمتیں سلب کر لی جاتی ہیں تب وہ ان کی قیمت واہمیت کا احساس کرتا ہے۔ اب وہ ان کی تعریف کے ترانے گانے لگتا ہے اور ان سے محروم ہو جانے کا غم کرتا ہے۔

ہندستان میں زمانہ ماضی اور حال میں جو بہت سارے کبرائے قوم گزرے ہیں ان کی طرح مولانا آزاد بھی بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت تھے۔ انھوں نے صداقت کی تعلیم دی، محبت کا سبق دیا اور اعمال صالحہ کی تلقین کی۔ فلاح انسانی کا حصول ان کی زندگی کا مقصد تھا، اس کے محرکات نہایت رفیع وجلیل تھے۔ یہ مقصد ہمیشہ ان کے ملحوظ خاطر رہا، ان کے ضمیر نے اس کی پرورش کی، اور ان کی غیر معمولی ذہانت نے اس کو تقویت پہنچائی۔ ان کی پاک روح اصول صحیحہ اور اقدار انسانیہ کا مرقع تھی جن کو انھوں نے اپنی زندگی میں جذب کر لیا تھا اور دوسروں کو اس کی تبلیغ کیا کرتے تھے تاکہ زندگی کی صحیح راہ کی طرف ان کی ہدایت ہو سکے۔ جس طرح پانی اس برتن کا رنگ اور شکل اختیار کر لیتا ہے، جس میں وہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اصول اور تصورات بھی شخصیت کا رنگ اور مزاج قبول کر لیتے ہیں، خواہ یہ شخصیت صالح اور امین ہو یا فاجر اور قبیح۔ نیک اور عادل شخص عموماً اپنے علوم وفضائل کو اپنی قوم کی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کا علم اس چشمے کے مانند ہوتا ہے جس سے ہر شخص سیراب ہوتا ہے۔ وہی

تعلیم ایک خبیث روح میں بلا و مصیبت کا سبب بن جاتی ہے، قوم کو گمراہ کرتی ہے اور اس کو اعمال سیئہ پر اُکساتی ہے۔ پاک زمین میں جب ایک بیج بویا جاتا ہے تو وہ ایک سرسبز و شاداب درخت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور پھل دیتا ہے۔ وہی بیج جب خراب زمین میں ڈالا جاتا ہے تو مٹی ہی میں گل سڑ جاتا ہے، مٹی اس کو اسی طرح کھا جاتی ہے جس طرح زنگ لوہے کو کھا جاتا ہے۔ ہمارے رسول کریم، صلوات اللہ علیہ، نے اس مفہوم کو اس طرح صحیح طور پر ادا کیا ہے کہ ''خدا نے رشد و ہدایت کی جس دعوت پر مجھے مامور کیا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے، اگر یہ صالح زمین پر ہوتی ہے تو اس سے درخت اُگتے ہیں اور پھل دیتے ہیں، جب بنجر زمین پر ہوتی ہے تو یہ پانی کا ذخیرہ کر لیتی ہے جو لوگوں کے کام آتا ہے لیکن اگر یہ بارش غیر صالح زمین پر ہوتی ہے تو نہ اس سے درخت اُگتے ہیں اور نہ یہ پانی ہی کا ذخیرہ کرتی ہے کہ پینے یا زراعت کے کام آئے۔''

(۳)

مولانا کی ذات میں خیر ہی کو جگہ مل سکتی تھی اور صرف امن و محبت ہی آسرا پا سکتے تھے۔ ایسی شخصیت میں جب ایک دفعہ صداقت کا ظہور ہو جاتا ہے تو پھر اس کی تجلی سے اوروں کی راہ منور ہو جاتی ہے۔ ایسی شخصیت صداقت کو پانے کے بعد پھلتی اور پھولتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس نکتہ کو یوں ادا کیا ہے:

وَالبَلَدُ الطَّیبُ یخرج نباتہ بِاِذنِ رَبِّہٖ وَالَّذِی خَبُثَ لَا یَخرُجُ اِلَّا نَکِدًا

(الاعراف:۵۸)

''اور (دیکھو!) اچھی زمین اپنے پروردگار کے حکم سے اچھی پیداوار ہی نکالتی ہے، لیکن جو زمین نکمی ہے، اس سے کچھ پیدا نہیں ہوتا، مگر یہ کہ نکمی چیز پیدا ہو!''

مولانا کی یہ خوش نصیبی تھی کہ مکہ مکرمہ ان کا مولد، ہندستان ان کا موطن اور اسلام ان کا مذہب تھا۔ مکہ مکرمہ میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کے والدین نے وہاں سکونت اختیار

کی تھی زمین رسالت کے مقدس ماحول سے فیوض و برکات حاصل کیں۔ یہ غیر قرین قیاس نہیں کہ جاذبۂ الٰہیہ نے مولانا پر اپنا پرتو ڈالا ہو اور ان کے قلب میں جاگزیں ہو گیا ہو کیونکہ متبرک ماحول ہی میں فیوض الٰہیہ کا ورود ہوتا ہے۔

مولانا نے اپنی زندگی ہندستان میں بسر کی جہاں روح مادیت کے قیود سے آزاد ہوتی ہے، جہاں زندگی کی لذات وشہوات سے اجتناب واحتراز ایک عام قاعدہ ہے، وہ ہندستان جہاں ارباب ہنر پرورش پاتے ہیں، جہاں ذہنی فضایل کو نشو ونما پانے کا موقع ملتا ہے اور جہاں نقاد اور مبصر پیدا ہوتے ہیں۔

اسلام جو مولانا کا دین وایمان تھا، ایک ایسا مذہب ہے جو رنگ ونسل کے اعتبارات سے ماورا ہو کر انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتا ہے۔ ایک پیدایشی مسلمان اپنے پیدایشی عقیدے کی بنا پر کسی دوسرے پر ترجیح نہیں پاتا اور نہ کوئی ممتاز مقام حاصل کرتا ہے، اور نہ اسلامی عقیدے ہی کہ وجہ سے کوئی اخلاقی رذائل سے پاک سمجھا جا سکتا ہے۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے انسان اپنے اعمال وافعال ہی کی بنا پر اور ان خیر و شر کی وجہ سے جو اس کی ذات میں پائے جاتے ہیں یا تو علوے مرتبت حاصل کر سکتا ہے یا پھر اسفل السافلین میں جا گرتا ہے۔

اسلامی اصولوں کو مولانا کی ذات میں ایک خوشگوار اور موافق ماحول ملا۔ بہت جلد ان اصولوں نے ان پر غلبہ پالیا۔ ان ہی سے ان کے ذہن کی تشکیل ہوئی جس سے وہ سوچا کرتے تھے، ان ہی سے ان کے قلب کی تشکیل ہوئی جس سے وہ محسوس کرتے تھے اور ان ہی سے ان کے ضمیر کی صورت بنی جس سے وہ حکم لگاتے تھے۔ اسلام کے قوانین وروایات پر عمل ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا، نہ اسلام کی راہ پر جادہ پیمائی اور اس کے اوامر کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کے لیے سخت تھا۔ ان کی ذات میں اسلام ایک سیرتِ صالحہ اور اپنے تمام باطنی خیرات وحسنات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگر مولانا مذہبی آدمی نہ ہوتے تب بھی ان کی سیرت تمام اخلاقی رذایل سے پاک ہوتی۔

مولانا کی عظمت کا کامل ظہور وجود باری کے عقیدے میں ہوتا ہے، جو ان کے قلب میں راسخ تھا اور ان کے اسلامی اصول کے صحیح فہم وبصیرت میں، بغاوت کے الزام میں انھیں ایک

برطانوی عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان کے خلاف شہادت کا مواد ان کی دو تقریروں سے حاصل کیا گیا جو انھوں نے کلکتہ میں کی تھیں اور ان میں تمام ہندستانیوں کو عام طور پر اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکومت کے خلاف شہری مقاومت پر اُبھارا گیا تھا۔ مقدمہ سنہ ۱۹۲۲ء میں چلایا گیا جب کہ مولانا میں ابھی شباب کا شعلہ فروزاں تھا۔ زندگی کی اس منزل میں انسان کو عموماً یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے شباب کو قائم رکھے اور اس کو پیری سے دہشت ہوتی ہے۔ عام طور پر انسان لذائذ حیات سے متمتع ہونا چاہتا ہے اور اپنے ہی معاملات سے اگر مولانا اپنے زمانہ شباب میں اس پہلو کو اختیار کرتے تو سمجھا جاتا کہ جوانی کے فتنہ جو مزاج کا یہی تقاضا تھا۔ اگر پیری میں ان کا یہ رویہ ہوتا تو سمجھا جاتا کہ یہ ضعیفی کی یاس وقنوط کا نتیجہ تھا لیکن احکام قضا کا یہ منشاء تھا کہ مولانا اپنی عمر کی اس منزل میں جب کہ وہ جوانی اور پیری کے دوراہے پر تھے عزیمت کا ثبوت دیں۔ اس طرح قضا وقدر رفعت انسانی کی ایک مثال، جبر واستبداد کی مقاومت کا ایک نمونہ، صداقت پر کامل ایقان کا ایک ثبوت جریدۂ عالم پر ثبت کرنا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد کو مقابلہ کرنا تھا سلطنت برطانیہ کے سطوت وجلال کا جس کی دہشت عوام کے قلوب پر مستولی تھی اور ان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور نجات کی ہر اُمید کو ان کے سینوں سے محو کر دیا تھا۔ مولانا تنہا اس عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ کرنے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قوی ایمان اور آہنی عزم کے سوا ان کے پاس اور کوئی ہتھیار نہ تھے۔ جیوری کے سامنے وہ تنہا کھڑے تھے اور ان سے کسی قسم کے رحم یا ہمدردی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ جیوری سے ان کی توقع کچھ اسی قسم کی ہو سکتی تھی جو ایک مسکین بھیڑ کے بچے کو بھوکے بھیڑیوں سے ہو سکتی ہے۔ جوں ہی عدالت میں اس جنگ کا آغاز ہوا ظاہر ہو گیا کہ یہ تاریخ کی ایک شدید جنگ ثابت ہونے والی ہے۔ اس جنگ میں مولانا کو بنی آدم کے لیے فتح مبین حاصل ہوئی، ایسی فتح جس نے نسل ہا نسل تک انسانیت کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔ اب ہم مولانا کے لیے جگہ خالی کرتے ہیں تا کہ وہ اپنے موثر الفاظ میں اس مجادلہ کا قصہ بیان کریں جس میں قوی تن ہی حصہ لے سکتے ہیں اور جو انسان کے قلب کو قوی کرتا اور اس میں جان ڈال دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شر کی قوتوں کو شرمندہ اور ذلیل کر دیتا ہے۔

مولانا نے عدالت کا مقابلہ جرأت اور استقامت کے ساتھ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عدالت میں نہیں حاضر ہوئے بلکہ کسی عزیز سے ملنے آئے ہیں۔ عدالت میں جو سناٹا چھایا ہوا تھا وہ مولانا کے الفاظ سے ٹوٹا۔

''میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان یہاں پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی اُمید ہے، نہ طلب ہے نہ شکایت ہے! یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف یہاں دم لے لینا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم سیدھے جیل چلے جاتے۔''

(قول فیصل: کلکتہ، البلاغ پریس، ۱۹۲۳ء، ص ۳۲)

یہ کہہ کر مولانا اپنے لیے قید یا موت کا فاصلہ قریب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک ایسے ملک میں رہنے کی بہ نسبت جہاں ظالموں ہی کی چلتی ہو انھوں نے محبس و موت ہی کو ترجیح دی۔ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصے میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد اور شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور ونشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابل رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے، کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے، اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے۔''

''بہرحال میرا ارادہ نہ تھا کہ میں بیان دوں لیکن...... جب میرا مقدمہ پیش ہو چکا ہے تو میں نے دیکھا کہ گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے معاملے میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے۔ حال آں کہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس کی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیے۔''

پہلے میرے خلاف دفعہ ۱۷/۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کا دعویٰ کیا گیا تھا، لیکن جب اس کا

ویسا ثبوت بھی بہم نہ ہو سکا، جیسا کہ آج کل اثبات جرم کے لیے کافی تصور کیا جاتا ہے تو مجبوراً واپس لے لی گئی۔ اب ۱۲۴/ الف کا مقدمہ چلایا گیا ہے، لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مقصد براری کے لیے کافی نہیں، کیوں کہ جو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، وہ ان بہت سی باتوں سے خالی ہیں، جو میں اپنی بے شمار تقریروں وتحریروں میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اور وہ شاید گورنمنٹ کے لیے زیادہ کارآمد ہوتیں!"

یہ دیکھ کر میری رائے بدل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا وہی اب متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے کے دکھلا نہیں سکتی اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں۔" (ایضاً: ص ۳۵،۳۶)

کیا کسی نے ایسے ملزم کو دیکھا ہے جو اپنے جرم کا ثبوت خود فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور عدالت کو اپنے خلاف فرد جرم سنانے میں مدد دیتا ہے؟ اس کام کی توقع محن و ابتلاء کے موقعوں پر صرف عالی نہاد ہستیوں ہی سے ہو سکتی ہے۔ مولانا نے بیان کے دوسرے حصے میں اپنے جرم کے ثبوت میں فرمایا:

"اگر یہ بیانات کورٹ کی رائے میں میرے جرم کے ثبوت کے لیے کافی ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ گزشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں گا۔" (ایضاً: ص ۴۷)

مولانا اچھی طرح جانتے تھے کہ غلط کاموں کو جائز قرار دینا اپنے ضمیر، خدا اور انسانیت کے خلاف عمل کرنا ہے۔ ان کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ اپنے مذہب اور اپنے ضمیر کے آگے اخلاقی طور پر ذمے دار ہیں کہ وہ باطل کو اپنی پوری قوت سے دفع کریں اور اگر اس مقصود کے حصول میں مادی قوت ناکام ہو تو پھر ظالموں کے جرائم کو واشگاف کر کے رکھ دیں۔ شیر کی گرج دار آواز میں انھوں نے عدالت کو مخاطب کیا:

"میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے میرا مذہبی فرض یہی ہے کہ میں ظالم

کے ظلم کا اعلان کروں۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے، جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسایٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے، بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیے اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ معیار فضیلت نہیں ہے، بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام سب سے اچھے ہوں......

"انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا......"

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دستبردار ہو جائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبے کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے، کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔"

(ایضاً: ص ۵۰، ۵۱ و ۵۲)

یہ تھی سیرت مولانا آزاد کی! وہ پیشہ ور سیاست داں ہرگز نہ تھے جو کسی ناگہانی صورت حال کے مقابلے کے لیے اور مختلف موقعوں کی ضرورتوں کے پیش نظر اپنا لباس بدلتے رہیں۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھے اور کبھی اپنے مذہب کا سودا کرنے پر راضی نہیں ہوئے، وہ کبھی اپنے یقین و اذعان سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ ہمیں یا حق و صواب کی حمایت کرنی چاہیے یا شر کا ساتھ دینا چاہیے۔ حق و صواب کی حمایت میں ایک مسلمان ہر بلا و مصیبت کو برداشت کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"اسلام تمام تر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جا بجا کہتا ہے: "مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے" ہر حال میں سچی بات کہے (وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہ)"

اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لیے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے۔

''جن مسلمانوں کے مذہبی فرایض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں، ان کے لیے دفعہ ۱۲۴-الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہوسکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔'' (ایضاً: ص ۵۶)

''میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہرحال ہونی ہی تھی، لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی دردانگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴-الف کا مقدمہ چلایا جائے گا!'' (ص ۶۳)

اپنے اس مشہور بیان کو ختم کرتے ہوئے وہ اپنے ہم وطنوں کی طرف مخاطب ہوئے جنھیں عدالت میں ان کے خلاف شہادت دینے کے لیے لایا گیا تھا۔ ان کے لیے قیام عذر کی کوشش کی اور خدا سے دعا کی کہ وہ ان کی خطا معاف کرے:

''قبل اس کے کہ میں اپنا بیان ختم کروں، اپنے ان ہم وطن بھائیوں کی نسبت بھی ایک دو جملے کہوں گا جو اس مقدمے میں میرے خلاف کام کررہے ہیں...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ سی آئی ڈی کے جن آدمیوں نے میرے خلاف شہادت دی ہے، انھوں نے اس اعتماد کے سوا جو اپنے کام پر ظاہر کیا کوئی بات بھی غلط نہیں کہی ہے......''

''البتہ میرا یقین ہے کہ انھوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ہے، وہ ضرور معصیت ہے لیکن ساتھ ہی مجھے ان کی کمزوری بھی معلوم ہے وہ محض چند روپیوں کی نوکری کی وجہ سے ایسا کررہے ہیں اور اتنا قوی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ہر بات پر ترجیح دیں۔ پس میرے دل میں ان کے لیے کوئی رنج اور ملامت نہیں ہے۔ میں اس کام کے لیے انھیں معاف کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا بھی انھیں معاف کردے۔''

(ایضاً: ص ۷۸، ۷۹)

مولانا انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ وہ سب سے یہ توقع نہیں کرسکتے تھے کہ وہ

عزیمت کے اس مقام تک پہنچ سکیں گے جس پر وہ فائز تھے۔ اسی لیے وہ دوسروں کی کمزوریوں کو معاف کرنے اور ان کے لیے قیام عذر کرنے کو تیار تھے۔ تاہم وہ اپنی قوم کے راہ گم کردہ افراد سے اپنا رابطہ بھی منقطع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ان سے اس اُمید پر ربط قایم رکھنا چاہتے تھے کہ ان کی کمزوریوں کا مداوا کریں اور عفو، حکمت و مساحت کی قوت سے ان کا علاج کریں۔

جب وہ المناک داستان ختم ہونے کو تھی جس کو شہنشاہیت کے حامیوں نے عدل کا جامہ اوڑھ کر پیش کیا تو مولانا نے مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے بلا تامل مجھے دے دے! مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے، کسی ایک پرزے سے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی، پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔''

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈینیو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا:

''زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جاسکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمھارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔''

''مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمھارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا! آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں۔ مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے، وقت اس کا جج ہے اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا، والحمدللہ اولا و آخرا''

(ایضاً: ص ۸۰)

یہ تھے مولانا آزاد! اسلام پر یقین کامل نے انھیں تمام بلاء ومحن میں استقامت عطا کی تھی۔ نہ ان کے قدم کو لغزش ہوئی اور نہ انھوں نے سواء السبیل سے انحراف کیا۔ اسلام توحید مطلق کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے انسان صرف خدا ہی پر توکل کرنا سیکھتا ہے۔ مومن غیراللہ کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ وہ صداقت کی حمایت میں اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے دین ومذہب کے امر کے امتثال میں صداقت کی حمایت کی۔

اسی وجہ سے انھوں نے قاید ذی شان مہاتما گاندھی سے قریبی تعلق قائم رکھا تھا۔ دین اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود دونوں کا صداقت پر ایمان تھا اور دونوں نے اس کی تبلیغ کی۔ مولانا آزاد مومن قانت تھے تو گاندھی جی پکے ہندو۔ ہندستان کے فرقہ واری جھگڑوں کی وجہ سے ان دونوں میں وحشت پیدا ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ ان جھگڑوں نے بہت سارے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تعلقات بگاڑ دیے تھے۔ شہنشاہیت پسندوں نے صدہا سال سے یہ نزاع پیدا کر رکھی تھی اور جب بھی قایدین قوم نے اس آگ کو بجھانا چاہا اس کو اور ہوا دے دی گئی لیکن مذہب کے معنی اور اس کی تاثیر کے متعلق مولانا اور گاندھی جی کو جو گہری بصیرت حاصل تھی، اس نے ان دونوں کو رشتہ محبت میں باندھ رکھا تھا اور شہنشاہیت پسندوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر دیا تھا۔ ان دونوں کی سعی بالآخر مشکور ہوئی اور ہندستان نے برطانیہ کو شکست دینے اور اس کی فوجوں کا یہاں سے تخلیہ کروانے میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح اس نے اپنی کھوئی ہوئی آزادی اور عزت کو دوبارہ پالیا۔

مولانا آزاد کے لیے مذہب کوئی ایسی چیز نہ تھا کہ لوگوں کو محض تجرید اور قناعت کی زندگی بسر کرنے اور اپنی ذات کے سوا کسی اور شے سے سروکار نہ رکھنے کی تلقین کرتا۔ ان کے پاس مذہب کوئی مال تجارت نہ تھا جو کذب ونفاق کی خرید میں استعمال کیا جا سکے یا پھر مادی منفعت یا ذاتی وجاہت کے حصول میں کام آئے۔ مذہب ایسی کوئی چیز ہے بھی نہیں، وہ اخلاق اور سیرت صالحہ کا نام ہے، وہ انسان کو ثبات علی الحق اور طیبۂ قلب عطا کرتا ہے۔ ان کی رائے میں مذہب سے انسان وہی سکون حاصل کر سکتا ہے جو ایک پاپیادہ مسافر کو گرمی کے موسم میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے ملتا ہے۔

اسلام جو مولانا کا دین تھا ایک ایسا مذہب ہے، جو انسان پر خیر و برکت کی لگاتار بارش کرتا ہے اور متعدد و مختلف قوموں کو نسل ونسب کی وحدت میں مربوط کر دیتا ہے۔قرآن کریم کی یہ آیت اس نکتے کے متعلق اسلام کا عقیدہ پیش کرتی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (سورۂ حجرات:۱۳)

”اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمھاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ (ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں) اور امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے، جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔“(۱)

مولانا آزاد کے ذہن میں حصول علم کا مقصد مذہب کی خدمت سے کچھ کم نہیں۔ان کی نظر میں تعلیم مال جمع کرنے کا ذریعہ نہیں کہ بخیل کی طرح اس کا ذخیرہ کیا جائے یا مسرف کی طرح اس کو پھونک دیا جائے۔تعلیم کے سپرد بھی وہی وظیفہ کار ہے جو مذہب کے ذمے ہے۔ تعلیم ذہن کو روشن، سیرت کا تزکیہ اور قلب میں وہ جاذبہ انسانیت پیدا کرتی ہے جو صداقت کی اشاعت کے لیے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتا ہے اور اس طرح تعلیم اسرار کائنات کو مکشوف کرتی اور قوائے فطرت کو بنی نوع انسانی کی فلاح کے لیے استعمال کرتی ہے۔

تعلیم کے ان فواید کے پیش نظر مولانا آزاد نے اپنے نفس کو زیورِ علم سے آراستہ کیا اور اس کے حصول میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔انھیں اطمینان تھا کہ وہ ایک مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح طلب علم میں مصروف ہیں اور اسی مجاہد کے ایمان و اعتماد کے ساتھ جو حق و صداقت کی تبلیغ کے لیے مجاہدہ کر رہا ہے، اسی لیے مولانا آزاد نے تعلیم کو اپنے پیام امن کے نشر کرنے کے لیے ایک آلہ قرار دیا۔وہ جانتے تھے کہ تمدنی تعلقات لوگوں کو باہم مربوط کرنے میں وہی قوت واثر رکھتے ہیں جو آبائی تعلقات کا ہوتا ہے۔وہ بخوبی واقف تھے کہ ان تعلقات کی وجہ سے لوگ

---

(۱) آیت اور ترجمہ مولانا آزاد کے قلم سے ہے۔(باقیات ترجمان القرآن: جلد سوم ص ۶۹ بہ حوالہ الہلال، ۲رستمبر ۱۹۱۴ء، ص ۷)

ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں اور جوں ہی ان کے خیالات و تصورات میں یگانگت پیدا ہوتی ہے وہ ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہو جاتے ہیں۔ ان کی راے میں لوگ تمدنی تعلقات ہی کی بنا پر ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے دوست بنتے ہیں۔ اسی طریقے سے ایک جامع ''وحدتِ انسانی'' کا حصول ممکن ہوتا ہے اور لوگوں میں محبت و مودت پیدا کی جاسکتی ہے۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے پہلے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے اپنے خطبہ افتتاحیہ میں فرمایا:

''تمدنی تعاون بین الاقوامی نقطہ نظر سے بھی نہایت ضروری تھا۔ اگر ہم محبت اور حسن ارادت کی اساس پر افراد کے عظیم اجتماعات کی تعمیر میں کامیاب ہو جائیں تو پھر لوگوں کے دلوں سے شک وشبہ، بعد و بیگانگی رفع ہو جائیں گے اور ہم بین الاقوامی اتفاق و اتحاد پیدا کرنے اور امن عالم کو قایم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے'' تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمدنی رشتے سیاسی رشتوں سے بھی زیادہ لوگوں میں اتحاد پیدا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی تعلقات کی بنا تو ذاتی منفعتوں پر قایم ہے لیکن تمدنی تعلقات خلوص و اتفاق پیدا کرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور علم و تربیت کی اہمیت پر غور و فکر نے ان کے قلب میں جذبہ محبت کو بیدار کیا اور اعمال صالحہ کی خواہش پیدا کی۔ اپنی ساری زندگی میں انھوں نے نہ کسی سے نفرت کی نہ کسی کو ضرر پہنچایا خواہ ان کا مخالف کتنا ہی بد یا بدنام کیوں نہ ہو اور نہ انھوں نے ان لوگوں سے نفرت کی جو ہندستانی قوم کو غلام بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور ان کے وطن کی حرمت کی ہتک کر رہے تھے۔ گاندھی جی کی طرح انھوں نے برطانیہ کی استعماریت کے خلاف جنگ کی، اہل برطانیہ کے خلاف نہیں! وہ جنگ ایسی نہیں تھی جس میں ہندستانیوں نے اہل برطانیہ کے خلاف ہتھیار اُٹھائے ہوں۔ اس جنگ میں جو ہتھیار استعمال ہوئے وہ اخلاقی ہتھیار تھے، برطانوی سامان کا مقاطعہ کیا گیا۔ ہندستانی کوئی ایسی چیز نہیں استعمال کرتے جو برطانیہ میں بنی ہو۔ انھیں برطانوی باشندوں سے ملنے اور ان سے سماجی تعلقات قائم رکھنے کی اجازت تھی۔ کوئی شخص اس وقت خیال نہیں کر سکتا تھا کہ یہ تحریک کس قدر موثر ثابت ہوگی، لیکن عملاً یہ منجنیقی آلات سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔ اس نے شہنشاہیت کے ایوان میں زلزلہ

ڈال دیا اور اس کے حامیوں کو بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تھے آزاد، گاندھی جی کی طرح ان کا بھی ایقان تھا کہ خیر سے خیر ہی صدور کرتا ہے اور شر سے شر ہی پیدا ہوتا۔ حق و صداقت ہی کے تمسک سے ہندستان کو بالآخر فتح حاصل ہوئی۔ صداقت اور راستی کے اصول ہی پر ہندستان نے اپنی زندگی کی تعمیر میں کامیابی حاصل کی اور مملکت کو محبت و امن کی اساس پر قایم کیا۔

مولانا آزاد کی وفات سے ہندستان کو جو نقصان ہوا وہ سارے عالم انسانیت کا نقصان ہے۔ کیوں کہ عالم انسانیت بھی صداقت کے ایک روشن مینار سے محروم ہو گیا! اس کا صدمہ اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے جب ہمیں اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ عالم انسانیت صداقت کے حامیوں اور داعیوں کا کس قدر محتاج ہے! اس جاں کاہ صدمے کی تسکین صرف اس خیال سے ہوتی ہے کہ مولانا نے اپنے علمی و عقلی کمالات کا ایک وافر ذخیرہ چھوڑا ہے جو حق و صداقت و حریت کے نشر و اشاعت کے کام میں لایا جا سکتا ہے، گو ان کی سوانح حیات موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے تاہم بلاخوف تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگ ہندستان میں اور ہندستان سے باہر مسلم اور غیر مسلم ممالک میں ان کی لاثانی شخصیت سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں اگر چہ مولانا کی عمر کا آفتاب غروب ہو چکا ہے تاہم وہ ابد تک ضیاء پاشی کرتا رہے گا! اگر چہ ان کی تاریخ حیات کا یہ درخشاں باب ختم ہو چکا ہے تاہم ابدی تاریخ میں اس کا اپنا ایک موزوں مقام ہوگا۔ ان درخشاں صفحات کے مصنف [1] کا مقلدین میں ایک خاص مقام ہوگا۔ ہندستان، جو بجائے خود ایک اقلیم ہے، جب بھی اپنے فلسفیوں، رہبروں اور ٹیگور، گاندھی، اقبال اور آزاد کے پایے کی شخصیتوں کی یاد تازہ کرتا ہے تو اس کو یہ توقع اور اُمید ہوتی ہے کہ اس کے موجودہ اور زندہ قائد اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کریں گے جو گاندھی، ٹیگور، اقبال اور آزاد کی رحلت سے پیدا ہو گیا ہے۔ ہندستان تو عالم انسانیت کے سورماؤں کا جنم بھوم اور گہوارہ رہا ہے۔

خدا کی رحمتیں اس لافانی روح پر نازل ہوں، خدا اس کی سالگرہ کے دن کو فیض و ہدایت کا سرچشمہ بنا دے۔ حق تعالیٰ اپنے کرم سے ہندستان اور سارے عالم کے اس عظیم الشان نقصان

کی تلافی کا سامان کرے! آمین!

حوالہ

(۱) یہ مقالہ ''مولانا ابوالکلام آزاد...... کتاب التذکرہ'' مرتبہ پروفیسر ہمایوں کبیر/مترجم میر ولی الدین سے ماخوذ ہے۔ اس میں مولانا کی فکر، ان کی سیرت اور خدمات قوم و وطن زیر بحث آئی ہیں۔ اس کتاب میں یہاں جملہ ''درخشاں صفحات کے مصنف'' ہے، لیکن جس پس منظر میں یہ جملہ آیا ہے، اس میں لفظ ''صفحات'' کے بجائے ''صفات، سیرت، شخصیت کے الفاظ زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے یا سہو قلم! اصل انگریزی متن اس وقت سامنے نہیں، ورنہ حقیقت معلوم ہو جاتی! مزید کچھ کہنا مناسب نہیں۔ قارئین کرام خود غور فرمالیں۔

یہ ایسی ہی غلطی ہے، جیسی کہ ''قول فیصل'' سے ایک عبارت کی۔ نقل میں پیدا ہو گئی تھی۔ مولانا نے مجسٹریٹ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''......مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ دیکھ رہا ہے......''

لیکن مقالے کے متن میں ''مستقبل'' کی جگہ بھی ''مورخ'' نقل ہوا تھا۔ جسے درست کر دیا۔ (ا-س-ش)

مولانا آزاد کی معنویت دورِ حاضر میں

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کو ۲۳ سال کی مدت گزر گئی۔ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۸۱ء کے درمیان ایک نسل کا فاصلہ حائل ہے۔ اس زمانے میں ذہنی اور جذباتی اعتبار سے دُنیا اور خود ہمارے ملک نے بڑی طویل مسافت طے کی ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ خوب اور زِشت کے بعض عالمی اور دائمی پیمانے ہوتے ہیں، یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ہر دور اپنی بعض مخصوص اقدار بھی رکھتا ہے جن سے چشم پوشی نہ ممکن ہے اور نہ مناسب۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دائمی اور عارضی اقدار کے درمیان تصادم ہو تو کن اقدار کا ساتھ دیا جائے اور کن اقدار سے روگردانی کی جائے۔ دراصل یہ سوال بہت پیچیدہ ہے، کیوں کہ اس بارے میں اگر کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے تو اور بہت سی اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف ڈاکٹر اقبالؔ نے کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے کہ:

آئین نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ جو قوم یا ملت ماضی کے فکری اور اخلاقی سرمایے سے اپنا دامن یک سر خالی کر لیتی ہے وہ راستے کی تاریکیوں میں بھٹکتی ہی رہتی ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنا اس کے لیے آسان نہیں رہتا ہے۔ اس مشکل کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے جو کسی عرب دانش ور نے تجویز کیا ہے یعنی ''خُذ ما صفٰی ودَعْ ما کدر'' ماضی کے سرمایے میں جو اچھا اور تاب ناک نظر آئے اسے لے لو اور جو خراب اور گندہ ہو اسے چھوڑ دو۔ بالعموم صورتِ

حال اس سے مختلف ہوتی ہے یعنی اختیار کرنے والے روایات کے نام پر وہ سب کچھ اختیار کر لینا چاہتے ہیں جس کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے اور ترک کرنے والے جدت پسندی کے نام پر ماضی کی ہر چیز۔ سے اپنا رشتہ منقطع کر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دونوں رویے مریضانہ ہیں جو ذہن کے کسی چھپے ہوئے چور کا پتا دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ماضی کے اُجلے نقوش میں شخصیتوں کے روشن افعال و اعمال کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ ماضی نام ہی ہے اشخاص کے اچھے برے کارناموں اور کارستانیوں کا! خصوصاً اگر کسی قوم یا ملک کا حال فکری اور عملی انتشار کا شکار ہو تو اس کے لیے اور ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ماضی کی عظیم شخصیتوں کے کارناموں سے روشنی، حرارت اور حرکت مستعار لینے کی کوشش کرے۔ بدقسمتی سے اس وقت ہمارا ملک، بالخصوص اس کی سیاسی زندگی شدید فکری اور عملی انتشار سے دوچار ہے۔ اس صورت میں ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم ان قومی رہنماؤں کے افکار و اعمال کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں جنھوں نے ماضی قریب میں ہماری تاریک راہوں کو اپنی سلامت فکر اور حسن عمل سے منور کیا تھا۔ ان عظیم شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ذاتِ گرامی، بقول پنڈت جواہر لال نہرو، ایک ایسی مخصوص عظمت کی حامل تھی جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولانا آزاد کے فکر و عمل کے وہ کون سے گوشے ہیں جن کی تابانی آج بھی بدستور قائم ہے اور توقع ہے کہ ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ آج کے دور میں مولانا آزاد کی معنویت ان کے فکر و عمل کے ان ہی گوشوں سے عبارت ہے۔

شخصیت کی تشکیل میں فکر اور عمل کو یکساں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فکر محض چاہے وہ کتنی ہی ارفع و اعلیٰ کیوں نہ ہو، اگر اس کا نتیجہ عمل کی صورت میں نہ نکلے تو صاحب فکر کو زیادہ سے زیادہ ایک اچھا مصنف یا مقرر بنا سکتی ہے، قوموں اور ملکوں کی قسمت اس کی ذات سے وابستہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح عمل محض، اگر اُس کی پشت پر فکر سلیم کا سہارا نہ ہو، اکثر بے راہ کر دیتا ہے۔ یہی بات ہم عقل اور عشق کے رموز میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ عقل کا کام فکر سلیم مہیا کرنا ہے لیکن صرف عقل کے ذریعے کوئی جاوداں کارنامہ مشکل ہی سے انجام پاتا ہے۔ جب تک مقصد کی لگن، جس کا دوسرا نام عشق ہے، اُسے متحرک نہ بنائے۔ عشق کی آگ میں تپے بغیر عقل

''محوِ تماشائے لبِ بام'' ہی رہتی ہے، ''بے خطر آتش نمرود میں کود'' پڑنا تنہا عشق کا کام ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اگر عشق عقل کا دامن چھوڑ دے تو اس کے لیے یہ تمیز کرنا آسان نہیں رہتا کہ کون سی آتش میں کب کود پڑنا چاہیے اور کس آتش سے کب دامن بچانا چاہیے۔ عشق صحراؤں کی خاک بھلے ہی چھنوادے لیکن وہ انسانی صلاحیتوں کو تعمیری رُخ اسی وقت عطا کر سکتا ہے جب اس کی رہنمائی کے لیے عقل موجود ہو۔ جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو ہمارے ماضی قریب کے کتنے ایسے رہنماؤں کے نام میرے پردۂ ذہن پر اُبھر رہے ہیں جن کی شخصیت اس لیے ادھوری رہ گئی کہ اس کے خمیر میں فکر و عمل یا عقل و عشق کا صحیح اِمتزاج نہیں تھا۔ جو عقل محض تھے انھوں نے ممکن ہے کسی نہ کسی طرح اپنا وقتی مقصد حاصل کرلیا ہو لیکن عشق سے تہی مایہ ہونے کے سبب وہ گدازِ قلب کی نعمت سے محروم ہی رہے جو انسانیت کا اصلی سرمایہ اور حیاتِ جاودانی کا ضامن ہے اور اسی لیے ان کا حصولِ مقصد کتنے بے گناہ انسانوں کی جسمانی اور روحانی اذیت کا پیش خیمہ بن گیا۔ اسی طرح جن شخصیتوں میں عشق کا رنگ چوکھا تھا لیکن عقل کی اس درجے فراوانی نہیں تھی وہ ''آتش نمرود'' میں بھلے ہی کود پڑے ہوں لیکن اپنے پیچھے ایسے تابندہ نقش قدم نہیں چھوڑ سکتے جن کی پیروی کر کے بعد میں آنے والی نسلیں اپنے مستقبل کی صحیح خطوط پر تشکیل کر سکتیں۔

قدرت نے مولانا آزاد کی ذاتِ گرامی میں فکر و عمل یا عقل و عشق کا جو توازن مہیا کیا تھا میرے نزدیک وہ مولانا کی شخصیت کا امتیازی جوہر ہے۔ کم لوگ ہوں گے جن کی ذات میں فکر و عمل کی ایسی مطابقت پائی جاتی ہو جیسی مولانا کی ذات میں پائی جاتی تھی۔ مولانا نے اپنی مختلف تصانیف اور مضامین (بالخصوص تذکرہ) میں ماضی کی جن عظیم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے ان کی قدرِ مشترک جبر و زیادتی اور ظلم و تعدی کے مقابلے میں سر نہ جھکانا بلکہ اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا تھی۔ یہ وصف خود مولانا آزادؒ میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ وقت کی سب سے بڑی استعماری طاقت کے مقابلے میں ہمیشہ سینہ سپر رہے بلکہ خود اپنوں کے سب و شتم اور دل آزاری کا مقابلہ بھی انھوں نے اسی عزم و حوصلہ اور متانت و وقار کے ساتھ کیا۔ انھوں نے جو راہ اپنے لیے ۱۹۱۲ء میں متعین کرلی تھی اس پر ۱۹۵۸ء تک جب وہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے،

یکساں پامردی اور مستقل مزاجی کے ساتھ گامزن رہے۔ مولانا کے بارے میں مختلف اوقات میں مختلف گوشوں سے جو غلط فہمیاں پھیلائی گئیں ان میں ایک غلط فہمی یہ بھی تھی کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے مولانا آزادؒ اپنے افکار وعقائد کے اعتبار سے ۱۹۱۲ء کے مولانا آزادؒ سے یکسر مختلف تھے۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا کا مشن احیاے دین تھا جب کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء میں وہ متحدہ قومیت کے نقیب بن گئے تھے۔ یہ خیال سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ مولانا آزادؒ نے اپنی عملی زندگی کے ابتدائی دور سے ہندو مسلم اتحاد (جس کا دوسرا نام متحدہ قومیت ہے) کو اپنا سب سے بڑا مشن بنایا تھا اور وہ حتی الامکان اس مشن کی تکمیل سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں، جب ان کے دوسرے سب ساتھی یکے بعد دیگرے تقسیم ملک پر راضی ہو گئے تھے، وہ آخر وقت تک اس کی مخالفت کرتے رہے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ تقسیم ملک سے متحدہ قومیت کے تصور کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور جیسا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں، وقت کے مؤرخ نے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مولانا آزادؒ کے خیالات کا بنیادی سرچشمہ تعلیماتِ اسلام تھیں لیکن یہ سوچنا مولانا کے ساتھ سخت ناانصافی کے مترادف ہوگا کہ وہ اس سرچشمے سے اِکتسابِ فیض کرنے میں اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر بھی غافل ہوئے ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام میں مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں حائل ہو۔ مولانا کا ارشاد ہے ''خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تھی۔ اُس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا، بجنسہٖ اس کے الفاظ ہیں ''ہم ان قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک ''اُمۃ واحدۃ'' بننا چاہتے ہیں۔ ''اُمتہ'' کے معنی ہیں قوم اور نیشن ''واحدۃ'' کے معنی ہیں ایک'' اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو (جن کی اکثریت نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) ''میری قوم'' فرمایا تھا۔ آپ نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تھی کہ ''اللھم اھد قومی، فانھم لا یعلمون'' اے اللہ ''میری قوم'' کو ہدایت فرما کیوں کہ وہ جانتے نہیں ہیں۔'' اصل بات یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) ''مولانا آزاد کا مذہب لوگوں کو جوڑتا تھا، توڑتا نہیں تھا'' اس کے برعکس جن لوگوں کا مذہب توڑتا ہے، جوڑتا

نہیں ہے وہ ان رموز کا وجدان کیسے کر سکتے ہیں! اسلامی تعلیمات کے مطابق سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ مولانا آزادؒ اس جہاد کی تلقین اہلِ وطن، بالخصوص مسلمانوں کو برابر کرتے رہے اور نہ صرف تلقین کرتے رہے بلکہ جب بھی موقع آیا خود اس پر عمل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت مولانا کا برطانوی دور کی ایک عدالت کے روبرو وہ بیان ہے جو بعد میں ''قولِ فیصل'' کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا پر الزام تھا کہ انھوں نے برطانوی افواج کے ہندستانی سپاہیوں کو بغاوت پر اُکسایا تھا۔ مولانا نے نہ صرف یہ الزام قبول فرمایا بلکہ عدالت کو للکارا کہ تم اپنا کام کیے جاؤ (یعنی سزا دیتے رہو)، ہم اپنا کام کیے جائیں (یعنی بار بار اس طرح کے ''جرائم'' کرتے رہیں)۔ آخری فیصلہ کسی اور عدالت میں ہوگا اور اُس فیصلے کا ہم سب کو انتظار کرنا چاہیے۔ ''سلطانِ جابر'' صرف کوئی حکومت ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ معاشرہ کبھی کبھی اس سے بھی بڑھ کر یہ رول اختیار کر لیتا ہے۔ دُنیا گواہ ہے کہ مولانا نے معاشرے کے جبر کو بھی اُسی صبر و استقلال اور خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز فرمایا اور اپنی متعینہ راہ پر مضبوطی سے قائم رہے جیسا کہ ان کا طرزِ عمل بدیشی حکومت کے مقابلے میں تھا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اسلامی تعلیمات سے منہ پھیر لیا تھا انھیں مولانا کی اُس بے مثال تقریر پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے خون آشام دور میں دہلی کی شاہجہانی مسجد میں ارشاد فرمائی تھی اور جس نے کم سے کم دہلی کے مسلمانوں کے لیے مسیحائی کا کام کیا تھا۔ اس تقریر میں مولانا نے صاف صاف فرمایا تھا کہ میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے بلکہ وہی پرانا نسخہ ہے جو ساڑھے تیرہ سو سال قبل عالم انسانیت کا محسن اعظم لایا تھا یعنی ''لا تھنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون ان کنتم مؤمنین'' کم زور نہ بنو، غمگین نہ ہو۔ تم ہی سربلند رہو گے بشرطے کہ صاحب ایمان ہو۔

مولانا آزاد کی تعلیمات میں خودداری کو مرکزی مقام حاصل تھا اور خود مولانا کی زندگی خودداری کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی تھی جس کی مثالیں اُن کے دور میں بھی کم یاب تھیں اور اب تو تقریباً نایاب ہیں۔ مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ اپنی سیاسی زندگی کے ایک خاص دور میں مولانا عوامی زندگی سے بڑی حد

تک الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ اس کی مختلف لوگوں نے مختلف توجیہیں کیں جو زیادہ تر معاندانہ تھیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مرحوم) نے اپنی تالیف ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں اس ''راز'' پر سے پردہ اُٹھایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اُس زمانے میں مولانا آزاد کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ ٹرین میں ہمیشہ اُونچے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے اور کلکتہ میں بھی کار یا ٹیکسی ہی میں باہر نکلتے تھے۔ ان کی جیب اُنھیں اس کی اجازت نہیں دیتی تھی اور ان کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنا سفر خرچ کانگریس یا کسی دوسری جماعت سے وصول کریں۔ اس کا حل انھوں نے یہ تجویز فرمایا کہ کلکتہ میں اپنے مکان میں گوشہ نشین ہو گئے اور سفر سے احتراز کرنے لگے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی کامیابی کے لیے عوام سے رابطہ رکھنا اور ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہونا کتنا ضروری ہے لیکن مولانا آزاد اس قسم کے ادنیٰ تصورات سے بدرجہا بلند و بالا تھے۔ انھوں نے سیاسی زندگی شہرت و نام آوری کے لیے اختیار نہیں فرمائی تھی بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا ان کی زندگی کا ایک مشن تھا اور ان کے نزدیک سیاست اس مشن کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھی۔ یہی کیفیت مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کی بھی تھی۔ انھوں نے صحافت کا پیشہ تجارت کے لیے نہیں دعوت کی خاطر اختیار فرمایا تھا۔ انھوں نے ''الہلال'' کے ایک شمارے میں خاص اس موضوع پر ایک اداریہ سپردِ قلم فرمایا تھا جس میں ''داعی'' اور ''تاجر'' کے فرق کی وضاحت فرمائی تھی۔ اس میں اُنھوں نے اخبار نکالنے والوں کو سمجھایا تھا کہ ان کا مقام ''داعی'' کا ہے ''تاجر'' کا نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مولانا کے کسی معتقد سرمایہ دار نے ''الہلال'' کے لیے ایک گراں قدر رقم دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو مولانا نے اس کی یہ پیش کش شکریے کے ساتھ رد فرما دی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سرمایے کی سنہری زنجیر راہِ حق میں پیش قدمی کرنے سے کسی نہ کسی درجے میں ضرور باز رکھتی ہے۔ آج کتنے اخبار نویس ہیں جو اس جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کر سکتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے، اس پر لبیک کہنے والا کوئی مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ مولانا آزاد پنڈت جواہر لال نہرو کی وزارت میں وزیر تھے لیکن دنیا جانتی ہے کہ پنڈت جی کا رشتہ ان سے عقیدت اور احترام کا تھا۔ اس کی بہت اچھی شہادت آں جہانی شری شریمن نرائن سابق گورنر گجرات نے اپنی خودنوشت

سوانح عمری میں دی ہے۔ یہ بات محض قابلیت سے حاصل نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اُس کا اصلی سبب کردار کی عظمت ہوتا ہے اور یہ ان دونوں کے کردار کی عظمت ہی تھی جس نے خود وزیر اعظم کو اپنے وزیر تعلیم کے احترام پر مجبور کر دیا تھا۔

میری ناچیز رائے میں آج کا سب سے اہم مسئلہ اخلاقی اقدار کا زوال ہے۔ یوں تو اخلاقی اقدار کا یہ زوال زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہے لیکن اُس کا سرچشمہ یقیناً ہماری موجودہ سیاسی جماعتیں اور سیاسی رہنما ہیں۔ ہماری سیاسی زندگی آج جس بے اخلاقی کی تصویر پیش کرتی ہے جب ہم اس کا موازنہ مہاتما گاندھی اور مولانا آزادؒ کے دور کی سیاسی زندگی سے کرتے ہیں تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ خان عبدالغفار خاں نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ اُس دور میں سیاست نام تھا ایثار، قربانی اور خدمت خلق کا اور آج سیاست ذریعہ بن گئی ہے حصولِ اقتدار کا۔ پروفیسر خواجہ غلام السیدین (مرحوم) نے چند سال قبل اپنی مختصر لیکن بیش بہا تصنیف ''زبان، زندگی اور تعلیم'' میں موجودہ سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کے کردار کی کتنی اچھی نقاب کشائی فرمائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''گویا ساری خوبی، ساری دیانت داری، ساری دانش مندی ہماری طرف ہے، جو بھی (دل بدل کی مصلحتوں کے ماتحت!) اس وقت ہماری طرف ہو اور جس قدر برائی بے اصولی، بے ایمانی وہ دوسری طرف ہے۔ جس سے مراد ہے وہ طرف جو ہماری نہ ہو۔''

خواجہ صاحب نے ''دل بدل'' کی جن ''مصلحتوں'' کا ذکر فرمایا ہے وہ اب اُس وقت سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ آج سیاست داں جس آسانی سے جماعتیں بدلتے رہتے ہیں اور دوسری جماعتیں اُنھیں جس خوش دلی کے ساتھ قبول کرتی رہتی ہیں چند برس قبل اس کا تصور بھی محال تھا۔ وہی آدمی جب تک دوسری جماعت میں ہے برا ہے، بے ایمان ہے، ناقص العقل ہے لیکن جب ہمارے ساتھ آ گیا تو اس کی ساری خرابیاں دور ہو گئیں اور وہ دودھ کا دُھلا بن گیا۔ عربی قول ہے ''النَّاسُ علیٰ دینِ ملوکھم'' (عوام اپنے حکمرانوں کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں)۔ یہ بے اخلاقی کی کیفیت سیاسی جماعتوں اور سیاسی رہنماؤں سے بڑھ کر

عوام میں سرایت کرگئی ہے اور پورا معاشرہ اُس سے متاثر ہوگیا ہے۔ مولانا آزاد کا طریقہ اس کے برعکس تھا۔ مہاتما گاندھی کی مانند وہ بھی اخلاقیات کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ گاندھی جی کی طرف جس چیز نے انھیں سب سے پہلے کھینچا تھا وہ گاندھی جی کی دیانتداری تھی۔ ایک مرتبہ چندے میں کوئی معمولی رقم ان کے پاس آئی اور انھوں نے وہ رقم کستور باجی کو دے دی کہ اس کو چندے کے حساب میں جمع کردیں۔ جب چند دن کے بعد انھوں نے کستور باجی سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ جمع کرنا بھول گئیں۔ اس پر گاندھی جی نے نہ صرف کستور باجی کو تنبیہ فرمائی بلکہ اس واقعے کا ذکر ''ہریجن'' میں بھی کیا۔ مولانا آزاد کی نظر سے گاندھی جی کی یہ تحریر گزری تو اُسے پڑھ کر انھیں یقین ہوگیا کہ جو شخص ایک معمولی رقم کے معاملے میں اِتنا دیانت دار اور راست باز ہوسکتا ہے اس کے ہاتھ میں ملک و قوم کا مستقبل یقیناً محفوظ ہے۔ مولانا آزاد کی زندگی کے آخری دنوں میں ''مندرا گھپلے'' کے سلسلے میں ''چھاگلا کمیشن'' نے جو فیصلہ دیا تھا اُس کے مطابق اُس وقت کے وزیرخزانہ شری ٹی ٹی کرشنم اچاری کا دامن صاف نہیں تھا۔ پنڈت نہرو اپنی خلقی مروّت کے پیش نظر اس کے حق میں نہیں تھے کہ شری کرشنم اچاری کے خلاف کارروائی کی جائے۔ مرکزی کابینہ نے اُس وقت کے وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت کی سرکردگی میں ایک سہ رُکنی کمیٹی مقرر کی کہ وہ اس فیصلے سے متعلق اپنی رائے پیش کرے۔ مولانا آزادؔ اس کمیٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن انھیں اندیشہ ہوا کہ کمیٹی پنڈت نہرو کی مرضی کا لحاظ رکھ کر ایسی رائے نہ دے دے جو حق و انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہو۔ چناں چہ وہ ذاتی طور پر کمیٹی کے ممبروں، بالخصوص پنڈت پنت سے ملے اور اُن پر زور دیا کہ وہ پنڈت نہرو کی مرضی سے زیادہ حکومت اور ملک کی نیک نامی کو پیش نظر رکھ کر رائے دیں۔ بالآخر کمیٹی نے ''چھاگلا کمیشن'' کے فیصلے کے حق میں رائے دی اور شری کرشنم اچاری کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے چند ہی دن کے بعد مولانا آزاد کو فالج ہوا جس کے نتیجے میں انھوں نے جان جان آفریں کو سونپ دی۔ گویا یہ زندگی کی آخری خدمت تھی جو مولانا نے ملک و قوم کی انجام دی۔ ان کا رویہ اپنے مخالفین کے ساتھ جس عفو و درگزر بلکہ رافت و مرحمت کا رہا اس کا تصور بھی آج کے بیشتر سیاست دانوں کے لیے محال ہے۔ آج کی

سیاست تو عبارت ہے بدلے اور انتقام سے۔ خیر گاندھی جی اور مولانا آزاد تو مذہبی اخلاقیات کے پابند اور پیرو تھے، پنڈت جواہر لال نہرو (جن کا روایتی مذہب سے برائے نام ہی تعلق تھا) بھی سیاسی زندگی میں اخلاقی اقدار کی برتری کے اُسی طرح قایل تھے جیسے اوّل الذکر دونوں بزرگ۔ یہی سبب ہے کہ آج کے سیاسی پیمانوں کے مطابق پنڈت جی ایک سادھو تھے جو اتفاق سے سیاست میں آ گئے تھے۔ گویا سیاست کا مطلب ہے اخلاقی اقدار سے یک سر صرف نظر، ورنہ آپ سنت سادھو تو ہو سکتے ہیں، سیاست داں نہیں ہو سکتے۔

آج جس طرح عقائد و نظریات کے ساتھ وفاداری کی جگہ جماعتوں بلکہ اشخاص کے ساتھ وفاداری نے لے لی ہے اور اُس پر جس طرح اصرار کیا جاتا ہے وہ بھی سیاست کے اخلاقیات کی گرفت سے آزاد ہو جانے ہی کا کرشمہ ہے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد کا ہمیشہ اس پر اصرار رہا کہ افراد کی اہمیت صرف یہ ہے کہ وہ بعض اصول و نظریات کی نمایندگی کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ''ترجمان القرآن'' میں ایک جگہ انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ ''کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔'' گویا اصلی اہمیت ''سچائی'' کی ہے اور اگر کوئی شخصیت کسی سچائی کی راہ نہ دکھائے تو ہیچ ہے۔ خواہ دُنیوی پیمانوں کے اعتبار سے کتنی ہی بڑی اور صاحب جاہ و اقتدار کیوں نہ ہو۔ ایک موقع پر جب مولانا آزاد کی خدمت میں حاضری ہوئی تو ایک مسئلے پر مولانا ہم سے ناراض ہو گئے، دوسرے وقت پھر حاضر ہوئے تو نہایت دریا دلی اور شفقت سے اپنے گزشتہ رویے پر اظہارِ ندامت فرمایا اور اس کے ساتھ ارشاد فرمایا ''میں جانتا ہوں کہ آپ کو میرے ساتھ تعلق خاطر ہے اور یہ تعلق خاطر میری ذات سے نہیں ہے بلکہ میرے عقائد و نظریات سے ہے۔'' گویا عقائد و نظریات کے مقابلے میں ذات لاشئ محض ہے۔ اگر آج کے سیاست داں یہی رویہ اختیار کر لیں تو ہماری سیاسی زندگی اور اس کے ساتھ معاشرے کی کتنی خرابیاں دُور ہو سکتی ہیں۔ شخصیت پرستی کا اظہار خوشامد اور چاپلوسی کی صورت میں ہوتا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا چوں کہ اب وفاداری کا مرکز اصول و نظریات بلکہ جماعتوں کی جگہ سکڑ اور سمٹ کر افراد تک محدود ہو گیا ہے، اس لیے خوشامد کی لے بہت تیز ہو گئی ہے اور اس کے ایسے طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں جو اَب سے چند برس پہلے تک مفقود تھے۔ زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اس خوشامد سے

بعض ایسے لوگوں کا دامن بھی آلودہ ہے، جن کے بزرگوں نے اس ملک میں عزیمت کی راہیں متعین کی تھیں۔ نیز خوشامد کی اس فضا نے سیاسی جماعتوں سے بڑھ کر تعلیمی اور علمی اداروں اور دانش گاہوں کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔ مولانا آزاد خوشامد سے سخت بے زار تھے۔ ان کی حصولِ آزادی کے بعد کی جس تقریر کا حوالہ اُوپر دیا جا چکا ہے اُسی میں انھوں نے مسلمانانِ ہند سے فرمایا تھا:

> ''میں تم سے نہیں کہتا کہ تم اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی پالیسی اختیار کرو جو غیر ملکی حکومت کے دور میں تمھارا شعار رہا ہے۔''

مولانا کا یہ مشورہ آج سب ہندوستانیوں کے لیے اس سے کہیں زیادہ مستحق عمل ہے جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے لیے تھا۔ مولانا آزاد کی رانچی میں نظر بندی سے رہائی کے بعد کلکتہ سے ایک عربی رسالہ ''الجامعۃ'' کے نام سے نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مرحوم) اور سرپرست مولانا آزاد تھے۔ اس کے دوسرے شمارے میں مولانا ملیح آبادی نے گاندھی جی کی تصویر چھاپی جس پر اُن کے بارے میں کئی مدحیہ الفاظ لکھے۔ مولانا آزادؒ نے اسے ناپسند فرمایا اور لکھا کہ گاندھی جی کے لیے صرف ''ہندوستان کی پُرامن تحریک کے قائد لکھنا کافی ہے۔'' مولانا آزاد خود اپنے لیے بھی خوشامد کو سخت ناپسند فرماتے تھے بلکہ وہ تو اپنی جائز تعریف و توصیف سے بھی اپنے عقیدت مندوں کو باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل عین اس مقام پر جہاں اب ان کا مزار ہے کل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری تقریر فرمائی تھی۔ اس موقع پر انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اُس وقت کے نائب صدر پنڈت سندر لال نے انجمن کی طرف سے مولانا کا استقبال کرتے ہوئے ابھی ان کی تعریف میں چند جملے ہی کہے تھے کہ ہزاروں انسانوں کے مجمع میں مولانا نے انھیں ٹوکتے ہوئے فرمایا ''پنڈت جی! اب آپ ہی کہتے رہیں گے یا مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع دیں گے۔'' مولانا کی اس تنبیہ کے بعد پنڈت سندر لال کے لیے سوائے خاموش ہو جانے کے چارہ نہیں تھا۔

عوامی زندگی کی ایک اور نمایاں خرابی یہ ہے کہ کبھی مذہب، کبھی قوم، کبھی ملت، کبھی زبان،

کبھی پردیش اور کبھی ذات برادری کے نام پر لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز اور فیصلے کے خلاف رائے عامہ کی برتری تسلیم کرلیں اور اُس کے سامنے سر جھکا دیں۔ مولانا آزاد اس رویے کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہے اور انھوں نے اس منطق کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار فرمایا۔ تحریک پاکستان کے دورِ شباب میں مولانا کے ہم مذہبوں کا ان کے ساتھ جو برتاؤ رہا اس کے باوجود وہ اس تحریک کو ملک اور مسلمانوں کے لیے مضر ہی سمجھتے اور کہتے رہے کیوں کہ ان کے نزدیک سچ یہی تھا اور سچ کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ''صداقت اپنے حامیوں کی کثرت وقلت اور استقامت وتزلزل سے ہمیشہ بے پرواہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ سچ کی کسوٹی اس کے حامیوں کی کثرت نہیں ہے، اس کے لیے تو اتنا کافی ہے کہ وہ سچ ہے'' ایک دوسری جگہ اسی سلسلے میں انھوں نے فرمایا ہے ''کوئی سچی بات اس لیے ترک نہیں کردی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں اس کا دوست نہ ہو۔'' ظاہر ہے کہ سچ کی کسوٹی انسان کی عقل سلیم اور ضمیر کی آواز ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے اگر سچ بولنے والے اور سچ سننے والے دونوں مولانا آزادؒ کے ان ارشاداتِ عالیہ کو حرزِ جاں بنالیں تو ایک طرف سچ بولنے والوں پر مخالفین کے سب وشتم کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور دوسری طرف سچ سننے والے (چاہے وہ اُسے سچ نہ بھی مانیں) سچ بولنے والے کی کردار کشی سے باز آجائیں گے۔ افسوس ہے کہ اس وقت صورتِ حال یہ نہیں ہے یا تو کسی بات کو سچ سمجھنے والا رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر سچ بولنے سے باز آجاتا ہے ورنہ اس کی رائے سے اختلاف کرنے والے اُس پر زندگی حرام کردیتے ہیں اور حیرت ہے کہ اس دوسرے گروہ میں بعض وہ لوگ بھی شامل ہوگئے ہیں جو کبھی پہلے گروہ میں شامل رہ چکے ہیں۔ قبولِ عام اور حصولِ اقتدار کی خواہش لوگوں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے!

جہاں تک وقت کے بعض دوسرے اہم مسائل یعنی فرقہ پرستی، خویش پروری، جاہ طلبی وغیرہ سے متعلق مولانا آزادؒ کی معنویت کا تعلق ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس لیے اُس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف ان امور کی نشان دہی کی کوشش کی گئی ہے جس پر عام طور سے لوگوں کی نظر بہت کم جاتی ہے۔ اگر ہم مولانا کی زندگی سے سبق لینا چاہیں تو وہ آج بھی ہمارے لیے روشنی اور ہدایت کے ایک عظیم مینارے کی صورت میں موجود ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت ہمارے زمانے میں

ڈاکٹر کامل قریشی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے افکار و خیالات کے ذریعے ملک و قوم کی جو خدمات انجام دیں وہ قومی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ انھوں نے ایک جید عالم، ایک عظیم خطیب، ایک زبردست صحافی، ایک عالی مرتبہ مجتہد، ایک بے بدل دانشور، ایک ماہر سیاست، منفرد مفسر قرآن، بلند مقام مفکر، فلسفی، دوربین، صاحب فکر و فن، مدبر، عظیم قومی رہنما اور ایک جینیئس کی حیثیت سے ہندستان کی جنگ آزادی، قومی اتحاد، وطن پرستی، انسان دوستی اور ملکی تعمیر و ترقی میں جو رول ادا کیا اُس کی نظیر مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔ اوایل عمر سے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ قومی جدوجہد اور ملک کے تعمیری کاموں میں پیش پیش رہے اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے شب و روز مصروف رہ کر راہیں متعین کر گئے جو قوم کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئیں۔

مولانا آزاد کی داستانِ زندگی ہماری قومی زندگی کی داستان ہے، جو اُن کے افکار و اذکار، خیالات و جذبات اور احساسات و نظریات کی آئینہ دار ہے۔ اُن کی حیات و خدمات پر اب تک ملک و بیرونِ ملک سے بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو اُن کے ناقدوں، قدر شناسوں اور پرستاروں کی طرف سے خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتی ہیں اور جو اُن کے افکار و خیالات، اُن کی زندگی کے نقوش اور مشن کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اُن کی روشن ذات، زندگی بھر ہماری رہنما رہی اور ہمیں حالات کے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتی رہی، بھٹکنے سے بچاتی رہی اور جہاں جہاں گرنے کا خوف تھا ہمیں سنبھالتی رہی۔

آج کے دور میں جبکہ ہماری قوم ایک ذہنی خلجان، باہمی خلفشار اور ایک شدید قسم کے تباہ کن رُوحانی بحران سے دوچار ہے۔ کیا ہم مولانا آزاد کے افکار و خیالات کی روشنی میں اُن کا کوئی کامیاب حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے موضوع کی روشنی میں آج انھی باتوں سے بحث کریں گے، اُن کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں مولانا آزاد کے فکر و نظر، علم و عمل، اصول و ضوابط، اُن کی زندگی کے جملہ شعبوں سے متعلق عقائد اور ان باتوں پر نظر ڈالنی ہوگی جو اُن کے یہاں ایمان و یقین کا درجہ رکھتی ہیں اور جن سے اُن کے گفتار و کردار اور ذات و صفات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ مولانا آزاد نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک خالص مذہبی ماحول تھا۔ ان کے والد مولوی خیر الدین ایک بہت بڑے عالم، کئی مذہبی کتابوں کے مصنف جادو بیان واعظ، باا‌ثر شخصیت اور ایک پیر طریقت تھے۔ اُن کے ملک و بیرون ملک میں ہزاروں مرید تھے۔ اُن کے علم و فضل، وعظ و نصیحت اور رُشد و ہدایت کا دور دور چرچا تھا۔ ایسی فضا میں اگر مولانا آزاد چاہتے تو بادشاہی کرتے لیکن اُن کے مجتہدانہ مزاج نے ایسے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے ہوئے اپنی راہ الگ متعین کی۔ وہ شروع ہی سے غور و فکر کے عادی تھے۔ تقلید کی جامد و ساکت دنیا سے نکل کر شوقِ تجسس نے انھیں زمانے کی نئی دریافتوں اور اجتہاد کی راہ پر لگا دیا تھا۔ اپنے محدود احاطوں میں گھر کر دین و مذہب کا جو مطلب اُن کے دور میں سمجھایا جا رہا تھا، اس سے انھیں قطعاً اختلاف تھا اُن کے نزدیک اسلام کیا تھا، قرآن کا پیغام کیا تھا، دین و مذہب کا کیا مقام تھا اور شریعت کا کیا مطلب تھا۔ ان سب پر وقتاً فوقتاً اظہارِ رائے کر کے وہ اپنے مافی الضمیر کو پیش کرتے رہے۔ ''ترجمان القرآن'' کے نام سے جب قرآن کے ترجمے و تفسیر کی اشاعت ہوئی تو بہت سے علمائے کرام نے اس کو مستند نہیں مانا اور خاص طور پر مولانا آزاد کے وحدت ادیان کے نظریے پر شدید اعتراض کیے گئے۔ مولانا نے ان اعتراضوں کے کھل کر جواب دیے لیکن علماء کا طبقہ اس پر مطمئن نہ ہو سکا مگر مولانا بھی اپنے نظریے پر اٹل رہے، کیوں کہ یہ نظریہ اُن کے نزدیک ایمان کی حیثیت رکھتا تھا، انھوں نے ''الہلال'' میں ایک جگہ اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''دنیا کے تمام مذاہب حق پر ہیں، لیکن دنیا کے پیروانِ مذاہب حق سے

منحرف ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی گمراہی ہے، جس قدر بھی اختلاف ہے، جس قدر دعوؤں کی لڑائی اور جماعت بندیوں کا تصادم ہے، پیروانِ مذہب کے فعل وعمل پر ہے۔ مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔ اگر پیروانِ مذہب کا یہ انحراف دُور ہو جائے جو حق نہیں ہے، تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو حق ہے۔ یہی مذاہب عالم کا مشترکہ حق اور دنیا کی عالمگیر رُوحانی صداقت ہے۔'' (الہلال)

مولانا کے نزدیک مذہب ملانے والی چیز تھی، لڑانے والی نہیں۔ جوڑنے والی شے تھی، توڑنے والی نہیں۔ مذہب انسانوں کو انسانیت سے بہرہ ور کرنے اور بندوں کو خدا سے ملانے کا نام ہے۔ یہ گمراہوں کو راہِ راست پر لاتا ہے اور راہِ راست پر چلنے والوں کو منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے۔ مولانا کے مذہبی خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے، ملاحظہ ہو:

''انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے، مذہب کی رُوح ایک دوسرے کو پہچاننے والی رُوح ہے، مذہب کی رُوح خدمت کی روح ہے، مذہب کی روح دوسروں کے لیے اپنے کو مٹانے کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔''

(ایک ہمہ گیر شخصیت: ابوالکلام آزاد، نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا، دسمبر ۱۹۵۸ء، ص ۲۸)

مولانا نے اپنے گھر میں علماء کا عمل دیکھا تھا۔ ملک کے دوسرے علاقوں کے علماء کا فکر و عمل بھی اُن کے سامنے تھا۔ انھیں ندوۃ العلماء میں رہنے اور وہاں کے حالات کے مشاہدے کا موقع بھی ملا تھا۔ مولانا کی روشن خیالی، طبیعت کی جدت، تقلید سے انحراف اور اجتہاد سے رغبت رکھنے والا مزاج ہمیشہ یہ چاہتا تھا کہ طبقہ علماء اپنے موجودہ حالات پر از سر نو نظر ڈالے۔ نئے تقاضوں کو جاننے اور اسلام کی دعوت کو سمجھنے اور سمجھانے کے کچھ ایسے طریقے اختیار کرے جو

زیادہ لائق فہم، پسندیدہ اور قابل قبول ہوں۔تب ہی وہ بحسن وخوبی اپنے فرایض سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔

مگر افسوس کہ ان باتوں کی گہرائی کو سمجھنے، تسلیم کرنے اور صداقت ماننے کے باوجود طبقۂ علماء نے ان پر خاطر خواہ توجہ نہ دی اور جناب ضیاء الحسن فاروقی کے بقول ''مولانا کے دل پر یہ داغ بہت گہرا تھا اور اسے وہ اپنے ساتھ دنیا سے لے گئے''۔

(افکارِ آزاد: ضیاء الحسن فاروقی، ص ۲۵)

مولانا نے ہوش سنبھالتے ہی ہندستان کے مسلمانوں کو سرسیّد اور علی گڑھ کے افکار و خیالات کے زیر اثر پایا۔سرسیّد مسلمانوں میں ایک روشن خیال اور اجتہاد پسند شخصیت کے مالک تھے۔مولانا آزاد نے سرسیّد کے فکر ونظر کو اپنے دل ودماغ کے مطابق پاکر اُن سے ذہنی رشتہ تو قائم کرلیا لیکن جیسے جیسے انھوں نے حالات کا جائزہ لیا اور ان پر ان باتوں کا انکشاف ہوا کہ سرسیّد اور علی گڑھ مسلمانوں کو جنگ آزادی سے دُور اور انگریزوں سے قریب لے جارہے ہیں جس سے وہ ایک طرف ملک کو آزادی دلانے والی طاقتوں کا ساتھ نہیں دے پارہے اور دوسری طرف انگریزوں کی وفاداری کا اعلان کر کے ہم وطنوں سے دُور ہوتے جارہے ہیں جو مسلمانوں کے مستقبل کے لیے سراسر نقصان دہ ہے۔انھوں نے اس کے خلاف جدوجہد کا آغاز کرتے ہوئے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ وہ ہم وطنوں سے کٹ کر نہ رہیں اور آزادی کی لڑائی کے لیے میدانِ عمل میں آکر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوجائیں۔

اسی طرح بنگال کے انقلابیوں سے جب انھوں نے تعلق استوار کیا اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے ان کے دل سے شک وشبہ دور کیا تو مسلمانوں کے حق میں ایک نئی فضا ملک میں پیدا ہونے لگی۔اسی اثنا میں ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ جب مولانا نے مسلم ملکوں کا سفر کیا اور وہاں جدوجہد آزادی کی تڑپ اور حریت کی لڑائی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور تازہ دم ہوکر ہندستان لوٹے تو ہندستانی مسلمانوں کو وہاں کے حالات سے آگاہ کیا اور پھر ''الہلال'' جاری کرنے کے بعد مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف ملک کے تمام طبقوں کے ساتھ جنگ آزادی کے لیے آواز دی تو ہندستان آزادی کے انقلابی نعروں سے گونجنے لگا اور جنگ آزادی کے لیے ایک متحدہ پلیٹ فارم وجود میں آگیا۔اس سلسلے میں مولانا کے قلم، تحریر،

تقریر اور ''الہلال'' کا یہ وہ تاریخ ساز کام تھا جو ہماری تاریخ آزادی میں سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔

ہم وطن ہندوؤں اور دوسرے طبقوں کے ساتھ مل کر آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے مولانا آزاد نے جن باتوں کو ایمان و یقین کی حد تک اپنے پیش نظر رکھا، اُن میں ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کو اوّلیت حاصل تھی۔ انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے ہندو مسلم اور ملک کے دوسرے طبقوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے رکھ دیا تھا۔ انگریزوں سے نجات حاصل کرنے اور ملک کو آزادی دلانے کے لیے یہ انتہائی ضروری تھا کہ ہندستانیوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ان میں باہمی اتحاد کا جذبہ، مشترکہ تہذیب کا احساس اور متحدہ قومیت کی اہمیت و افادیت کا خیال بیدار کیا جائے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے مولانا آزاد نے ''الہلال'' کے اوراق اور اپنی زندگی کے شب و روز وقف کر دیے جس کے سبب ملک میں جنگ آزادی کے لیے ایک نیا متحدہ محاذ تیار ہوا۔ مولانا آزاد ناپسندیدہ بات گوارا کر سکتے تھے لیکن ہندو مسلم اتحاد ان کو اتنا عزیز تھا کہ اُس پر وہ آزادیٔ کامل بھی قربان کر سکتے تھے۔ ایسی آزادی جو اتحادِ باہمی کے بغیر ملے وہ اُن کے نزدیک بربادی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ ۱۹۲۳ء کے کانگریس کے اجلاسِ خصوصی (دہلی) کے موقع پر اپنے خطبے میں انھوں نے کہا تھا:

> ''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطے کہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''
>
> (خطباتِ آزاد: نئی دہلی، ساہتیہ اکادیمی، ۱۹۷۴ء، ص ۲۰۵)

انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر اور بھی کئی جگہ خیالات کا اظہار کر کے اپنے دلی جذبات پر روشنی ڈالی ہے۔ آگرے کی صوبائی مجلس خلافت (۱۹۲۱ء) کی صدارت کرتے

ہوئے انھوں نے کہا تھا:

''ہندستان کے لیے، ہندستان کی آزادی کے لیے صداقت و حق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ فرایض ادا کرنے کے لیے ہندستان کے ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور اُن کی یکجہتی ضروری ہے۔'' (ایضاً: ص ۴۶)

''اگر ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرایض انجام دینا چاہتے ہیں تو بحیثیت ہندستانی ہونے کے انھیں انجام دینا چاہیے۔'' (ایضاً: ص ۴۷)

وہ آگے اپنے اسی عقیدے پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان میں ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں......'' (ایضاً)

''ہندستان کے سات کروڑ مسلمان ہندستان کے ۲۲ کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔'' (ایضاً: ص ۵۱)

وہ اتحادِ باہمی کی بات اسی پر ختم نہیں کرتے، اپنے عقیدے کی پختگی کے اظہار کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں:

''اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اس وقت انجام دیں گے جب ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے تو یہ وہ لفظ ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے اس وقت لکھوایا تھا جب ہم سب مل کر قریش کے مقابل ایک نیشن بن جانا چاہتے تھے۔''

(مفہوم، ایضاً)

ایک بار مولانا نے اپنی گرفتاری سے قبل ایک اور اپیل جاری کرتے ہوئے جن باتوں کا

اظہار کیا تھا۔ اس میں جن پہلوؤں کو پیش نظر رکھا تھا وہ اُن کے دلی جذبات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اُن سے، اُن کے جذبہ اسلام پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں اور بھی کہوں گا۔''

''ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں اور اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی نادانی کی بات بھی ہو جائے تو اُسے بخش دیں اور اپنی جانب سے بھی کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اس مبارک اتفاق کو صدمہ پہنچے۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں (اور وہ کبھی نہ چاہیں گے) جو اسلام کے خلاف ہو، اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ اُن کے مشوروں پر کاربند رہیں۔''

(ہفتہ وار پیغام: کلکتہ، ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء، ص ۵،۸)

اسلام اور وطنیت کے تصورات پر بھی مولانا نے وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کے ذریعے بہت سی ایسی باتوں کو صاف کرنے کی کوشش کی جو ہم وطنوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے باہمی اتحاد کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ مولانا نے اپنے مقصد کے اظہار کے لیے اسلام اور نیشنل ازم وطنیت اور اسلامیت اور مذہب و سیاست کے کسی بھی موضوع کو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے ''الہلال'' کے ذریعے اپنے اُن عقاید کی تشریح کرتے ہوئے بار بار لکھا کہ اسلام اور نیشنل ازم ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ یہ دونوں ایک ہیں۔ مسلمان کے لیے اپنے وطن کی خدمت اور تعمیر و ترقی کی فکر اسلام کے احکامات میں داخل ہے۔ اسی طرح وطنیت اور اسلامیت کے درمیان بھی کوئی فرق و تضاد نہیں۔ ایک ہندستانی مسلمان جس طرح اپنے ہندستانی ہونے پر فخر کر سکتا ہے اتنا ہی اپنے مسلمان ہونے پر بھی اس کو فخر ہونا چاہیے۔ مولانا کے یہاں مذہب و سیاست دو چیزیں نہ تھیں، اُن کے عقیدے کے مطابق ان کی سیاست بھی مذہب کے راستے ہی سے آئی تھی۔ وہ ملک کی جدوجہد آزادی میں اسی لیے لگے تھے کہ یہ اُن کے نزدیک فریضہ اسلام سے

کم نہ تھا، ۱۹۱۳ء میں انھوں نے لکھا تھا:

"مسلمان ہندستان میں رہتے ہیں۔ ہندستان کی خدمت اُن کا دینی فرض ہے۔ انھوں نے جس جوش و ایثار سے جنگ طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے معاملے میں حصہ لیا تھا اس معاملے میں بھی اسی طرح حصہ لیں۔ مسلمانوں کا نصب العین خدمت عالم ہے۔ وہ انسانیت کے خادم ہیں، اُن کے لیے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس اور اُس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔"

مولانا جب ایک بار پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے اقلیتوں اور خصوصاً اسلام کے ساتھ اپنے گہرے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"گیارہ صدیاں گزر گئی ہیں اور ہندستان کی سرزمین سے بھی اسلام اسی طرح وابستہ ہے جس طرح کہ ہندو دھرم۔ اگر اس ملک کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے یہاں موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندستانیوں کا مذہب بن چکا ہے۔"

(مفہوم، رام گڑھ کانگریس کا خطبہ صدارت)

مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے سلسلے میں مولانا آزاد کے خیالات نہایت واضح اور صاف تھے۔ انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اگر مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے جذبات کو فروغ نہ دیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ آنے والے زمانے میں ملک کے اکثریتی طبقے کی احیائی تحریکیں اس کو زبردست نقصان پہنچائیں اور صدیوں کے میل جول سے بنی ہوئی مشترکہ ہندستانی زندگی کا نام و نشان مٹ جائے، انھوں نے اپنے خطبوں، تقریروں اور تحریروں میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا اور کہا کہ:

"میں اس بات پر بھی فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندستانی ہوں اور ناقابل تقسیم اور متحدہ ہندستانی قومیت میں شامل ہوں۔" (ایضاً)

مشترکہ تہذیب مولانا آزاد کے لیے ہندستان کے مشترک قومی سرمایے سے کم نہ تھی۔ وہ

اس کے تحفظ، فروغ اور تشہیر کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے، انھوں نے اپنے فکر و نظر، فعل و عمل اور گفتار و کردار سے اس کی تعمیر و ترقی میں جس قدر حصہ لیا اس کا شاہد اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہے۔ وہ اس کے لیے جیے اسی کے لیے سرگرمِ عمل رہے اور اسی کے پروان چڑھتے رہنے کی آرزو لے کر سدھارے۔ اُن کے نزدیک ہندستان کے رہنے والوں کا بھلا اسی میں تھا کہ مشترکہ تہذیب کے جذبات کو ملک میں پھیلائیں۔ اس چمن کے مختلف رنگوں کے پھولوں کو ایک گلدستے میں سجائیں۔ اس کے ہزار رنگوں کو یک رنگ کر دیں۔ اس کی قسم قسم کی خوشبوؤں کو ایک اعلیٰ مہک بنا کر ملک کی قومی فضاؤں میں کیف و سرور کی طرح بکھیر دیں۔ مشترکہ تہذیب کے اس عقیدے پر مولانا کے خیالات بہت واضح صورت میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ مثلاً:

> ''صدیوں کی مشترکہ تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترکہ زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اُس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔'' (ایضاً)

وہ آخر میں کہتے ہیں:

> ''ہماری اس ایک ہزار سال کی اس مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔'' (خطبہ رام گڑھ: ایضاً: ص ۳۰۰)

مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے جو ذاتی کوششیں کیں ان میں اُن کے ہم نواؤں کے طور پر بہت سے اور ہندو

مسلم اکابرین قوم بھی شریک تھے جن میں خاص طور پر مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو سرفہرست تھے جن کی نظر میں ہندستان اور ہندستانیوں کی خیر و برکت مولانا کے مشن کی کامیابی میں پوشیدہ تھی۔ یہ رہنمایانِ قوم زندگی بھر مولانا کے اس مشن کے داعی بن کر کام کرتے رہے۔ مہاتما گاندھی اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں اس کا پرچار کرتے رہے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد اپنی شخصیتوں کے اعتبار سے متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کی جیتی جاگتی یادگار بن چکے تھے۔ خواجہ غلام السیّدین کا یہ قول اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمن میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن، ہندستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے۔'' (ابوالکلام آزاد: نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا، دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۸۲، ۸۳)

ہندستان کے سیاسی سین پر جلوہ گر ہونے کے بعد مولانا آزاد اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے ایک خوشگوار اور متحدہ ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے دوران جس تاریخی قومی اتحاد کا مظاہرہ یہاں کے ہندو مسلمانوں نے مل کر کیا تھا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی، علی برادران، مولانا آزاد اور دوسرے بہت سے نامور رہبرانِ قوم جمع ہو گئے تھے جس سے انگریزی طاقت لرز گئی تھی لیکن پھر اُس نے اپنی حکمت عملی سے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے سازشیں شروع کر دیں اور کچھ ہی زمانے کے بعد وہ اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ گیا، جیسے جیسے آزادی کی جدوجہد تیز ہوئی انگریز نے ہندستانیوں کے باہمی اتفاق کو ختم کرنے کی کوششوں میں بھی تیزی پیدا کر دی اور وہ ہندو مسلمان جو ابھی تک مشترکہ جدوجہد سے آزادی حاصل کرنے کے لیے انگریزی طاقت کے سامنے صف آرا تھے طبقوں میں بٹ گئے۔ متحدہ ہندستان کے بجائے ملک کی تقسیم کا نعرہ لگنا شروع ہو گیا اور اس طرح دو قومی نظریہ وجود میں

آیا۔ کانگریس کا نظریہ تھا کہ ہندو مسلمان اپنی ثقافت اور ہندستانیت کے اعتبار سے ایک قوم ہیں۔ اس لیے ہندستان کو متحد رہ کر آزادی کی جدوجہد کرنی چاہیے اور لوگوں کو فرقوں میں نہ بٹنا چاہیے۔ مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ ہندو اور مسلمان اپنے کلچر، زبان اور معاشرت کے اعتبار سے دو مختلف قومیں ہیں، اس لیے ملک کی تقسیم ضروری ہے۔ ادھر ہندوؤں کے احیاء پرست طبقوں کا ردعمل بھی مسلمانوں کے حق میں نہ تھا۔ مولانا آزاد کا موقف تھا کہ ہندو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالیں اور آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک کنبے کے طور پر اپنے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کریں۔ مولانا آزاد، مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کسی صورت میں ہندستان کی تقسیم کے حق میں نہ تھے لیکن جنگ عظیم ثانی کے دوران حالات کی تیزی کے ساتھ ساتھ ملک کی صورتِ حال بھی برابر بدلتی رہی اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا گیا، جس میں رفتہ رفتہ اس قدر شدت پیدا ہوئی کہ اس کے نعم البدل کے طور پر دوسری تجویزیں پیش کرنے کے باوجود یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا اور انجام کار جب یہ محسوس کر لیا گیا کہ مسلم لیگ جو پاکستان کی دعوے دار ہے وہ کسی طرح بھی ملک کی تقسیم اور پاکستان کے اپنے مطالبے کے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تو تبادلہ خیال اور باہمی افہام و تفہیم کی کوششیں کی گئیں۔ کرپس مشن اور شملہ کانفرنس وغیرہ کا سلسلہ جاری ہوا، مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کی ملاقاتوں کا اہتمام ہوا۔ مولانا آزاد نے لیگی مسلمانوں کو پاکستان کے قیام اور اس کے خطرناک نتائج سے مسلسل اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے آگاہ کیا۔ اس دوران اُنھیں اپنی قوم کی بری بھلی باتیں سننی پڑیں۔ طعنہ کشی، بے عزتی اور یہاں تک کہ گالیاں برداشت کرنی پڑیں۔ علی گڑھ کے طلباء نے اُن کے ساتھ بدسلوکی کی۔ مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ نے انھیں شو بوائے کہا۔ انھیں کالے جھنڈے دکھائے گئے۔ اُن کے خلاف نعرے لگائے گئے اور کون سا ایسا حربہ تھا جو انھیں ذلیل کرنے کے لیے قوم نے استعمال نہیں کیا، لیکن وہ مایوس نہ ہوئے۔ انھوں نے ثابت قدمی کو نہ چھوڑا۔ اُن کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ ملک تقسیم نہ ہو۔ اس کی تقسیم ہندو مسلمان دونوں کو کمزور کر دے گی۔ وہ آخری دم تک یہ لڑائی لڑنے کا عزم رکھتے تھے کہ ملک میں عبوری حکومت کے ناخوش گوار نتائج دیکھ کر کانگریس نے فیصلہ کر لیا کہ ملک کی تقسیم

ہو جائے اور پاکستان کا مطالبہ مان لیا جائے۔ سردار پٹیل، پنڈت نہرو اور حد تو یہ کہ مہاتما گاندھی نے بھی تقسیم تسلیم کر لی تو مولانا آزاد جن کا پنڈت نہرو اور گاندھی جی کے عزمِ راسخ پر تکیہ تھا بے دست و پا رہ گئے، ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد جو قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی ہندو پاکستان میں ہوئی، اُس خونیں داستان سے کون واقف نہیں۔ سرحد کے اِدھر اور اُدھر دین و مذہب کے نام پر جو ننگا ناچ ہوا جس سے وحشت و بربریت کا دیو بھی کانپنے لگا اور شیطان کی شیطنیت بھی لرز اُٹھی یہ ہول ناک داستان ہماری تاریخ انسانیت کا ایک سیاہ باب ہے۔ دونوں ملکوں میں آزادی کے جشن کا آغاز ہونے ہی کو تھا کہ ان فسادات کے رونما ہو جانے سے فضائیں ماتم میں ڈوب گئیں۔ بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح ہندستان کے مسلمانوں کو اپنے ملک (ہندستان) کا وفادار رہنے کی تلقین کرنے کے ساتھ انھیں خدا کے سپرد کر کے کراچی رُخصت ہو چکے تھے۔ ہندستان کا لیگی طبقہ شش و پنج میں تھا کہ کیا کرے جو اُس نے سوچا بھی نہ تھا وہ سب رونما ہو رہا تھا۔ اُن کی جان و مال، عزت آبرو اور مستقبل سب کچھ خطرے میں تھا کہ ایسے عالم میں یوپی کے سربرآوردہ مسلم نمایندے مولانا آزاد سے ملے اور اُن کے سامنے حالات رکھے۔ مولانا نے اُن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بدقسمتی سے پاکستان کا مطالبہ منوانے کے لیے ملک کے اُن صوبوں کے مسلمانوں نے بھی اپنے اندھے جوش اور ناعاقبت اندیشی سے حصہ لیا تھا جنھیں اس بات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ اُن کے علاقے پاکستان سے باہر رہیں گے، آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ اُسی غیر دانش مندانہ اقدام کا نتیجہ ہے۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کو ضبط و تحمل اور حوصلے سے کام لینا اور موجودہ حالات سے گھبرا کر کسی پست ہمتی کا شکار نہ ہونا چاہیے۔ تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب اور دلی کے مسلمان خاص طور پر قتل و غارت گری کا نشانہ زیادہ بنے۔ دلی والے جانتے ہیں کہ فسادات کے دوران مولانا آزاد کس طرح دلی کے گلی کوچوں، بازاروں، محلوں، مسجدوں اور مختلف جلسہ گاہوں میں برابر مظلوم مسلمانوں کی ڈھارس بندھاتے رہے، کس طرح وہ پرانے قلعے، عیدگاہ اور دوسرے ریلیف کیمپوں میں پہنچ کر پناہ گزینوں کے زخموں پر مرہم رکھتے رہے۔ حال آں کہ ان حالات پر وہ خود بھی دل شکستہ، رنجور اور ملول تھے، لیکن یہ وقت قوم کو

خوف و خطرے سے نجات دلانے، احساسِ پستی سے نکالنے اور حالات کا شکار ہونے سے بچانے کا تھا۔ اس لیے ایک نباضِ وقت اور طبیب قوم کی طرح انھوں نے منتشر اور بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک بار پھر دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں اس لیے جمع کیا کہ بدلی ہوئی فضا میں یہ سوچیں کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ ملک میں کن خطوط پر تنظیم قائم کی جائے اور کس طرح آزاد ہندستان میں مسلمان اپنے قومی فرایض سے عہدہ برآ ہوں۔

اس موقع پر مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے طویل اور تاریخی خطبے میں مولانا نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ ہر طرح اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ تقسیم ملک کے بعد آزاد ہندستان میں جو مسلمان ہیں، یہ ان کا وطن ہے۔ انھیں یہاں عزت آبرو سے رہنے، اپنے سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور مذہبی امور آزادی سے انجام دینے کا حق ہے۔ ماضی کی جس غلط سیاست نے نقصانِ عظیم پہنچایا ہے، مسلمان اُس سے بچیں۔ ہندستان کی مشترکہ اور جمہوری شہریت میں اپنا مقام پیدا کریں۔ قوم و ملک سے فرقہ پرستی کے زہر کو ختم کرنے میں اپنا رول ادا کریں۔ ہم وطنوں کے دوش بدوش چل کر ملک کے سچے شہریوں کی طرح تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں لگ جائیں، اپنا پورا زور باہمی اتحاد، سیکولرازم اور جمہوریت کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں لگا دیں۔ اس خطبے کے آخری الفاظ مولانا کی زبان میں ملاحظہ ہوں:

> ''جہاں تک اس اجتماع کا تعلق ہے۔ آپ صاف دوٹوک فیصلہ کریں کہ آیندہ کوئی مسلم مجلس، کوئی مسلم نظام، سیاسی میدان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم نہ کریں گے اور کسی مجلس کے مقصد پر فرقہ واریت کی پرچھائیں بھی نہ پڑنی چاہیے۔''

(خطبۂ صدارت اجتماع لکھنؤ، دسمبر ۱۹۴۷ء)

مولانا نے اس موقع پر مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو کر ملک کی تعمیر و ترقی میں لگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد ایک تجویز کی روشنی میں ایک کمیٹی کی تشکیل ''اتحاد و ترقی'' کے نام سے عمل میں لائی گئی جس کی شاخیں یوپی میں کچھ جگہ قائم کی گئیں لیکن بعض نامعلوم حالات کی بنا پر یہ کمیٹی کچھ عرصے کام کر کے ختم ہو گئی۔

مولانا آزاد کو یوں تو بیشتر صدمے اُن کے ہم قوم افراد نے پہنچائے لیکن جن ذاتی صدموں نے انھیں بے حد مغموم اور دل شکستہ کیا اُن میں:

پہلا اُن کی وفادار بیوی زلیخا کی موت کا حادثہ تھا۔ جس وقت وہ جیل میں تھے اور انھیں جنازے تک میں شریک ہونا نصیب نہ ہوا۔

دوسرا ملک کی تقسیم جس نے ہندو مسلمانوں کو عظیم جانی و مالی نقصان پہنچایا اور مولانا خون کے آنسو روئے۔

تیسرا اور عظیم صدمہ مہاتما گاندھی کا سانحہ قتل تھا جس نے انھیں بے دم کر دیا۔

مہاتما گاندھی مولانا کے اُن محترم ساتھیوں میں تھے جن کی رائے کی مولانا قدر کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے بہیمانہ قتل سے مولانا کے قومی مشن کا وہ ساتھی جو قدم قدم پر اُن کا ہم نوا تھا رُخصت ہو گیا تھا اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے میدان میں تنہا رہ گئے تھے لیکن چوں کہ وہ حالات سے لڑنے کے خوگر تھے اس لیے انھوں نے قومی خدمت کے جذبے سے اپنی تنہائیوں کو تادم آخر انجمن بنائے رکھا اور دوسروں کو بھی تعمیر قوم و وطن کے لیے دعوتِ فکر و عمل دیتے رہے۔

مولانا آزاد نے یوں تو اپنی زندگی میں قوم و ملک کے سلسلے میں بیشتر پیشین گوئیاں کیں جن میں سے کچھ بہت زیادہ اہم ہیں جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں اور جن کی صداقت پر مولانا کی ہوش مندی، بالغ نظری اور دُور بینی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

۱۹۳۷ء میں حکومت ہند جب صوبوں کی وزارت سازی کا کام انجام دے رہی تھی تو یو پی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی تعاون سے سرکار بنانے کا سوال مولانا کے سامنے آیا۔ مولانا نے یو پی کے لیگی رہنماؤں چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو کانگریس کے ساتھ تعاون کی یقین دہانی کے بعد طے کر لیا کہ اُن کو لیگ کے نمایندوں کے طور پر یو پی کی وزارت میں شامل کر لیا جائے گا۔ مولانا کے خیال کے مطابق اس طرح کانگریس کو تقویت ملتی اور لیگ کا زور ختم ہو جاتا لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے اس فیصلے کو مولانا کے اصرار کے باوجود پسند نہ کیا اور معاملہ ختم ہو گیا جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں یو پی میں تیز تر ہو گئیں اور آخر کار پاکستان کی تحریک زور پکڑ گئی۔ ۱۹۴۶ء میں جب عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا اور

محکموں کی تقسیم کا سوال پیش ہوا تو سردار پٹیل وزارت داخلہ کے لیے شدت کے ساتھ مصر تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ وزارتِ داخلہ سے زیادہ اہم محکمہ مالیات ہے جس کے کنٹرول میں سب محکمے رہتے ہیں لیکن سردار پٹیل کی نادانشمندانہ ضد کے سبب محکمہ مالیات کانگریس کے ہاتھ سے نکل کر لیگی نمائندے نواب زادہ لیاقت علی خاں کے قبضے میں چلا گیا۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا اور وزارتوں کے درمیان جو باہمی کشمکش ہوئی اُس کے نتیجے میں ملک کو تقسیم ہونا پڑا۔

مولانا آزاد تحریک پاکستان کے آغاز ہی سے مسلمانوں اور خاص طور پر لیگیوں کو اس کے خطرناک نتائج سے مسلسل خبردار کرتے رہے تھے اور طرح طرح سے عقلی، نظری اور جغرافیائی دلایل دے کر انھیں سمجھاتے رہے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ لوگ آنکھیں کھولیں اور اس مطالبے سے باز رہیں، لیکن ناعاقبت اندیش قوم نہ مانی اور نتائج جو رونما ہوئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مولانا نے تقسیم پاکستان کو غیر قدرتی اس لیے قرار دیا تھا کہ ایک بلاک کے دو حصے مشرق اور مغرب میں رہ کر کس طرح اپنی تعمیر و ترقی، دفاع اور وحدت کو برقرار رکھ سکتے ہیں؟ چنانچہ زمانے نے دیکھا کہ تقسیم در تقسیم کی غلطی ہوئی اور بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ مولانا نے کہا تھا کہ پاکستان بننے سے جتنے مسائل حل ہوں گے اُس سے زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ محرکین پاکستان نے اپنے مسائل کے حل کے لیے جو راہ اختیار کی تھی، کیا اُس سے اور مسائل پیدا نہیں ہوئے؟ مولانا آزاد دل کی گہرائیوں سے قومیت اور وطن پرستی کے جذبات سے سرشار تھے لیکن وہ اپنی مستقبل شناس آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لوگ خود کو ہندستانی کہنے کے بجاے اگر بنگالی، پنجابی، گجراتی اور مہاراشٹری ہی کہتے رہے اور صوبہ پرستی، علاقہ پرستی اور زبان پرستی کرتے رہے تو ملک کے نیشنل ازم کا کیا ہوگا! آج کے حالات سے کیا اندازہ نہیں ہوتا کہ مولانا کتنی دُور تک دیکھ رہے تھے!

مولانا کو اس پر تو افسوس تھا کہ ملک تقسیم ہوا اور ہندو مسلم اپنی اس تقسیم کو نہ روک سکے۔ اس لیے سیاسی طور پر ناکام رہے، لیکن اس سب کے باوجود وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو اپنی معاشرت و تہذیب کو تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کی حفاظت سب کا مقدس فریضہ ہے۔ کیوں کہ اُن کا پختہ عقیدہ تھا کہ:

"پانی پر چھڑی رکھ دینے سے ایسا معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم بھی غائب ہو جاتی ہے۔" (ہماری آزادی: مولانا ابوالکلام آزاد، لاہور، حمادالکتبی دواخانہ، ۱۹۷۸ء، ص ۳۹۵)

انھوں نے قیام پاکستان پر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کیا:

"جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے۔ اب دونوں ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں۔ اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی تو وہ نئے اور بڑے مصائب و آلام کا باعث بن سکتی ہے۔" (ایضاً: ص ۴۵۴)

مولانا آزاد نے قوم وملت کی جو خدمت انجام دی اور پوری زندگی جس طرح ایثار و قربانی کے ساتھ دین و وطن کے لیے وقف کی، اُتنی ہی اُن کی ناقدری کی گئی۔ قدر تو درکنار لوگوں نے اُن کے ساتھ جو محسن کشی کی اُس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انھوں نے سب کچھ سہا لیکن اُف نہ کی۔ سب کچھ سنا اور لبوں کو سی لیا۔ بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں خود بھی ناقدری کا گہرا احساس تھا۔ ذلت و ناقدری کی ساری باتیں اُن کے کلیجے پر داغ بن گئی تھیں اور غالباً یہی سبب تھا کہ انھوں نے کئی بار سیاست سے کنارہ کشی کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن گاندھی جی کے اصرار نے انھیں ہر بار ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ اس دنیا سے نکلنے کی کوشش میں زیادہ اُلجھتے رہے اور مجبوراً انھیں سیاست کی اسی سنگلاخ زمین میں پوری زندگی کاٹنی پڑی۔ انھیں خودداری، انا اور احساسِ خودشناسی بلا کا تھا جس کی مثالیں اُن کی داستانِ حیات میں بیشتر جگہ ملتی ہیں، جن سے اُن کی شخصیت کے خدوخال اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمھارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں" (ابوالکلام آزاد- احوال و آثار: مرتبہ مسعودالحسن عثمانی لکھنؤ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۹۶)

''افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامے کے بندے اور وقتی جذبات و انفجار و ہیجان کی مخلوق ہو، تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر، تم جانتے ہو، نہ پہچانتے ہو، تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اُتنی تیزی کے ساتھ فرار بھی ہو جاتے ہو۔''

مرزا غالبؔ نے زندگی میں کہا تھا:

''میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

(ایضاً: ص ۹۴-۱۹۳)

مولانا فرماتے ہیں:

''میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔'' (ایضاً: ص ۱۹۲)

یہ آخری اقتباس اور ملاحظہ ہو:

''افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالبؔ کو تو صرف ایک شاعری کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔'' (ایضاً: ص ۱۹۱)

مولانا میں یہ احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گئے ہیں انھیں سمجھنے والا زمانہ آگے آئے گا اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اُن کا شمار اُن عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جو اپنے زمانے سے پہلے ظہور میں آجاتی ہیں۔

مولانا آزاد زندگی میں اپنوں کے مطعون رہے۔ موت کے بعد اپنوں اور بیگانوں دونوں کے معتوب ہو کر فراموش کر دیے گئے۔ اُن کے نہ جانے کیا کیا سنہری خواب تھے۔ وہ آزادی کے متوالے تھے، جو ملک کی تقسیم کے ساتھ ملی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے انھیں ہندو مسلم فرقہ پرستی سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ملک میں متحدہ قومیت، سیکولرازم اور جمہوریت کو سرسبز دیکھنا چاہتے تھے لیکن اُنھیں خزاں ہاتھ آئی وہ صوبہ پرستی، علاقائیت اور محدود فکر و نظر کے مخالف تھے، ملک میں یہ زہر کس قدر سرایت کر گیا ہے اسے کون جھٹلا سکتا ہے۔ وہ

ہندستان کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو آزاد ہندستان میں خوش حال دیکھنے کے آرزومند تھے۔ مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ منطقی، سیاسی، اقتصادی، سماجی اور مذہبی طور پر مسلم معاشرہ جس طرح انحطاط پذیر ہے اُس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ اردو زبان، کلچر اور دوسرے مسائل کا کیا حال ہے۔ یہ سب باتیں کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ یہ سب خواب ابھی تک ادھورے ہیں۔ مولانا زندگی بھر ان خوابوں کی حسین تعبیر کے لیے ملک و قوم کی خدمت میں لگے رہے اور جاتے وقت جو کچھ کہہ گئے وہ پتھر کی لکیر ہے۔ جو کچھ کر گئے وہ زندۂ جاوید ہے، اور جو کچھ چھوڑ گئے، اُس کی حقیقت آج بھی اتنی ہی مسلم ہے جتنی ان کے زمانے میں تھی۔

ان سطور میں مولانا آزاد کے وہ خیالات جن کو اُن کے یہاں عقاید کا درجہ حاصل ہے، اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ تمام نیک جذبات، صالح احساسات اور ان کی فلاح و بہبود سے بھرپور نظریات جن پر مولانا زندگی بھر عامل رہے اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے آج بھی اتنی ہی اہمیت و افادیت رکھتے ہیں، جتنی مولانا کی حیات میں تھی۔ لیکن جس طرح مولانا کی زندگی میں اُن کے حسن کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود لوگ نظرانداز کرتے رہے، اس سے کچھ بدلی ہوئی حالت آج بھی نہیں ہے، بلکہ کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ آج قومی اتحاد، سیکولرازم، مشترکہ تہذیب اور جمہوریت کا نام لینا اگرچہ ایک فیشن بن گیا ہے، مگر اس کی رُوح غائب ہوگئی ہے۔ آج اربابِ فکر و نظر کے لیے کیا سوچنے کی بات نہیں ہے کہ اگر

مولانا زندہ ہوتے تو کیا وہ خاموشی سے ان ہی اصولوں اور قومی عقیدوں کا خون ہوتا ہوا دیکھتے۔

کیا وہ ہندستان کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو اس طرح پامال ہوتا ہوا دیکھ کر برداشت کر سکتے تھے؟

کیا وہ انسان، انسانیت، عدل و انصاف، مساوات، صداقت اور آفاقی نیکیوں کا علم بلند کرنے کے لیے مردانہ وار میدانِ عمل میں نہ آجاتے؟

یہ چند سوال ایسے ہیں جو مولانا آزاد کی معنویت کی روشنی میں آج اربابِ نظر کو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید

ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید نے اپنی کتاب ''ہسٹاریکل ڈسٹریشن'' میں مولانا ابوالکلا آزاد علیہ الرحمۃ کی زندگی اور سیاسی خدمات سے متعلق ایک باب تحریر کیا ہے جس کی تلخیص ہ نذرِ قارئین کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے نہایت منطقی انداز میں ان حقایق پر روشنی ڈالی ہ کہ مولانا مرحوم ومغفور نے برصغیر میں کس طرح اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے گوشہ نشینی اور کم آمیزی کے باوجود بھی بے مثال خدمات سرانجام دی ہیں۔ (ایڈیٹر)

مولانا ابوالکلام آزاد سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ وہ ان دنوں لاہور میر ایک جلسہ عام سے خطاب کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد کو بیرون موچی دروازہ میر جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ میں مولانا کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا مگر ابھی تک نہ ا ان کی تحریروں سے شناسائی ہوئی تھی اور نہ ہی ان کی کوئی تقریر سنی تھی۔ میں مولانا کو سننے کے شوق میں ایک گھنٹہ قبل ہی جلسہ گاہ میں پہنچ گیا اور سٹیج کے قریب ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سامعین بھی آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پنڈال ایک جم غفیر میں بدل گیا۔ یہاں تک کہ باغ سامعین کو سمیٹنے سے عاجز نظر آنے لگا۔ مولانا کی تقریر سننے کے خواہش مند لوگوں میں ہر طبقے کے افراد موجود تھے۔ مولانا کا خطاب سیاسی نہیں بلکہ مذہبی نوعیت کا تھا اور اس کے مخاطب صرف مسلمان تھے مگر اس کے باوجود سامعین میں ہندوؤں اور سکھوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ میں مولانا کے طرز خطابت سے بے حد متاثر ہوا اور میری روح ان کی روانی تقریر کے ساتھ ساتھ بہنے لگی۔ مولانا کی تقریر میں جہاں اشعار نگینوں کی صورت میں

جڑے ہوئے تھے، وہاں قرآن پاک کی آیات کے گوہر بے بہا بھی اسے چار چاند لگا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولانا دنیا بھر کے پھولوں سے ایک ہار پرونے میں مصروف ہیں۔ جس کی مختلف النوع خوشبوئیں پورے ماحول کو معطر کر رہی تھیں۔ لوگ ہر طرف سے سر دُھن رہے تھے اور واہ وا اور سبحان اللہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھی۔ تقریر ختم ہوتے ہی مولانا اپنے میزبان میاں افتخار الدین کی کار میں سوار ہوئے اور ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔

مولانا سے میں اس قدر متاثر تھا کہ بلاتوقف سائیکل پر پاؤں رکھا اور بیس منٹ کے اندر اندر کینال پارک میں واقع میاں افتخار الدین کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوٹھی میں چنیدہ افراد کا ایک اور اجلاس منعقد ہو رہا ہے اور میں بن بلائے وہاں پہنچ گیا ہوں۔ لان میں بہت سی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں میں ان میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مولانا انتہائی ڈرامائی انداز سے کوٹھی سے برآمد ہوئے اور میں نے دیکھا کہ لوگ ان کے احترام میں ایستادہ ہیں۔ میں بھی تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ مولانا نے حاضرین کو بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی ان کے درمیان ایک کرسی پر تشریف فرما ہو گئے۔ مولانا نے ہر موضوع پر بات چیت کی لیکن سیاسی نوعیت کے سوالوں کا جواب دینے سے عملاً گریز کیا۔ مجلس قریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس کے بعد مولانا قیام گاہ پر واپس چلے گئے اور مولانا کے معتقدین گھروں کو سدھار گئے۔ اس واقعے کے دو روز بعد مولانا آزاد پشاور روانہ ہو گئے۔ الوداع کہنے والوں میں میں بھی موجود تھا۔ جانے کو تو مولانا چلے گئے مگر جاتے ہوئے میرے قلب و ذہن پر عقیدت و احترام کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

میں نے اکثر لوگوں کو مولانا کے خلاف بولتے اور سخت سست کہتے سنا ہے لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ میں نے انھیں خود ان کی تقریر و تحریر کے آئینے میں ایک سچا اور مخلص مسلمان پایا۔ میں اس معمے کو اُس وقت حل کرنے میں ناکام رہا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ اُس عمر میں میرا ذہن پختگی کے ان مراحل کو طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس گتھی کو سلجھا سکے۔ تاہم میں نے مولانا کی تحریروں کو جمع کر کے ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ واللہ! سیاست ان میں کہیں نام کو بھی نہیں تھی۔ سوائے ان چند بیانات کے جو انھوں نے اپنی گرفتاری سے قبل عدالت کے

سامنے دیے تھے۔ مولانا کی تمام تر تحریریں اسلامی ادب اور تاریخ پر تھیں۔ ان کے تصنع سے مبر طور پر تحریر اور علم کی گہرائی و گیرائی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے موچی گیٹ سے باہر مولانا کی تقریر کا ان کی تحریروں سے بھی موازنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا کی تحریر و تقریر میں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا۔ بلکہ دونوں میں ایک ہی اندازِ خطابت اور حقایق موجود ہیں۔

(ترجمہ: راشد چودھری)

مولانا ابوالکلام آزاد اور تہذیبی مفاہمت

مولانا کوثر نیازی

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۹۸ء کو ہندستان میں مولانا کے صد سالہ پیدائش کی یادگار کے طور پر منایا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۸۹ میں گورنمنٹ آف انڈیا نے دہلی میں ایک انٹرنیشنل سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ پاکستان میں ۲؍دسمبر ۱۹۸۸ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو (شہید وطن) کی حکومت قایم ہو چکی تھی۔ مولانا کوثر نیازی (وفات ۱۸؍مارچ ۱۹۹۴ء) نے پاکستان کے نمایندے کی حیثیت سے مذکورہ سیمینار میں شرکت کی تھی اور ایک مقالہ پڑھا تھا۔

یہ مقالہ ہفت روزہ لولاک، فیصل آباد (ایڈیٹر طارق محمود) میں ۲؍اگست ۱۹۹۰ء کو شائع ہوا تھا۔ خاک سار کی نظر سے گزرا تھا اور اپنے ذخیرے میں اسے محفوظ کر لیا تھا۔ یہ مقالہ قارئین کی ضیافت طبع کی خاطر پیش کیا جاتا ہے۔

اس مقالے اور اس کے عنوان میں مولانا کوثر نیازی نے جس چیز کو ''تہذیبی مفاہمت'' کا نام دیا ہے ظاہر ہے کہ تہذیبی مفاہمت پاکستان اور ہندستان کے مابین ہی مقصود ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی قسم کے خیالات کے اظہار کے لیے ''دونوں ریاستوں کے تعلیمی اور ثقافتی روابط'' کا نام دیا ہے۔ یہ بات انھوں نے حضرت نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی علیہ الرحمہ کے نام ایک خط میں حضرت کی کسی ایسی ہی رائے کی توثیق میں لکھی تھی۔ جسے حضرت شروانی کے خط میں تو نہ سہی، مولانا آزاد کے بیان میں پڑھ لیا جا سکتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''......آپ کی رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ ہندستان کی تقسیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں

ہونا چاہیے کہ دونوں ریاستوں کے تعلیمی و ثقافتی روابط میں انقسام و تجدید کے الگ الگ دایرے بن جائیں۔ آج جب ہم تمام اقوام عالم کو ایک دوسرے سے قریب تر اور مربوط دیکھنا چاہتے ہیں تو اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود اپنے ملک کے اندر ایک دوسرے سے منقطع ہو جائیں۔

یہ میری ذاتی رائے ہی نہیں بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا کا طے شدہ مسلک ہے۔

(مکاتیب ابوالکلام آزاد: مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری، ص ۶۷۳)

مجھے معلوم نہیں کہ مرحوم کوثر نیازی کی ''تہذیبی مفاہمت'' اور مولانا آزاد کے الفاظ ''تعلیمی و ثقافتی روابط'' میں ''معنی و تعبیر'' کا کیا فرق ہے؟ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ دونوں جملوں میں کوئی فرق ہے ضرور! اور اس بارے میں مولانا آزاد کے الفاظ زیادہ محتاط ہیں لیکن اس کا فیصلہ قارئین کرام کے ذوق ورائے پر چھوڑتا ہوں!

کوثر نیازی مرحوم کا یہ نایاب مقالہ لایق مطالعہ ہے۔ یہ ذہن میں ایک نئے دریچے کو کھولتا ہے۔ دونوں ملکوں میں تہذیبی مفاہمت یا ثقافتی روابط کے قیام کے لیے فضا کو سازگار بناتا ہے، تعصبات کی گرد سے ذہن کو صاف کرتا ہے اور اتحاد و مفاہمت کی فضا کو پیدا کرتا ہے۔

(ا-س-ش)

مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر کے حوالے سے اس بین الاقوامی سیمینار میں پاکستان کی نمایندگی کرتے ہوئے مجھے انتہائی مسرت ہو رہی ہے، مولانا صرف آپ ہی کی نہیں ہماری بھی بڑی محترم شخصیت ہیں۔ ان کی سیاست سے پاکستانیوں کو لاکھ اختلاف سہی مگر تین باتوں میں کسی کو کلام نہیں۔

(۱) وہ عصر حاضر کی تحریک آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے۔

(۲) وہ ہندستان کی تحریک آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے۔

(۳) وہ اُردو ادب اور صحافت میں اپنی طرز کے آپ موجد تھے اور آپ ہی خاتم بھی اسلوبِ نگارش انھوں نے ایجاد کیا وہ انھی سے شروع ہوا اور انھی پر ختم ہو گیا۔

ہم پاکستانی ان کا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکتے کہ انھوں نے گو زندگی بھر تقسیم ہند کی

زبردست مخالفت کی مگر پاکستان بن جانے کے بعد ہمارے ساتھ ان کا رویہ بے حد ہمدردانہ رہا، اسی انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے پہلے جلسے میں، جس کے زیر اہتمام آج آپ اس تاریخی اجتماع میں شریک ہیں، پاکستان کے مندوبین بھی موجود تھے اور مولانا نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

ہم سیاسی اسباب سے علاحدہ ہو گئے لیکن ہم ایک تھے اور ہماری تہذیبی زندگی ایسی ہے کہ اگر اسے تقسیم کیا گیا تو دونوں کو نقصان پہنچے گا۔

ایک اور موقع پر قیام پاکستان کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ فرمایا اور یہ اقتباس میں آپ ہی کے ملک سے چھپنے والی کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے' ص ۲۱۱ سے نقل کر رہا ہوں کہ

''جو کچھ ہونا تھا ہو چکا پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے، اب دونوں ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراک عمل سے کام لیں، اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی تو وہ نئے اور بڑے مصائب و آلام کا باعث بن سکتی ہے۔'' (مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، ۱۹۸۶ء)

کاش! مولانا کی یہ نصیحت دونوں ملکوں کی حکومتیں اور عوام اپنے دل میں اُتار لیں تو یہ جو روز روز فضا میں تناؤ اور کشیدگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، نظر نہ آئیں اور ہم ان دو بھائیوں کی طرح زندگی گزارنے لگیں جو گھر کا بٹوارا کرتے ہوئے بیچ میں دیوار تو کھڑی کر لیتے ہیں لیکن دُکھ سکھ میں بدستور ان کا سانجھا رہتا ہے۔

مولانا آزاد کا یہ کہنا کہ دونوں ملکوں کی تہذیبی زندگی ناقابل تقسیم ہے۔ ایک مولوی کا قول نہیں ایک صوفی کا فرمودہ ہے۔

یوں تو مولانا آزاد کی کئی جہتیں تھیں وہ عالم بھی تھے اور سیاستدان بھی، ادیب بھی تھے اور صحافی بھی، مگر میرے نزدیک اصلاً وہ مذہبی سے زیادہ ایک روحانی آدمی تھے۔ ان کا مذہب ظاہری رسوم سے عبارت نہ تھا۔ وہ اس کے اندر ڈوب کر اس کی اسپرٹ اور اس کی روح کو پا چکے تھے۔

''ترجمان القرآن'' اور بالخصوص تفسیر سورۂ فاتحہ میں انھوں نے جس ''روح مذہب'' کا ذکر کیا ہے وہ اس دعوے کا واضح ثبوت ہے۔ ان کے نزدیک تمام آسمانی مذہب کے رستے (شرائع) جدا جدا تھے مگر ان سب کی منزل ایک تھی۔ ان میں سے کوئی پا پیادہ منزل کی طرف جا رہا ہے تو کوئی چھکڑے میں، کوئی بس پر تو کوئی ٹرین کے ذریعے، کوئی طیارے سے تو کوئی کسی اور ذریعے سے ان میں سے کچھ یہ دعویٰ تو کر سکتے ہیں کہ وہ دوسروں کی نسبت جلد منزل پر پہنچ جائیں گے مگر یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ دوسروں کا رُخ ہی سوے منزل نہیں، اسے آپ ''وحدت دین'' کا نام دے دیں یا روحانیت کا مولانا نے اپنی معرکتہ الآ را تفسیر سورہ فاتحہ میں بہ تفصیل یہی نظریہ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''اس اُم الکتاب کے نزدیک سیدھا راستہ تمام انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہے اور اس دعا کے ذریعے ایک انسان ان سب ہادیانِ برحق کے راستے پر قائم رہنے کی آرزو کا اظہار کرتا ہے۔''

یہ صحیح ہے کہ مولانا پیری مریدی کے ماحول میں آنکھیں کھولنے کے بعد تقدس کی اس مصنوعی فضا سے بیزار ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کبھی اپنے مرحوم باپ کے عرس میں بھی شریک نہیں ہوئے لیکن اس کے باوجود وہ ایک ظاہر بین وظاہر دار مولوی نہ تھے، اندر سے اوّل و آخر ایک صوفی صافی تھے جو شے کی حقیقت کو دیکھتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ......

''جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا؟''

اپنے افکار میں جگہ جگہ انھوں نے اسلام کے حقیقی تصوف کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا ہے، ان کا مشہور مضمون ''حیات سرمد'' اس کی جیتی جاگتی شہادت ہے، جس میں انھوں نے اپنے زورِ قلم سے سرمد کو امر بنا دیا ہے۔ اسی مضمون میں وہ دارا شکوہ اور اورنگ زیب عالمگیر کا تقابل بھی کرتے ہیں اور واضح طور پر اپنا فیصلہ دارا شکوہ کے حق میں سنا ڈالتے ہیں۔ انھوں نے ان اہل قلم کی مذمت کی ہے۔ جنھوں نے دارا شکوہ کی ''کردار کشی'' میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ہمیں تو عالمگیر کی ہوشیاری سے دارا شکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے۔''

سب کو معلوم ہے کہ اورنگ زیبؒ ہماری تاریخ میں "ظاہری مذہبیت" کے نمائندہ ہیں اور دارا شکوہ تصوف کے اور تصوف بھی خالص ہند کا اسلامی تصوف جس میں جگہ جگہ "ویدانت" کی آمیزش اسے عرب اور عجم کے دوسرے مکاتب تصوف سے جداگانہ رنگ دیے ہوئے ہے، دارا شکوہ سے بڑھ کر ہماری تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا فرد مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے تہذیبی مفاہمت کا علم بردار ہوگا! شہنشاہ اکبر کی تہذیبی مفاہمت ایک بے دین اور لامذہب تہذیبی مفاہمت ہے، لیکن دارا شکوہ اسلام اور ہندومت کی مذہبی روح کو برقرار رکھتے ہوئے تہذیبوں کا ایک ایسا آمیزہ تیار کرتے ہیں جس میں جسموں ہی کو نہیں دلوں کو بھی فتح کرنے کی زبردست تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان کی مشہور کتاب "مرج البحرین" کا جس نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی تصدیق و تائید کرے گا۔

اس لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزاد عالم گیر سے نہیں دارا شکوہ سے متاثر نظر آتے ہیں کہ ان کے نزدیک بھی مسلمانوں کی برصغیر کی آمد کے بعد ایک نیا ہندستان قائم ہوا۔ مولانا کے بقول مسلمانوں نے اس سرزمین کو "جمہوریت" اور "انسانی مساوات" کے تحفے دیے اور یہاں کے بکھرے ہوئے مٹیریل میں اسلامی ثقافت کے اجزا ملا کر ایک عجب تعمیر کھڑی کی۔ مولانا اس مخلوط اور مشترک تہذیب کو غیر مخلوط اور خالص عرب ثقافت کے معاشرتی مظاہر پر برملا ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام ثبات اور تغیر سے مرکب ہے۔ اس کی اقدار کبھی تبدیل نہیں ہوتیں، لیکن معاشرتی مظاہر میں اس کے تغیر کی صلاحیتیں ہمیشہ نئے نئے گل بوٹے کھلاتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہندستان اور عرب کے اسلام میں کوئی فرق نہیں کہ دونوں کے بنیادی عقاید اور اقدار ایک ہیں لیکن معاشرتی طور پر اطوار کی رنگا رنگی نے ان کے مذہبی مراسم میں خاصا فرق پیدا کر دیا ہے، عرب سماج میں میت کی تجہیز و تکفین سے لے کر اس کے فاتحہ، درود تک ایسی کوئی رسم نہیں پائی جاتی جو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے لازمہ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ سوئم، دسواں اور چہلم کی رسمیں ہمارے ہاں ہندوؤں کے تیجے، دسویں اور چالیسویں سے آئی ہیں۔ قوالی، بھجن کے زیر اثر پیدا ہوئی ہے۔ تعزیے، سہرے کا عکس ہیں، مزاروں پر نذر نیاز کی دیگیں مندروں کے پرشاد سے آئی ہیں، قبروں پر پھولوں کے ہار بھی عرب میں نہیں چڑھائے

جائے، ہمارے ہاں اس لیے ڈالے جاتے ہیں کہ انھیں ہندستان میں دیوی دیوتاؤں پر بھینٹ کیا جاتا ہے۔ یہاں میں نے صرف زندگی کے ایک شعبے میں برصغیر کے مشترک مذہبی مظاہر کی نشان دہی کی ہے۔ آپ کسی بھی دوسرے شعبے کا جائزہ لے لیں یہی رنگ آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا۔ مولوی ان تمام باتوں کو ''بدعت'' کہہ کر رد کر دے گا مگر صوفی کو ان مراسم پر وجد بھی آئے گا اور حال بھی یہاں ''غبارِ خاطر'' میں ''چڑے چڑیا کی کہانی'' کی طرف اشارہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، جس میں جیل کے دو چڑوں کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا نے ایک کا نام ''ملا'' رکھا ہے اور دوسر ،کا صوفی آپ اسے پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ اس میں ''صوفی چڑا'' ہی مولانا کا محبوب چڑا نظر آتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں (بعض اشعار اور مشکل فقرے میں نے حذف کر دیے ہیں۔)

''اب مختصر اً ملا اور صوفی کا حال بھی سن لیجیے۔ ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے، جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اُٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آ جائے دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہے گا، کیا مجال ہے کہ ہم سایے کا کوئی چڑا اس محلے کے اندر قدم رکھ سکے، کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی، لیکن پہلے ہی مقابلے میں چت ہو گئے...... فرمایئے اگر اس کا نام ملا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا؟''

''ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے ''تعرف الاشیاء باضدادہا'' اسے جب دیکھیے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے، بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ وسخن کا سا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے، جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو اور کبھی کبھی سر اُٹھا کے ''ہا'' کر دیتا ہو...... میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا۔''

(غبارِ خاطر، لاہور، مکتبہ احرار، تیسرا ایڈیشن، ص ۲۷۴-۲۷۳)

مولانا نے اپنے انداز خاص میں ''صوفی اور ملا'' کے احوال ومقامات پر جو بلیغ گفتگو کی ہے وہ انھی کا حصہ ہے، مگر صاف ظاہر ہے کہ وہ ''ملا'' کو پسند نہیں کرتے ''صوفی'' کو پسند کرتے ہیں۔

انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''تذکرہ'' میں بھی صوفی و ملا کا تقابل بڑے دلاویز

انداز میں کیا ہے، مگر وہ اقتباس سنانے سے پہلے میں ''الہلال'' میں ایک خط کے جواب میں ان کے ان جملوں کا تذکرہ کروں گا جس میں انھوں نے دینی مدرسوں اور رائج الوقت مذہبی تعلیم پر زبردست چوٹ کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''آپ پوچھتے ہیں کہ مشرق ومغرب کے کن دارالعلوموں میں میں نے ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ گزارش ہے کہ الحمدللہ کسی میں نہیں!(الہلال: ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۲، ص ۳)

اس کے برعکس حضرت خواجہ غریب نواز حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ الاسلام ملتانی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے بالمقابل علمائے سو کی کارستانیوں کے پول کھولنے کے بعد جب وہ ان صوفیا واولیا کے قبول عام اور بقائے دوام کا ذکر کرتے ہیں تو کتنے حسین انداز میں کرتے ہیں:

''یہ کیا اندھیر ہے کہ ایک فقیر بے نوا پھٹی کملی اوڑھ کر کسی کھنڈر میں بیٹھ جاتا ہے۔ ''ہدایہ'' کی چار سطریں سامنے رکھ دیں تو (اس کے) ہوش وحواس گم ہو جائیں ''قدوری'' اور ''کنز'' بھی پوری نہیں پڑھی۔ اس پر عالمگیریوں اور جہاں ستانیوں کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں دلوں کا مالک! آبادیوں کی آبادیاں ہیں کہ سمٹی چلی آ رہی ہیں، افسوس ان بندگانِ نفس کو کون سمجھائے کہ کارخانۂ الٰہی کے تعزز وتذلل کا صرف وہی قانون نہیں ہے، جو تم نے مولویت ومشیخت کی مسندوں پر بیٹھ کر سمجھ رکھا ہے، مدرسوں کی دماغ سوختگیوں کے علاوہ بھی کچھ کرنے کے کام ہیں اور شاید سارا دارومدار انھی پر ہے۔'' (تذکرہ: دہلی، ساہتیہ اکاڈمی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۹۸)

......مولانا اپنے دور کی ایک عبقری شخصیت تھے۔ وہ سترہ سال کی عمر میں جب علامہ شبلی کے ساتھ الندوہ کی ادارت میں شریک ہوئے تو دینی حلقوں میں ان کا مقام بطور عالم دین کے تسلیم کر لیا گیا۔ ۲۷، ۲۸ برس کی عمر میں الہلال اور البلاغ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے دین ودانش کی دنیا میں ان کا سکہ چلنے لگا۔ ۳۳ برس کی عمر میں وہ ''امام الہند'' مان لیے گئے۔ ۳۵ برس کے تھے کہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ زندگی کے ان پہلے ۳۵ سالوں میں وہ ایک قومی سیاسی رہنما بن کر مطلع سیاست پر چھا گئے۔ بہت سے لوگوں کو مولانا کی زندگی کے ان دو مختلف ادوار میں تضاد نظر آتا ہے مگر میں اسے تضاد نہیں مولانا کا ذہنی وفکری ارتقا قرار دیتا ہوں، ایک ایسا ارتقا

جس میں فکری کڑی سے کڑی ملتی چلی جارہی ہے۔

مولانا شروع میں سر سیّد احمد خان سے متاثر ہوئے، مذہب کے بارے میں ان کے ''سائنسی اپروچ'' نے مولانا کو ان کا گرویدہ بنا دیا لیکن جلد ہی وہ اس سحر سے نکل گئے، سر سیّد کی ''انگریز نوازی'' کو چھوڑ دیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعے مسلمانوں کو غلامی کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ کریں، اسی سفر کا ایک سنگ میل ان کا ''پان اسلامزم'' کی طرف جھکاؤ بھی ہے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ تنہا مسلمان کچھ نہیں کر سکتے، جب تک دوسرے ابنائے وطن کا تعاون بھی حاصل نہ کیا جائے، تو وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی بن گئے۔ مولانا اپنے الہلال اور کانگریس کے ادوار میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے ''قول فیصل'' میں فرماتے ہیں:

> ''ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی آزادی کی جو روح پھونک رہے ہیں، الہلال اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔''
>
> (قول فیصل: کلکتہ، البلاغ پریس، ص ۶۸)

ان کے نزدیک ہندو آزادی کی جدوجہد حب الوطنی کے تحت کر رہے تھے مگر مسلمانوں کے لیے یہ ایک ایمانی فریضہ تھا اور جب اس کی ادائیگی کے لیے مولانا نے تہذیبی مفاہمت اور ہندو مسلم اتحاد کو ضروری قرار دیا تو اس وقت بھی انھوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا اس اتحاد اور مفاہمت میں انھیں وہی روح کارفرما نظر آئی جو پیغمبر اسلام کے اس عمل میں تھی جسے ''میثاق مدینہ'' کہا جاتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے قریشی حملہ آوروں سے مدینہ کو محفوظ کرنے کے لیے یہودیوں، عیسائیوں اور سائبیوں سے جو معاہدہ کیا تھا، مولانا نے آگرہ میں مجلس خلافت کے خطبۂ صدارت میں اسے بنیاد بنا کر فرمایا:

> ''احکام شرع کی رو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فریق ہو سکتا ہے، جو
> نہ صرف ایشیا کو، مشرق کو، بلکہ اس تمام کرۂ ارض کی سچائی کو جو قوت آج
> چیلنج دے رہی ہے، جو اس کو مٹانا چاہتی ہے، جس کے غرور سے اللہ کی
> اس عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے، وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا

کوئی دوسری طاقت نہیں ہے، اس لیے ہندستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکامِ شرع کو سامنے رکھ کر حضور پیغمبر اسلام (ﷺ) کے اس اُسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں جو انھوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا...... ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد ومحبت کا پیمان باندھ لیں...... اور دونوں مل کر ہندستان کی ایک ''قوم اور نیشن'' ہو جائیں...... اس وجود مقدس نے جو عہد نامہ لکھا بجنسہ یہ اس کے الفاظ ہیں اِنَّہ، اُمَّۃٌ وَّاحِدۃٌ (یہ ایک اُمت اور ایک قوم ہے۔)'' (خطبات ابوالکلام آزاد: لاہور، ادبستان، ص ۴۷، ۴۸)

اس میں شک نہیں کہ ہماری تحریک آزادی میں شامل بھی رہنماؤں نے بڑی قربانیاں دی ہیں مگر مولانا اور ان کے ہم خیال کانگریسی علمائے دین کا راستہ سب سے مشکل اور کٹھن تھا انھیں ایک طرف آزادی کے لیے جدوجہد کرنی تھی اور دوسری طرف اپنے اقدامات کے لیے رہنمائی بھی اسلام سے حاصل کرنی تھی۔ مولانا آزاد کا تو یہاں تک عقیدہ تھا کہ انھوں نے ۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء کے ''الہلال'' میں ایک خط کے جواب میں لکھا:

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے! لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔''

(الہلال: ۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۸)

اس عقیدے کے ہوتے ہوئے تہذیبی مفاہمت اور ہندو مسلم اتحاد کو بھی دوش بدوش رکھنا ایک ایسا دشوار گزار مرحلہ تھا جسے مولانا ابوالکلام آزاد جیسا جاں باز عالم ہی سلامتی کے ساتھ عبور کر سکتا تھا۔ انھوں نے سیاست کے لیے مذہب کو استعمال نہیں کیا، مگر اپنی تمام تر سیاست کی بنیاد، مذہب پر رکھی۔ اس سفر میں کون سی گالی تھی جو انھیں نہیں دی گئی، کون سا الزام ہے جو ان پر نہیں تراشا گیا۔ مگر وہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ کہتے ہوئے مردانہ وار ہر موڑ سے گزرتے چلے

گئے کہ:

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خدا ست
آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی!

آزادی کی جدوجہد میں انھیں دشنام والزام سے نوازا گیا مگر مجھے معاف کیجیے اگر میں یہ کہوں کہ آزادی کے بعد بھی ان سے کچھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا گیا۔ مولانا نے فرمایا تھا:

''میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔''

ایک دوسری جگہ اپنے آپ کو انھوں نے ''ناوقت کا پھل'' قرار دیا ہے۔ غالب کے لفظوں میں وہ گویا خود کو ''عندلیبِ گلشن ناآفریدہ'' ٹھہرا رہے تھے۔ محسوس ہوتا ہے کہ گلشن تخلیق کرنے کی ان کے عقیدت مندوں نے اب تک کوئی ٹھوس کوشش نہیں کی۔ پاکستان کی بات تو رہنے دیجیے کہ وہاں بدقسمتی سے سیاسی اختلافات کے باعث خواص کو بھی مولانا کے مقام کا عرفان نہیں، خود ہندستان میں بھی حکومتی اور عوامی سطح پر مولانا کی فکر کو اُجاگر کرنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کی حکومت نے ۱۹۸۸ء کو مولانا آزاد کا سال قرار دے کر پورا سال تقریبات کا اہتمام کیا اور آج کا یہ بین الاقوامی سمینار اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے، مگر اس میں بھی ستم ظریفی کا یہ پہلو کتنا نمایاں ہے کہ مولانا اور ان کی فکر پر تیار ہونے والے تمام مضامین اور تقریریں اُردو کے بجائے انگریزی زبان میں ہیں۔

مولانا آزاد اُردو کے مایہ ناز ادیب اور اسکالر تھے ان کا تمام فکری سرمایہ اُردو زبان میں ہے۔ اب مولانا سے تو محبت کا دعویٰ کرنا اور اس زبان سے بیر رکھنا، جسے انھوں نے پوری زندگی سینے سے لگائے رکھا۔ ایک ایسا تضاد ہے جس کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ یاد رکھیے زبانیں سب خالق کی ہیں، جو اس نے مخلوق کی سہولت کے لیے بنائی ہیں، اُردو کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کی زبان نہیں۔ یہ پورے ہندستان کی زبان ہے یہ پنڈت رتن ناتھ سرشار،

چکبست لکھنوی، منشی پریم چند، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، آنند نرائن ملا، مالک رام اور پنڈت گوپی چند نارنگ کی زبان ہے۔ اسے آپ جائز مقام دیں گے تو لوگوں کو مولانا آزاد کے خیالات تک رسائی حاصل ہوگی اور انھیں ان کے خیالات تک رسائی حاصل ہوگی تو آپ کے ملک میں تہذیبی مفاہمت بڑھے گی ورنہ یاد رکھیے مولانا کی یاد میں چند جلسے کرنے، چند کتابیں لکھنے اور کچھ یادگاریں بنا دینے سے کام نہیں چلے گا۔

(ہفت روزہ لولاک۔ فیصل آباد: ۲/اگست ۱۹۹۰ء، صفحہ ۸ تا ۱۱+۷)

نوٹ:

یہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے جن مراحل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں پھر بھی اس پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے:

۱- ۱۹۱۳ء میں جب کہ ان کی عمر ۱۵ برس کی تھی، خدنگ نظر۔ لکھنؤ کے حصہ نثر کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔

۲- اسی سال کے نومبر ۱۹۱۳ء سے انھوں نے اپنا علمی رسالہ سان الصدق۔ کلکتہ جاری کیا، جس کے وہ خود ہی مالک و مدیر تھے۔ مئی ۱۹۰۵ء جاری رہا جس نے حالی و شبلی جیسے فضلائے وقت کو حیرت میں ڈال دیا۔

۳- ۱۷ برس کی عمر ۱۹۰۵ء میں مولانا آزاد الندوہ کے اسسٹنٹ یا معاون ایڈیٹر بنے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ شبلی کے فیض صحبت نے انھیں مولوی سے مولانا بنا دیا تھا۔

۴- ۲۷ برس کی عمر نومبر ۱۹۱۵ء میں البلاغ جاری کیا تھا، جو ۱۹۱۶ء کے مارچ میں مولانا کے کلکتہ سے اخراج اور رانچی میں نظر بندی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔

۵- عمر کے اٹھارہویں برس ۱۹۰۶ء میں، وہ وکیل۔ امرتسر کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے تھے۔

۶- ۳۳ برس کی عمر (۱۹۲۱ء) جب امیر شریعت، امیر الہند یا امام الہند بنانے کا مسئلہ زیر غور آیا تو جمعیت علمائے ہند کی ایک جماعت یا حزب انھیں اس منصب پر مولانا کو فائز کرنا چاہتی تھی اور حضرت شیخ الہند جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس دہلی، ۱۹۲۰ء ہی میں بعمر ۳۲ برس انھیں اس منصب پر فائز کرنا اور ان کے ہاتھ پر سب سے پہلے خود بیعت کرنا چاہتے تھے۔

۷- ۳۵ برس کی عمر، ۱۹۲۳ء کے ستمبر میں مولانا آزاد آل انڈیا کانگریس کے خصوصی اجلاس دہلی کے صدر بنائے گئے تھے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

دعوتِ عزیمت کا ایک زریں باب

ابوسلمان شاہ جہان پوری

مولانا ابوالکلام آزاد کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور اخلاق و سیرت کی بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان کی شخصیت پر اخبار کے لیے ایک مختصر سا مضمون لکھنا چاہیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ اس دنیائے علوم و معارف کے کس گوشے سے، تاریخ دعوتِ عزیمت کے کس باب سے اور عظمت سیرت و کردار کے کس پہلو سے صرف نظر کی جائے اور تذکرہ کے لیے ان کے شخصی کمالات کے کس پہلو کا انتخاب کیا جائے۔ ان کے علم و فضل کا ہر ایک پہلو اور اخلاق و سیرت کا ہر نقش دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا ہے:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مَی نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اس لیے ان کی شخصیت کے کسی اور پہلو پر ترجیحاً نہیں، بیان کی آسانی کی خاطر میں اس مضمون میں ان کی صداقت شعاری کی خوبی اور حق گوئی کے کمال کی طرف چند اشارات کرنا چاہتا ہوں۔

جہاں تک انسانی فطرت کا تعلق ہے حق پسند واقع ہوئی ہے لیکن بوجوہ حق کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، پہلی ٹھوکر جو اس راہ میں لگتی ہے وہ حق ناشناسی کی ہے یعنی علم و مطالعہ و بصیرت کی کمی، حالات و واقعات کا تجزیہ و تفرید کی صلاحیت نہ ہونے، معاملات و مسائل، سے نتائج کے استخراج کی عدم قابلیت، علم و مطالعہ کو حالات و مسائل پر تطبیق کی صلاحیت

کے عدم وجود یا تعلیم و تربیت کے غلط انداز پر ہونے کی وجہ سے انسان سچائی کی پرکھ اور حق کی پہچان سے عاجز رہ جاتا ہے اور اس طرح ایک غلط فکر کے محور پر اس کے شب و روز کی گردش اور غلط خطوط پر اس کی زندگی کی تگ و دو شروع ہو جایا کرتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو حق شناسی کی راہ میں اس قسم کی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی، وہ صاحب علم و بصیرت تھے، ان کا ذہن رسا، نظر تیز، مطالعہ وسیع اور حافظہ بلا کا تھا، ان کے اندر حالات و واقعات کے تجزیہ و تفرید کی اعلیٰ صلاحیت تھی۔ معاملات و مسائل سے نتائج کے استخراج میں وہ عدیم المثال قابلیت کے مالک تھے، اپنے علم و مطالعہ کو پیش آمدہ حالات و مسائل پر تطبیق دینے کی صلاحیت ان میں اعلیٰ درجہ کی موجود تھی اور یہ ان کی سلامتی طبع کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنے ابتدائی تعلیمی ماحول اور گرد و پیش سے کوئی غلط اثر و اندازِ فکر قبول نہیں کیا، جو حق شناسی کی راہ میں ان کے لیے رکاوٹ بنتا۔

حق گوئی کا مقام حق شناسی کی منزل کے بعد آتا ہے جس طرح حق شناسی کی راہ میں متعدد رکاوٹیں پیش آتی ہیں، اسی طرح حق گوئی کی راہ میں بھی مختلف موانع پیش آتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو حق کی پہچان اور سچائی کی پرکھ ہوتی ہے لیکن وہ ایسے ماحول میں گھرا ہوتا ہے، جو قطعاً حق ناشناس ہوتا ہے، حالات انتہائی ناسازگار ہوتے ہیں اور اس لیے وہ حق گوئی کی سعادت سے محروم رہتا ہے، کبھی اس کے احباب اس کے اظہارِ حق میں مانع ہوتے ہیں، کبھی بیوی بچوں کے مستقبل کا خیال اس کی زبان پر تالا ڈال دیتا ہے، کبھی ماں باپ کی محبت حق گوئی میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے، کبھی ذاتی مفاد کے نقصان کا خیال اور کبھی راہ کی مشکلات اور مصائب کا تصور اس کا دامن کھینچتا ہے کہ ان خطرات کو کیوں مول لیا جائے۔ ایسی راہ میں کیوں قدم رکھا جائے اور ایسی بات سے زبان کیوں آشنا کی جائے جس کے اظہار میں زندگی کی راحتوں اور لذتوں کے لیے خطرہ ہو، کبھی اظہار حق میں یہ بات رکاوٹ بنتی ہے کہ علم و بصیرت کی کمی کی بنا پر اسے اپنی رائے پر خود پختہ یقین نہیں ہوتا یعنی حق گوئی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اپنے علم و مطالعہ کی صداقت اور افکار و نظریات کی صحت پر کامل یقین ہو، حق کا وہ صرف شناسا ہی نہ ہو بلکہ حق کا والہ و شیدا بھی ہو، حق کی محبت اس کی رگ و پے میں رچی اور بسی ہو، ماں باپ، اولاد، بیوی اور بہنوں بھائیوں کی محبت پر حق کا عشق غالب ہو، زندگی میں وہ کوئی ذاتی

غرض نہ رکھتا ہو اور مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت ہو۔

سورۂ توبہ کی ایک آیت اس باب میں جامع ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ راہ حق و جہاد میں کیا موانع پیش آتے ہیں اور کن آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟

یہ تمھارے ماں باپ تمھاری اولاد، تمھارے بہن بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا کاروبار تجارت، ذرائع معیشت، تمھارے پسندیدہ وآرام دہ مکانات اور مقیم زندگی کی راحتیں ہیں جو بعض اوقات آزمائش بن جاتی ہیں، پس اگر یہ چیزیں تمھیں راہِ حق میں جہاد کرنے میں رکاوٹ بن جائیں تو یقین رکھنا چاہیے کہ پیشانی پر فسق و محرومی کی مہر لگ جاتی ہے اور ہدایت و کامیابی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور جہاد کیا ہے؟ افضل و اعلیٰ جہاد تو یہی ہے کہ حق کا اعلان کیا جائے، ظلم کے مقابلے میں حق کی گواہی دی جائے۔

اس معیار اور اصول کو سامنے رکھ کر جب ہم مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں اپنی پوری زندگی میں اسی جہاد میں مصروف نظر آتے ہیں، زندگی کے ہر دور میں ان کی سیرت کا یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، ابھی ان کی عمر ۱۵، ۱۶ سال سے زیادہ نہ تھی کہ گھر کی رسمی و روایتی زندگی اور بعض عقاید سے ان کے دل کا اطمینان اُٹھ گیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کے والد مرحوم کی خوش عقیدگی اور مولانا کی حق پسندی میں بعد المشرقین پیدا ہو گیا۔

مولانا ایک انتہا پر تھے تو ان کے والد دوسری انتہا پر تھے، ان سے یہ توقع کرنا عبث تھا کہ وہ مولانا کی آزاد خیالی سے مصالحت اور حق پرستی کو گوارا کرلیں گے اور نئے خیالات کے ساتھ مولانا کے لیے گھر میں جگہ نہ تھی، ان کی جگہ پر کوئی اور ہوتا تو شاید خاندان کی مذہبی روایات اور زندگی کے خلاف اس کے دل میں کوئی خیال ہی پیدا نہ ہوتا اور اگر دل میں کوئی خیال پیدا بھی ہوتا تو باپ کے پیار اور بھائی بہنوں کی محبت کے مقابلے میں اس کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی لیکن مولانا کی فطرت کے یہ چیز بالکل خلاف تھی کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے ہیں اسے خاندانی روایات یا ماں باپ اور بھائی بہنوں کی محبت پر قربان کر دیں، وہ گھر کی ایک ایک راحت سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے مخالفتوں کے وار اپنے سینے پر روکے۔ وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اور اسی وجہ سے سب کی چاہتوں کا مرکز تھے لیکن جن ہاتھوں نے انھیں محبت کے جام پیش کیے تھے انھیں ہاتھوں سے دل پر نفرتوں کے تیر بھی کھائے، انھوں

نے زندگی کی راحتوں اور خوشیوں کے مقابلے میں ہر تلخی گوارا کر لی اور پیشانی پر شکن نہ آئی لیکن سیاہ کو سفید کہہ دینے کا ان کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا اور باطل کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دینے کا ننگ گوارا نہ کیا۔

مولانا نے خود بیان فرمایا ہے کہ ان کی زندگی کی ایک دائمی تکلیف اور اذیت شروع ہو گئی تھی۔ پہلے صرف اپنے محسوسات کی تکلیف تھی پھر خارج میں بھی ایک ایسی مقاومت موجود ہو گئی جس کے مقابلے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

والد مرحوم کی نظر پھر جانے کی وجہ سے دوسرے سب بھی ناپسند کرتے تھے، یہ حالت بہت جلد دور ہو سکتی تھی اگر وہ ایک مرتبہ بھی یہ کہہ دیتے کہ ان کے خیالات ایسے نہیں ہیں یا تھے اب ان سے رجوع کر لیا ہے لیکن بالفاظ مولانا ”ایک لمحے کے لیے بھی اس صریح کذب گوئی اور تقیے کا خیال دل میں نہیں گزرا۔ یہی خیال ہوا کہ جب میرے خیالات ایسے ہیں ہی اور میرے والد اس پر آشفتہ خاطر ہیں تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو گھر چھوڑ کر چلا جاؤں یا اس آشفتگی کو جھیل لوں اور واقعی مولانا نے والد مرحوم کے غیض و غضب کو پوری طرح جھیل لیا لیکن اپنے خیالات سے ایک قدم پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا اور والد صاحب سے صاف کہہ دیا کہ بہت سی باتیں سرسیّد کی کتابوں میں ان کے دل کو لگی ہیں اور وہ انھیں پسند کرتے ہیں، انھیں لوگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے اور پیر بنانے سے تکلیف ہوتی ہے وہ خود کو اس لائق نہیں سمجھتے۔ اس لیے اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

خاندانی منصب قائم رکھنے کے لیے ان کے بھائی موجود ہیں، اجازۃ و خلافۃ اور پیشوائی کا یہ منصب انھیں کو دے دیا جائے۔ مولانا آزاد کی خاندانی زندگی یعنی بیعت و ارشاد کا سلسلہ جو ایک مذہبی ریاست کا درجہ رکھتا تھا اور خاندانی روایات جنھیں مذہبی تقدس کا درجہ حاصل تھا ان سے اختلاف و انحراف اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی مخالفتوں اور نفرتوں کو برداشت کر لینا کوئی ادنیٰ درجے کی بات نہیں یہ شرف صاحبِ عزیمت ہستیوں ہی کو حاصل ہوتا ہے، ان ذلك لمن عزم الامور۔

یہ معلوم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مرحوم اس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے جسے آج کل عرف عام میں ”بریلویت“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے تشدد کا اندازہ صرف

اس ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے نزدیک مولانا احمد رضا خاں مرحوم بریلوی کا ایمان بھی مشتبہ تھا، علماء احناف اور علمائے حق کا وہ گروہ جو سلف کے مسلک کا پابند تھا جس نے سنت و سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا اور اس سے سرمو انحراف بھی جسے گوارا نہ تھا۔ مرحوم مولانا آزاد کے والد کے نزدیک اس جماعت صالحین کے کفر میں تو شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ تھی اور اس لیے اس گروہ سے شرف نسبت رکھنے والے علمائے حق، سرفروشانِ اسلام اور مجاہدین ملت کی مخالفت ان کے نزدیک اسلام کی سب سے بڑی خدمت اور اللہ کے راستے میں سب سے بڑا اجہاد تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب ہنگامہ دار و گیر شروع ہوا اور وہ علما جو جماعت مجاہدین سے دور نزدیک کی کوئی نسبت و تعلق رکھتے تھے، خاص طور پر انگریزی حکومت کے ظلم و جور کا نشانہ بنے، ان میں سے بہت سے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر حجاز کو دار الاماں سمجھ کر ہجرت کر گئے، لیکن ان مظلومین حق کو وہاں بھی چین نہ ملا اور اس دار السلام اور دار الاماں میں بھی ان پر تکالیف و مصائب کے پہاڑ توڑے گئے۔ قید و بند اور تازیانوں کی سزائیں دلوائی گئیں اور ان میں سے بہت سوں کو گرفتار کر کے پھر اسی ظالم و جابر حکومت کے حوالے کر دیا گیا جس کے ظلم و ستم سے بھاگ کر بیت اللہ الحرام کے دامن رحمت و امن میں پناہ لی تھی۔

مولانا آزاد نے بڑے رنج اور دُکھ کے ساتھ بیان فرمایا کہ ان گرفتارانِ بلا کے خلاف فتنہ اُٹھانے میں سب سے بڑا حصہ خود ان کے والد مرحوم کا تھا۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی) میں مولانا نے ایک جگہ نہیں کئی جگہ علمائے حق کے اس مقدس گروہ کی مخالفت میں والد مرحوم کی سرگرمی اور ان کے تشدد پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اگر مولانا آزاد کی صداقت شعاری اور حق گوئی کی اور کوئی مثال نہ ہوتی تب بھی ان کے عظیم اور صاحبِ عزیمت ہونے کے ثبوت کے لیے تنہا یہ بیان کافی تھا۔

یہ تو خاندانی روایات و رسوم، باپ کی شفقت، بھائی بہنوں کی محبت اور گھریلو زندگی کی راحت و آرام کے مقابلے میں حق گوئی کی مثالیں تھیں، اعلانِ حق کے راستے میں کاروبار معیشت کے مندا پڑ جانے کا خوف اور حکومت و اقتدار کی ہیبت ناکیاں ہمیشہ سے بڑی رکاوٹ

ثابت ہوتی ہیں لیکن مولانا ابوالکلامؒ آزاد کے لیے کاروبارِ معیشت کے نقصان اور طاقت و اقتدار کی قہرمانیوں کی حقیقت ہی کیا تھی، ان کی طبیعت پر حق کا عشق اس درجے غالب تھا کہ کاروبار کے سود و زیاں اور قید و بند کی زندگی کا ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آتا تھا، یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ اس حق گوئی کے نتیجے میں ان کا کاروبار تباہ ہو گیا، انھیں سخت ترین مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ تنگ دستی کے شدید ترین دور اُن پر آئے اس حق پرستی کی پاداش میں ان کی تصنیفات ضائع ہو گئیں اور بیسیوں مسودات تہس نہس ہو گئے، جن سے وہ ہزاروں نہیں لاکھوں روپے کما سکتے تھے لیکن انھوں نے اس کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔ روپے کی جھنکار اور چاندی سونے کے سکوں کی جگمگاہٹ نے کتنے ہی مدعیانِ حق کے پائے استقلال کو متزلزل کر دیا ہے۔ اگر مولانا چاہتے تو قلم کی ایک ایک جنبش پر لاکھوں کا ڈھیر ہو جاتا یا ان کی خاموشی کے ایک ایک لمحے پر لاکھوں نچھاور کر دیے جاتے، ان کے چشم و ابرو کے ایک ایک اشارے پر صاحبان جاہ و حشمت جبیں سائی کرتے نظر آتے، وہ چاہتے تو بت کی طرح پوجے جاتے اور بارش کی طرح ان پر بن برستا، لیکن حق کے عشق کی شورش انگیزیاں ایسی نہ تھیں جن پر مال و زر کی ہوس کا کوئی اثر ہوتا یا چاندی سونے کے سکوں کا لالچ اس آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ان پر حق گوئی اور حق پرستی کا ایسا نشہ چڑھا ہوا تھا جسے مصائب و تکالیف یا ہوس زر یا ہوس جاہ و عزت کی کوئی ترشی بھی نہ اُتار سکی۔ وہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پکارتے پھرے کہ میرے سینے میں ایک انگیٹھی دہک رہی ہے، میں وہی حرارت آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں، میرا ایمان اور میرا اسلام مجھے پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان حالات میں میرے لیے بس ایک ہی فرض رہ گیا ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف جو چولہا دہک رہا ہے اس میں لکڑیاں ڈال دوں۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں انھیں تحریک ترک موالات کے قاید اور رہنما کی حیثیت میں گرفتار کر لیا گیا، یقیناً ان کی گرفتاری تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہ تھی، لیکن ایک داعی اور مبلغ حق کی حیثیت سے آج ان کا کردار تاریخ دعوت و عزیمت کا ایک درخشاں باب ہے۔ مولانا پر دفعہ ۱۲۴/ الف کے تحت مقدمہ چلا تھا، استغاثے میں کہا گیا تھا کہ مولانا نے دو جگہ ایسی تقریریں فرمائیں جو دفعہ ۱۲۴/ الف کی زد میں آتی ہیں مولانا نے پہلے تو اپنے بیان میں استغاثے کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا پھر فرمایا:

''میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف ان ہی دو موقعوں پر بلکہ گزشتہ دو سال (۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء) کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطالب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی حملے کیے، ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے، میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ (۱۲۴/ الف کا) جرم قرار دیا جائے گا! میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مجرم سمجھوں۔

یقیناً میں نے کہا کہ موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے، لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کیوں مجھ سے توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں، میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں! میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں، گورنمنٹ حق تلفی اور ناانصافی سے باز آجائے۔ جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہونا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے، تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟

آج (۲۰۱۱ء میں) ۹۱ برس کے بعد بھی اس بیان کی شدت محسوس کی جا سکتی ہے اور اس وقت جب کہ حکومت اس تحریک کو سختی کے ساتھ دبا دینے اور اس کے لیڈروں کو انتہائی سزائیں دینے پر آمادہ تھی، برسر عدالت اعتراف جرم کرنا اپنی موت کو دعوت دینی تھی۔ عزیمت و استقلال اور بے خوفی کی اس سے بڑی کیا مثال ہوگی کہ ایک شخص استغاثے کی خامی کو دور کر دیتا ہے، صاف صاف اعتراف جرم کرتا ہے، استغاثے کے لیے خود ثبوت فراہم کرتا ہے اور عدالت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ حکومت سرتاپا ظلم و ناانصافی ہے، اسے درست ہونا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے! اس کے سوا اور کوئی تیسری راہ نہیں، میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ اگر یہ جرم ہے تو میں اس جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ اس جرم کی زیادہ سے زیادہ جو سزا چاہیں یا جو ہو سکتی ہے بلا تامل دے دو!

اعلانِ حق کی راہ میں عوام کی جہالت ہمیشہ سنگ گراں بنی ہے، عوام کی حق ناشناسی اور جہالت کے سیلاب میں وقت کے کتنے ہی مدعیانِ حق وصداقت کے قدم لڑکھڑا گئے اور قیادت ورہنمائی کے مقامِ بلند سے ترجمانی محض کے اسفل السافلین میں جا گرے، لیکن مولانا آزاد کا شماران اصحابِ عزیمت واستقلال مدعیانِ حق میں ہوتا ہے، جو ہر طرح کے سیلابِ حوادث میں اپنے داعیانہ مقام پر پہاڑ کی طرح جمے کھڑے رہتے ہیں اور قوم کو اس کی جہالت و عاقبت نااندیشی سے پلٹ پلٹ کر بلاتے رہتے ہیں اور حق ناشناسی کے گرداب سے نکالنے کی آخری دم تک سعی کرتے رہتے ہیں۔

کلکتہ کے بعض ناعاقبت اندیشوں نے عوام کو ایک مرتبہ انتہائی مشتعل کر دیا۔ مولانا اس زمانے میں جامع مسجد ناخدا۔ کلکتہ میں جمعہ وعیدین کی نماز پڑھاتے تھے۔ حالات انتہائی نازک صورت اختیار کر چکے تھے لیکن مولاناؒ نے عوام کے اس انتہائی اشتعال اور ناراضگی کے عالم میں بھی وہی بات کہی، جو ان کے نزدیک حق تھی۔ انھوں نے عوام کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا:

”ایک چیز اور یاد رکھو! ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولو۔ تم مجھ سے ساری فرمایشیں کر سکتے ہو، مجھ سے سب کچھ لے سکتے ہو، مگر ایک سیکنڈ کی خاطر، ایک سیکنڈ کے پچاسویں حصہ کے لیے بھی، میری نسبت یہ توقع نہ کرنا کہ میں نے جس حقیقت کو اپنی بصیرت کی روشنی میں دیکھ لیا ہے ٹھیک اسی طرح، جس طرح تم اس سورج کو دیکھ رہے ہو، اس حقیقت سے، ہاں! اس حقیقت سے...... ہاں! اسی حقیقت سے ایک انچ بھی ہٹ جاؤں گا، زمانے کی تلخیاں یا کروڑوں روپے کا لالچ، جو بھی ہو مجھے اس حقیقت سے برگشتہ نہیں کر سکتا اور لوگوں کی خواہش! لوگوں کی خواہش حقیقت کے سامنے چیز ہی کیا ہے! سارے انسان...... یہ تو خس وخاشاک کے ڈھیر ہیں...... خس وخاشاک کے...... ہاں! خس و خاشاک کے، یعنی مٹی کے ڈھیر ہیں!

حقیقت کے آگے اس مٹی کے ڈھیر کی حقیقت ہی کیا ہے! مکھیوں کا گروہ

ہیں، تم کو اگر مکھیاں گھیر لیں تو کیا تم مکھیوں کے آگے سر جھکا دو گے؟ یقیناً نہیں! بلکہ اُن پر قابو حاصل کرو گے۔ مجھے جو کچھ ملا ہے حقیقت کی روشنی میں ملا ہے۔ قبولِ عام کے لیے میں نے کبھی کسی کی پیروی نہیں کی، بلکہ اپنی راہ خود بنائی ہے۔ کوئی لالچ مجھے لبھا نہیں سکا۔ کسی کی ہیبت نا کی مجھے مرعوب نہیں کر سکی۔ جس راہ کو درست، سچ اور حق سمجھ کر بصیرت کی روشنی میں اختیار کیا اسی جادۂ حق پر آج تک قایم ہوں اور اس کے نتائج کو انتہائی قریب دیکھ رہا ہوں۔ جتنا تم مجھ کو! انسانی جنگل، ذرّات کا یہ صحرا، اس کی نبض تو میرے ہاتھ میں ہیں، حقیقت کے سامنے ان خواہشات کا شمار ہی کیا؟ حقیقت بہر حال حقیقت ہے!''

پچھلی سطروں میں ہم نے اشارہ کیا تھا کہ حق گوئی اور اس راہ میں عزیمت و استقلال کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اپنے فکر کی صحت صداقت اور عقیدے کی سچائی پر پختہ یقین ہو اور اپنی ذاتی کوئی غرض نہ رکھتا ہو۔ جس درجے کوئی شخص اپنے فکر و عقیدہ میں راسخ، پختہ اور بے غرض ہوگا اسی درجے وہ بے پناہ ہوگا۔ جسے کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی اور مولانا کی زندگی اور سیرت پر تاریخ اپنی مہر صداقت ثبت کر چکی ہے کہ انھوں نے اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں جس چیز کو حق سمجھا مدت العمر اسی پر قائم اور اسی کے داعی رہے۔ انھوں نے ۱۸، ۱۹ برس کی عمر میں زندگی کا ایک نقشہ بنایا تھا اور کبھی کسی مصلحت یا کسی شخص کی خاطر اس میں تبدیلی گوارا نہیں کی۔ انھوں نے کبھی زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی حالات کے پہاڑ میں بہنے کے لیے اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے اپنے دل سے غرض نکال دی تھی اور اسی لیے وہ بے پناہ ہو گئے تھے۔ ایک ایسی شخصیت جسے کوئی تلوار نہ کاٹ سکی، ایک ایسا پہاڑ جسے حوادث روزگار کا کوئی سیلاب جنبش نہ دے سکا اور جسے وقت کا طوفان اس کی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ــــ ایک جامع حیثیات شخصیت

ابوسلمان شاہجہان پوری

امام غزالی کے تذکرہ میں مرحوم شیخ مرافی نے لکھا تھا:

جب مختلف علماء کا ذکر آتا ہے تو اس سے ذہن ان خصوصیات کی طرف منتقل ہوتا ہے، جو ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں یا جس کی وجہ سے ان کو دوسروں پر امتیاز حاصل ہے۔ مثلاً جب ابن سینا اور فارابی کا نام آئے گا تو ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ خصوصیات نکھر کر قلب و ذہن کے سامنے آجائیں گی۔ ابن عربی کا تذکرہ ہوگا تو اس انداز کا تاثر اُبھرے گا کہ کسی بلند پایہ صوفی کے حالات بیان کیے جارہے ہیں۔ اسی طرح امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل کا تذکرہ ہوگا تو معلوم ہوگا حفظ وصدق کے اُونچے بیانوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو معرفت رجال میں ملکہ راسخہ رکھتے ہیں۔ لیکن غزالی کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ ان کا نام آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی آدمی کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے، بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیر بحث ہیں جن میں ہر ایک علم وفضل کی ایک مستقل بالذات اقلیم کا تاجدار ہے۔

جامع حیثیات شخصیت:

ٹھیک یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور پر صادق آتی ہے۔ زبان پر ان کا نام آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کا تذکرہ نہیں ہورہا ہے بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیر بحث ہیں اور ان میں سے ہر شخص اپنے فن میں یکتائے روزگار اور شہنشاہ علم وفن ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کی بے شمار دولتوں اور فکر ونظر کی بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ دین کے

متبحر عالم تھے اور مختلف علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ میں گہری نظر رکھتے تھے انھیں فن تجوید، علم کلام، منطق، مناظرہ وغیرہ میں عبور حاصل تھا۔ علم ہیئت اور فلسفہ قدیم و جدید پر ان کی ناقدانہ نگاہ تھی۔ دساتیر وقوانین کا نہ صرف مطالعہ کرنے والے بلکہ بنانے والے تھے، تاریخ عالم کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک پہلو پر نظر تھی، جغرافیہ عالم میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اُردو ادب اور انشاء تو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ انھیں انگریزی، فرانسیسی، عربی اور فارسی زبانوں کی تاریخ و ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ ہر زبان کے تمام بڑے بڑے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کی تخلیقات پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ مذکورہ زبانوں میں ادب تاریخ، مذہب اور فلسفے کا تمام بہترین لٹریچر ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ ہندو اور چینی فلسفہ و مذہب کا مطالعہ انھوں نے زیادہ تر انگریزی کی مدد سے کیا تھا۔ اُردو صحافت کے دامن میں انھوں نے اب (۲۰۱۱ء) سے ۹۵ برس پیشتر جو کچھ ڈال دیا تھا، آج تک اس میں اضافہ نہ کیا جاسکا۔ خطابت میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ ان کی طلاقت لسانی کے سامنے برٹش حکومت اپنی تمام آہنی اور جنگی طاقتوں کے ساتھ لرزتی رہی۔ عملی سیاست میں انھوں نے اس وقت قدم رکھا اور برٹش امپیریلزم کے قصر عظمت پر اس وقت ضرب لگائی جب بڑے بڑے نیتاؤں اور لیڈروں کا میدان میں دور دور پتا نہ تھا۔ نظری سیاست میں بھی ان کا مقام دنیا کے چند سیاست دانوں میں تھا۔ ماہر تعلیم کی حیثیت سے برصغیر کی وہ ایک مانی ہوئی شخصیت تھے۔ ہندستان کو انھوں نے اپنے دور وزارت میں اپنے افکار اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اتنا مالا مال کر دیا کہ اس کے تذکرے کے لیے جدید ہندستان کی تاریخ میں ایک طویل اور نمایاں باب ہوگا۔ دنیا کے امن کے لیے تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کا انھوں نے جو خاکہ پیش کیا وہ امن کے علم برداروں اور دنیا کے دانشوروں کے پیش نظر ہے، چنانچہ اس خاکے کے مطابق تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کا ایک عالمی نقشہ مرتب کیا گیا۔ اثری تحقیقات ان کا محبوب موضوع تھا اور اس سلسلے میں قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید ترین معلومات و تحقیقات ان کے علم و مطالعے میں تھیں۔ طب پر ان کی زبان کھلی تو طب قدیم و جدید کے نظریوں اور طریق علاج اور منضج، مسہل، تبرید، تکمید سے لے کر ریشہ خطمی اور گاؤ زبان تک کوئی پہلو نہ چھوڑا اور اپنی معلومات کا بڑے بڑے حکیموں سے لوہا منوایا۔ مصوری میں ان کا

مطالعہ اتنا وسیع اور ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ وہ نہ صرف اس کی تاریخ، عہد بہ عہد ترقی اور ہر عہد کی خصوصیات سے واقف تھے بلکہ وہ ایک تصویر کو دیکھ کر یہ بتا سکتے تھے کہ وہ کس عہد میں بنائی گئی اور اس عہد کی خصوصیات کے لحاظ سے اس میں کیا نقص اور کیا کمال ہے، موسیقی کا ذوق ان کی طبیعت میں رچا بسا تھا۔ اس کو انھوں نے عملی لحاظ سے سیکھا تھا اور فنی لحاظ سے اس کی تکمیل کی تھی۔ ہندستان میں لکھنؤ اور آگرہ اور بیرون ہند عراق اور بغداد کے ماہرین فن موسیقی سے بحث ومباحثہ رہتا تھا۔ وہ اس فن کے بھی رمز شناس تھے اور اسلامی تاریخ کی ایک ایک شخصیت سے واقف تھے۔ جسے اس فن لطیف سے لگاؤ تھا وہ شخصیت خواہ عالم ہو، خواہ صوفی، خواہ درویش ہو، خواہ شہنشاہ ان کے مطالعے کی حدود سے باہر اور حافظے کی گرفت سے آزاد نہ تھی۔ ڈراما اور سینما وغیرہ کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقیوں سے وہ ایک ماہر فن اور صاحب مضمون کی طرح واقف تھے۔ مشرقی کھانوں کا تذکرہ ہو یا مشرقی لباس کا بیان ہو ہر موضوع پر اپنی معلومات اور مطالعے کی وسعت سے سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ علوم وفنون کی جزئیات پر بھی ان کی اتنی گہری نظر تھی کہ کسی صاحب مضمون کو بھی یہ خصوصیت حاصل نہ ہوگی۔

جعفری خاندان کی تاریخ ہو یا پٹھانوں کی تاریخ، ان کے خاندانوں کا بیان اس تفصیل اور روانی سے کرتے تھے کہ خود صاحب علم ومطالعہ جعفری اور پٹھان بھی حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ حقے کی تاریخ اس کی تدریجی ترقی، عہد بہ عہد اس کی شکلوں کی تبدیلی، اس کی ''نے'' کی مختلف شکلیں، ان کی لمبائی، موٹائی اور شکل کے اختلاف سے اس کی آواز پر معمولی اثر، پتنگ کی تاریخ، اس کی مختلف شکلیں، ان کے اڑانے کے طریقے، چائے کی اقسام اور اس کا تاریخی تذکرہ ہو، بلبلوں اور ان کی اقسام کا بیان ہو، پھول پودے اور ان کی اقسام زیر بحث آئیں یا پرندوں اور جانوروں کی نفسیات پر قلم اُٹھائیں وہ ہر چیز کا بیان اس تفصیل سے کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کے بیان کی قدرت پر عش عش کر اُٹھتے ہیں بلکہ ان کے علم ومطالعے کی وسعت، حیرت انگیز قوت حافظہ اور بے نظیر قوت استحضار کا اعتراف کرتے ہی بن پڑتا ہے۔ یہ کمال کچھ ان کی طلاقت لسانی ہی کا نہیں تھا بلکہ یہ ان کی قابلیت اور حافظہ واستحضار کی بے نظیر صلاحیتیں تھیں۔ ان کی طلاقت لسانی کا تو یہ عالم تھا کہ وہ اگر ارہر کی اُبلی دال اور پیچ نکلے ہوئے

چاولوں کو دنیا کی لذیذ ترین اور مفید ترین غذا ثابت کرنا چاہتے یا تہہ بند، بنیان اور معمولی چپل کو وہ دنیا کا نفیس ترین اور فایدہ مند لباس ثابت کرنا چاہتے تو کون اس سے انکار کی جرأت کر سکتا تھا۔ ان کی طلاقت لسانی کا اندازہ حضرت امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ کے شکر گزار تھے کہ ابوالکلام نے نبوت کا دعویٰ نہیں کر دیا ورنہ ان کے لیے مقابلہ دشوار ہو جاتا۔ یہ اس خطیب اعظم کا اعتراف ہے جس نے اپنی خطابت سے چودھویں صدی ہجری کے ہندی کاذب ''نبی'' کو اس کے مہبط وحی اور شہرستان نبوت کذبی میں شکست فاش دی تھی۔ جس کا وجود اس نبی اور اس کی اُمت کے لیے ہندستان و پاکستان میں سب سے بڑا خطرہ تھا اور جس کا انتقال اس نبی کاذب کی اُمت کے لیے اس ''نبی'' کے ظہور کے بعد سب سے بڑی خوشی تھی۔

پوشیدہ صلاحیتیں:

ابوالکلام کے علم وفضل کے جن گوشوں کی طرف اشارہ کیا گیا یہ تمام وہ پہلو ہیں جن کا ذکر اور جن کا اعتراف ملک اور بیرونِ ملک کے علماء ومشاہیر کر چکے ہیں یا ابوالکلام کی زندگی کے یہ وہ گوشے ہیں جو لوگوں کے علم میں آ گئے۔ ان کے ایک وجود میں علم وفضل کی کتنی ہی ایسی دنیائیں آباد تھیں جن کا لوگ پتا بھی نہ چلا سکے، اور کسی طرح لوگوں کے احاطۂ علم میں نہ آ سکیں۔ علامہ نیاز فتح پوری نے مولانا مرحوم کی اس جامعیت کے متعلق فرمایا تھا:

> ''یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اس سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حال آں کہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں۔ ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔ وہ امکانات کیا تھے؟ ان کا تعین وصراحت آسان نہیں تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط ومعاملے کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو

ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبّی اور بدیع الزمان ہوتے، اگر وہ مذہب و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے، اگر محض علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم اور فیلسوف نہ ہوتے، اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو زمانے نے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے اُبھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف الہلال والبلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔"

عرفانِ خودی:

ابوالکلام کو خود بھی اپنی جامعیت اور فکر و نظر کی وسعتوں کا احساس تھا۔ ایک موقع پر بے ساختہ ان کے قلم سے چند جملے نکل گئے، فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سرو سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف ایک اپنی شاعری ہی کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالع دکان رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم وفنون، ادب، انشاء، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار راہیں مبداء فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن دل مالا مال نہ ہوا ہو، بحدے کہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔

ما زلت انزل فی ودادک منزلا
تتحیر الالباب بعد نزولہا

لیکن افسوس! جس ہاتھ نے فکر ونظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا اس نے شاید سروسامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد ومحل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا:

کم ارنا زاک الزمان بمدح
فشغلنا بذم ھذا الزمان!

یہ اشارات تو ان کے علم وفضل کی جانب تھے، ان کی شخصیت کے اور بہت سے پہلو ہیں مثلاً ان کی شخصیت کا جو پہلو سب سے پہلے دامن شوق وعقیدت کو اپنی جانب کھینچتا ہے، ان کی زندگی کا اٹھان ہے۔ انھوں نے ایک مخصوص عقاید وافکار کے خاندان میں آنکھیں کھولیں، ایک مخصوص ماحول میں اُن کی تعلیم وتربیت ہوئی، لیکن ان کی فطرتِ سلیمہ نے اس ماحول سے بغاوت کی اور ان عقاید وافکار کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حق کی طلب وجستجو نے انھیں شک و انکار اور الحاد وفسق کی وادیوں کی بھی خاک چھنوائی لیکن ان کے بخت کی فیروز مندی انھیں ہر نشیب وفراز سے صحیح سلامت منزل مقصود کی طرف لے گئی، اور بالآخر سعادت وارجمندی نے ان کے قدم چومے۔

مولانا کی سیرت اور کردار:

اس کے بعد ان کی سیرت کا پہلو آتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے علمی فضایل ومحاسن کا پہلو عظیم الشان تھا یا اخلاقی کمالات کے لحاظ سے وہ بڑے تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے عظیم الشان تھے۔ چھوٹوں کے لیے ان کا وجود سرتاپا شفقت ورحمت، دوستوں کے ہمدرد وغم گسار، نیاز مندوں اور عقیدت کیشوں کے لیے ہمہ تن دعا وسلامتی۔ لیکن فراعنۂ وقت کے مقابلے میں کبھی ان کی کج کلاہی نہ گئی۔ اوچھوں سے ہمیشہ درگزر کیا، کم ظرفوں کو کبھی منہ نہ لگایا اور ان کی کسی بات کا کبھی جواب نہ دیا۔ غلط کاروں کو ہمیشہ معاف کر دیا، مخالف سے کبھی بدلہ لینے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ کچھ عاقبت نااندیشوں نے نوجوانوں کو بھڑکایا اور ان سے اخلاق وشرافت کی حدود تڑوائیں، عقیدت مندوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہا، مولانا آڑے آئے ''شورش! انہیں معاف کر دو، یہ بچے ہیں ان کی کوئی خطا نہیں'' دوستوں نے مجبور کیا مولانا زبان کھولیں، جواب ملا ''میرے بھائی! موسمی ہوائیں ہیں گزر جائیں گی''

مقام عزیمت:

جس بات کو انھوں نے غلط سمجھا، غلط کہا اور جس بات کو انھوں نے صحیح جانا، ببانگ دہل صحیح کہا اور اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ ان کے نزدیک حق کے معاملے میں عوام کا اشتعال اور دوستوں کی ناراضگی اضافی چیزیں تھیں، مخالفتوں کے طوفان آئے اور بڑے بڑے صاحبان عزم وہمت تنکوں کی طرح بہہ گئے لیکن اس کوہِ استقلال کو کوئی چیز اس کی جگہ سے جنبش نہ دے سکی۔ مصائب وحوادث نے بہت سوں کا وقار خاک میں ملا دیا لیکن ابوالکلام جس مقام پر تھے اس سے نیچے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، عوام کے سیلاب کے آگے بڑے بڑے خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے اور رہنمائی کے مقام بلند سے ترجمانی کے مقام اسفل میں اتر آئے لیکن ابوالکلام کے نزدیک عوام کے جذبات کتنے ہی تیز وتند کیوں نہ ہوں انھیں رہنمائی کا مقام نہیں دیا جا سکتا، چنانچہ جب انھیں عوام کے اشتعال اور ان کی ناراضگیوں کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے عوام کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا:

''ایک چیز اور یاد رکھو! ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھولو! تم مجھ سے ساری فرمایشیں کر سکتے ہو، مجھ سے سب کچھ لے سکتے ہو، مگر ایک سیکنڈ کی خاطر۔ ایک سیکنڈ کے پچاسویں حصے کے لیے بھی، میری نسبت یہ توقع نہ کرنا کہ میں نے جس حقیقت کو اپنی بصیرت کی روشنی میں دیکھ لیا ہے ٹھیک اسی طرح، جس طرح تم اس سورج کو دیکھ رہے ہو۔ اس حقیقت سے...... ہاں! اس حقیقت سے ایک انچ بھی ہٹ جاؤں گا۔ زمانے کی تلخیاں یا کروڑوں روپے کا لالچ، جو بھی ہو مجھے اس حقیقت سے برگشتہ نہیں کر سکتا اور لوگوں کی خواہش! لوگوں کی خواہش حقیقت کے سامنے چیز ہی کیا ہے! سارے انسان، یہ تو خس و خاشاک کے ڈھیر ہیں، خس و خاشاک کے، ہاں! خس و خاشاک کے، یعنی مٹی کے ڈھیر ہیں! حقیقت کے آگے اس مٹی کے ڈھیر کی حقیقت ہی کیا ہے! مکھیوں کا گروہ ہیں، تم کو اگر مکھیاں گھیر لیں تو کیا تم مکھیوں کے آگے سر جھکا دو گے؟ یقیناً نہیں! بلکہ ان پر قابو حاصل کرو گے، مجھے جو کچھ ملا ہے، حقیقت کی روشنی میں ملا ہے۔ قبول عام کے لیے میں نے کبھی کسی کی پیروی نہیں کی، بلکہ اپنی راہ خود بنائی ہے، کوئی لالچ مجھے لبھا نہیں سکا، کسی کی ہیبت ناکی مجھے مرعوب نہیں کر سکی۔ جس راہ کو درست، حق اور سچ سمجھ کر سچائی کے ساتھ، بصیرت کی روشنی میں اختیار کیا، اسی جادۂ حق پر آج تک قایم ہوں اور اس کے نتائج کو انتہائی قریب دیکھ رہا ہوں، جتنا تم مجھ کو! انسانی جنگل، ذرات کا یہ صحرا، اس کی نبضیں تو میرے ہاتھ میں ہیں، حقیقت کے سامنے ان کی خواہشات کا شمار ہی کیا؟ حقیقت بہر حال حقیقت ہے!''

یہ وہی مقام عزیمت و دعوت تھا، جہاں سقراط نے زہر کا پیالا پیا تھا، کبھی گلیلو نے موت کو خوش آمدید کہا اور کبھی امام احمد بن حنبلؒ نے قید و بند کی سختیوں کو لبیک کہا تھا۔ ابوالکلام کے حصے میں بھی تلخیوں کے گھونٹ اور نفرتوں کے جام آئے۔ انھوں نے صبر و شکر کے ساتھ ان کو پی لیا اور اُف تک نہ کی!

ایک عہد:

صحیح اعتراض ہوتو آدمی خاموشی سے سن لیتا ہے لیکن لغو اعتراضات اور بہتان تراشیوں پر تو کون شخص اپنی زبان بند رکھ سکتا ہے لیکن ابوالکلام نے جب ایک مرتبہ عہد کرلیا کہ جو شخص ان کے خلاف مناظرانہ رنگ میں کچھ کہے گا یا لکھے گا، اس کے خلاف نہ کچھ لکھیں گے نہ اس کی شکایت سے زبان آلودہ کریں گے، تو پھر کبھی ان کا قلم نہ اُٹھا، نہ زبان پر کسی کا شکوہ آیا۔ مدت العمر وہ اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ ذلك لمن عزم الامور۔

مولانا کی خدمات:

ان کے علم وفضل اور سیرت واخلاق کے ساتھ ایک پہلوان کی خدمات کا ہے اور اس کے اتنے ہی میدان ہیں جتنے کہ علم وفضل اور فکر ونظر کے لحاظ سے ان کی شخصیت کے پہلو ہیں۔ علم، ادب، انشاء، مذہب، سیاست، اصلاح، تعلیم، فلسفہ، صحافت تاریخ وغیرہ میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں ہیں، ان کو کوئی مورخ اور تذکرہ نگار نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ایسی جامع الصفات شخصیت کے علوم ومعارف اور فضایل ومحاسن کے بیان، اخلاقی کمالات کے اظہار اور اس کی خدمات کے تذکرے کے لیے ایک فرد کا قلم کیوں کر کافی ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے بڑے بڑے علماء کے مجامع، عظیم الشان اکیڈمیاں، ان کے نامحدود وسائل اور صدیوں کی کوششوں کی ضرو.ت ہوتی ہے۔ ایک مختصر صحبت اور فرصت کے چند لمحے تو اشارات کے لیے بھی کافی نہیں ہو سکتے۔ البتہ چند لمحوں میں یاد کیا جا سکتا ہے اور اشکوں کا نذرانہ عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے۔

۲۲رفروری ہمیں ایک شخصیت کی یاد دلاتی ہے۔ وہ شخصیت جو اپنی ذات سے ایک انجمن تھی، ایک ادارہ تھی۔ ۲۲رفروری کو ہم اس کا ماتم کرتے ہیں اور یہ ماتم ایک شخص کی موت کا نہیں ہوتا بلکہ علم وفضل کے تاج محل کے ڈھے جانے، اخلاق وسیرت کے نشاط محل کے اُجڑ جانے، دعوت وعزیمت کے قصر بلند کے گر جانے، عظمتِ اسلاف کی آخری خانقاہ کے مسمار ہو جانے اور سب سے بڑھ کر نظروں سے اللہ کی حجت کے اوجھل ہو جانے کا ماتم ہے۔ یہ ماتم ہمارا تنہا ماتم نہیں، دنیائے علم وفضل کا ماتم ہے!

مولانا ابوالکلام آزاد کی چند برسیاں

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی
مولانا عبدالشاہد خان شروانی

(۱)

پچھلے سال ۲۲ر فروری کو ہندستان پر بالعموم اور ہندستانی مسلمانوں پر بالخصوص امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے جو قیامت گزری تھی اس کا تصور آج بھی لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ اگلے روز تعزیتی جلسے میں پنڈت نہرو نے بالکل صحیح کہا تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا مولانا آزاد کی جدائی کا غم ہلکا ہوتا جائے گا لیکن اُن کی وفات سے ہندستان کی قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا احساس بڑھتا جائے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ دورانِ سال میں ایسے متعدد واقعات پیش آتے رہے ہیں جن سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے مولانا آزادؒ کی یاد بری طرح محسوس ہوئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ زمانہ قریب یا بعید میں اس کمی کا احساس کس حد تک زائل ہو سکے گا۔ حضرت مولانا جن خصوصیات کے جامع تھے ان کا اظہار دوران سال میں مختلف گوشوں سے برابر ہوتا رہا ہے۔ دراصل یہ ان کی شخصیت کی جامعیت ہی کا کرشمہ ہے جس نے ملک کے مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ لوگوں کو بلا استثنا اس طرح متاثر کیا اور رُلایا۔ ہماری قومی زندگی سے ان کا تعلق اتنا گہرا اور قریبی تھا کہ ہمارے لیے اُنھیں الگ کر کے اس زندگی کا تصور بھی دشوار تھا۔ کانگریس کی اُوپر کی لیڈرشپ میں جس ممتاز حیثیت کے مالک تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں تھا جس پر ان کی شخصیت کی چھاپ نہ لگی ہو۔ وہ صرف ہماری جنگ آزادی کے بہادر اور دور اندیش سپہ

سالار ہی نہیں تھے بلکہ ملک کی تمناؤں اور حوصلوں کے مظہر بھی تھے، وہ ہمارے اتحاد اور ترقی کی ایک روشن مثال تھے، وہ روشنی کا ایک ایسا مینارہ تھے جس سے ناگپور کانگریس کے الفاظ میں ''ان کے ہم وطن دشواریوں اور پریشانیوں کے مواقع پر'' ان سے طاقت اور رہنمائی حاصل کرتے تھے، وہ فرقہ پرستی، علاحدگی پسندی اور ہر طرح کے رجعت پسندانہ نظریات کے سخت دشمن اور مخالف تھے۔ اُن کا نقطہ نظر تمام مسائل میں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا دینی ہوں یا معاشی، ترقی پسندانہ تھا۔ ان کا دماغ روشن، دل فراخ اور نظر وسیع تھی۔ وہ ذاتی اغراض سے اتنے بلند تھے کہ ان کا کوئی بدترین دشمن بھی کبھی اُن پر اس قسم کا الزام نہیں لگا سکا۔ کانگریس کی اندرونی جتھہ بندیوں کی اُنھیں ہوا بھی نہیں لگی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اُنھیں پورے ملک کے تمام کانگریسیوں کا یکساں اعتماد اور وفاداری حاصل تھی۔ ان باتوں کے علاوہ وہ ایک عظیم مفکر، عظیم تر ادیب اور اوّل درجے کے مقرر تھے۔ علومِ اسلامی کے ماہر کی حیثیت سے ان کی شہرت ہندستانی سرحدوں کے باہر بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک پاکستانی سیاست داں کے الفاظ میں ''اگر چہ وہ ہندستانی تھے لیکن ان کا تعلق تمام دنیا سے تھا'' اور تمام دنیا ہی کا ان پر حق بھی تھا۔ وہ اس حق کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے اور حتی الامکان اُس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ یونیسکو کی طرف سے منعقدہ گاندھیائی سیمینار میں دہلی میں انھوں نے دسمبر ۱۹۵۲ء میں مغربی اور مشرقی فلسفوں کا جو تقابلی مطالعہ اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا اُس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہی تو ایک غیر ملکی کمیونسٹ لیڈر نے ان کی وفات پر کہا تھا کہ ''وہ دنیا کے عوام کے لیے امن کے پرجوش محافظ تھے'' ہندستان کی آزادی کے بعد مولانا آزاد کی ساری کوششیں اس ملک میں ایک ترقی پذیر، خوش حال، ایمان دار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بالغ النظر معاشرے کے قیام پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود وہ یہ فریضہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک انجام دیتے رہے اور یہ بات اب ایک کھلا راز ہے کہ ان کی آخری بیماری بھی ایک اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ اس راہ میں اُنھیں بہت سی دوستیوں میں شگاف پڑتے ہوئے دیکھنے پڑے اور بہت سی مخالفتیں مول لینی پڑیں لیکن انھوں نے اس کی ذرا پروا نہیں کی۔ وہ عمر بھر اپنوں کے طعنے اور غیروں کی گالیاں سنتے آئے تھے لیکن

اپنے راستے سے ایک قدم نہیں ہٹے تھے تو اب اس کی کیا پروا کرتے۔ بقول خود ان کی بے غرضی نے اُنھیں ''بے پناہ'' بنا دیا تھا اور جو ''بے پناہ'' بن جاتا ہے، اُسے نہ کوئی تلوار کاٹ سکتی ہے، نہ کوئی طاقت جھکا سکتی ہے۔ مولانا آزادؒ کے کردار کے دو نمایاں پہلوان کی بے باکانہ حق گوئی اور غیر معمولی دور اندیشی و فراست تھے۔ ان دونوں صفات کا اظہار حال میں ایک دفع پھر ہوا ہے۔ انگریزی میں اُن کی خود نوشت سوانح عمری (جسے انگریزی کا جامہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے پہنایا ہے) شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب نے ملک کے سیاسی حلقوں میں ایک آگ لگا دی ہے۔ اداریے لکھے جا رہے ہیں، تنقیدیں شائع ہو رہی ہیں، بیانات دیے جا رہے ہیں، پریس کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں اور ریزولیوشن منظور کیے جا رہے ہیں۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ آزادی کے بعد کے ہندستان میں اب تک کسی کتاب نے لوگوں کے ذہنوں پر اتنے گہرے اثرات مرتب نہیں کیے تھے جتنے اس ڈھائی سو صفحات کی انگریزی کتاب نے کیے ہیں۔ روزنامہ ''اسٹیٹس مین'' دہلی کے ایک کالم نویس نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد موت کے بعد بھی اپنی روایتی جرأت اور خلوص سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔'' یہ موقع اس کتاب پر کسی تفصیلی تبصرے کا نہیں ہے لیکن شاید اتنا لکھنا بے موقع نہ ہوگا کہ اس کتاب میں مولانا نے بہت سے رازوں پر سے پردے اُٹھائے ہیں اور بہت سے بتوں کو ایک جنبش قلم سے سرنگوں کر دیا ہے۔ انھوں نے نہایت بے باکی اور صفائی سے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، راجہ جی اور مسٹر جناح کے بہت سے خیالات اور طرزِ عمل سے اظہار اختلاف کیا ہے لیکن اُس شرافت اور وسیع النظری کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے جو ان کی شخصیت کی ایک بیش بہا روایت بن گئی تھی۔ ایک حقیقی بڑے آدمی کی طرح انھوں نے خود اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ اُردو کے ایک بڑے نقاد کے الفاظ میں اس کتاب کے مطالعہ سے ایک مدبر کی حیثیت سے مولانا آزاد کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا ایک پہلو ایسا ہے جو اُن مسلمانوں کے لیے بالخصوص فخر اور مسرت کا باعث ہے جو مولانا آزاد کی قیادت اور اُن کی ذات سے عقیدت کو اپنی سب سے قیمتی متاع سمجھتے تھے۔ یعنی جب ملک کے سب نامی گرامی نیتا بلا استثنا ملک کی تقسیم پر ایمان لے

آئے تھے تو صرف ایک شخص ایسا تھا جو ملک کو اس تباہی سے ہم کنار کرنے کے لیے کسی بھی قیمت پر آمادہ نہیں تھا اور وہ شخص امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد تھے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کاملۃً۔ کیا اب بھی کسی بدطینت اور ضمیر فروش فرقہ پرست کی یہ ہمت ہوسکتی ہے کہ ہم پر ملک کے مفاد سے غداری اور اس کے ساتھ بے وفائی کا الزام لگا سکے؟

ہم جانتے ہیں کہ ۲۲رفروری کو ایک دفعہ پھر ملک کے مختلف حصوں میں مولانا آزادؒ کے ساتھ عقیدت کا اظہار اور ان کے کارناموں کی تعریف وتوصیف مختلف طریقوں سے کی جائے گی لیکن اصلی سوال اُن کے پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ مولانا آزادؒ نے اپنی وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے دہلی میں اپنی زندگی کی آخری تقریر اُردو کو اُس کا حق دلوانے کے لیے کی تھی لیکن کیا ایک سال گزر جانے کے بعد بھی اُردو کو اس کا حق مل سکا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے جو کہ یقیناً ہے تو یہ ہم سب کے لیے کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے۔ (دہ روزہ جمہور-علی گڑھ: ۲۴رفروری ۱۹۵۹ء، ص ۳)

(۲)

لیجیے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال اور بیت گیا اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو ہم سے جدا ہوئے پورے دو سال ہوگئے۔ سدا رہے نام اللہ کا! اس عرصے میں حضرت مولانا کی یاد قائم رکھنے کے لیے قوم اور حکومت دونوں ہی نے بہت کچھ کیا ہے۔ ثقافتی تعلقات کی ہندستانی کونسل (۱) نے ہر سال ان کے یومِ وفات پر ہندستان یا بیرونِ ہند کی کسی ممتاز شخصیت سے کسی ایسے موضوع پر تقریر کرانے کا سلسلہ شروع کیا ہے جو حضرت مولانا کو عزیز تھا۔ پچھلے سال اس سلسلے میں پنڈت نہرو نے ''ہندستان آج اور کل'' کے موضوع پر فاضلانہ تقریر فرمائی تھی۔ پچھلے سال ۲۲رفروری ہی کو انگریزی میں ایک یادگاری جلد شائع ہوئی جس میں ہندستان اور بیرونِ ہند کے ممتاز افراد نے حضرت مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان لوگوں میں جواہر لال نہرو، رادھا کرشنن، لارڈ پیتھک لارنس، لوئی ماسیون، مالکم میکڈانلڈ، ہوریس الیگزنڈر، راج گوپال اچاری، جے بی کرپلانی، سیّد محمود، ہمایوں کبیر، ایم سی چھاگلا، تارا چند، سعید نفیسی وغیرہ شامل

تھے۔ دورانِ سال میں ہندستانی پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں صدر جمہوریت نے حضرت مولانا کی شبیہہ کی نقاب کشائی فرمائی۔ اس موقع پر انھوں نے اور وزیر اعظم دونوں نے تقریر کرتے ہوئے حضرت مولانا کی شخصیت کو ''نایاب'' قرار دیا۔ صدر جمہوریہ ہند نے فرمایا کہ

''مولانا ایک عظیم رہنما تھے۔ ان کی زندگی پوری طرح قوم کے لیے وقف تھی۔ وہ ذاتی اغراض سے ہمیشہ ماورا رہے۔''

وزیر اعظم نے کہا:

''وہ جنگ آزادی کے دنوں میں (اپنے ساتھیوں کے لیے) روشنی کا ایک مینارہ تھے اور بعد میں جب ہندستان آزاد ہو گیا تو اپنے افعال اور عظیم کارناموں سے انھوں نے ملک کی شان و شوکت میں اضافہ کیا۔''

حیدر آباد میں حضرت مولانا کے نام سے مشرقی علوم کی تحقیق کی ایک اکاڈیمی قائم ہوئی ہے[۲] (اس سے پہلے ایسی اکاڈیمی پٹنہ میں قائم ہو چکی ہے جس کا ایک ہفتہ وار ترجمان بھی شائع ہوتا ہے)[۳] طے پایا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی نئی شاندار لائبریری کا نام ''ابوالکلام آزاد لائبریری'' ہوگا۔ اسی طرح ثقافتی تعلقات کی کونسل کی نئی عمارت دہلی میں ''آزاد بھون'' کے نام سے تعمیر ہو رہی ہے جس کا سنگ بنیاد صدر جمہوریہ ہند نے رکھا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے اقدامات حضرت مولانا کی یاد قائم رکھنے کے لیے کیے جا رہے ہیں اور ان کا سلسلہ صرف ہندستان ہی تک محدود نہیں ہے۔ روس میں اعلان ہوا ہے کہ وہاں حضرت مولانا کی خودنوشت انگریزی سوانح عمری کا روسی زبان میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ دہلی میں حضرت مولانا کا نہایت خوشنما مزار بھی تعمیر ہو گیا ہے جو مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

یہ تو جو کچھ ہوا بہت ٹھیک ہوا اور ہونا ہی چاہیے تھا لیکن ہمارے آپ کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا صرف اتنی کر کے قوم اور حکومت دونوں اس فرض سے سبک دوش ہو سکتی ہیں جو مولانا آزاد کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے۔ ہمارے خیال سے تو نہیں! اصل میں کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کے زندگی بھر کے پیغام پر عمل پیرا ہونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔ تو پھر کیا ایسا ہو سکا؟ کیا رشوت ستانی، خویش پروری، جانب داری، خودغرضی اور اسی طرح کی دوسری

خرابیوں سے ہمیں نجات مل سکی؟ کیا ملک کی سیاسی زندگی سے فرقہ پرستی کا قلع قمع کیا جاسکا؟ کیا ہندستان کی مختلف ریاستوں اور مرکز کے زیر اقتدار علاقوں میں اُردو کو اس کا جائز مقام مل سکا؟ کیا صوبہ پرستی، ذات برادری کا بھید بھاؤ اور آپسی کھینچا تانی دور ہو سکی؟ اگر ایسا نہیں ہو سکا اور یقیناً نہیں ہو سکا تو ہم مولانا آزاد کی یاد قائم رکھنے کا نام کس منہ سے لیتے ہیں؟ یہی تو وہ اعلیٰ اقدار ہیں جو حضرت مولانا کو عزیز تھے اور جن کے لیے انھوں نے اپنی بیش قیمت زندگی تج دی۔ کاش! ہم اب بھی اس طرف توجہ کر سکیں، تاکہ دوسری دنیا میں ان کی رُوح کو زیادہ سے زیادہ سکون وراحت حاصل ہو سکے!! (جمہور-علی گڑھ: فروری ۱۹۶۰ء، ص ۳)

حواشی

(۱) انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز (آئی سی سی آر)

(۲) ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ-حیدرآباد، ڈائریکٹر خواجہ محمد احمد (۱۹۶۰ء)

(۳) ابوالکلام اکادمی، پٹنہ، ترجمان ہفتہ وار الکلام، ایڈیٹر شاہد رام نگری (بہت تھوڑی زندگی پائی)

(۳)

۲۲ر فروری کا دن ہندستان کی تاریخ میں ہمیشہ رنج والم کے ساتھ یاد رکھا جائے گا، کیوں کہ یہی وہ دن ہے جب آج سے تین سال قبل ہندستان کا وہ عظیم فرزند جو علم وادب، دین وسیاست، فہم وفراست اور انسانیت وشرافت کا نیر تاباں تھا اور جسے دنیا امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کے نام سے جانتی تھی، ہمیشہ کے لیے خسوف میں آ گیا۔ ایک مولانا آزادؒ کے اُٹھ جانے نے بیک وقت اسلام، ہندستان، اُردو اور اسلامی علوم وفنون کو اتنا زبردست نقصان پہنچایا، جس کی تلافی مستقبل قریب میں ممکن نظر نہیں آتی ہے۔ وہ کیا گئے انسانیت اور شرافت کی بزم اُجڑ گئی اور فہم وفراست اور عقل ودانش کی شمع بجھ گئی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایک ذاتِ باری کے علاوہ ہر ایک کو فنا ہے اور مولانا اس کلیے سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتے تھے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے چلے جانے کے بعد بھی ان کا نام اور ان کے کارنامے زندہ رہتے ہیں اور دنیا انھیں اچھائی

سے یاد کرتی ہے۔ مولانا آزادؒ اس معاملے میں بہت خوش قسمت رہے کیوں کہ ان کے انتقال پر ملال پر ان کے اہل وطن نے جس طرح ان کا ماتم منایا اور ہندستان اور بیرونِ ہند کے اکابر نے جن الفاظ میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا، اس کی مثال کہیں مشکل ہی سے ملے گی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس تین سال کے عرصے میں جتنا مولانا کے بارے میں کہا گیا ہے اور جتنا ان پر لکھا گیا ہے، ان کے فکر و ذہن کے جن جن گوشوں سے نقاب اُٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے اوصاف و خصوصیات کو جس جس طرح اُجاگر کیا گیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

پچھلے سال مولاناؒ کے یومِ وفات پر ہندستان کے ثقافتی امور کی کونسل کی طرف سے برطانیہ کے مشہور و ممتاز مورخ مسٹر ٹوائن نے ''آزاد میموریل لکچرس'' کے سلسلے میں ''ہندستان اور دنیا'' کے زیر عنوان ۲۲ رفروری کو نئی دہلی میں دو لکچر دیے۔ اس موقع پر انھوں نے ہندستان کی روایتی رواداری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

''آج ہندستان نے جو ہندو اکثریت کا ملک ہے اپنے ایک ایسے عظیم ترین فرزند کی یاد میں جو مسلمان تھا مجھے جو ایک عیسائی اور انگریز ہوں تقریر کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندستان میں یہ نقطہ نظر پیدا کرنے میں خود ہندستان کے اس عظیم ترین فرزند کا کتنا حصہ تھا۔''

اسی تاریخ سے آل انڈیا ریڈیو دہلی نے مولانا کی یاد میں ایک ہفت روزہ اُردو پروگرام ''اُردو مجلس'' کے نام سے نشر کرنا شروع کیا۔ مولانا کا اُردو سے جو تعلق تھا اور اس پر ان کے جو احسانات تھے، ان کے پیش نظر یہ مولانا کی ایک اچھی یادگار ہے۔

دوران سال میں صدر جمہوریۂ ہند نے ثقافتی امور کی کونسل کی نئی عمارت ''آزاد بھون'' کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا کو ان الفاظ میں خراج عقیدت ادا کیا ''مولانا آزادؒ ثقافتی اور انسانی خصوصیات کا مجسمہ تھے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم محب وطن بلکہ ایک مفکر، انسانیت دوست اور فلسفی بھی تھے۔'' اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا:

''یہ ہندستان کی خوش قسمتی تھی کہ حصولِ آزادی کے بعد مولانا آزادؒ اس کے پہلے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ ان کا زاویہ نگاہ وسیع اور ذہن گہرا تھا۔

ان کی علمیت اتنی زبردست تھی کہ وہ انسان کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔
تاہم ان کے افعال واعمال انسانیت دوستی کے تابع تھے۔''

بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ''مولانا آزاد لائبریری'' کی شاندار عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے پنڈت جی (جواہر لال نہرو) نے فرمایا:

''مولانا نے زندگی بھر قدیم اور جدید قدروں کے درمیان ایک پل بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہماری آزادی کی انقلابی جدوجہد کے زمانے میں اپنے وقت کے سیاسی افکار پر زبردست اثر ڈالا۔''

اس سال کے دوران مولانا آزاد کی زندگی اور کارناموں پر تین نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم کی تصنیف ''ذکرِ آزاد'' جوان کے اور مولانا کے چالیس سالہ تعلقات کی بہت خوبصورت اور دلکش یادگار ہے، اور جس سے مولانا کی زندگی کے بہت سے نئے گوشے پہلی دفعہ لوگوں کی نظر کے سامنے آتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں سری نگر میں منعقدہ ''آزاد سمینار'' میں پڑھے گئے مقالات کا دلچسپ اور معلومات آفرین مجموعہ ''انوارِ ابوالکلام'' اور مولاناؒ کے قدیم عقیدت منداور اُن کے نظریات وافکار کے ترجمان مولانا محمد یونس خالدی لکھنوی کی ارادت مندانہ تصنیف ''روح آزاد'' انجمن ترقی اُردو (ہند) کے ادبی نقیب ''اُردو ادب'' کا خصوصی شمارہ طویل انتظار کے بعد اسی دوران میں نظر نواز ہوا جس میں کئی مضامین ایسے ہیں جو ابوالکلامیات میں قابل قدر اضافہ کہے جاسکتے ہیں۔ حال میں ''ماحول'' کراچی کا آزاد نمبر بھی شائع ہوا ہے جو ابھی ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ ''جمہور'' نے اپنی سابق روایت کے مطابق پچھلے سال بھی اپنا ''آزاد نمبر'' پیش کیا تھا اور اب پھر یہ شمارہ اسی ذات گرامی کے ساتھ منسوب ہے۔ ان کے علاوہ ہندستان اور پاکستان کے اُردو اور انگریزی جرائد میں مولاناؒ کے بارے میں متفرق مضامین کثیر تعداد میں برابر شائع ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں ماہ نامہ ''صبا'' حیدر آباد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو اکثر مولانا پر کچھ نہ کچھ شائع کرتا رہتا ہے۔

مہاراشٹر کے وزیر غذا سیّد غیاث الدین قاضی نے، ہتواڑے کے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکیم پیش کی جو مولانا آزادؒ کے نام سے منسوب ہے۔ اس اسکیم کا افتتاح اورنگ

آباد میں مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ شری وائی بی چوہان نے کیا۔ مرکزی وزارت تعلیم کے سابق سیکرٹری خواجہ غلام السیدین نے اندور اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں مولانا آزادؒ کے فلسفہ تعلیم پر گراں قدر مقالات پڑھے۔ علی گڑھ میں اپنا مقالہ پڑھنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ ''نئے ہندستان کے نظام تعلیم پر مولانا نے اپنی شخصیت کی جو زبردست چھاپ لگائی ہے ابھی اس کا عرفان بہت کم لوگوں کو ہے۔ یہ مقالہ یہی عرفان پیدا کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔''

غرض آزاد ہندستان اپنے اس عظیم فرزند کی یاد مختلف طریقوں سے تازہ رکھتا رہا اور اس کی روح کے حضور خراج عقیدت پیش کرنے کا کوئی موقع اس نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا اور ہونا ہی چاہیے تھا لیکن مولانا آزاد کی یاد قایم رکھنے کے لیے یہ کافی ہرگز نہیں ہے۔ ان کی یاد قائم رکھنے کا سب سے اچھا طریقہ تو یہ ہے کہ ان کے افکار و نظریات پر عمل پیرا ہونے اور ان کے ادھورے کام کو مکمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ آزاد ہندستان میں ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن تنگ نظری، علاحدگی پسندی اور دوسری سماجی برائیوں کا قلع قمع کرنا تھا۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس تین سال کی مدت میں ہم اس جانب کتنے قدم آگے بڑھے ہیں۔ جب تک ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہیں گے، مذہب، صوبہ اور زبان کے نام پر تنگ نظری اور علاحدگی پسندی کی آب یاری کی جاتی رہے گی۔ رشوت ستانی، بدعنوانی اور خویش پروری پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ فسادات اور بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی اور مولانا آزاد کی محبوب زبان اُردو کو اس کا صحیح مقام نہیں ملے گا۔ اس وقت تک یہ کہنا دُشوار ہے کہ ہم نے اس ملک میں مولانا کی یاد واقعی تازہ رکھی ہے اور ان کی روح کے حضور حقیقی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے افضال و اکرام کی بارش فرمائے۔ آمین!! (جمہور، آزاد نمبر (علی گڑھ): ۲۶ رفروری ۱۹۶۱ء، ص ۳، ۴)

(۴)

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو ہم سے رُخصت ہوئے چار سال ہو گئے۔ ان کی وفات سے ہماری قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ جب ملک

کسی نئے موڑ سے گزرتا ہے تو بے ساختہ ذہن میں مولانا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اگر اس وقت وہ بقید حیات ہوتے تو ہماری رہنمائی کس انداز سے فرماتے اور اس کے کیا نتائج نکلتے۔ حالیہ عام انتخابات کے موقع پر کانگریس کو جس اندرونی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا اور اس کی صفوں میں جو انتشار رونما ہوا اس نے مولانا کی کمی کا احساس اور بھی تیز کر دیا۔ یہ واقعہ ہے کہ کانگریس ہائی کمان میں دو ہی ایسے شخص تھے جو اس کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا کرتے تھے۔ ایک سردار پٹیل اور دوسرے مولانا آزاد اور اب ان دونوں کے اُٹھ جانے سے کانگریسی تنظیم کا یہ گوشہ بالکل خالی ہو گیا ہے۔

مولانا آزاد پر دادِ تحقیق و تنقید برابر دی جا رہی ہے اور ہر بڑے آدمی کی طرح ان پر بھی موافق و مخالف دونوں نقطہ نظر سے لکھا جا رہا ہے۔ اختلاف اگر مخالفت نہ بن جائے تو یقیناً قابل قبول ہونا چاہیے لیکن ان دونوں کی سرحدیں ایک دوسرے سے اتنی ملی ہوئی ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا بعض اوقات اچھے اچھوں کے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ انڈیا ونس فریڈم کی اشاعت کے بعد سے بعض حلقوں میں مولانا آزاد کی مخالفت کا طوفاں اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ جن میں پاکستان کے بعض مصنفین و ناشرین پیش پیش ہیں۔ انڈیا ونس فریڈم کے جواب میں کئی کتابیں پاکستان سے شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں جناب رئیس احمد جعفری اور جناب عبدالوحید لکھنوی کی تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں کتابیں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی انتہائی مضحکہ خیز کوشش کا حکم رکھتی ہیں۔ اسی طرح آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے مجلے ''العلم'' میں کیپٹن محمد ایوب خاں کا ایک طویل مقالہ قسط وار شائع ہو رہا ہے جس میں مقالہ نگار سنجیدہ تنقید کے درجہ سے ہٹ کر دشنام طرازی پر اُتر آئے ہیں۔ اس مقالے کے سلسلے میں ہندستان سے دو احتجاجی مراسلے بھی ''العلم'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک جناب ریاض الرحمٰن شروانی (مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ) کا اور دوسرا جناب عبداللطیف اعظمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی) کا لیکن اس کے باوجود مقالے کی اشاعت بدستور جاری ہے۔ جو ''العلم'' کے ہندستانی ناظرین کے لیے سخت تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔

مولانا کی وفات کے بعد ساہتیہ اکاڈمی (دہلی) نے مولانا کی تحریروں کی جمع و ترتیب کے

لیے ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی اور اس کمیٹی کی طرف سے ان تحریروں کی اشاعت کے پروگرام کا اعلان بھی ہو گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ان کا ایک مجموعہ بھی منصۂ شہود پر نہیں آیا ہے۔ کسی عظیم مفکر کی یاد تازہ رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ اس کے افکار کی نشر و اشاعت ہی ہو سکتا ہے۔ مولانا آزادؒ کے احسانات ہندستان پر اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی یاد قایم رکھنا ان کے اہل وطن کا پہلا فرض ہونا چاہیے۔ اگر ساہتیہ اکاڈمی نے اس بارے میں کوتاہی برتی تو وہ ایک بڑے جرم کی مرتکب ہوگی۔ جس کے لیے اسے موجودہ اور آیندہ نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

ہم مولانا آزاد کی چوتھی برسی کے موقع پر ان کی یاد میں دل کی گہرائیوں سے نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہیں کہ ان کے درجات بلند ہوں۔ آمین (۱)

(جمہور، آزاد نمبر، ۶ر و ۲۶ر فروری ۱۹۶۲ء، ص ۳)

۱- دس روزہ جمہور (علی گڑھ) کے فاضل مدیر مرحوم مولانا عبدالشاہد خاں شروانی (وفات: ۱۸ر فروری ۱۹۸۴ء) مرتب و مقدمہ نگار ''کاروان خیال'' و ''باغی ہندستان'' مولانا آزاد کے عاشق صادق تھے۔ سلسلے کا یہ آخری مضمون افضل بدر کے قلم سے ہے۔

باب ۲

سیاسی افکار و خدمات

فہرست مضامین

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت

عبدالسلام قدوائی

تحریک ترکِ موالات کے شباب کا زمانہ تھا۔ میری عمر اس وقت ۱۳ سال کے قریب رہی ہوگی، گاؤں گاؤں میں خلافت اور کانگریس کمیٹیاں قائم تھیں۔ گاندھی جی اور علی برادران کا نام بچے بچے کی زبان پر تھا، ان کے ساتھ دوسرے رہنماؤں کے نام بھی لیے جاتے۔ میرے ایک ماموں عبدالحی تھے وہ مولانا آزاد سے بہت عقیدت رکھتے تھے، اصل معتقد تو وہ علامہ شبلی کے تھے لیکن چونکہ انھوں نے مولانا آزاد کو مولانا شبلی کی مجالس میں اکثر دیکھا تھا، اور ان کی زبان سے بارہا تعریف و تحسین کے کلمات سنے تھے، اس لیے مولانا آزاد سے بھی ان کو بہت تعلق ہو گیا تھا۔ پھر جب الہلال نکلا تو اس کے مطالعے سے ان کی عقیدت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کے پُراثر مضامین اور سحر آفریں تقریروں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے، کبھی کبھی الہلال کے مضامین پڑھ کر لوگوں کو سناتے، بعض اوقات مجھ سے بھی پڑھواتے، اس زمانے میں میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ الہلال ٹائپ میں چھپتا تھا اور لوگ مشکل سے پڑھ پاتے تھے، لیکن میرا سابقہ ٹائپ سے اسکول میں اس طرح ہو چکا تھا کہ جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزی حکومت کی طرف سے ہفتہ وار لڑائی کا اخبار شائع ہوا کرتا تھا جو ٹائپ میں چھپا ہوتا تھا، جس دن اخبار آتا ہیڈ ماسٹر صاحب تمام لڑکوں کو جمع کرتے اور کسی لڑکے سے اخبار پڑھواتے، اس طرح مجھے ٹائپ میں چھپی ہوئی تحریروں کو پڑھنے کی مشق ہو گئی تھی، اس بنا پر ماموں صاحب مجھے اکثر الہلال دے کر سنانے کا حکم دیتے اس وقت میری تعلیمی استعداد زیادہ نہیں تھی اس لیے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ الفاظ کو پورے طور پر سمجھتا تھا لیکن مجموعی طور پر مولانا کے زورِ بیان کا اثر ذہن پر

ضرور پڑتا تھا۔ اس طرح مجھے بھی مولانا آزاد سے عقیدت پیدا ہوگئی اور تمنا ہونے لگی کہ ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو۔

اب میں لکھنؤ آ گیا تھا اور ندوہ میں پڑھنے لگا تھا، ایک دن غالباً اگست ۱۹۲۳ء میں معلوم ہوا کہ آج شام کو رفاہ عام کے ہال میں مولانا آزاد کی تقریر ہوگی۔ میں بہت خوش ہوا کہ دلی تمنا برآئی۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی جلسے میں پہنچ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریک ترک موالات کا اثر کم ہونے لگا تھا اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے بجائے اختلاف کی فضا بڑھتی جا رہی تھی، انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کامیاب ہو رہی تھی اور اتحاد و اتفاق کے نعروں کی بجائے ہر جگہ اختلافات کو ہوا دی جا رہی تھی، جا بجا فرقہ وارانہ فسادات بھی ہونے لگے تھے، تحریک آزادی کے رہنما اصلاحِ حال کی کوششیں کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سنہ بیس و اکیس کی متحدہ فضا پھر قائم ہو جائے لیکن فرنگی حاکموں نے اختلاف کی اس طرح تخم ریزی کی تھی کہ قومی رہنماؤں اور کارکنوں کی جدوجہد لا حاصل ہو رہی تھی اور سارے ملک میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس دن مولانا آزاد نے اسی موضوع پر تقریر کی اور داعیان اتحاد کو سمجھایا کہ اس صورتِ حال سے مایوس نہ ہوں، آزادی کی راہ میں ایسے پیچ و خم آتے رہتے ہیں، ایسے مواقع پر قوم پرور رہنماؤں اور کارگزاروں کو نا اُمیدی کی بجائے عزم و حوصلے سے کام کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کلکتہ کے ایک خاندان کا حوالہ دیا کہ تیس برس کی طویل جدوجہد کے بعد ان کے اختلافات ختم ہوگئے۔ پھر فرمایا کہ جب ایک خاندان کے درمیان صلح کرانے میں تیس برس صرف ہو سکتے ہیں تو قوموں اور ملکوں کا معاملہ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، مولانا کی تقریر بڑی پرزور اور موثر تھی اسے سن کر کارکنوں کی افسردگی دور ہوئی اور نئے جوش و ولولے کے ساتھ ملک میں اتحاد کی فضا قایم کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

مولانا شروع سے ہندستان کی آزادی کے علم بردار تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا کہ ''ایک چراغ جو روشن ہو کر پھر نہیں بجھتا وہ حریتِ صحیحہ کا چراغ ہے۔'' مسلمان ہندستان میں رہتے ہیں، ہندستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے جس کی بجا آوری لازم ہے۔ انھوں نے جس جوش و ایثار سے جنگ طرابلس و بلقان اور مسجد کانپور کے معاملے میں حصہ لیا تھا۔ اس

معاملے میں بھی اسی طرح حصہ لیں۔ انسانیت اور حق وعدل کے پرستاروں کے لیے امتیازِ این وآں نہیں ہے۔ مسلمانوں کا نصب العین خدمت عالم ہے۔ وہ انسانیت کے خادم ہیں ان کے لیے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔''

مولانا بار بار کہتے تھے کہ آزادی کی ہوائیں ہر طرف چل رہی ہیں اور غلام قوموں نے تہیہ کرلیا ہے کہ غلامی کے طوق وسلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے، یہ جذبہ نہ زور وقوت سے مٹ سکتا ہے اور نہ داد ودہش سے! آزادی کے متوالوں کو سیم وزر کے انبار متاثر کر سکتے ہیں نہ جاہ ومنصب کے وعدے انھیں راہ حق سے ہٹا سکتے ہیں۔ ظالم حکمرانوں کے مظالم کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق پر ہیں۔ قید وبند، دار ورسن یا کسی تشدد سے کبھی حریت پسند مرعوب نہیں ہوتے اور بالآخر وہ وقت آ گیا جب ظالموں کے تخت ہائے عظمت وجلال سرنگوں ہو گئے اور مظلوموں نے آگے بڑھ کر حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ حق وباطل کی کشمکش کا ہمیشہ یہی انجام ہوا ہے، ممکن ہے ظالموں کی رسّی کچھ عرصے کے لیے دراز ہو جائے لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب ظلم وستم کا خاتمہ ہو جائے گا، ظالم فنا ہو جائیں گے اور عدل ومساوات کا دور دورہ ہوگا۔

ایک موقعے پر مسلمانانِ ہند کو مخاطب کر کے انھوں نے فرمایا: ''جو سیاسی دور چند سال پیشتر تک تھا وہ گزر چکا ہے۔ اب اس کی واپسی کی توقع فضول ہے، کسی شخص یا جماعت کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ آزادی کی تحریک کو روک دے۔ آزادی تو حاصل ہو کر رہے گی جس کا جی چاہے اُس کے وابستگان کی فہرست میں اپنا نام درج کرائے اور جس کا جی چاہے مخالفت کی بدنامی مول لے، فتح وکامرانی آخرکار آزادی کے طلبگاروں ہی کو ہوگی۔''

تحریک آزادی کی مخالفت میں برطانوی حکومت کے اشارے سے مذہبی حربہ استعمال کیا جا رہا تھا اور مذہبی فرقوں کو ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کر کے لڑانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ وطن دوستی اور قوم پروری کے خلاف نام نہاد پیشوایانِ مذہب احکام جاری کر رہے تھے لیکن مولانا نے ہمیشہ اس طرح کی تمام غلط بیانیوں کا پردہ فاش کیا اور ان غلط کار اشخاص کی غلطی واضح کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ''آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ کوئی مذہب اپنے پیرووں کو

اس حق سے محروم نہیں کرسکتا۔" انھوں نے خاص طور سے مسلمانوں کو تلقین کی کہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد تمھارا دینی فرض ہے اور یاد دلایا کہ ظلم واستبداد کو مٹا کر دنیا میں عدل ومساوات کو فروغ دینے کے لیے تم نے کیسی عظیم الشان جدوجہد کی ہے۔ تم نے دنیا کو جمہوریت صحیحہ کا چہرہ دکھایا تھا، پھر آج یہ لیت ولعل کیوں ہے۔

اسلام اور نیشنلزم کے عنوان سے الہلال (دور جدید) میں ایک طویل مضمون لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ اسلام اور نیشنلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ وہ ہندستانی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کے لیے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اسلام کا حکم ہے۔

رام گڑھ کے خطبہ صدارت میں وضاحت سے بتایا کہ وطنیت اور اسلامیت کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ ایک مسلمان اپنی اسلامیت پر فخر کے ساتھ اپنے ہندستانی ہونے پر بھی فخر کرسکتا ہے۔ جن لوگوں نے غور سے مولانا کی تحریریں نہیں پڑھی ہیں وہ الہلال والبلاغ کے ابوالکلام اور کانگریس کے صدر ابوالکلام کو ایک دوسرے سے مختلف سمجھتے ہیں لیکن اگر مولانا کا سارا لٹریچر وہ غور سے پڑھیں تو انھیں ان کی زندگی میں نہ تضاد نظر آئے گا، نہ اختلاف بلکہ شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ ان پر چھایا ہوا محسوس ہوگا، مولانا کے یہاں دین ودنیا اور مذہب وسیاست علاحدہ علاحدہ خانے نہیں تھے، ان کی سیاست بھی مذہب ہی کی راہ سے آئی تھی، وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں اس لیے لگے تھے کہ ان کے نزدیک یہ اسلام کی تعلیم کا تقاضا تھا وہ حکومت وسیاست کا کام ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

اسلام استبداد کو ناپسند کرتا ہے وہ کسی ایسے اقتدار کو گوارا نہیں کرسکتا جس سے خدا کے بندے آزادی کی نعمت سے محروم ہو کر غلامی میں مبتلا ہو جائیں۔ عہد فاروقی میں کسی حاکم نے اپنے ماتحتوں پر کچھ بے جا سختی کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"اللہ نے تو ان لوگوں کو آزاد پیدا کیا تھا تم نے انھیں غلام کب سے بنا لیا"

حضرت عمر کا یہ حریت آفریں قول ہمیشہ مولانا آزاد کے سامنے رہتا تھا اور وہ ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے تھے اور جہاں کہیں انسانیت غلامی کے شکنجے میں گرفتار نظر آتی تھی وہ بے چین ہو جاتے تھے وہ جس طرح ہندستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے، اُسی طرح دنیا

کے تمام ملکوں اور قوموں کی آزادی کے خواستگار تھے۔ ایران ہو یا افغانستان، مصر ہو یا ترکی کہیں انھوں نے جابر حکمرانوں کو معاف نہیں کیا۔ وہ جس زور و شور سے برطانوی سامراجیت کے خلاف اظہار خیال کرتے تھے اسی قوت و شدت کے ساتھ سلطان عبدالحمید ناصر الدین قاچار، شریف حسین اور ان کے اعوان و انصار کے خلاف بیان دیتے تھے اور جو لوگ اس ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے ان کی تائید اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ اسی نقطہ نظر کے ماتحت انھوں نے سیّد جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سعد زغلول، مصطفیٰ کامل، عبدالعزیز ثعالبی وغیرہ علمبرداران حریت و استقلال کی حمایت کی۔ مولانا کی تمنا تھی کہ دنیا کے تمام مظلوم ظالم حکمرانوں سے نجات پائیں، ان کی غلامی کی زندگی ختم ہو اور وہ آزادی کی فضا میں سانس لیں۔ حق و باطل کے معرکے میں مولانا ہمیشہ حق کی جانب رہتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ باطل کے پاس خواہ کتنا ہی ساز و سامان ہو، کیسے ہی دولت کے ڈھیر ہوں، کتنی ہی طاقتور فوجیں ہوں اور ہلاکت خیز اسلحہ کے کتنے ہی انبار ہوں لیکن اس کی قسمت میں ناکامی و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں اور حق کے لیے بے سروسامانی کے باوجود فتح و کامرانی مقدر ہے۔ وہ سمجھتے تھے الحق **یعلو ولا یعلی علیه** حق میں خود سربلندی کی صلاحیت ہے، اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تاریخ کے اوراق کھلے ہیں جس کا جی چاہے حق و باطل کی کشمکش و انجام دیکھ لے۔ بعض اوقات باطل اس ساز و سامان کے ساتھ میدان میں آیا کہ نگاہیں خیرہ ہو گئیں، لیکن حق کی ایک ہی ٹکر نے اسے چور چور کر دیا۔ تاریخ کے علاوہ قرآن مجید کے مطالعے نے بھی ان کے اس یقین و اذعان میں اضافہ کر دیا تھا۔ قرآن مجید نے اقوام و ملل کے سرگزشت بڑی وضاحت سے بیان کی ہے اور حق و باطل کی رزم آرائیوں کے پراثر واقعات سنائے ہیں اور بتایا ہے کہ حق جب سامنے آ جاتا ہے تو باطل کو فرار پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ حق کی ضرب سے باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے اور وہ فنا کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو دیکھ کر فرعون کہتا تھا کہ میں مصر کا فرماں روا ہوں، میرے مقابلے میں یہ مہین (بے حیثیت) جسے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے، کیسے غالب آ سکتا ہے اور طاقت سے مرعوب درباری اور مصاحب تائید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ دم بھر میں انھیں پیس کر رکھ دیں گے، لیکن پھر کیا

ہوا صاحب تاج وتخت فرعون اور اس کے حمایتی فنا ہو گئے اور بے حقیقت اسرائیلی ساری مملکت کے مالک ہو گئے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ انگریز مغلوب ہو سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے جن کے پاس لاتعداد فوجیں ہیں، عظیم الشان جنگی بیڑا ہے، کثیر التعداد ہوائی جہاز اور بیشمار اسلحہ ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ نہتے ہندستانیوں سے شکست کھا جائیں گے۔ لیکن مولانا تاریخ عالم اور صحف سماوی کی روشنی میں یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کا سارا جاہ وجلال دھرا کا دھرا رہ جائے گا اور ایک دن بے سرو سامانی کے باوجود ہندستانی غالب آجائیں گے۔ لوگ کہتے تھے کہ شیشہ وسنگ کے تصادم میں شیشہ چور چور ہو جائے گا لیکن مولانا فرماتے تھے کہ حق کی طاقت شیشہ کو وہ قوت عطا کرے گی کہ اس سے ٹکرا کر پتھر کیا لوہا بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ چند ہی برس میں مولانا کی دور بینی اور روشن ضمیری عیاں ہو گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ باایں ہمہ جاہ وجلال اور عظمت و جبروت انگریزی حکومت سرنگوں ہو گئی اور یونین جیک کی جگہ قومی جھنڈا لہرانے لگا۔

مولانا کی خواہش تھی کہ ہندستان کی تمام قومیں متحد رہیں اور انگریزوں کے جانے کے بعد سب مل جل کر حکومت کا انتظام سنبھالیں لیکن ساحرانِ فرنگ نے کچھ ایسا افسوں پھونکا کہ وہ حقایق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ عقل دور بین جذبات کے وقتی پردوں میں دب گئی۔ ظنون و اوہام نے اعصاب کو مجہول کر دیا اور تابناک مستقبل پر خوف کا ایسا [illegible] گیا کہ ایک گروہ نے علاحدگی ہی میں عافیت محسوس کی۔ مولانا نے بہت سمجھایا، مستقبل کے نقشے کھینچ کر دکھائے اور اطمینان دلانے کی پوری کوشش کی مگر فرنگیوں کا جادو کسی طرح نہ اُترا اور ایک چھوٹا سا حصہ ملک سے الگ ہو ہی گیا۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء میں مولانا کسی کام سے لکھنؤ آئے تھے، کارلٹن ہوٹل میں قیام تھا، خبر ملی تو میں بھی ملاقات کے لیے گیا۔ صبح کا وقت تھا اطلاع کرائی تو بلا لیا کچھ اور اشخاص بھی آ گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ میری عادت تھی کہ سیاسی معاملات کے بجائے علمی مسائل پر گفتگو کرتا تھا۔ قرآن مجید پر مولانا کی نظر بہت گہری تھی۔ زیادہ تر اسی کے متعلق سوالات کرتا تھا اور مشکل آیات کے بارے میں ان کا نقطہ نظر معلوم کرتا تھا، لیکن فضا ایسی سیاست آلود تھی کہ دوسرے

لوگوں نے مجھے اس کا موقع نہ دیا اور ملک کے موجودہ حالات، اُن کے علل واسباب اور مستقبل کے امکانات پر گفتگو چھیڑ دی۔ مولانا نے صورت حال سمجھائی، مسلم لیگ کے شبہات کا ذکر کیا، کانگریس کے نقطہ نظر کی تشریح کی اور اپنی وہ تجاویز بتائیں جن پر عمل کر کے ملک تقسیم سے بھی محفوظ رہ سکتا تھا۔ مسلمانوں کو جو خطرات محسوس ہوتے تھے ان کا سد باب بھی ہو سکتا تھا اور اکثریت واقلیت دونوں ایک ہی ملک میں امن واطمینان کے ساتھ رہ سکتی تھیں اور ملک کا انتظام بھی حسن وخوبی کے ساتھ چل سکتا تھا۔ یہ پلان بہت واضح اور اس کے فوائد نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے، لیکن عقلیں کچھ اس طرح پروپیگنڈے کا شکار تھیں کہ ایک صاحب نے کہا مولانا! یہ تدبیریں کافی نہیں ہیں موجودہ حالات میں تقسیم ناگزیر ہے۔ مولانا نے فرمایا آپ کی تجویز اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ تقسیم کے عمل جراحی سے ملک کو جو صدمہ پہنچے گا وہ تو پہنچے ہی گا لیکن ملک کے باشندوں کے سر پر بھی ایسی قیامت گزر جائے گی جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کروڑوں آدمی گھر سے بے گھر ہو جائیں گے۔ اربوں کی جائیداد تباہ ہو جائے گی، تجارت وکاروبار تہس نہس ہو جائے گا اور وہ خون خرابہ ہوگا جس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آج مسلمانوں کو جو سبز باغ دکھایا جا رہا ہے آیندہ کہیں اس کا پتا نہیں ہوگا اور اسلامی حکومت کا جو خواب وہ دیکھ رہے ہیں جب آنکھ کھلے گی تو اس کی تعبیر معکوس نظر آئے گی۔ اس وقت یہ ایسے جوش کے عالم میں ہیں کہ اپنے دوستوں اور خیر خواہوں کو نہیں پہچانتے ہیں لیکن کل جب اس کے ہولناک نتائج ان کے سامنے آئیں گے تو انھیں ہوش آئے گا کہ کتنی بڑی غلطی انھوں نے کی ہے۔ اس وقت جو لوگ بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے ہیں اور ان کی تائید و نصرت اور حفاظت واعانت کا اعلان کرتے ہیں کل ان کا کہیں پتا نہیں ہوگا۔ وہ انھیں جہنم کے حوالے کر کے جنت کی ہوا کھا رہے ہوں گے۔ افسوس ہے کہ مسلمان مخلص وخود غرض اشخاص کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔ کاش انھیں نظر آ جاتا کہ لوگ ان کی لاشوں پر اپنے محل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی، کروڑوں اشخاص تباہ و برباد ہو گئے، جان و مال اور عزت وآبرو کی ایسی بربادی ہوئی کہ جس کا کبھی کسی نے تصور بھی نہ کیا تھا! اور وہ

خوں ریزی ہوئی کہ الامان والحفیظ! پھر اس ساری تباہی کے باوجود کچھ حاصل نہ ہوا۔ اسلامی حکومت کا کیا ذکر پائیدار، مستحکم اور پرامن حکومت کے لیے بھی سرحد پار کے لوگ ترس گئے۔ اسلام پسندوں کا جو حشر ہوا اس کی سرگزشت بڑی ہی عبرت انگیز ہے۔ حریت نوازوں کا حال بھی عیاں ہے۔ تقسیم کی حمایت میں اعلان کیا جاتا تھا کہ اس سے مسلمانوں کا ایک وطن بن جائے گا۔ اس غرض سے ہندستان کے گوشے گوشے سے مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان کا رُخ کیا لیکن آج ان مہاجروں سے پوچھیے کہ یہ سودا کتنا گراں پڑا، جن کی تائید و نصرت کے بھروسے پر وطن ترک کیا تھا۔ ان کی نصرت کی اُمید موہوم ثابت ہوئی۔ زبان، تہذیب اور نسل وخون کے جھگڑے اس شدت سے اُٹھے کہ کبھی ہندستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بنگالی بہاریوں کے دشمن ہو گئے۔ سندھی، یوپی والوں سے خار کھانے لگے۔ تقسیم نے پھر تقسیم در تقسیم کی شکل اختیار کی۔ مشرقی بنگال سے جان بچا کر بھاگنا مہاجروں کو دشوار ہو گیا۔ اس کے باوجود ہنوز اطمینان نہیں ہے اور مستقبل مزید خطرات سے لبریز نظر آتا ہے۔

آج مولانا یاد آتے ہیں اگر ان کا مشورہ مان لیا گیا ہوتا اور تقسیم کے بجائے ان کا متحدہ ہندستان کا پلان تسلیم کر لیا جاتا تو برصغیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور دو عظیم الشان قوموں کے اتحاد سے سارے عالم کی قومیں اتحاد کے مضبوط رشتے میں منسلک ہو جاتیں اور ساری دنیا آفات و مصائب کے بجائے اخوت ومحبت اور امن وسکون کی فضا میں ترقی کی منزلیں طے کرتی۔

۱۹۷۴ء کے موسم حج میں کچھ ہندستانی اور پاکستانی احباب مکہ معظمہ میں اکٹھے تھے۔ ماضی قریب کے واقعات پر تبصرہ ہونے لگا اس موقع پر ایک مؤرخ دوست نے فرمایا کہ تاریخ قوموں کی غلطیوں کا فیصلہ صدیوں میں کرتی ہے لیکن ہندستان کی تقسیم کی غلطی ۲۵ برس کے اندر ہی واضح ہوگئی۔

اس غلطی کے اعتراف کے بعد مولانا آزاد کی دوربینی اور سیاسی بصیرت کا اعتراف لازمی تھا۔ سب کے دل ان کی عظمت کے احساس سے لبریز تھے۔

ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت

پروفیسر عابد پشاوری

مولانا آزاد اُن نابغہ روزگار ہستیوں میں سے تھے جن کے لیے فلک برسوں آہیں بھرتا ہے۔ جن دیدہ وروں کے انتظار میں نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔ یہ جس طرف جھک پڑے تاریخ سازی کا کارنامہ انجام دیا، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں خود جن کے لیے تاریخ لکھی جاتی ہے۔ ہر راہ میں اُن کے نقشِ قدم موجود، ہر میدان میں یہ سرگروہِ لشکر خواہ۔ وہ ادب ہو، دین ہو، صحافت ہو یا سیاست ہو! اخبار نکالا تو صحافت کو نئے آفاق سے آشنا کیا، ادب کی طرف جھکے تو اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا، دین کی طرف رُخ پھیرا تو ترجمان القرآن جیسا عدیم المثال کارنامہ یادگار چھوڑا اور میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو بڑے بڑے سیاسوں کے دلوں پر اپنی دیدہ وری کا سکہ بٹھا دیا۔ اُن کی سیاسی بصیرت کا جائزہ لینے کے لیے ہندستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ لکھنا پڑے گی۔ اس مختصر مقالے میں تو صرف چند اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے بعض حضرات کو میرے خیالات یک طرفہ محسوس ہوں۔ لہٰذا یہاں اس امر کا اعتراف کر لینے میں کوئی قباحت نہیں کہ موضوع میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ تاہم حتی الامکان میں نے اُس سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے (اس کے باوجود کامیابی وناکامی کے داد و بے داد کے مستحق برادرِ بزرگ ڈاکٹر خلیق انجم ہیں) البتہ گوناگوں مصروفیات، خرابی صحت اور ہجومِ افکار نے اتنا مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دی جیسا کہ حق ہے۔ چناں چہ اس مقالے کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے، ان میں بیشتر مولانا آزاد کی اپنی تحریریں یا تقریریں ہیں یا پھر اُن کے مداحوں کی لکھی ہوئی

اُردو کتابیں۔ انگریزی کتابیں فراہم کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ بہرحال اپنے مطالعے کا نچوڑ سطورِ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

پہلی بات جو ان کی سیاسی بصیرت کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے خاصی کم سنی میں اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کو جدوجہد آزادی کے قومی دھارے میں کھینچ لانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت تک مسلمانوں کی قیادت علی گڑھ سے متاثر پارٹیوں کے ہاتھوں میں تھی، جن کا مقصد سرسیّد کے اُس خواب سے کچھ مختلف نہیں تھا جس میں وہ مسلمانوں کو سوٹ بوٹ پہنے جنٹل مین بنے گھومتے دیکھتے تھے۔ بقولِ آزاد جن کا عقیدہ تھا ''مسلمانوں کو برطانوی تاج کا وفادار اور قومی تحریک سے الگ اور بے تعلق رہنا چاہیے۔'' مولانا اس صورتِ حال کو خطرناک خیال کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر مسلمان سیاسی تحریک سے الگ تھلگ رہے تو ہندستان کی آزادی کا خواب بے تعبیر رہے گا۔ چناں چہ اُن کا پہلا اور بڑا کام تھا مسلمانوں کو سیاسی تحریک کے قومی دھارے میں شامل کرنا اور آخر تک یہی کام کرتے رہے۔

اب سوال تھا کہ یہ مشکل کام کیسے کیا جائے اور طریق کار کیا ہو؟ تن تنہا کروڑوں انسانوں کو اپنا ہم خیال بنا لینا نہ سہل ہے اور نہ بچوں کا کھیل۔ مولانا سہل پسند تھے بھی نہیں ورنہ زندگی بھر آرام سے والد کے سجادے پر بیٹھتے اور ہزاروں لوگ دست بوسی بلکہ قدم بوسی کو موجود تھے۔ چنانچہ جب ایک بار انھوں نے اپنا رستہ منتخب کر لیا تو بے محابا نکل کھڑے ہوئے اور پھر بہ قولِ مجروح:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اُن کے لیے کارواں سازی کا پہلا موقع لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کی تجویز نے فراہم کیا۔ مولانا بنگال کے انقلابیوں سے ملے۔ رفتہ رفتہ اُن سے قریب ہوئے۔ انگریزوں کے رویے کے سبب شروع شروع میں وہ مسلمانوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مولانا نے انھیں یقین دلانا چاہا کہ مسلمان من حیث الجماعت اُن کے دشمن نہیں ہیں۔ اگر کوشش کی جائے

تو مسلمان جدوجہد آزادی میں شریک ہو جائیں گے۔ مولانا نے انھیں سمجھایا اگر مسلمان تحریک کی مخالفت میں سرگرم یا سیاسی تحریک سے بے تعلق بھی رہے تو آزادی کا حصول دشوار ہو جائے گا۔ اس لیے (انقلابیوں کو) ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اس جماعت کی تائید اور دوستی حاصل کریں۔ ابتداءً انقلابیوں کو یقین نہ دلایا جاسکا کہ مولانا کی سیاسی تشخیص صحیح ہے، لیکن رفتہ رفتہ کچھ انقلابی اُن کے ہم خیال ہو گئے۔ اب مولانا نے مسلمانوں میں کام کرنا شروع کیا اور نوجوانوں کی ایک جماعت کو اپنا ہم خیال بنالیا یا یوں کہیں کہ سیاسی منصوبوں کی ذمے داریاں اُٹھانے کے لیے تیار کرلیا۔ البتہ مولانا یہ محسوس کرتے تھے کہ انقلابیوں کا دائرۂ کار یا جولان گاہ بہت محدود ہے۔ ان کی سرگرمیاں صرف بنگال اور بہار (جو اُن دنوں بنگال ہی کا حصہ تھا) تک محدود تھیں۔ مولانا نے انھیں اپنا میدان وسیع کرنے کا مشورہ دیا۔ حسب سابق انھوں نے مولانا کا مشورہ نہیں مانا لیکن رفتہ رفتہ مولانا نے انھیں قائل کرلیا اور پھر دو سال کے اندر اندر ملک کے مختلف علاقوں میں انقلابیوں کی خفیہ انجمنیں قائم ہوگئیں۔

اسی زمانے میں مولانا نے عراق و مصر و ترکی کا سفر کیا۔ وہاں بھی انھوں نے انقلابیوں اور ینگ ٹرکس سے تعلقات پیدا کیے۔ بہ قول خود ''وہاں کے انقلابیوں کو اس امر پر حیرت تھی کہ ہندستان کے مسلمان قومی تحریک سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ہندستان کی آزادی میں رہنمایانہ حصہ لینا چاہیے'' چناں چہ مولانا اس سفر سے یہ عزم لے کر لوٹے کہ وہ مسلمانوں کو بیدار کریں گے۔ اُس کا واحد طریقہ تھا اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانا اور اس مقصد کے لیے اخبار سے زیادہ مؤثر ذریعہ اور کوئی نہیں۔ چنانچہ ''الہلال'' کا اجرا اسی سفر کی دین ہے۔

ہندستان میں اُس وقت سب سے زیادہ اخبار یوپی اور پنجاب سے نکلتے تھے لیکن مولانا ان کے صوری و معنوی معیار سے کچھ خوش نہیں تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اُن کا اخبار بجائے لیتھو کے ٹائپ میں نکلے۔ چناں چہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے الہلال پریس قائم کیا اور وسط ۱۹۱۲ء سے ''الہلال'' جاری ہو گیا۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ''الہلال'' نے چند ہی دن میں وہ مقبولیت حاصل کرلی جو کسی اور جریدے کو حاصل نہیں تھی۔ اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ تین ماہ کے

اندر تمام ابتدائی نمبروں کو دوبارہ شائع کرنا پڑا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ مولانا نے اس امر کا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ مسلمانوں کے دل میں مذہب ہی کے راستے اُترا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ''الہلال'' کا معتد بہ حصہ اسی مقصد کے لیے وقف تھا۔ اس سے ''الہلال'' کی مقبولیت کے ساتھ اس کے دشمنوں میں اضافہ ہوا۔ بہ قول مولانا آزاد ''اس وقت مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی علی گڑھ پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ جس کے اراکین سرسیّد کی پالیسی کے امین تھے۔ ان کا بنیادی عقیدہ تھا مسلمانوں کو برطانوی تاج کا وفادار اور قومی تحریک سے الگ اور بے تعلق رہنا چاہیے۔ ''الہلال'' کی دعوت کو انھوں نے اپنے وقار کے لیے خطرہ سمجھا۔ انھوں نے نہ صرف ''الہلال'' کی مخالفت شروع کر دی، بلکہ ایڈیٹر کے بھی دشمن ہو گئے اور اُسے قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ ''الہلال'' کی مقبولیت صرف ایک مخصوص طبقے کو ہی نہیں کھٹکتی تھی بلکہ حکومت بھی اس کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی تھی۔ چنانچہ ضمانتیں طلب اور ضبط ہونے لگیں اور آخر ۱۹۱۵ء میں پریس ہی ضبط ہو گیا۔ پانچ ماہ کے وقفے کے بعد مولانا نے ''البلاغ'' جاری کیا۔ حکومت کو یہ بھی پسند نہ آیا۔ بار بار ضمانتیں طلب اور ضبط کرنے میں حکومت کے وزن و وقار کو بھی دھکا لگتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ہی بار اپنا لوہاری ہتھوڑا چلا دیا اور ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت ایڈیٹر ہی کو کلکتہ بدر کر دیا۔ مولانا نے رانچی (بہار) کو اپنا مستقر بنا لیا۔ حکومت کو ان کی آزادی بھی نہ بھائی۔ کچھ ہی مدت گزری تھی کہ مولانا آزاد کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ ماہ نظر بندی میں گزرے۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا رہا ہوئے۔ اسی زمانے میں خلافت تحریک کا آغاز ہوا۔ اگرچہ مولانا نے وفد میں شرکت نہیں کی لیکن تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے خیال میں اب معاملہ وفود اور عرض داشتوں سے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تجویز پیش کر دی۔ بہ قول خود مولانا آزاد ''الہلال کے بعض مضامین میں خود اس قسم کا پروگرام پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ میرٹھ کے جلسے میں جب مہاتما گاندھی نے عدمِ تعاون کی تحریک پیش کی۔ مولانا نے غیر مشروط طور پر اُن کی تائید کی۔ اگرچہ ابھی بعض لیڈر متامل تھے۔ البتہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور کے اجلاس میں دوسرے لیڈر بھی

گاندھی جی سے متفق ہو گئے اور ایک بار پھر وہی گرفتاریوں کا چکر چل نکلا۔ چنانچہ سب سے پہلے اسیر ہونے والوں میں مسٹر سی آر داس اور مولانا آزاد تھے۔ جب تک مولانا آزاد رہا ہوں تب تک کونسل کی ممبری کے سوال پر کانگریس میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ سی آر داس، موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں وغیرہ نے سوراج پارٹی قائم کر لی۔ رہائی کے بعد مولانا دونوں دھڑوں میں مفاہمت کی کوششوں میں لگ گئے اور ۱۹۲۳ء کے اسپیشل سیشن میں سمجھوتا ہو گیا۔ مولانا کو اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا۔ مولانا کی عمر اس وقت ۳۵ برس کی تھی اور بقول بعض وہ اُس وقت تک کے منتخب ہونے والوں میں سب سے کم عمر صدر تھے۔

اُس دور میں حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ نمک کا قانون بنا تو گاندھی جی نے اُس کے خلاف آندولن چھیڑ دیا۔ چناں چہ پھر سب لیڈر گرفتار ہو گئے۔ گاندھی اِرون سمجھوتا ہوا تو سب کو رہائی ملی۔ حکومت نے گول میز کانفرنس بلائی جو ناکام ہوئی۔ گاندھی جی پھر گرفتار ہو گئے۔ حکومت کی سختیاں بڑھنے لگیں۔ اسی دوران میں قانونِ حکومت ہند کا نفاذ عمل میں آیا اور صوبوں کو خود مختاری دینے کا اعلان ہوا لیکن کانگریس کا ایک قومی حصہ انتخابات کا مخالف تھا۔ اس کے برعکس مولانا انتخابات کے بائیکاٹ کے خلاف تھے۔ اُن کا خیال تھا اس طرح مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں پر ناپسندیدہ عناصر قابض ہو جائیں گے اور قوم کے نمائندے بن بیٹھیں گے جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ البتہ انتخابات میں شرکت سے عوام کی سیاسی تربیت ہو سکے گی۔ آخرش مولانا کا نقطۂ نظر غالب رہا۔ کانگریس نے انتخابات میں حصہ لیا اور پنجاب اور سندھ کے سوائے ہر جگہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔

اب کانگریس میں نئے اختلافات شروع ہو گئے۔ اکثر زعماء کا خیال تھا کہ کانگریس کو عہدے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کے خیال میں صوبہ جاتی خود مختاری ایک ڈھکوسلا تھی۔ سارے اختیارات گورنر کے ہاتھ میں تھے۔ اُن کے برعکس مولانا کی رائے تھی کہ صوبہ جاتی حکومتوں کو جو اختیارات دیے گئے ہیں اُن سے پورا فایدہ اُٹھانا چاہیے اور جب گورنر کے اختیارات سے تصادم ہو تو مناسب وقت کارروائی کرنی چاہیے۔ اختیارات (خواہ محدود ہوں) سے کام لیے بغیر کانگریس کے پروگرام پر عمل نہیں ہو سکے گا۔ دوسری طرف اگر کسی اختلافی مسئلے

پر کانگریسی وزارتوں کو، جس میں قوم کی ہمدردی اُن کے ساتھ ہوگی، استعفیٰ دینا پڑا تو اُس سے قوم کے ذہن پر کانگریس کا تسلط اور بھی بڑھ جائے گا، لیکن ادھر تو کانگریس اپنی اُدھیڑ بن میں تھی اُدھر گورنر نے اُسے متامل دیکھا تو غیر کانگریسی پارٹیوں کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی۔ اس سے وائسرائے پر کانگریس کی آپسی پھوٹ بھی واضح ہوگئی۔

پنڈت نہرو نے اُس زمانے میں عہدے قبول کرنے کے خلاف اظہارِ خیال کیا تھا۔ لہٰذا اُن کے لیے اب یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ عہدے قبول کر لینا چاہیے۔ چناں چہ جب واردھا میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور حقیقت کے اعتراف میں مولانا نے لیڈروں کو پس و پیش میں مبتلا دیکھا تو غیر مبہم الفاظ میں تجویز کیا کہ کانگریس کو عہدے قبول کر لینا چاہیے۔ اس گفتگو کے بعد گاندھی جی بھی مولانا سے متفق ہو گئے اور کانگریس نے صوبوں میں وزارتیں بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۲۱ء میں برطانوی ولی عہد ہندستان آیا تو اُس کے استقبال کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ کانگریس کے تقریباً سب لیڈر جیل میں تھے۔ البتہ مدن موہن مالوی وائسرائے سے ملے تو یہ تاثر لیا کہ اگر اس وقت حکومت کی بات مان کر اُس کا بائیکاٹ نہ کیا جائے تو حکومت ایک گول میز کانفرنس بلائے گی۔ مالوی جی، سی آر داس اور مولانا آزاد سے علی پور جیل میں ملے۔ انھوں نے لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا جو حکومت نے مان لیا لیکن جب مالوی جی مہاتما گاندھی کے پاس گئے تو انھوں نے یہ شرط رکھی کہ پہلے سب لیڈر رہا کر دیے جائیں اُس کے بعد وہ گول میز کانفرنس کی تجویز پر غور کریں گے۔ لہٰذا کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا۔ بائیکاٹ نہ صرف برقرار رہا بلکہ بہت کامیاب رہا۔ البتہ اُس کے بعد بمبئی اجلاس میں گول میز کانفرنس کی بات اُٹھائی تو وقت گزر چکا تھا اور حکومت نے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اسی زمانے میں چوری چورا کے حادثے سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک معطل کر دی۔ ملک میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ گاندھی جی پھر گرفتار ہو گئے اور انھیں چھ برس کی سزا ملی۔ نتیجے میں عدم تعاون کی تحریک دم توڑ گئی۔

کانگریس نے ۱۹۲۱ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ مسٹر سی آر داس کی رائے تھی کہ اب

کانگریس کو ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں قانون ساز مجلسوں پر قبضہ کرنے کی تیاری کرنی چاہیے اور انھیں ملک کے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ پنڈت موتی لال نہرو، وٹھل بھائی پٹیل اور حکیم اجمل خاں بھی مسٹر داس کے ہم خیال تھے۔ اس سے مسٹر داس کو بہت تقویت ملی۔ انھوں نے سوچا کہ دوسرے کانگریسی لیڈر بھی ان سے اتفاق کریں گے۔ چناں چہ جب مسٹر داس رہا ہوئے تو گیا کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ ری سپشن کمیٹی نے مسٹر داس کو صدر منتخب کیا۔ انھوں نے خطبہ صدارت میں تجویز کیا کہ کانگریس کونسلوں میں داخلے کا پروگرام منظور کرلے اور سیاسی جنگ کو قانون ساز مجلسوں کے اندر جاری کرے گا۔ گاندھی جی جیل میں تھے۔ کانگریس کے ایک حصے نے سی راج گوپال آچاری کی سرکردگی میں تجویز کی مخالفت کی اُنھیں اندیشہ تھا کہ اس سے حکومت یہ نتیجہ نکالے گی کہ کانگریس گاندھی جی کی قیادت سے انحراف کرنے لگی ہے۔ چناں چہ راج گوپال آچاری ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ کی مخالفت نے تجویز رد کروا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ Pro-changers اور No-changers چھ ماہ بعد مولانا آزاد رہا ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ کانگریس کی جو قوت انگریز کے خلاف لڑائی میں صرف ہونا چاہیے تھی وہ آپس کی خانہ جنگی میں صرف ہو رہی ہے۔ دونوں دھڑوں نے مولانا کو اپنے ساتھ ملانا چاہا لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور ملک کو سیاسی جدوجہد کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخراُن کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ دہلی میں کانگریس کا خاص اجلاس ہوا اور دونوں فریقوں نے بالاتفاق مولانا کو صدر منتخب کیا۔ خطبہ صدارت میں مولانا نے زور دے کر کہا ہمارا اصل مقصد ملک کو آزاد کروانا ہے۔ ۱۹۱۹ء سے ہم عملی احتجاج کے پروگرام پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اس سے فائدہ بھی ہوا ہے۔ اب اگر بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ قانون ساز اسمبلی کو جدوجہد کا میدان بنانا چاہیے تو ہمیں ہٹ دھرمی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ جب تک یہ یقین ہو کہ سب کا مقصد ایک ہے تب تک ہر گروپ کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ جس پروگرام کو مفید و موثر سمجھے اس پر عمل کرے۔ چناں چہ فیصلہ ہو گیا کہ پرو چینجرز اور نو چینجرز دونوں آزادی کے ساتھ اپنے اپنے پروگرام پر عمل کرسکیں گے۔ راجندر پرشاد گروپ نے اپنے تعمیری پروگرام کو اُٹھایا اور سی آر داس گروپ نے

سوراج پارٹی بنا کر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ نتیجتاً اسمبلیوں میں بہت سے لوگ سوراج پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ نو چینجرز کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ کونسلوں میں داخلے سے گاندھی جی کی قیادت کمزور ہو جائے گی۔ سوراج پارٹی نے گاندھی جی کی فوری رہائی کا ریزولیوشن پیش کیا۔ مولانا لکھتے ہیں ریزولیوشن منظور ہونے سے پہلے گاندھی جی رہا ہو گئے۔

اس طویل گفتگو سے آپ کو مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کی کچھ نہ کچھ جھلک تو مل ہی گئی ہوگی، مجھے ذاتی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں مولانا آزاد کی وہی حیثیت ہے جو بینکوں میں ریزرو بینک کی ہے۔ ریزرو بینک، بینکوں کا بینک ہے۔ مولانا آزاد لیڈروں کے لیڈر ہیں۔ اُن کے خیالات ونظریات وآرا کا سب لیڈر احترام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بار جب تحریک میں تعطل کی کیفیت پیدا ہوئی تو مولانا نے اُسے نہ صرف توڑا بلکہ تحریک کو از سرِ نو فعال بنانے اور آگے بڑھانے میں بھی کامیاب ہوئے۔ آخر میں میں بہت اختصار کے ساتھ اُن کی قیادت کے بہت اہم دور کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

زمانہ دوسری جنگ عظیم کا ہے۔ برطانیہ پر جنگ کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہندستان کی شمولیت جنگ میں ضروری ہے لیکن غلام ملک دوسروں کی آزادی کے لیے اپنے آپ کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کے لیے تیار نہیں، امریکہ اور چین بھی برطانیہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ ہندستان سے کوئی سمجھوتا کر لے۔ اس غرض سے کرپس مشن کا قیام عمل میں آیا۔ سر اسٹیفرڈ کرپس اس کے سربراہ ہیں۔ یہ وہ تاریخی زمانہ ہے جب مولانا آزاد کانگریس کے صدر ہیں۔ چناں چہ کمیشن سے گفت وشنید کی ساری ذمے داری اُن پر ہے۔ مہاتما گاندھی امن کے راستے پر اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ وہ ہندستان کی آزادی کے انعام کے بدلے بھی جنگ میں شریک ہونے کو تیار نہیں۔ وہ وائسرائے کو روحانی طاقت سے ہٹلر کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ایسے میں مولانا کو کرپس مشن سے گفت وشنید کی ذمے داری سونپی جاتی ہے۔ سر کرپس پیشے سے وکیل ہیں۔ گفت وشنید میں پینترے بدل بدل کر وہ اپنے سارے حربے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہندستان کو تیرہ اُدھار پر ٹرخانا چاہتے ہیں لیکن نو نقد دینے کو تیار نہیں۔ مولانا آزاد نے جس طرح اُن کا ہر وار خالی دیا، جس طرح ہر حربہ بیکار کر دیا وہ اُن کی سیاسی سوجھ

بوجھ پر دال ہے۔ دنوں اور ہفتوں طویل گفتگوئیں ہوئیں لیکن نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات۔ مشن ناکام ہو کر واپس جاتا ہے، لیکن جب جنگ خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے، جاپانی ہندستان کی سرحدوں پر دستک دے رہے ہیں۔ سبھاش بابو اپنی آزاد ہند فوج ترتیب دے کر میدانِ جنگ میں اُتر چکے ہیں۔ سادہ لوح ہندی، جاپان کو نجات دہندہ خیال کرنے لگا ہے۔ لہٰذا اگر اس کی فوجیں ہندستان میں داخل ہوں تو وہ ان کے راستے میں آنکھیں بچھانے کو تیار ہے۔ مولانا محسوس کر رہے ہیں کہ یہ صورت حال انتہائی تشویش ناک ہے۔ ایک قدیم غنیم جس کی قوت مدافعت جواب دینے کو ہے، کے مقابلے میں ایک تازہ دم غیر قوم کی غلامی کا پھندا زیادہ سخت ہوگا۔ وہ اس تازہ غلامی کو بدترین لعنت خیال کرتے تھے۔ ان حالات میں برطانیہ ایک بار پھر مصالحت پر آمادہ ہے۔ ابھی کانفرنسوں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری ہے کہ جنگ کا خاتمہ سامنے نظر آنے لگتا ہے اور پھر دفعتاً جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر برطانیہ میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آ جاتی ہے۔ لیبر گورنمنٹ ہندستان کی آزادی کے باب میں سنجیدہ ہے۔ چناں چہ کیبنٹ مشن کا قیام عمل میں آتا ہے۔ فارمولا اُس کے پاس بھی کم و بیش وہی ہے جو سر کرپس لے کر آئے تھے لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ حکومت اس بار واقعی سودا کرنا چاہتی ہے۔ مولانا پیش کش کو منظور کرنے پر آمادہ ہیں اور مسلسل گفت و شنید متعدد نشستوں کے بعد کم و بیش اپنے منصوبے کے مطابق معاملے طے کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیگ اور انگریز مل کر کے بٹوارے پر آمادہ تھے، لیکن ٹو نیشن تھیوری کی بات مولانا کے حلق سے نیچے نہیں اُترتی۔ چناں چہ انھوں نے ایک معقول تجویز پیش کی کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔ دفاع، رسل و رسائل اور امورِ خارجہ کے سوا بقیہ سب محکمے صوبوں کے اختیار میں ہوں۔ وہ برضا و رغبت اگر کوئی اور شعبہ مرکز کو سونپنا چاہیں تو عذر نہ پس و پیش۔ یہ ایک ایسا حل تھا جس سے ملک تقسیم سے بچ سکتا تھا۔ کم و بیش سب طے ہو گیا لیکن ہندستان کی بدقسمتی، حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ پانسا پلٹا اور بنا بنایا کھیل بگڑتا نظر آیا۔ اس میں کسی حد تک خود مولانا کو بھی ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے۔ وہ سات سال سے کانگریس کے صدر تھے۔ حالات کے جبر نے انتخابات کرانے کا موقع ہی نہ دیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے نئے انتخابات کروانے کا

فیصلہ ہی نہیں کیا۔ خود صدارت سے الگ ہو جانے کا بھی فیصلہ کر لیا اور اپنی طرف سے صدارت کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کا نام بھی تجویز کر دیا۔ یہ غالباً موزوں ترین تجویز تھی اور شاید اسی لیے مولانا اپنے فیصلے کو صحیح قرار دیتے تھے۔ البتہ ہونی اٹل ہے۔ غلطی مولانا کی صرف اتنی تھی کہ لوگوں کی خواہش اور اصرار کے باوجود انھوں نے ایک برس اور کانگریس کا صدر رہنا منظور نہ کیا۔ حال آں کہ وہ اپنے اس اقدام کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں، تاہم جس مشکل زمانے میں انھوں نے انگریزوں سے گفت وشنید کی تھی اور معاملے کو ایک مقام تک پہنچایا تھا آخری نتیجہ نکلنے تک انھیں قیادت کی ڈور اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہیے تھی۔ خصوصاً جب کہ بظاہر اُن کی مخالفت بھی نہیں تھی مگر وہ راضی نہ ہوئے اور پھر کانگریس کے نئے صدر کے ایک معمولی بیان سے لیگ بلکہ مسٹر جناح بدگمان ہو گئے اور انھوں نے طے شدہ سمجھوتے کو رد کر کے از سر نو بات چیت کی، بلکہ بٹوارے کی مانگ کی۔ وائسرائے لندن گئے۔ وہ خود گفتگو کو از سر نو آغاز کرنے کے خلاف تھے۔ انھوں نے برطانوی حکومت کو اپنی رپورٹ پیش کی تو یہ تجویز بھی رکھی کہ ہندستان کی آزادی کے معاملے کو دو سو برس تک ملتوی رکھا جائے۔ وزیر اعظم اس سے متفق نہ ہوئے۔ وائسرائے نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ گویا آخری کیل تھی۔ اس کے بعد مولانا لاکھ کوشش کے باوجود کمانِ قسمت سے نکلے ہوئے تیر کو لوٹا نہ سکے۔ حالات قابو سے باہر ہو گئے۔

لارڈ ویول کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ یہ گویا تقسیم ملک کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔ ہندستان پہنچ کر انھوں نے کانگریسی زعما کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ تقسیم کو ماننے پر نہ صرف راضی ہو گئے بلکہ اُسے مستحسن سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ ماؤنٹ بیٹن نے مہاتما گاندھی کو بھی شیشے میں اُتار لیا۔ مولانا نے ماؤنٹ بیٹن کو متنبہ کیا تھا کہ تقسیم سے بہت خون خرابہ ہوگا لیکن انھیں اپنی سپاہ گری کا غرہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار تقسیم طے پا جائے اس کے بعد میں خون کا ایک قطرہ نہیں بہنے دوں گا۔ تاریخ نے مولانا کے اندیشے کو صحیح ثابت کر دیا۔

مولانا آزاد کا سیاسی رول

شہباز حسین

مولانا آزاد کئی لحاظ سے منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ قدرت نے اپنی عطا اور بخشش میں ان کے ساتھ بڑی فیاضی سے کام لیا تھا اور اس طرح سے ان کی ذات مجموعۂ کمالات بن گئی تھی۔ وہ ۱۹۱۲ء میں الہلال کے ساتھ ہلال بن کر اُفق سیاست پر اُبھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے بدر کامل بن گئے۔ انھیں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ سیاسی رہنما، مذہبی عالم، ادیب و انشا پرداز، صحافی اور دانش ور۔ سبھی اس نئی آواز، نئے انداز تخاطب اور نئے استدلال سے متاثر ہوئے اور مولانا جلد ہی ایک ممتاز قومی رہنما بن گئے۔

مولانا آزاد نے جب اپنی الگ آواز بلند کی تو مسلمانوں کا بڑا طبقہ سرسیّد کے افکار سے متاثر تھا۔ ایسا ہونا قدرتی بھی تھا۔ سن ستاون کے غدر نے نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی طاقت کا خاتمہ کر دیا تھا بلکہ ان کی معاشی اور سماجی حالت کو بھی کمتر کر دیا تھا۔ سرسیّد نے حاکم اور محکوم کی غلط فہمیوں کو دور کیا تھا اور مسلمانوں کو انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا مشورہ دیا تھا۔ خود مولانا آزاد سرسیّد کے خوشہ چین اور ان کی عظمت کے معترف تھے۔ ۱۹ر نومبر ۱۹۴۹ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کنووکیشن ایڈریس میں برملا اعتراف کیا ہے کہ سرسیّد انیسویں صدی کے سب سے بڑے سماجی مصلح تھے۔ انھوں نے بڑی وضاحت سے ان کی خدمات کو بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> ”سرسیّد نے علی گڑھ میں ایک کالج ہی نہیں بلکہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک فکری اور تہذیبی مرکز کی بنا ڈالی۔ اس مرکز کی کلیدی حیثیت

خود سرسیّد تھے۔ انھوں نے اپنے گرد وحید العصر دانشوروں کو جمع کر لیا تھا۔ شاید ہی ہندستان کے کسی رسالے نے اپنی نسل کے ذہنوں کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا تہذیب الاخلاق نے کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس رسالے نے جدید اُردو ادب کی بنیاد ڈالی۔ غالباً ہندستانی مسلمانوں میں اس وقت کوئی ایسی ادبی شخصیت نہیں تھی جو اس ادبی حلقے سے متاثر نہ ہوتی ہو۔ یہاں اپنے عہد کے بہترین مسلم مصنفین کی تربیت ہوئی۔ محمدی ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں جدید طرز کی نظمیں پڑھی گئیں اور خطابت کا بھی یہی فورم تھا۔ اسی پلیٹ فارم سے اپنے عہد کے بہترین مقررین کی تربیت ہوئی۔‘‘

سرسیّد کی عظمت کے اعتراف کے باوجود مولانا سرسیّد کے سیاسی افکار سے متفق نہ تھے۔ بلکہ اسے مسلمانوں کے لیے مہلک سمجھتے تھے۔ اس خطبے میں کہتے ہیں:

’’مسلمانوں کے اُس سیاسی جمود کا واحد سبب وہ رہنمائی تھی جو انیسویں صدی کے ربع آخر میں اس ادارے کے بانی سرسیّد احمد نے انھیں دی تھی۔ علی گڑھ پارٹی نے اس حکمت عملی کو اپنایا اور ہندستانی مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے الگ رکھنے کی کوشش کی اور کچھ برگزیدہ شخصیات کو چھوڑ کر عام طور پر انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔‘‘

مولانا کو سرسیّد کے سیاسی افکار سے اختلاف کرنے کا پورا حق تھا اور مولانا کی عظمت ثابت کرنے کے لیے سرسیّد کی نفی کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ جس ادارے کے بانی اور جس کے رفقاے کار وحید العصر تھے۔ ان کا اثر ہونا ضروری تھا۔ سرسیّد نے بڑا ہمہ گیر اثر ڈالا تھا اور اس اثر کا بہت دنوں تک باقی رہنا لازمی تھا۔

مسلمان تعلیمی پسماندگی کا شکار تھا۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلباء کو نئے مواقع مل رہے تھے۔ لہٰذا عام طور سے سرسیّد کے افکار کی تائید کی گئی کہ اس وقت مسلمانوں کے لیے کسی ایک سیاسی تحریک میں شامل ہونا جس کا ہدف انگریزی سرکار ہے، مناسب نہیں ہے۔

ایسی بات بھی نہیں کہ مسلمانوں نے کانگریس کی تحریک سے بے اعتنائی برتی۔ کانگریس کے دوسرے اور تیسرے اجلاس سے ہی مسلمان ڈیلی گیٹوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی مگر مسلم آبادی کا بڑا حصہ ابھی تک کانگریس کو شک وشبہے کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

مولانا آزاد بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں سن شعور کو پہنچے تھے۔ ہندستان کے انقلابیوں سے واسطہ رکھا تھا، مشرق وسطیٰ کا دورہ کر چکے تھے اور امپیریلزم کی سفاکیوں کو اچھی طرح محسوس کر چکے تھے۔ لہٰذا انھیں انٹی امپیریلسٹ ہونا ہی تھا۔ بیسویں صدی کی بھی کوئی تحریک حریت **Anti imperialist** ہونے کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا مولانا آزاد نے مسلم ریاست کو ایک نیا رُخ اور نیا موڑ دینے کی کوشش کی۔ وہ اس سے بھی آگاہ تھے کہ ہندستان کی مذہبی قیادت ہر شدت کے ساتھ اینٹی امپیریلسٹ رہی ہے۔ وہ مسلمانوں پر مذہب کے اثرات سے بھی واقف تھے۔ لہٰذا انھوں نے نہایت ولولہ انگیز انداز میں مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ جنگ آزادی میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر برٹش سرکار کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں۔ انھوں نے اس زبان میں بات کی جو آسانی سے مسلمانوں کی سمجھ میں آجائے۔ جیسے:

> ''احکام شرع کے رو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فریق ہوسکتا ہے، جو نہ صرف ایشیا کی، مشرق کی بلکہ اس تمام کرۂ ارض کی سچائی کو آج چیلنج کررہا ہے، اس کو مٹا رہا ہے تو وہ برٹش گورنمنٹ کے علاوہ کوئی دوسری طاقت نہیں۔ اس لیے ہندستانی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر، پیغمبر اسلام کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر، جو انھوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا تھا، وہ نمونہ جو سرور کاینات نے عملاً اور حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے، ہندستان کے مسلمانوں کا شرعی فرض ہے کہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد ومحبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔''

مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے تصورات کو کامیاب

بنانے کی جو زبردست کوششیں کیں وہ کامیاب بھی ہوئیں۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے دوران جس قومی اتحاد کا مظاہرہ ہوا وہ ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔ مگر یہ اتحاد دیرپا ثابت نہ ہوا۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں مگر سب سے بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان اپنی اقلیتی حیثیت سے بے حد خائف تھے۔ انھیں نظر آرہا تھا کہ انگریز اگر چلے گئے تو ایک جمہوری حکومت بنے گی۔۔ اس میں ظاہر ہے کہ غالب اکثریت ہندوؤں کی ہوگی۔ پنجاب اور بنگال میں بھی مسلمانوں کی اکثریت اتنی زیادہ نہ تھی بہار اور یو پی میں ہندوؤں کی تھی۔ مولانا آزاد نے متحدہ قومیت کا تصور پیش کر کے اس خوف کو دور کرانا چاہا۔ ابتداءً سرسیّد بھی متحدہ قومیت کے حامی تھے اور قوم سے ہندو اور مسلمان دونوں مراد لیتے تھے مگر بعد میں وہ کچھ تذبذب میں پڑ گئے اور انھیں انگریز دوستی میں ہی فلاح کی صورت نظر آئی۔ مگر مولانا آزاد کے مدلل منطقی استدلال، قرآن وسنت کے حوالے کے باوجود مسلمانوں کے دلوں کا خدشہ دور نہ ہو سکا۔

کانگریس ایک قومی جماعت ضرور تھی مگر اس میں ایسے افراد بھی تھے جن کا ذہن فرقہ وارانہ مسئلے میں بالکل صاف نہ تھا۔ کانگریس کے رہنماؤں میں ہر شخص گاندھی اور نہرو نہیں تھا۔ کانگریس مجبور تھی کہ ایسے لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلے جو بعض اوقات یا عموماً فرقہ وارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کررہے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو راہِ نجات اس میں نظر آئی کہ وہ انگریز سرکار سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کریں۔ جداگانہ انتخابات، ملازمتوں میں ریزرویشن اور وینج متوسط طبقے کے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے بڑا پرکشش تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ملک کی آزادی کے خواہش مند نہ تھے۔ لیگ اور کانگریس کے جلسے اب اکثر ساتھ ساتھ ہونے لگے تھے۔ لیگ نے بھی آزادی کے نصب العین کو اپنایا تھا اور ممتاز قومی رہنما دونوں پارٹیوں کے اسٹیج پر رونق افروز ہوتے تھے۔ مگر مسلمانوں کی خلش باقی تھی اور وہ کوئی ایسی صورت چاہتے تھے جس میں ایک وجدانی طرزِ حکومت کی صورت میں اکثریت کے رحم وکرم پر نہ رہنا پڑے۔ مولانا آزاد نے کہا اپنے پر بھروسا رکھو، اتنی بڑی تعداد اقلیت اور مجبور محض نہیں ہوسکتی۔ مہاتما گاندھی پر بھروسا کرو۔ اپنی مشترک تاریخ اور تمدن پر غور کرو، مگر مسلمانوں کی غالب اکثریت ان مدبرانہ

اور دانشورانہ باتوں کو صحیح تناظر میں نہ دیکھ سکی۔

خود مسلمان بھی زبردست مخمصے میں گرفتار تھے۔۱۹۳۵ء میں ایکٹ کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نہایت رجعت پرستانہ قرار دے چکی تھی۔۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ میں مرکزی اور صوبائی سطح کی ایسی ضمانتیں نہ تھیں جو ان کے خدشات کو دور کرسکتیں۔اس کے تحت جو انتخابات ہوئے تھے اس سے کانگریس کی طاقت اور لیگ کی کمزوری آشکارا ہو چکی تھی۔مسلم لیگ نے ۴۲۸ مسلم سیٹوں میں ۱۰۹ سیٹیں جیتی تھیں۔۱۹۳۷ء میں صوبوں میں کانگریس نے وزارتیں بنائیں اس نے مسلمانوں کے احساس محرومی کو مزید بڑھا دیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے سے برٹش حکومت بھی سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ جرمنی اور روس کے عزائم اسے مجبور کر رہے تھے کہ وہ جنگی کوششوں میں ہندستان کی بھرپور حمایت حاصل کرے۔اپنی غیر مشروط حمایت کے لیے کانگریس نے ہندستان کی آزادی اور ایک دستور ساز اسمبلی بلانے کے انتظامات کی شرط لگائی۔ظاہر ہے یہ مطالبہ اس وقت برٹش سرکار کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔لہٰذا اس وقت برطانوی حکومت کی حکمت عملی نے یہ طے کیا کہ کانگریس کی نمائندہ حیثیت کو مشکوک بنا دیا جائے اور اس بات کو تسلیم نہ کیا جائے کہ کانگریس ہی ملک کی واحد ترجمان ہے۔۱۸رستمبر ۱۹۳۹ء کو ایک بیان کے ذریعے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ہندستان کے آیندہ سیاسی ڈھانچے کو تشکیل دیتے وقت ان کے مطالبات اور مفادات کا پورا خیال رکھا جائے گا۔۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت جو انتخابات ہوئے تھے اس میں مسلم لیگ کو جزوی طور سے سہی ایک کل ہند حیثیت حاصل ہوئی تھی۔اس طرح مسلم لیگ کو اور اس کے قائد کو مسلمانوں کے ترجمان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مسٹر محمد علی جناح نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھایا۔یہ کہنا کہ وہ انگریزوں کے آلہ کار بن گئے تھے درست نہیں ہوگا۔

کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں جس سے برٹش سرکار کی فوری مشکلات تو دور ہو گئیں مگر اس سیاسی بحران کو دور کرنا ضروری تھا۔لہٰذا وائسرائے ہند نے مسٹر جناح کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں کے مطالبوں کے بارے میں ایک ''مثبت پالیسی'' بنائیں اور اس کی وضاحت کریں

تاکہ آیندہ مذاکرات میں اس کی بنیاد پر گفتگو کی جا سکے۔

مسلمانوں کے لیے کل ہند طور پر قابل قبول پلان کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خود مسلم سیاست طرح طرح کے تضادات کا شکار تھی اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہی تھی۔ پھر بھی مسٹر جناح یہ سمجھ چکے تھے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ سے مسلمان عام طور سے غیر مطمئن ہیں۔ جس میں ایک مضبوط مرکز کے خدوخال نمایاں تھے۔ ایک مضبوط مرکز اور ایک دستور ساز اسمبلی کا رد کرنا ضروری تھا۔

مسلم اکثریت کے صوبے صوبائی خودمختاری اور ایک کمزور یا نام نہاد مرکز کے طلب گار تھے۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمان ایک مضبوط مرکز چاہتے تھے تاکہ ریاستی حکومتیں اگر ناانصافی سے کام لیں تو مرکز اپنے اختیارات سے کام لے کر اس کا سدباب کر سکے۔ اس مرکز میں مسلمانوں کی مساوی یا موثر نمایندگی ضروری تھی تاکہ ان میں اتنی طاقت ہو کہ حکومت چلانے کے لیے کانگریس ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو جائے۔ لہٰذا مسلم لیگ نے وہ نظریہ پیش کیا جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوا اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منظور کیا گیا۔ اس ریزولیوشن میں بہت سی چیزیں مبہم تھیں اور آخیر دم تک مبہم رہیں کیوں کہ اس کی وضاحت ممکن ہی نہ تھی۔ مسلم سیاست اتنے تضادات کا شکار تھی کہ یہ وضاحت بڑی مہلک ثابت ہوتی۔

یہ ریزولیوشن کسی عملی تجویز کے بجائے ایک خواب تھا جس کی تعبیر ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کر رہا تھا یا کر سکتا تھا اور اسی لیے یہ بہت جلد مسلمانوں میں مقبول ہو گیا۔ اس موضوع پر مولانا آزاد نے بڑی تفصیل کے ساتھ 'ہماری آزادی' میں لکھا ہے:

> ''اس اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی پورے ہندستان کے لیے بلکہ خاص طور سے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوگی اور در اصل جتنے مسئلے اس کے ذریعے حل ہوں گے، اس سے زیادہ نئے مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔''

مولانا نے ان تمام خطرات سے آگاہ کیا ہے جو پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کو درپیش ہوں گے اور یہاں تک لکھا کہ اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ اس سے مسلمانوں کو کسی طرح سے بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ خود اس کو منظور کرلیں گے اور دوسروں کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ آگے لکھتے ہیں کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے لیے اس قدر مضر ہے تو مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اس کی ہم نوا کیسے ہوگی۔ اس کا جواب مولانا کے الفاظ میں سنیے ''اس کا سبب انتہا پسند فرقہ پرست ہندوؤں کے رویے میں ملتا ہے۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کی گفتگو چھیڑی تو انھیں اس میں اتحاد اسلامی کی ایک ناپاک سازش نظر آنے لگی اور انھوں نے اس خوف میں اس کی مخالفت شروع کی۔ یہ ہندستانی مسلمانوں اور مسلمانوں کی ریاستوں کے درمیان جتھا بندی کا پیش خیمہ ہے۔ اس مخالفت نے لیگ کے جاہلوں کو اُکسایا اور انھوں نے ایک سیدھے سادے مگر نامعقول منطقی استدلال سے کام لے کر کہا کہ چوں کہ ہندو اتنی شدت سے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے یقیناً اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہوگا اور اس طرح جذباتی ہیجان کی ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں سوچ سمجھ کر اچھے برے کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہوگیا اور خاص طور سے مسلمانوں کا نوجوان اور اثر پذیر طبقہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔''

مگر اس رو میں بہنے کی وجہ بھی تھی۔ جس ملک میں مسلمان اتنے دنوں تک حکمراں رہے وہاں محض اقلیت بن کر رہنا ان کے لیے بے حد تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مساوی حیثیت پر تو رضامند ہو سکتے تھے اور قومی نظریے نے اسی ضرورت کو پورا کیا۔ جناح صاحب نے ایک کامیاب وکیل کی طرح وکالت کی کہ ہندو مسلمان دو الگ قومیں ہیں انگریزوں کے جانے کے بعد جو انتقالِ اختیارات ہوگا اس میں دونوں قومیں برابر شریک ہوں گی۔ وہ وکیل تھے، دستوری تحفظات چاہتے تھے اور ہر بات کی وضاحت اور صراحت پر زور دیتے تھے۔

انھیں مسلمانوں کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ وحدانی مرکز باقی نہ رہے جو انگریزوں نے بنایا ہے۔ ایک نیا مرکزی نظام ہو جس میں مسلمانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہو اور مسلم اکثریتی صوبوں کو خود مختاری حاصل ہو اور کیبنٹ مشن پلان کی گروپنگ کی اسکیم پر ان کی رضامندی اسی جذبے کی مظہر ہے۔ مگر یہ اسکیم بھی بے اعتمادیوں کے دھندلے میں گم ہوگئی۔

مگر آج جب ہم حالات اور واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ گروپنگ کی اسکیم بھی بہت سے خطرات سے دوچار تھی اور خود مسلمانوں کے لیے بھی سودمند نہ تھی۔ مولانا آزاد کو اس اسکیم کے فیل ہو جانے کا بہت افسوس ہے مگر ہندستان اور پاکستان میں صوبوں کی جو آویزش ہے اور حالات نے جو رُخ اختیار کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کمزور مرکز بری طرح ناکام رہتا اور آپس کی کشمکش حالات کو مزید بدتر بنا دیتی!

مولانا آزاد اور مسٹر محمد علی جناح آزادی کے آخری مرحلے میں مسلمانوں کے دو عظیم رہنما تھے، جنھوں نے دو مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے مسائل کا حل کرنا چاہا۔ مسٹر جناح ایک وکیل تھے اور ان کا طریقہ کار ایک آزمودہ اور قابل وکیل کا تھا۔ مولانا آزاد مدبر اور دانشور تھے۔ ان کا اپروچ ہمہ پہلو اور ان کا کینوس بہت وسیع ہے۔ جنگ آزادی کے زمانے میں بھی وہ فرقہ واریت سے لڑتے رہے اور آزادی کے بعد بھی۔ مگر مولانا کا سب سے اہم رول یہ ہے کہ انھوں نے حالات سے مردانہ وار مقابلے کرنے کی دعوت دی۔ نڈرتا اور بے خوفی کا سبق دیا، اپنے پر بھروسا کرنے کی تلقین کی، اتحاد اور اتفاق کی برکتوں کو واضح کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر قسم کی دستوری تحفظات، ضمانتیں، وعدے بے کار ہیں اگر جذبہ خیر سگالی موجود ہو۔ اگر دل میں کدورتیں ہیں تو کوئی معاہدہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لیے انھوں نے اکثریت پر اعتماد کرنے کی تلقین کی کیوں کہ انگریز تو جانے والے تھے وہ چلے جائیں گے اور جو لوگ رہ جائیں گے ان ہی سے پیمانِ وفا باندھنے کی ضرورت تھی۔

مولانا انسان کی انسانیت سے مایوس نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بھروسا، اعتماد، اخوت اور محبت سے آپس کے رشتے بنتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔

انھوں نے مسلمانوں کو مذہب کی کٹر تاویلات کے دائرے سے نکالنے میں مدد کی اور اسلام کا آفاقی اور حرکی پیغام یاد دلایا جس کے مخاطب سارے انسان تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی سوچ کو بدلنے، ان میں حرکت پیدا کرنے اور ایک غیر جذباتی انداز اپنانے پر زور دیا۔ انھوں نے دلیل، منطق، توازن اور تجزیہ کا سہارا لینے کی تلقین کی۔ انھوں نے قومی زندگی کو صالح اقدار کی بنیادوں پر استوار کرنے میں ساری زندگی صرف کر دی۔ مولانا خود بھی اپنے

مشن سے بخوبی آگاہ تھے:

''ہم اس بازار میں سودا کے نفع کے لیے نہیں، تلاشِ زیاں ونقصان میں آئے ہیں، صلہ وتحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلب گار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں اور دنیا کے زروسیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لیے آئے ہیں۔''

ہمیں افسوس ہے کہ مولانا کے زیادہ تر اندازے صحیح ثابت ہوئے۔

اس انداز، اس مزاج، فہم وفراست، علم وفضل، تدبر ودانش کے کسی رہنما کے پیدا ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ ان کی تحریریں ہمارے پاس ہیں اور اگر ہمیں اپنی منزل مل سکتی ہے تو ان ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر مل سکتی ہے۔

تحریک آزادی اور مولانا آزاد

ظفر احمد نظامی

عالمی تاریخ میں ہندستان کی تحریک آزادی کی روئداد ایک نئے اور شاندار باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے مختلف ادوار کے اُفق پر مختلف رہنماؤں نے اپنی قیادت کے نور سے راہوں کو منور کیا اور عوام کی رہنمائی کی۔ رہنماؤں کی اس طویل فہرست میں محی الدین احمد فیروز بخت مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو مکہ جیسے محترم اور مقدس شہر میں ایک کٹر مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی اور چھوٹی ہی عمر میں علم و دانش کی وہ تمام منزلیں طے کر لیں جنھیں سر کرنے کے لیے دوسروں کو عمریں درکار ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی بہن کا یہ قول بڑا اہم ہے کہ ''مولانا آزاد نے بچپن نہیں دیکھا، چھ سات برس کی عمر سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ ننھے ننھے کاندھوں پر ایک سر ہے جس میں ایک بڑا اُونچا دماغ ہے۔'' ان کی عظمت کے اعتراف میں بلبل ہند سروجنی نائڈو کا یہ قول بھی بڑا وزن دار ہے کہ ''مولانا کی ذہنی عمر اُن کی ولادت کے وقت پچاس برس کی تھی'' دراصل مولانا نے جنگ آزادی کے سپاہی کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا مگر جلد ہی ان کا شمار اس کے سالاروں میں ہونے لگا۔

اگرچہ نوعمری ہی میں مولانا آزاد نے مختلف رسائل وجرائد سے وابستہ ہو کر صحافت کے میدان میں ناموری حاصل کر لی تھی تاہم موجودہ صدی کی پہلی دہائی کے وسط تک وہ لیلائے سیاست کی زلفوں کے گرہ گیر نہیں ہوئے تھے لیکن اس دور کے دو اہم واقعات نے انھیں عملی سیاست کی کوچہ نوردی پر مجبور کر دیا۔ ان میں پہلا واقعہ تقسیم بنگال کا تھا اور دوسرا خود غیر ملکوں میں ان کا سفر۔ تقسیم بنگال نے مولانا کو بڑا متاثر کیا۔ دراصل مکہ سے واپسی کے بعد ان کے

والد کلکتہ ہی میں مقیم ہو گئے تھے اور وہاں کے تمدن کو مولانا نے بہت قریب سے دیکھا تھا اس لیے وہ صوبے کی وحدت کو مجروح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے جسے وہ ہندو مسلم اتحاد پر ضرب کاری سے تعبیر کرتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے تقسیم کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے رہنماؤں میں سے اربند گھوش اور شیام سندر چکروتی سے رابطہ قائم کر کے اس میں شمولیت کا ارادہ ظاہر کیا تو انھیں بڑا تعجب ہوا کیوں کہ تقسیم بنگال کا مقصد تو مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا لیکن مولانا نے ان پر واضح کر دیا کہ محض چند مسلمانوں کی وفاداری کو تمام مسلمانوں سے منسوب نہ کیا جائے بلکہ انھیں بھی تحریک میں شامل ہونے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ انھوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ اگر مسلمانوں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا اور انھیں تحریک سے علاحدہ رکھا گیا تو بددل ہو جائیں گے اور کبھی اس میں شامل نہ ہوں گے جب کہ تحریک کی کامیابی ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں پر منحصر تھی۔ مولانا کے دلائل نے بنگال کے رہنماؤں کو قائل کر دیا اور انھوں نے تقسیم بنگال کے خلاف چلائی جانے والی اپنی تحریک کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیے۔ مولانا نے اس کے دائرۂ کار کو وسیع کر کے ہندستان کے مختلف حصوں میں حکومت کے خلاف خفیہ انجمنوں کو بنانے میں ان کی بڑی مدد کی۔

۱۹۰۸ء میں مولانا نے مصر، شام، ترکی اور فرانس کے سفر کے دوران وہاں کے نوجوان رہنماؤں اور قائدین سے ملاقات کی اور انھیں ہندستان کی صورتِ حالات سے باخبر کیا اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو بیداری اور شعور سے ہم کنار کرنے کی غرض سے ایک معیاری اخبار کی ضرورت ہے۔ یوں تو مولانا صحافت کے تعمیری اثرات سے بخوبی واقف تھے اور اسے ملک وقوم کی خدمت کا ایک موثر ذریعہ تصور کرتے تھے۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ جب تک ذاتی پریس نہ ہو اخبار جاری کرنا فضول تھا۔ یہی سبب ہے کہ غیر ملکی سفر سے واپسی کے بعد وہ اپنے طریق کار اور لائحہ عمل پر غور کرتے رہے۔ یہ پورا عرصہ انھوں نے نجی پریس قائم کرنے میں صرف کیا۔ انجام کار وہ اپنے مقصد میں ۱۹۱۲ء میں کامیاب ہوئے۔ جب انھوں نے کلکتہ سے ہفت روزہ ''الہلال'' کا اجرا کر کے اُردو صحافت کی تاریخ میں ایک شاندار باب کا اضافہ کیا۔ اس کے ذریعہ مولانا نے اسلام کی تاریخ کو دہراتے

ہوئے مسلمانوں کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انھوں نے انھیں تنبیہ کی، ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور بے حسی کے خواب سے بیدار کیا۔ مولانا نے اپنے اخبار میں لکھا کہ:

> ''میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دِلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سرکشتگان خواب موت سے ہوشیار ہو جائیں۔ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دیے ہیں اور گھر والے سوئے ہوئے ہیں لیکن اے رونے کو ہمت اور مایوسی کو زندگی سمجھنے والو، یہ کیا ہے کہ تمھارے گھر میں آگ لگ چکی ہے، ہوا تیز ہے اور شعلوں کی بھڑک سخت ہے، مگر تم میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو۔ پھر اگر اسی وقت کے منتظر تھے تو کیا نہیں سنتے کہ وقت آ گیا ہے۔ اگر تم کشتی کے ڈوبنے کا انتظار کر رہے تھے تو کیا نہیں دیکھتے کہ اس میں دیر نہیں......''

مولانا نے ہندستان کے مسلمانوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ اور علی گڑھ کی علاحدگی پسند سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے ملکی اور قومی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے پر اصرار کیا۔ انھوں نے انگریزوں کے تئیں مسلم لیگ کی وفاداری پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اسے اپنی پالیسی میں تبدیل کرنے اور اسے کانگریس کے نزدیک آنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے لکھا:

> ''جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندستان کا آخری انقلاب ہو چکا ہو گا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈالی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کیجیے کہ اس وقت ہندستان کی ملکی ترقی

کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بد بخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہ آزادی میں سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست اجانب میں بازیچہ لعب، ہندستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک بہترین پتھر بنی رہی۔ پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی جو آہ، ثم آہ! کہ مسلم تھی، جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی، جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی جو دنیا میں اس لیے بھیجی گئی تھی تا کہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے۔"

مولانا پھر لکھتے ہیں:

"اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بے شک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو اس میں کیا لکھا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا۔ ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا مگر انھوں نے اپنے منھ اور زبان پر قفل چڑھا دیے۔"

مسلمانوں سے براہِ راست تخاطب کرتے ہوئے مولانا نے کہا:

"......غفلت اور سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں، اب خدا کے لیے بستر مدہوشی سے سر اُٹھا کر دیکھیے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں تک پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ

بھولیے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ مسلم ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے
آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے۔ یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک
کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے
لیے ایک فرضِ دینی اور داخل فی سبیل اللہ......''

غرضیکہ مولانا نے ہر طرح مسلمانوں کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر ملک کی ترقی میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندازِ فکر ہی کو بدل دیا۔ ان کا انداز پیمبرانہ تھا جس کا اثر ہونا لازمی تھا۔ نیاز فتح پوری کے الفاظ میں ''مولانا آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کہ کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔'' مولانا عبدالماجد دریابادی کے نزدیک ''الہلال'' نے اُردو صحافت کی دنیا ہی بدل دی۔ صورت، سیرت، منظر و قالب سب پر اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار تھا۔ سجاد انصاری کی نظر میں ''الہلال'' نے ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کیا جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہو جائیں گے۔ جواہر لال نہرو نے لکھا کہ ''مولانا آزاد نے ''الہلال'' میں مسلمانوں سے ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ نہ صرف یہ کہ ان کے خیالات اور نقطہ نظر میں جدت تھی بلکہ ان کی تحریر کا رنگ بھی نیا تھا۔ ان کا اسلوبِ بیان جاندار تھا اور پُرزور بھی......'' مولانا کے رفیق کار فضل الدین احمد رقمطراز ہیں کہ ''الہلال'' کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا وہ پائیدار مذہبی انقلاب ہے جو یکا یک مسلمانوں میں اس کی دعوتِ حق سے پیدا ہو گیا۔ علماء و مشائخ کا گروہ جو اپنے مدرسوں اور حجروں سے کبھی جھانک کر بھی دنیا کی حالت پر نظر نہیں ڈالتا تھا ''الہلال'' نے ان کو یکایک نکال کر جدوجہد کے میدان میں کھڑا کر دیا۔'' اس کا ثبوت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے اس قول سے فراہم ہو جاتا ہے کہ ''ہم سب اصل کام بھولے ہوئے تھے ''الہلال'' نے یاد دلا دیا۔'' خود مولانا آزاد نے اعتراف کیا کہ ''الہلال'' کی اشاعت اُردو صحافت کی تاریخ میں

ایک نیا موڑ ثابت ہوئی۔ مختصر سے عرصے میں اس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کرلی۔ عوام اس کی جانب عمدہ طباعت اور اشاعت کے سبب ہی نہیں جھکے بلکہ اس کے ذریعے فروغ دی جانے والی قوم پروری سے متعلق تحریروں کی وجہ سے راغب ہوئے۔ الہلال نے عوام الناس میں انقلاب کی لہر دوڑادی اور اس کی مانگ اس قدر بڑھی کہ تین مہینوں کے اندر اندر اس کے تمام پرانے پرچے، اشاعتیں دوبارہ شائع کرنے پڑے کیوں کہ ہر نیا خریدار اس کے پورے سیٹ کا طلبگار ہوتا تھا۔

مولانا کی بے باک تحریروں نے تہلکہ مچادیا۔ اگرچہ قارئین کی اکثریت نے اس کا تاثر قبول کیا تاہم ان میں ایک اقلیت ایسے افراد پر بھی مشتمل تھی جن کی انگریزوں کے تئیں وفاداری ایک مسلم حقیقت بن چکی تھی۔ انھیں مولانا کا یہ اقدام پسند نہ آیا انھوں نے ''الہلال'' کی مخالفت کی۔ دراصل اس مخالفت کے پس پشت خود برطانوی حکومت کا ہاتھ تھا لیکن یہ مخالفت جس قدر شدید ہوتی گئی۔ الہلال کی مقبولیت میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا، حتیٰ کہ دو ہی سال میں اس کی اشاعت چھبیس ہزار تک پہنچ گئی اور دو آنے کا یہ اخبار دو دو روپے میں فروخت ہونے لگا۔ حکومت جب ''الہلال'' کی آواز کو دبانے میں کامیاب نہ ہوسکی تو اس نے اس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ مولانا کو حکومت کے اس اقدام کی پہلے سے توقع تھی، انھوں نے فوراً ہی ضمانت کی رقم جمع کرادی۔ اس سلسلے میں مولانا کا یہ نوٹ کس قدر دلچسپی کا حامل ہے جو انھوں نے الہلال کی اگلی اشاعت میں شائع کیا۔ لکھتے ہیں ''ضمانت کا روپیہ اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علاحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن الہلال پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لیے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اُکتا گئے تھے اور اب تو وہ وقت آ گیا تھا کہ اگر کوئی مانگنے کے لیے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔'' جب حکومت مولانا کے عزائم کو شکست دینے میں ناکام رہی تو اس نے دس ہزار روپے کی دوسری ضمانت طلب کی۔ مولانا نے یہ رقم بھی جمع کرادی۔ حکومت کے لیے یہ بڑی توہین آمیز بات تھی کیوں کہ ایک طرف تو الہلال کی تحریروں سے باغیانہ عناصر کو تقویت پہنچ رہی تھی تو دوسری طرف مولانا کی بے باکی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان حقائق پر توجہ مرکوز

کرتے ہوئے الہ آباد کے سامراج پرست انگریزی اخبار ''پایونیر'' نے ۲/نومبر ۱۹۱۴ء کی اپنی اشاعت میں ایک اداریہ قلم بند کیا جس کا عنوان ''کلکتہ میں پروجرمنزم'' تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ:

''الہلال ایک ہفتے وار مصور اخبار ہے جو اُردو زبان میں کلکتہ سے شائع ہوتا ہے اور جسے دلی کا ایک مسلمان ایڈٹ کرتا ہے۔ اس صوبے اور غالباً ہندستان کے دیگر صوبوں میں یہ کثیر الاشاعت اخبار ہے۔ آغاز جنگ کے وقت سے اس کی روش حیرت انگیز طور پر پروجرمن رہی ہے کہ جو لوگ اخبارات پڑھتے رہتے ہیں ان کے لیے یہ بڑا تعجب خیز ہے کہ گورنمنٹ اب تک اس کی تحریروں کو کیوں کر برداشت کرتی رہی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اخبار کی طرف کلکتہ میں یا تو بہت ہی کم یا بالکل توجہ نہیں کی جاتی کیوں کہ وہ اُردو میں شائع ہوتا ہے اور اس میں تو ذرا بھی شک نہیں کہ یہ من جملہ ان اسباب کے ہے جن کی وجہ سے اس کے ایڈیٹر نے اس کے مقام اشاعت کے لیے کلکتہ کو منتخب کیا ہے۔

ایک اور سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے سب سے زیادہ شرارت انگیز مضامین کا اسلوب کنایہ آمیز، محض استہزا اور پوشیدہ تمسخر ہے اگر ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جاتا ہے تو یا تو ان کا اثر غائب ہو جاتا ہے یا وہ اثر پورا نہیں ہوتا اور غالباً بہت سے یورپی عہدیدار خود اصل اخبار تو پڑھتے نہ ہوں گے۔

آغازِ جنگ کے وقت اس اخبار میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اٹلی کو انگلستان سے جو اعانت ملتی ہے اس کے اظہارِ تشکر کے طور پر وہ ناطرف دار ہے۔

جس زمانے میں جرمن پیرس کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے

اس تمام مدت میں جرمنی کی پیش قدمی کی مقاومت پر مذاق کا سیلاب بہایا جارہا تھا اور سقوطِ پیرس کو قطعی یقین کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر جو قرآن کے اقتباس کا بڑا شائق ہے اس نے قرآن کی وہ مشہور آیت اقتباس کی تھی، جس میں مکڑی کے جالے کے کمزور ہونے کا ذکر ہے۔''

دراصل پایونیر میں جن مضامین کی جانب اشارہ تھا وہ ''الہلال'' کی ۱۴اور ۲۱/ اکتوبر ۱۹۱۴ء کی اشاعتوں میں ''حدیث الجنود'' اور ''سقوطِ انٹورپ'' کے عنوانات سے شائع ہوئے تھے اور ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس میں قرآن پاک کی یہ آیت درج تھی۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

انجام کار حکومت بنگال نے ان مضامین کو قابل اعتراض ٹھہراتے ہوئے ان شماروں کو ضبط کرلیا اور پھر نومبر ۱۹۱۴ء میں الہلال پریس کے ضبطی کے احکامات صادر کردیے، مگر مولانا ہمت نہیں ہارے۔ پورے ایک سال بعد انھوں نے البلاغ پریس قائم کرلیا اور ''البلاغ'' کے نام سے دوسرا اخبار جاری کر کے ''الہلال'' کی روایت اور روح کو دوبارہ زندہ کردیا۔ حکومت بنگال اب زیادہ دنوں تک مولانا کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کیوں کہ ان کی دلیری اور بے باکی سے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کے ایکٹ کی دفعہ کے تحت انھیں بنگال سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا۔ دوسرے صوبوں نے ان کے داخلے پر پہلے ہی سے پابندی عاید کردی تھی، اس لیے ان کے لیے اب بہار جانے کے علاوہ اور کوئی جائے امان نہ تھی۔ ۳۰/ مارچ ۱۹۱۶ء کو مولانا کلکتہ سے روانہ ہو کر رانچی پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے مورابادی نامی قبائلی علاقہ میں قیام کیا۔ الہلال کے قارئین اور مولانا کے معتقدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ انھوں نے ہاٹھ ہزار افراد کے دستخطوں سے مولانا کی اس جلاوطنی کے خلاف حکومت کو ایک میمورنڈم پیش کیا تا کہ اس حکم کو منسوخ کرایا جا سکے جس کے تحت مولانا کو کلکتہ کو خیرباد کہنا پڑا تھا مگر حکومت بنگال کسی قیمت پر اپنے فیصلے میں ترمیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے نہ صرف یہ کہ جلاوطنی کا حکم منسوخ کرنے سے انکار کردیا بلکہ ۸/ جولائی ۱۹۱۶ء کو

نظر بندی کے احکامات بھی صادر کر دیے۔ اس طرح جون ۱۹۱۲ء سے نومبر ۱۹۱۴ء تک اور نومبر ۱۹۱۵ء سے اپریل ۱۹۱۶ء تک ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے جو پیغام دیا وہ دلوں اور دماغوں میں پیوست ہو گیا اور ان پرچوں کے بند ہو جانے کے باوجود ان کی صدائے بازگشت تادیر سنائی دیتی رہی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے بعدازاں مولانا نے لکھا تھا:

> ''الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی و سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ ان کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی مگر ''الہلال'' نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ خلافت یا سوراج ہے...... ''الہلال'' تمام تر آزادی یا موت کی دعوت تھی۔''

حکومت مبلغ کو نظر انداز کر سکتی تھی مگر اس کی دعوت کے اثر کو زائل کرنا، اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ پیغامبر پر پابندی عائد کر سکتی تھی لیکن اس کے پیغام کو زنجیریں نہیں پہنا سکتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ مولانا کی پونے چار سالہ نظر بندی کے دوران ان کے ذریعے سلگائی جانے والی چنگاری شعلہ بن گئی اور اس نے تحریک کو جاری و ساری رکھا۔ اپنے دورانِ نظر بندی میں مولانا نے ''ترجمان القرآن'' تذکرہ اور دوسری تصانیف پر کام کیا۔

رانچی میں نظر بندی سے رہائی کے بعد جنوری ۱۹۲۰ء کے تیسرے ہفتہ میں مولانا آزاد کی ملاقات ہندستان کے مختلف رہنماؤں سے ہوئی۔ انھوں نے ان سے ملک کی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا کیوں کہ مولانا کی عدم موجودگی میں ملک کے حالات میں زبردست تبدیلی رونما

ہو چکی تھی۔ کانگریس اور لیگ ایک دوسرے کے قریب آ چکی تھی۔ کانگریس کے انتہا پسند اعتدال پسندوں کے ساتھ آ ملے تھے۔ تلک اور اینی بیسینٹ ہوم رول کی تحریکیں شروع کر چکے تھے۔ جنگ کے اختتام کے بعد برطانوی حکومت نے ہندستانیوں کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء دے کر انھیں بہلانے کی کوشش کی تھی اس کے ساتھ ہی اس نے رولٹ ایکٹ کو بھی ہندستانیوں پر مسلط کر کے ان کی آزادی کو سلب کر لینے کا ناپاک اقدام کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں گاندھی جی نے ملک گیر پیانے پر ایک قومی تحریک چلا کر اس کی مخالفت کی تھی۔ اس تحریک کو دبانے کی غرض سے حکومت نے معصوم ہندستانیوں پر بڑے مظالم کیے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم واقعہ امرتسر میں گزرا، جب حکومت نے پنجاب کے دو نامور رہنماؤں یعنی ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا اور اس گرفتاری کے خلاف آواز بلند کرنے والے نہتے لوگوں کو جلیاں والا باغ کے احاطے میں گولیوں سے بھون ڈالا۔ ان شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے کانگریس، لیگ، جمعیۃ علماء اور خلافت کانفرنس کے اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں منعقد ہوئے۔ اگر مولانا کچھ پہلے رہا ہو جاتے تو وہ بھی ضرور ان میں شریک ہوتے۔

بین الاقوامی سیاست کے میدان میں پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کو جرمنی پر فتح حاصل ہوئی لہٰذا ترکی کو بھی شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ کیوں کہ اس نے جنگ میں برطانیہ کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ اتحادی طاقتوں نے ترکی کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہندستان کے مسلمان کانپ اُٹھے۔ کیوں کہ ترکی خلافت کا مرکز تھا اور وہاں کا سلطان عالمی اسلامی برادری کا خلیفہ تھا اس لیے ترکی کے خلاف برطانیہ کے اقدامات کو خلیفہ کے خلاف اقدامات سے تعبیر کیا جانا فطری تھا۔

ان تمام مسائل پر تبادلہ خیال کے دوران مولانا کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی جو پنجاب اور ترکی کے سلسلے میں انگریزی سامراج کے خلاف ایک موثر تحریک چلانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ یہ دو عظیم رہنماؤں کی پہلی ملاقات تھی اگر چہ وہ دونوں غائبانہ طور سے ایک دوسرے سے متعارف تھے۔ دوبدو ملاقات کا پہلا موقعہ تھا۔ پہلی ہی ملاقات بڑی تاریخ ساز ثابت ہوئی کیوں کہ جب گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک کا خاکہ پیش کیا تو خود مولانا کے الفاظ

میں ''میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر کہا کہ میں ان کے پروگرام کو پوری طرح منظور کرتا ہوں۔ اگر لوگ واقعتاً ترکی کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے گاندھی جی کے سمجھائے ہوئے پروگرام کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا'' اور اس طرح عدم تعاون کا آغاز ہو گیا۔ پروفیسر سرن مکر جی نے لکھا ہے کہ ''اس تحریک کے بانی کی حیثیت سے جس قدر حصہ گاندھی جی کا تھا اسی قدر مولانا آزاد کا بھی تھا۔''

مولانا نے خلافت کانفرنسوں کے ذریعے اس تحریک کو کامیاب بنانے اور عوام کو اس میں شامل ہونے کے لیے تیار کرنے کے سلسلے میں بڑی محنت کی۔ انھوں نے تحریک عدم تعاون کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے اسے کانگریس کے پلیٹ فارم پر منظوری حاصل کرنے کے سلسلے میں بھی گاندھی جی کی بڑی مدد کی اور عملی طور پر اس میں حصہ لیا۔ اس تحریک میں طلبہ سے کہا گیا تھا کہ وہ سرکاری مدارس سے بے رُخی اختیار کر لیں۔ اس کے پیش نظر مولانا نے کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے طلباء کو اپنے مدرسہ کو خیر باد کہہ دینے پر راضی کر لیا اور انھیں ناخدا مسجد میں اپنے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ میں داخل کیا جس کا افتتاح گاندھی جی نے کیا۔ اس سے پہلے مولانا اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے سلسلے میں بھی کامیاب کوشش کر چکے تھے۔ بعد ازاں مولانا نے کراچی میں منعقدہ خلافت کانفرنس کی اس قرارداد کی پرزور تائید کی جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ''مسلمانوں کے لیے فوج میں بھرتی ہونا اور فوج کی ملازمت کرنا حرام ہے۔'' انھوں نے آگرہ میں منعقد ہونے والی خلافت کانفرنس (اکتوبر ۱۹۲۱ء) کی صدارت کرتے ہوئے کراچی میں منظور شدہ قرارداد کی تائید کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

> ''...... میں نے سپاہیوں سے کہا ہے کہ بارش کی بوندوں کی طرح خدا کی لعنت تم پر برس رہی ہے۔ اگر لعنت سے بچنا چاہتے ہو تو انگریزی راج کی غلامی چھوڑ دو۔ ...... ہاں ہاں میں نے سپاہیوں سے، ہندستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے اور جب تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں یہی کہتا رہوں گا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں اور جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو

ورغلاؤں اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری کو چھوڑ دو۔ کیا عظیم الشان برٹش گورنمنٹ جس کی حکومت میں سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ گرفتار کرے؟ اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب پورا ملک کر رہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے کہا ہے اور لوگوں سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس جاؤ اور انھیں یہ پیغام سناؤ۔ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتی ہے تو کیوں نہیں قدم آگے بڑھاتی؟ کیا گورنمنٹ کی مشنری پر فالج گر گیا ہے؟''

حکومت نے مولانا آزاد کی اس صدارتی تقریر کو ایک کھلا ہوا چیلنج سمجھا اور بالآخر دسمبر ۱۹۲۱ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور دیش بندھو چترنجن داس کے ساتھ پریزیڈنسی جیل علی پور میں قید کر دیا۔ مولانا نے اپنے خلاف مقدمے کی کارروائی میں ستیہ گرہی کی حیثیت سے کوئی حصہ نہیں لیا تاہم انھوں نے عدالت میں ایک تحریری بیان ضرور داخل کیا جو بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور ''قول فیصل'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس بیان میں مولانا نے حکومت کو ایک ناجائز بیوروکریسی سے تعبیر کیا، جو کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہشوں کی دشمن تھی اور ہمیشہ انصاف اور صداقت پر اپنے جھوٹے وقار کو ترجیح دیتی تھی۔ ہندستانیوں کے خلاف حکومت کے ظالمانہ رویے کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے اپنے بیان میں لکھا کہ:

''...... وہ جلیان والا باغ امرتسر کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے وہ انسانوں کے لیے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں۔ وہ بے گناہ ترکوں کو صرف ایسے تازیانہ کی ضرب سے بے ہوش ہو جانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بت کی طرح یونین جیک کو سلام نہیں کرتے وہ بیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی۔ وہ اپنے تمام وعدوں کو توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی وہ سمرنا اور تھریس کو صریح نامنصفانہ طور پر یونانیوں کے حوالے کر دیتی ہے اور پھر تمام اسلامی

آبادی کے قتل وغارت کا تماشہ دیکھتی ہے۔ انصاف کی پامالی میں اس کی جرأت اور دلیری بالکل بے باک ہے اور حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے اس کے منہ میں کوئی لگام نہیں۔ سمرنا میں ستر فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے مگر وزیر اعظم بغیر کسی شرمندگی کے مسیحی آبادی کی اس میں کثرت کا اعلان کر دیتا ہے۔ یونانی حکومت تمام اسلامی آبادی کو خون اور آگ کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے لیکن وہ بے دھڑک ترکی مظالم کی فرضی داستانیں بیان کرتا رہتا ہے۔ پھر نہ تو ان تمام مظالم اور جرائم کے لیے اعتراف ہے نہ تلافی بلکہ ملک کی جائز اور باامن جدوجہد کو پامال کرنے کے لیے ہر طرح کا جبر وتشدد شروع کر دیا جاتا ہے۔ کیا یہ صرف اس لیے ہے کہ ظالم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے۔ اس کا حق دار ہو جاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے۔''

مولانا کا یہ بیان کسی ملزم کا بیان نہیں بلکہ ہندستانی عوام کی جانب سے خود حکومت کے خلاف فرد جرم تھا۔ اس میں انھوں نے حکومت کے خلاف الزامات شمار کرائے تھے۔ اس میں بے باکی تھی اور دلیری بھی، جرأت تھی اور بے خوفی بھی۔ اسی بیان میں انھوں نے اقرار کیا کہ وہ بار بار مسلمانوں کو عدمِ تعاون کا مشورہ دیتے رہے ہیں اس لیے انھیں اپنے جرم سے انکار نہیں۔ اپنے بیان کے اخیر میں عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے کہا:

''مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کی ایک دلچسپ اور عبرت انگیز بات ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمھارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی! میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد

یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلے لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے، وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری ہوگا۔''

مولانا کا یہ تحریری بیان ترک موالات کے دور کے ہر ہندستانی کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، جو عدمِ تشدد اور صداقت پر مبنی تھا اور یہی وہ ہتھیار ہے جس کی بنیاد پر گاندھی جی نے اس تاریخی تحریک کی عمارت تعمیر کی۔ مولانا اور گاندھی جی کے خیالات میں یکسانیت اور یگانگت نے تاریخ کو ایک نیا موڑ دے دیا تھا۔ مولانا کے اس دلیرانہ اور جرأت مندانہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے گاندھی جی نے لکھا کہ ''اس سے زیادہ مؤثر، صداقت سے پر اور بے باک بیان کسی اور ستیہ گرہی کا نہیں ہوسکتا۔'' بعدازاں اسی قسم کا بیان اپنی گرفتاری کے بعد گاندھی جی نے بھی عدالت میں دے کر مولانا کی ہم نوائی کی تھی۔ فروری ۱۹۲۲ء میں مولانا کو ایک سال کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ فیصلہ سننے کے بعد مولانا نے مسکراتے ہوئے مجسٹریٹ سے کہا کہ ''یہ سزا تو بہت کم ہے اور میری توقع کے خلاف بھی۔'' یہ مولانا کی دوسری اسارت تھی۔ پہلی نظر بندی ''الہلال'' کی بے باک تحریروں کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی۔ اب دوسری قید کی سزا بھی مسلمانوں کو فوج میں بھرتی نہ ہونے اور برطانوی حکومت کی حمایت میں جنگ نہ کرنے کے فتویٰ کے خلاف سنائی گئی تھی۔ یہ باقاعدہ قید تھی جس نے انھیں قیدیوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس قید کے دوران مولانا نے ''تذکرہ'' کی دوسری جلد مکمل کی جو بعدازاں ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

اسی دوران گاندھی جی نے ترکِ موالات کی تحریک واپس لے لی اور کانگریس کے رہنما اختلافات کا شکار ہوکر ''پرو چینجرز'' اور ''نو چینجرز'' میں بٹ گئے۔ پرو چنجرز انتخابات میں حصہ لے کر کونسلوں کی کارکردگی کو معطل کرنے کے حق میں تھے۔ جبکہ ''نو چنجرز'' اسے ترک موالات کے پروگرام کی اسپرٹ کے منافی تصور کرتے تھے اور اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے مخالف تھے۔ اس مسئلے کو سلجھانے کی اہم ذمے داری بھی ان کی

رہائی کے بعد مولانا آزاد کے کاندھوں پر آ گئی۔ انھوں نے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، کئی جلسے منعقد کیے اور رہنماؤں کے دونوں گروہوں میں مصالحت کی کامیاب کوششیں کیں۔ انھوں نے جنوری ۱۹۲۳ء میں دونوں گروہوں کے سامنے مندرجہ ذیل چھ نکاتی پروگرام پیش کیا:

۱۔ دونوں گروہ اگلے تین مہینے تک کانگریس میں طے شدہ پروگرام پر عمل درآمد کریں گے۔

۲۔ اس عرصے میں نہ تو کوئی نئی پارٹی بنائی جائے گی اور نہ کونسل میں داخلے کی بات کی جائے گی۔

۳۔ اگر اس مدت میں سول نافرمانی کرنے کا فیصلہ ہو جائے تو دونوں گروہ اس پر عمل کریں گے۔

۴۔ اگر یہ اقدامات ممکن ہوں تو صورت حال کا جائزہ لینے کی غرض سے کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا جائے۔

۵۔ خصوصی اجلاس سے ایک ماہ قبل دونوں گروہوں کو اپنی موافقت میں رائے عامہ ہموار کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

۶۔ کانگریس کے فیصلے کو نئی پارٹیاں بنائے بغیر دونوں گروہوں کے لیے عملی جامہ پہنانا لازمی ہوگا۔

اس طرح خصوصی اجلاس کی تجویز بھی مولانا ہی کے پروگرام کا ایک اہم حصہ تھی، اسی لیے مولانا کے تدبر اور وقار نے ملکی رہنماؤں کو مجبور کر دیا کہ وہ ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے خصوصی اجلاس کی صدارت کے لیے ان سے درخواست کریں جو دلی میں منعقد ہو رہا تھا۔ کانگریس کی صدارت کرنے والے وہ سب سے کم عمر رہنما تھے جن کی عمر پینتیس سال تھی۔ اپنے خطبہ صدارت میں مولانا نے قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر صورتِ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مستقبل کے لیے ہندستانیوں کی ذمے داریوں پر روشنی ڈالی اور حال میں اپنائی جانے والی پالیسیوں پر اپنی مثبت رائے کا اظہار کیا۔ بین الاقوامی میدان میں انھوں نے ترکی اور اتاترک مصطفیٰ کمال کی کامیابی پر مسرت ظاہر کی اور ترکی کے لیے گاندھی جی کی قیادت میں تحریک

خلافت کے سر اس کا سہرا باندھا کیوں کہ ان سے زیادہ اس کامیابی پر مبارک کا مستحق کوئی اور نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ:

"...... جب کہ ہم ترکی کی فتح عظیم کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے قسطنطنیہ کے عالی شان ایوانِ خلافت کی طرف دیکھ رہے ہیں، تو بے اختیار ہمارا خیال ہندستان کے ایک قید خانے کی طرف بھی رجوع ہو جاتا ہے جس کی ایک کوٹھری کے اندر ہندستان کی سب سے بڑی شخصیت محبوس ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ترکی سے باہر کوئی انسان اس کا مستحق ہے کہ ترکی کی فتح پر اسے مبارک باد دی جائے تو وہ ہندستان کے قائداعظم مہاتما گاندھی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس مقصد کی حمایت میں اس وقت آواز اُٹھائی جب کہ خود ترکی کے اندر قومی دفاع کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی حقیقت شناس نگاہیں تھیں جنھوں نے اوّل نظر ہی میں اس مسئلے کی ساری وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کر لیا اور تمام ہندستان کو دعوت دی کہ یہ صرف مسلمان ہی کا نہیں بلکہ تمام ملک کا قومی مطالبہ ہے......"

مولانا کا یہ خیال صحیح تھا کہ اگر ترکی کی فتح یابی کے سلسلے میں دنیا میں کوئی شخص مبارک باد کا مستحق تھا تو وہ مہاتما گاندھی کی ذات تھی جو ترکِ موالات کی تحریک کے بانی تھے اور انگریزوں کی جیل میں محبوس تھے۔ یہ مولانا کی صدق گوئی اور فراخ دلی تھی کہ انھوں نے حق پسندی کا ثبوت دے کر گاندھی جی کی عظمت کا اعتراف کیا۔

مولانا کے خطبے کے دوسرے حصے ملکی سیاست سے متعلق تھے جن میں عدم تعاون کی تحریک بھی شامل تھی۔ دراصل یہی وہ تحریک تھی جو کانگریس کے خصوصی اجلاس کے انعقاد کا سبب بنی اور جس میں تبدیلی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان مصالحت کرانے کا بار مولانا کے کاندھوں پر آ پڑا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا نے واضح کیا کہ نان کوآپریشن پہلے ایک اخلاقی وعظ تھا مگر اب اس نے سیاسی پروگرام کی شکل اختیار کر لی تھی جس کی اصل روح عدمِ تشدد میں

مضمر تھی اور جس کے ہتھیاروں میں ایثار، ضبط نفس اور اخلاقی روح کی بلندی شامل تھی۔ اس سلسلے میں اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے کہا:

''آزادی ہمارا مقصد ہے، عدمِ تشدد اور نان کوآپریشن ہمارا اصول ہے اور حصولِ مقصد کے لیے ہم نے ایک پروگرام اختیار کیا ہے جس کی ہر دفعہ ایک وسیلہ ہے، مقصد ہے۔ ہم اعتقاد نہیں بدل سکتے، ہم اصول نہیں ترک کر سکتے لیکن ہم وسائل میں ہر آن اور ہر لمحہ تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اگر اس تبدیلی سے ہمیں انکار ہوگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ سے انکار کردیں۔''

اس طرح مولانا نے نان کوآپریشن کی حمایت میں اپنا قیمتی ووٹ دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا کہ بدلتے ہوئے حالات میں آزادی کے مقصد کے حصول کی خاطر وہ وسائل میں تبدیلی کرنے کی موافقت میں ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ ایسا اختلافی مسئلہ نہ تھا جس کی خاطر اتحاد، سرگرمی اور اپنا وہ سب کچھ جو ہندستانیوں نے حاصل کیا تھا خطرے میں ڈال دیا جائے انھوں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

''......ہندستان کے لیے آج صرف تین راہیں ہیں یا موجودہ حالات پر قانع رہے یا مسلح انقلاب کرے یا نان کوآپریشن پر عمل کرے۔ ہم موجودہ حالات پر قانع نہیں رہ سکتے، ہم مسلح انقلاب نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ بس ہمارے لیے تیسری راہ سچائی کی ہے اور وہ نان کوآپریشن ہے۔''

''نو چنجرز'' اور ''پرو چنجرز'' کے اختلافات کو رفع کرنے اور ان دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے مولانا نے ایک نسخہ تجویز کرتے ہوئے کہا کہ:

''میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے، دوسری طرف کونسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں

جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے تحت دونوں جگہ کام ہو۔''

مولانا نے اس اختلافی مسئلے کو بحسن وخوبی حل کر کے کانگریس کو منقسم ہونے سے بچالیا اور دونوں گروہوں کو مطمئن کر دیا مگر انھوں نے واضح کر دیا کہ کونسلوں میں داخلہ ایک مقررہ پروگرام کے ماتحت تھا اس پروگرام میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو ہندستانی کے طرزِ عمل کو شرکت عمل کی آلودگی سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔ ویسے انھیں یقین تھا کہ کونسلوں میں پہنچ کر زیادہ مدت تک کام جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا کیوں کہ ان کا مقصود کسی صورت میں بھی شرکت عمل نہیں تھا۔ نتیجے میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آ گیا جس کے اُمیدواروں نے انتخابات میں حصہ لے کر قانون ساز سیاست کی بنیاد رکھی۔

باہر رہ کر کام کرنے کے سلسلے میں مولانا نے ایک نکاتی لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ اس کے تحت

(۱) تعمیری پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ،

(۲) ملک کی مزدور جماعتوں کی تنظیم اور

(۳) عوام کی سیاسی تعلیم شامل تھے۔

اس سلسلے میں ان کا اصرار تھا کہ سب سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کی سمت میں توجہ کی جانی چاہیے۔ اس نقطے کو واضح کرتے ہوئے ان کے تاریخی الفاظ ہماری تاریخ کے سنہری حروف بن گئے۔ انھوں نے کہا:

> ''......یہ (ہندو مسلم اتحاد) ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندستان کی آزادی کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں، محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اس سے ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطے کہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو

جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

مولانا نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد میں اپنے یقین کو عزیز رکھا اور اسے استحکام بخشا۔ مہاتما گاندھی کی طرح وہ بھی اتحاد کو ہر مقصد سے بالاتر رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں کو علاحدگی کی پالیسی ترک کر کے کانگریس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ انھیں ملک کی آزادی کو نصب العین قرار دے کر فرقہ وارانہ تنظیموں سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ انھوں نے تبلیغ و تنظیم اور شدھی اور سنگھٹن کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''......آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ ''انڈین نیشنل کانگریس'' ہے۔'' غرضے کہ مولانا نے ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے دو گروہوں کو یکجا کر کے انھیں مصالحت پر آمادہ کر لیا اور ہندو مسلم اتحاد کو حصول آزادی کے لیے لازمی عنصر قرار دیا۔ دراصل مولانا کے نزدیک یہ اتحاد ہمیشہ لازمی رہا۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں برابر اس کی تبلیغ اور تشہیر کی اور زندگی بھر اس مشن میں مصروف رہے ان کی زندگی کا بیشتر حصہ فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرنے اور اختلافات رفع کرانے میں صرف ہوا۔ وہ ہر امن کانفرنس میں شریک ہو کر اہم کردار ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں فسادات کے خلاف مہاتما گاندھی کے برت کے دوران منعقدہ اتحاد کانفرنس میں اہم حصہ لیا اور مسلمانوں کی جانب سے مہاتما جی کو ہندو مسلم اتحاد کے لیے جان و دل سے کام کرنے کا یقین دلایا۔ اس یقین دہانی کے بعد ہی مہاتما جی نے اپنا برت ختم کیا۔

۱۹۲۵ء میں مولانا نے آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت، جمعیۃ علماء کے اجلاس کی صدارت کی اور بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کرنے اور ہاتھ سے کاتے گئے سوت سے کپڑا بن کر پہننے کی تلقین کی۔ اس پورے عرصے میں ان کا پیغام یہی تھا کہ محض باہمی میل ملاپ اور بھائی چارہ ہی کے ذریعے ہندستان آزاد ہو کر پنپ سکتا ہے۔

ترکی میں اتاترک کے برسر اقتدار آنے اور بادشاہت اور خلافت کے خاتمے کے بعد ہندستان میں خلافت کمیٹی کی موجودگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ بہت سے مسلمان رہنما اسے ختم کر دینے کے حق میں تھے تو کچھ دوسرے اس کے وجود کی حمایت میں تھے۔ مولانا آزاد نے کان پور میں خلافت کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے نئے حالات کے پیش نظر اس انجمن سے مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شامل ہو کر حصول آزادی کے لیے جدوجہد کرنے پر اصرار کیا کیوں کہ ان کے نزدیک یہ کمیٹی عمل کی علامت تھی۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کی طرح کمیٹی کے لیے ایک تعمیری پروگرام بھی مرتب کیا تاکہ سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ سماجی تحریک بھی پروان چڑھتی رہے۔ انھوں نے اس سے تعلیمی میدان میں کام لینا چاہا۔ اس لیے پورے سال کے لیے ایک تعلیمی پروگرام طے کر دیا تاکہ کمیٹی اسے اختیار کر سکے۔ اس کے تحت چار نکاتی لائحہ عمل بنایا گیا:

(۱) عوام میں خواندگی کی اشاعت و تبلیغ کے لیے شبینہ اسکولوں کا قیام عمل میں لایا جائے یا مسجدوں کو استعمال کیا جائے۔

(۲) عوام کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح و ترقی کے لیے تعلیم گاہوں کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں لکچر دیے جا سکیں اور ماہانہ نصاب مرتب کیا جا سکے۔

(۳) ریڈنگ روم قایم کیے جائیں۔

(۴) جمعہ کے خطبے کے طریق میں اصلاح کی جائے تاکہ سامعین مفید معلومات سے مستفیض ہو سکیں۔

اس طرح مولانا نے ایک بے بس اور بے کس ادارہ کو فعال بنا دیا اور ایک بے روح جسم میں نئی روح داخل کر دی۔ اب جو خلافت کمیٹی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی وہی ایک متحرک انجمن کی شکل میں عملی اور تعمیری کاموں کے لیے مسلمانوں کا مرکز بن گئی۔ اگر اس وقت خلافت کمیٹی کو مولانا آزاد کی سربراہی نصیب نہ ہوتی تو وہ محض ماضی کی تاریخ کا ایک حصہ ہو کر رہ جاتی۔

ان تمام کوششوں کے باوجود ملک فرقہ وارانہ منافرت کا شکار رہا لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری۔ دراصل وہ انسانیت میں یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے مسلم ہندو اتحاد کی جہت میں ایک

اور کوشش کی اور جولائی ۱۹۲۶ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر ایک غیر سیاسی انجمن بنائی جس کا نام انڈین نیشنل یونین رکھا گیا۔ اس انجمن کا مقصد ایسے روشن خیال اشخاص کو منظم کرنا تھا جن کے نزدیک فرقہ واریت قوم پروری کی دشمن تھی اور جو فرقہ وارانہ منازعات کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی تباہ کاری کا سبب خیال کرتے تھے۔ اس یونین کے ذریعے مولانا آزاد اور موتی لال نہرو نے ملے جلے بورڈ بنائے تاکہ مختلف فرقوں کے درمیان باہمی اختلاف رفع ہو سکیں۔ بعدازاں اس کے مقاصد میں پنچایت کا قیام بھی شامل کر لیا گیا۔ اسی زمانے میں شملہ میں یونٹی کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور مولانا نے ان تمام میں حصہ لیا، انھوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے لیے رائے عامہ ہموار کی اور نہرو کمیٹی کے ذریعے مرتب کردہ ایک آئینی ڈھانچا پر مسلم لیگ کے ساتھ گفت وشنید میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۲ر مارچ ۱۹۳۰ء کو مہاتما گاندھی کا تاریخی ڈانڈی مارچ شروع ہو کر ۶ر اپریل کو ختم ہوا انھوں نے نمک کا قانون توڑ کر ملک بھر کو قانون شکنی کے لیے تیار کیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر حکومت نے ہندستان کے رہنماؤں کو جیلوں میں بھرنا شروع کر دیا۔ مولانا ستیہ گرہی کی حیثیت سے میرٹھ میں گرفتار کر لیے گئے۔ اس وقت ان کی نامزدگی کانگریس کے صدر کی حیثیت سے عمل میں آئی تھی۔ کیوں کہ ہر کانگریسی رہنما اپنی گرفتاری سے پہلے اپنے جانشین کو نامزد کر جاتا تھا اسی لیے مولانا آزاد نے بھی اپنی گرفتاری پر ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس اسیری کے دوران مولانا نے ترجمان القرآن کا خاصہ بڑا حصہ مکمل کیا کیوں کہ کامل ستائیس برس سے قرآن پاک ان کے شب و روز کی فکر کا موضوع رہ چکا تھا اس لیے انھوں نے ”اس کی ایک ایک سورۃ ایک ایک مقام، ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر...... وادیاں گزار کر مرحلے طے کیے۔“ دراصل اسیری نے ان کے لیے ہمیشہ تصنیف و تالیف۔ ۔ کے لیے وقت فراہم کیا اور یہی وہ وقت تھا جب انھوں نے اُردو ادب کو اپنے شاہکاروں سے مالامال کیا۔ ان کی رہائی ۱۹۳۱ء میں عمل میں آئی جو گاندھی ارون پیکٹ کا نتیجہ تھی۔ رہائی کے فوراً بعد مولانا نے کراچی میں جمعیت علماء کے اجلاس کی صدارت کی جو کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ہی منعقد کیا گیا تھا۔ گاندھی ارون پیکٹ کی رو سے مہاتما گاندھی نے لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت قبول کر لی تھی

اور کانگریس نے بھی انھیں اپنا واحد نمایندہ منتخب کیا تھا مگر مولانا مہاتما جی کے لندن جا کر کانفرنس میں شرکت کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک اگر چہ کانفرنس میں گاندھی جی کی موجودگی برطانوی حکومت کے ہند سے متعلق آئینی حیثیت کو مسلم کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی تھی تاہم فیصلوں کو کانگریس کی پالیسی سے مختلف ہونا تھا اور یہی ہوا بھی۔ کیوں کہ دوسری گول میز کانفرنس میں مہاتما گاندھی کو اپنا نقطہ نظر پیش کر کے حکومت کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور انھیں لندن سے خالی ہاتھ واپس ہونا پڑا۔ واپسی پر انھیں معلوم ہوا کہ حکومت نے ہندستانیوں پر مظالم کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے نتیجے میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مولانا آزاد بھی گرفتار کر کے جیل میں محبوس کر دیے گئے جہاں سے انھیں ایک سال بعد رہا کیا گیا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد کانگریس نے پہلی مرتبہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے الیکشن میں حصہ لینا منظور کیا۔ اس کے پس پشت بھی مولانا ہی کا ہاتھ تھا کیوں کہ ان کے نزدیک کانگریس کو اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ الیکشن کے سلسلے میں مولانا نے خاصی تگ و دو کی اور ۱۹۳۷ء میں جب الیکشن کے نتائج برآمد ہوئے تو کانگریس کو سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور صوبہ سرحد میں کانگریس سب سے بڑی اکثریتی جماعت کی حیثیت سے کامیاب رہی۔ اس نمایاں کامیابی کے باوجود کانگریس کے کچھ رہنما صوبوں میں حکومت سازی کے مخالف تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صوبائی گورنروں کو نئے ایکٹ نے بے شمار اختیارات دیے تھے اس لیے کانگریس رہنماؤں کو خدشہ تھا کہ وہ صوبائی وزیروں کی روزمرہ کارروائیوں میں مزاحم ہوں گے۔ مگر مولانا کا خیال تھا کہ کانگریس کو اپنی کارکردگی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع اور نہیں مل سکتا تھا۔ دراصل اقتدار آئے بغیر کانگریس کے لیے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہ تھا۔ ان کے نزدیک اگر کانگریس کو کسی مسئلہ پر اقتدار سے دست کش ہونا پڑا تب بھی اس کا وقار برقرار رہتا بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا۔ کانگریس کے رہنماؤں نے جن میں مہاتما گاندھی بھی شامل تھے، مولانا کے خیالات سے اتفاق کیا اور انجام کار کانگریس نے صوبوں میں حکومت سازی کا بار اپنے ذمہ لینا قبول کر لیا۔ مولانا کے الفاظ میں ''یہ ایک تاریخی

فیصلہ تھا کیوں کہ اب تک کانگریس نے صرف ایک منفی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر اقتدار کی ذمے داری کو قبول کرنے سے انکار کیا مگر اب پہلی بار انتظامیہ کے سلسلے میں کانگریس نے ایک مثبت رویہ اپناتے ہوئے حکومت سازی کی ذمے داری کو قبول کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا تھا'' اس سلسلے میں کانگریس نے ایک سہ رُکنی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی جس میں ڈاکٹر م راجندر پرساد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کے علاوہ مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ بورڈ کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ کانگریسی حکومتوں پر نظر رکھے اور اسے ضروری مشورے دے۔ اس طرح مولانا پورے ستائیس مہینے تک کانگریسی حکومتوں کی نگرانی میں مصروف رہے۔ اس پوری مدت میں کانگریس نے شاندار کام انجام دیے اور عوام کی خدمت کا بیڑہ اُٹھایا۔ اس کے اہم کارناموں میں زمینداری کا خاتمہ اور زراعتی قرضہ جات کی معافی شامل ہیں۔ مولانا نے صوبجاتی انتظامیہ کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لی اور ان کے ہر مسئلے کو سلجھانے میں کامیاب رہے۔ دراصل ان کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے آپ کو کانگریس کے کسی مخصوص گروہ سے وابستہ نہیں کیا بلکہ ہر معاملے میں غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور ہر موقعے پر صحیح مشوروں سے نوازا۔ کانگریسی حکومتیں بڑی کامیابی کے ساتھ سرگرم کار تھیں کہ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی حکومت کی ہندستان کو جنگ کے شعلوں میں دھکیل دینے کی پالیسی کے خلاف انھیں احتجاجاً مستعفی ہونا پڑا۔ اس موقعے پر مسلم لیگ نے کانگریسی صوبجاتی حکومتوں کے خلاف ظلم وزیادتی کی شکایتوں کو اکٹھا کر کے انھیں پیرپور رپورٹ کے نام سے شائع کیا تو مولانا نے اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھا کہ خصوصی طور پر کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کا پروپیگنڈا اسی بنیاد پر تھا کہ وہ ایک نام نہاد قومی انجمن ہے۔ جب کانگریس نے اس سے اتفاق نہ کیا تو مسلم لیگ نے کانگریس پر یہ الزام عائد کیا کہ اس کی وزارتوں نے اقلیتوں پر بے شمار مظالم کیے۔ مولانا نے بعدازاں لکھا کہ ''میں اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ الزامات قطعی بے بنیاد تھے اور یہی رائے وائسرائے اور مختلف صوبوں کے گورنروں کی بھی تھی۔ اگر ان الزامات میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو میں اس ناانصافی کے خلاف نہ صرف آواز بلند کرتا بلکہ میں تو اس مسئلے پر مستعفی ہونے تک کے لیے تیار تھا۔''

مارچ ۱۹۴۰ء میں کانگریس نے صدارت کا بار دوبارہ مولانا آزاد کے کاندھوں پر رکھ دیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں خصوصی اجلاس کی صدارت کی ذمے داری انھیں سونپی گئی تھی مگر اب دوسری جنگ عظیم کے دوران جب ملک سیاسی اور اقتصادی بحران کا شکار تھا، قوم نے پھر مولانا کو اپنی اُمیدوں کا مرکز بنانے ہی میں عافیت کا احساس کیا۔ اگر چہ پچھلے برسوں میں بھی مولانا سے اس ذمے داری کو قبول کرنے کی درخواست کی جا چکی تھی مگر مولانا تیار نہ ہوئے۔ اب حالات کی نوعیت مختلف تھی اور اس منصب کو قبول کرنا کسی چیلنج سے کم نہ تھا، اس لیے مولانا رضامند ہو گئے۔ ۲۰ رمارچ کو بہار میں واقع رام گڑھ نامی مقام پر کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبۂ صدارت میں گزشتہ برسوں میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کا جائزہ لیتے ہوئے ان تجاویز کا ذکر کیا جو کانگریس نے اپنائی تھیں۔ ان تجویزوں کے ذریعے کانگریس نے اعلان کیا تھا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فاشزم اور نازی ازم کی ارتجاعی تحریکوں کو ہندستان نے دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصور کیا اور ان قوموں کی حمایت کی جو آزادی اور جمہوریت کی حفاظت میں ان تحریکوں کے خلاف صف آرا تھیں لیکن ہندستان جرمنی کے خلاف برطانیہ کی حمایت میں صرف اسی وقت حصہ لے سکتا ہے جب اسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ اگر ہندستان کو آزادی کی نعمت سے محروم رکھا گیا تو ''ہندستان کسی حالت میں تیار نہیں کہ ایسی حالت میں برطانوی شہنشاہی کی فتح مندی کے لیے مدد کرے۔''

مولانا نے کہا کہ برطانوی حکومت نے دوسری عالمگیر جنگ میں ہندستان کو جبراً دھکیل دیا اور یہاں کے رہنماؤں سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا جب کہ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی آفریقہ اور آئرلینڈ، غرضے کہ سبھی نے جنگ میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہری مداخلت کے کیا۔ اس لیے کانگریس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ صوبجات میں اپنی حکومتوں سے مستعفی ہو جانے کے لیے کہے۔ جنگ میں حصہ نہ لینے کے کانگریس کے موقف کے بارے میں واضح الفاظ میں انھوں نے اعلان کیا کہ:

''......ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں ہمارا مقصد بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل جا رہی ہے۔''

مولانا کے یہ الفاظ برطانوی حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت سے تعبیر کیے جا سکتے ہ کیوں کہ جرمنی کے خلاف برطانیہ کی جنگ کی مخالفت اور اس میں حصہ نہ لینے کے لیے لوگو آمادہ کرنا سراسر بغاوت کے مترادف تھا مگر وقت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ مولانا واضح الفاظ میں ا موقف ظاہر کر کے لوگوں کو اپنا ہم نوا بناتے۔ دراصل برطانوی رہنماؤں نے دنیا کو یقیناً دلا۔ کی کوشش کی تھی کہ برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہے جب ک ہندستان سے بڑھ کر اور کوئی ملک نہیں ہو سکتا تھا جو اس اعلان کا استقبال کرتا۔ مگر واقعہ یہ ہے ک باوجود اعلان کے برطانوی سامراج اسی طرح امن و انصاف کی راہ میں مزاحم تھا جس طرح ک وہ جنگ سے پہلے تھا۔

مولانا نے ہندستان میں فرقہ وارانہ مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا ک اگرچہ ملک میں یہ مسئلہ اہمیت کا حامل ہے اور اس کی اہمیت کو کانگریس نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے. تاہم برطانوی حکومت نے اسے ہوا دی اور اسی مسئلے کو آزادی کے حصول کی راہ میں مزاحمت ک سبب بتایا۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندستان ہی کے حصے میں نہیں آیا تھ بلکہ دنیا کے دوسرے حصے بھی اس مسئلے سے دوچار تھے۔ کانگریس نے اس سلسلے میں واضح کر د کہ ہندستان کے آیندہ آئین میں اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کی پوری ضمانت ہو گی اور ان کے لیے جن تحفظات کی ضرورت تھی اس کا فیصلہ خود اقلیتیں کریں گی۔ اس لیے کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ کانگریس کے ساتھ اس مسئلے پر اور خود اپنے تعلق کو واضح

رتے ہوئے مولانا نے کہا:

''میں انیس برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا جس کی ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گزرا جب اس نے اس مسئلے کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقے سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرزِ عمل بھی تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرزِ عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔''

مولانا نے کہا کہ ''ہم میں فرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں فرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں فرقے مٹانے چاہئیں۔'' اس طرح اقلیتوں کے ذہنوں میں عدمِ تحفظ کا احساس حکومت ہی کا پیدا کردہ ہے۔

مولانا نے اعلان کیا کہ ہندستان کا آیندہ آئین وفاقی ہوگا اور جمہوریت اس کی اساس ہوگی۔ جس کے کل حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات کے خودمختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات ہوں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ ایسی صورت میں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو تیسری طاقت ہی ہوا دیتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کی رائے وہی تھی جس کا اظہار انھوں نے برسوں پہلے ''الہلال'' کے صفحات پر کیا تھا۔ انھوں نے مختلف فرقوں کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے اور باہمی اشتراک کو مستحکم بنانے کی دعوت دی تھی۔ مولانا نے مسلمانوں کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور آج بھی بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان

ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچر دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔''

مولانا کے ان الفاظ میں جس عقیدے کا اظہار ہے اسے ہر ہندستانی مسلمان کے عقیدے اور اس کی حیثیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں اس کی قومی حیثیت بھی مضمر ہے اور اس کے اسلامی وجود کی مرکزیت کا احساس بھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ پورا اقتباس جس طرح حصولِ آزادی سے پہلے بامعنی تھا اسی طرح اتنی ہی معنویت کا حامل آج بھی ہے۔ ہندستانی قوم کا تصور مسلمان کے وجود کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی حیثیت آج بھی اتنی ہی مسلم ہے جتنی کہ اُس دور میں تھی۔ ان الفاظ سے مولانا نے دراصل انگریزوں کے خیالات کی نفی کی ہندو فرقہ پرستوں کو منہ توڑ جواب دیا، علاحدگی پسند مسلمانوں کے گمراہ کن پروپیگنڈے کو بے نقاب کیا اور ہندستانی مسلمان کی اصل تصویر کو پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں مولانا نے تاریخ کے صفحات کا سہارا لے کر تہذیبوں کے اشتراک سے ایک نئی تہذیب کے اُجاگر ہونے کے عمل کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا:

''ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین

انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر یکے بعد دیگرے سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیب کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اپنے اسلام کے ذخیرہ کی سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا۔''

اس اقتباس نے مولانا نے دو تہذیبوں کے اشتراک سے ظہور میں آنے والی ہندستانی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ ''جمہوریت'' اور ''انسانی مساوات'' ہندستان کو اسلام کی دین ہیں۔ مولانا نے آگے کہا:

''تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا

ہے۔ گر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو، سلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اُٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندستانی ہوں اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔''

غرضے کہ مولانا نے ہندو مسلم اور عیسائی تینوں کے ہندستانی ہونے کا دعویٰ فخر کے ساتھ پیش کیا اور انھیں ایک متحدہ قومیت کی تسبیح میں پروکران کے رشتے کو پائیدار کیا۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے کہا:

''گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر دیا، ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر وہ اب ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اُسے چھوڑ کر اُس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو

چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے......"

مولانا کے عقائد ان الفاظ میں منعکس ہیں اور یہی وہ پیغام ہیں جو انھوں نے "الہلال" کی تحریروں کے ذریعے سیاست کے کوچے میں قدم رکھنے سے پہلے ہندستان کے مسلمانوں کو خصوصاً اور ہندستان کے عوام کو عموماً دیا تھا۔ دراصل مولانا حقیقت پسند تھے اور اسی حقیقت پسندی کی عینک سے انھوں نے عصری سیاست کو دیکھا اور وقت کے تقاضوں کو باقاعدگی سے سمجھ بوجھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے خطبے کے آخری حصے میں کہا:

"ہماری اس ایک ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"

مولانا کے خطبے کا ایک ایک لفظ دورِ حاضر میں بھی اتنی ہی معنویت کا حامل ہے جتنا کہ وہ خود ان کے عہد میں تھا۔ اس تاریخی خطبے میں مولانا نے لوگوں کو قسمت کی تعمیر میں مصروف ہو جانے کی صلاح دی اور واضح کر دیا کہ ان کی تمام تر کامیابیوں اور کامرانیوں کا انحصار اتحاد،

ڈسپلن اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی کے اعتماد پر ہے۔ خود انھیں کے الفاظ میں ''یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تیار کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔'' دراصل انھیں مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر مکمل اعتماد تھا اور قیادت کسی بھی تحریک میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا بھی مہاتما جی کی قیادت کے قایل تھے اور انجام کار اسی رہنمائی نے ہندستان کو کامرانی کی دہلیز تک پہنچانے میں مدد کی۔ تاہم ضروری نہیں تھا کہ وہ مہاتما جی سے اختلاف نہ کرتے۔ درحقیقت مولانا کی نظر میں غلامی ہی ہر مسئلے کا سبب تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اگر ہندستان آزاد ہو جائے تو اسے جمہوریت پسند ملکوں کے گروہ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ جب کہ مہاتما جی کے لیے آزادی سے زیادہ عدم تشدد کی اہمیت تھی۔ مولانا اس رائے سے متفق نہیں تھے ان کے نزدیک کانگریس کوئی Pacifist جماعت نہیں تھی بلکہ حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی انجمن تھی تاہم وہ مہاتما جی کو اپنا قائد تصور کرتے تھے۔

ہندو مسلم اتحاد اور ہندستانی مسلمانوں کے سلسلے میں مولانا کے خیالات کو وقت کے اہم ترین مطالبات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک متحدہ قومیت ہندستان کا مشترکہ ورثہ تھی جو ناقابل تقسیم تھی۔ ان کا خطبہ ان علاحدگی پسند عناصر کے لیے سخت جواب تھا جو ہندو اور مسلمانوں کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں تقسیم کر کے انھیں بہکانے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ اسے ان کے خطبہ صدارت کا ردِ عمل ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تقریر کے تیسرے ہی دن یعنی ۲۳ ؍مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے اپنی لاہور قرارداد میں ہندستان کی متحدہ قومیت کی نفی کرتے ہوئے مسلمانوں کو ایک علاحدہ قوم کی حیثیت دے کر تقسیم وطن کا مطالبہ کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تھی جسے ان کی وکالت اور حمایت کرنے کا حق حاصل تھا۔ اس کے بعد مولانا کی راہ میں کانٹوں کے علاوہ کچھ نہ تھا جن پر گامزن ہو کر وہ آزادی کی منزل کی جانب سرگرم سفر رہے اور ۱۹۴۶ء تک سات برس کے طویل دور میں کانگریس کی قیادت کا بارگراں اُٹھائے رہے۔ کانگریس کی تاریخ میں مولانا کے علاوہ ایسی کوئی شخصیت نہیں اُبھری جس نے اتنے طویل عرصے تک اس انجمن کی صدارت اور رہنمائی کی ہو۔

یہ تاریخی دور اس سبب سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی زمانے میں تاریخی واقعات رونما ہوئے، انگریزوں کی جانب سے ہندستان کے آئینی مسئلے پر مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا اور جنگ کے خاتمے پر عالمی صورت حال نے کروٹیں بدلیں۔

مولانا کے دورِ صدارت میں کانگریس نے جنگ کے خلاف ایک محدود تحریک کا آغاز کیا جسے انفرادی ستیہ گرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا بھی گرفتار ہوئے اور دسمبر ۱۹۴۱ء میں رہا ہوئے۔ اسی دوران امریکہ بھی برطانیہ کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شامل ہو گیا۔ اس نے برطانیہ سے اصرار کیا کہ وہ ہندستانی رہنماؤں کو مذاکرات کے ذریعے جنگ کی حمایت کے لیے راضی کرے۔ اُدھر چین کے رہنما چیانگ کائی شیک نے ہندستانی رہنماؤں کو گفتگو کرنے کے بعد برطانوی حکومت کو ہندی رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات پر آمادہ کیا۔ نتیجے میں برطانوی حکومت نے مارچ ۱۹۴۲ء میں اپنے نمایندے سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندستان بھیجا۔ سر کرپس پہلے بھی ہندستان کے رہنماؤں سے تبادلہ خیال کر چکے تھے جن میں مولانا بھی شامل تھے۔ اس مرتبہ بھی سر کرپس نے مولانا سے ۲۹/مارچ سے ۹/اپریل تک ملاقاتیں کیں کیوں کہ کانگریس نے مولانا کو سر کرپس کے ساتھ مذاکرات کے لیے اپنا واحد نمایندہ نامزد کیا تھا۔ دوران مذاکرات سر کرپس نے واضح کیا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندستان کو آزادی حاصل ہو جائے گی۔ دورانِ جنگ میں وائسرائے کی کونسل بھی ہندستانی ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ انھوں نے ہندستان کو ایک یونین میں منتقل کرنے کی پیشکش کی جس میں صوبوں کو اختیار تھا کہ وہ اس میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ مولانا نے سر کرپس کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی اور دوران جنگ میں محکمہ دفاع کے ممبر کے اختیارات معلوم کرنے چاہے اور کمانڈر ان چیف کی حیثیت کے بارے میں وضاحت چاہی۔ اسی طرح انھوں نے کونسل کے نام کے بارے میں معلوم کیا کہ اسے کونسل کہا جائے گا یا کابینہ کے نام سے موسوم کیا جائے گا اور اس میں وائسرائے کی حیثیت کیا ہوگی۔ سر کرپس ان سوالات کا تشفی بخش جواب نہ دے سکے اس لیے مولانا کی سفارش پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کرپس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ اس سلسلے میں مولانا کا خیال تھا کہ جب کرپس ہندستان آئے تھے تو ان کا ذہن صاف تھا اور وہ حقیقتاً یہاں کے

آئینی مسئلے کو صدق دلی سے حل کرنا چاہتے تھے مگر وائسرائے اور دیگر اعلیٰ برطانوی افسروں سے روزانہ ان کی ملاقات اور چرچل اور ان کی کابینہ کے کٹر ہندو دشمن ممبروں کے ساتھ ان کے مسلسل رابطے نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے مشن میں ناکام ہو گئے۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد کانگریس نے ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں مولانا آزاد کی صدارت میں ہندستان چھوڑو، تحریک کی قرارداد پاس کی۔ اس کے نتیجے میں تمام رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مہاتما گاندھی کو پونا کے آغا خاں پیلس میں محبوس کر دیا گیا اور مولانا آزاد اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ احمد نگر کے تاریخی قلعے میں مقید کر دیے گئے۔ جہاں تقریباً تین برس سے کچھ کم عرصے تک ان کا قیام رہا۔ یہیں انھوں نے وہ تاریخی خطوط قلم بند کیے جو بعد ازاں غبارِ خاطر کے عنوان سے شائع ہوئے اور اُردو ادب کا بہترین سرمایہ کہلائے جانے کے مستحق ہوئے۔ دوران اسیری ہی میں مولانا کی رفیق و شریک حیات زلیخا بیگم نے اپنے شوہر کی مفارقت میں دم توڑ دیا۔ اگر چہ مولانا سے اصرار کیا گیا کہ وہ حکومت سے درخواست کر کے اپنی علیل بیوی کے قریب پہنچ جائیں مگر مولانا نے نہ تو درخواست کی اور نہ ہی مشروط طور پر رہائی منظور کی۔ زلیخا بیگم کی وفات نے انھیں دنیا میں بالکل تنہا کر دیا اور ذہنی طور پر وہ ٹوٹ کر رہ گئے مگر مادرِ وطن کی آزادی انھیں اپنے اعزہ سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کے لیے وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہر آزمائش پر پورے اُترے۔

اپریل ۱۹۴۵ء میں مولانا کو احمد نگر سے بانکوڑہ منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی صحت گر چکی تھی۔ وزن چالیس پونڈ گھٹ گیا تھا اور بھوک غائب ہو چکی تھی۔ بالآخر دو سال نو مہینے اسیر رہنے کے بعد انھیں ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو رہا کر دیا گیا تاکہ وہ شملہ کانفرنس میں حصہ لے سکیں جو ہندستان کے آئینی مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے منعقد کی جا رہی تھی۔ کانگریس نے مولانا کو اپنے واحد نمایندے اور ترجمان کی حیثیت سے شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے نامزد کیا۔ مذاکرات کے دوران جو تجاویز برطانوی حکومت کی جانب سے پیش ہوئیں وہ کرپس کی پیشکش سے مماثل تھیں تاہم بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جب کہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی

اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آ رہا تھا، مولانا نے انھیں منظور کر لیا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے اصرار کیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تھی اس لیے وائسرائے کی کونسل میں مسلمان ممبروں کی نامزدگی کا حق صرف اسی کو حاصل تھا۔ مولانا اس دعویٰ سے کبھی اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک سیاسی معاملات میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ کانگریس کے ایک ہندو تنظیم ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جب کہ وہ خود گزشتہ ربع صدی سے اس سے وابستہ تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اس کی صدارت کر چکے تھے اور پچھلے پانچ برسوں سے اس کی سربراہی کر رہے تھے۔ اس لیے ان کے نزدیک کانگریس کو مختلف فرقوں کے لوگوں کی نامزدگی کا پورا پورا اختیار تھا۔ مگر لیگ کی قیادت کو مولانا سے اتفاق نہ تھا اس لیے کانفرنس ناکام ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندستان کا آئینی مسئلہ طے کرنے کے سلسلے میں کوئی کانفرنس فرقہ وارانہ مسئلے کی نذر ہوئی۔ وائسرائے بھی لیگ سے متفق نہ تھا۔ بعدازاں پریس کے نمایندوں سے گفتگو کرتے ہوئے مولانا نے واضح کر دیا کہ لیگ کے اس دعوے کو قطعاً تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے۔ اس کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں کہیں بھی مسلم لیگ حکومت سازی نہیں کر سکتی تھی۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت تھی، بنگال میں گورنر راج تھا، پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی۔ سندھ میں سر غلام حسین کی وزارت تھی جسے کانگریس کی حمایت حاصل تھی اور ایسی ہی صورت حال آسام میں تھی۔ اس لیے لیگ کا یہ دعویٰ بے بنیاد تھا کہ وہی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تھی۔ دراصل مسلمانوں کا ایک گروہ ایسا تھا جسے لیگ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے باوجود مسلم لیگ مسلمانوں کی نمایندہ ہونے کی دعوے دار تھی۔ دراصل محمد علی جناح کو برطانوی حکومت کی حمایت حاصل تھی اور وہ دنیا پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ تو ہندستان کے آئینی مسئلے کو سلجھانے کے لیے تیار تھی مگر ہندو مسلم نفاق کے سبب دونوں ہی فرقے ایک دوسرے پر اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

جنگ اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی اس لیے بین الاقوامی فضا میں بھی تبدیلی ناگزیر تھی۔ لندن میں لیبر پارٹی برسراقتدار آ گئی تھی مگر کانگریس کے دوسرے رہنماؤں کا خیال تھا کہ وہ بھی

کنزرویٹو پارٹی ہی کی طرح ہندستان مخالف ہوگی۔ انھوں نے ایک نئی تحریک کو شروع کرنے کی تجویز پیش کی لیکن مولانا ان کی رائے سے متفق نہ تھے۔ انھیں یقین تھا کہ سرا ٹیلی ہندستان دوستی کا مظاہرہ ضرور کریں گے اور وائسرائے بھی اس سلسلے میں مخلص ثابت ہوگا۔ تاہم مہاتما گاندھی نے تعمیری کاموں کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مولانا نے انھیں ہموار کرنے کی کوشش کی اور کانگریس کو انتخابات میں حصہ لینے پر رضامند کرلیا کیوں کہ وائسرائے نے الیکشن کا اعلان کر دیا تھا۔ مولانا کی دوراندیشی کام آئی اور تین صوبوں کے علاوہ تمام صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی۔ بنگال میں مسلم لیگ نے نصف نشستیں حاصل کیں اور مجلس قانون ساز میں وہ سب سے بڑی جماعت ٹھہرائی گئی۔ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ برابر کی حصہ دار ہیں۔ سندھ میں اگرچہ مسلم لیگ کو بیشتر نشستیں ملیں تاہم وہ اکثریت سے محروم رہی۔ انتخابات کے بعد مولانا کا بیشتر وقت مختلف صوبوں میں حکومت سازی کے اہتمام میں گزرا۔ انھوں نے بہار میں کانگریسی رہنماؤں کے اختلافات ختم کرائے اور ان میں اتحاد قائم کر کے وہاں بحسن وخوبی وزارت کی تشکیل کرائی۔ اسی طرح پنجاب میں کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کی مخلوط حکومت بنوائی۔ کانگریس پنجاب میں پہلی بار وزارت میں حصہ دار بنی۔ اسی زمانے میں مولانا نے بحری فوج کے افسروں کی بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ساتھ ہی آزاد ہند فوج کے افسروں پر مقدمہ کے دوران اُن کی رہائی کے لیے انھوں نے کوششیں کیں اور ان کے قانونی دفاع کا انتظام کیا۔ انجام کار سبھی افسر رہا کر دیے گئے۔

لیبر پارٹی پر مولانا آزاد کا اعتماد صحیح ثابت ہوا۔ وزیرِ اعظم اٹیلی نے برطانوی کابینہ کے تین ممبروں پر مشتمل ایک وفد ہندستان بھیجا تو مولانا نے کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے اس سے ملاقات کی۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے سلسلے میں مولانا نے مشن کے ممبروں کو مشورہ دیا کہ ہندستان کا آئین وفاقی ہونا چاہیے جس میں صوبوں کو حتی الامکان خودمختاری حاصل ہو مگر مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم واضح ہو۔ مرکز کو کم سے کم اختیارات حاصل ہوں اور ایک ایسی اختیاری فہرست مرتب کی جائے جس کے موضوعات پر دونوں کو قانون سازی کا حق

حاصل ہو۔ اگر چہ مولانا نے اس سلسلے میں اپنے رفقاء سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا تاہم مشن کو اپنی تجویز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تجویز سنتے ہی وزیر ہند پیتھک لارنس نے مولانا سے کہا ''درحقیقت آپ تو فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک بالکل نیا حل تجویز کر رہے ہیں۔'' بعدازاں کانگریس کے دوسرے رہنما اور مہاتما گاندھی نے بھی مولانا کے خیالات سے اتفاق کیا۔ مولانا نے اخبارات کے لیے ایک بیان جاری کرتے ہوئے اپنے تجویز کی تفصیل پیش کی۔ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان پر رائے زنی کرتے ہوئے مولانا نے کہا:

> ''اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ پورے ہندستان کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً نقصان دہ ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے مسائل حل ہونے کے بجائے اور اُلجھیں گے۔''

انھوں نے مزید کہا:

> ''اعتراف کرنا چاہیے کہ مجھے تو ''پاکستان'' کی اصطلاح ہی متضاد معلوم ہوتی ہے۔ یہ ظاہر کرتی ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک ہیں اور دوسرے ناپاک۔ پاک اور ناپاک کی یہ ارضی تقسیم نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام کی روح کے منافی بھی۔ اسلام کسی ایسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا کیوں کہ خود پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ خدا نے پوری دنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔ مزید برآں پاکستان کی تجویز شکست خوردگی کی علامت نظر آتی ہے اور ایک قومی وطن کے قیام کے متعلق یہودیوں کے مطالبے سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ ہندستانی مسلمان پورے ہندستان پر اپنا حق نہ سمجھ کر محض اس کے ایک گوشے میں خود کو محدود کر کے مطمئن ہو جانا چاہتے ہیں۔ کسی شخص کو ایک قومی وطن کے قیام کے سلسلے میں یہودیوں کی اُمنگوں سے ہمدردی ہو سکتی۔ ہے کیوں کہ وہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی بھی علاقہ کی

انتظامیہ میں کوئی موثر آواز نہیں رکھتے مگر ہندستان کے مسلمانوں کی حالت اس کے برعکس ہے۔ تعداد اور معیار۔ دونوں ہی کے اعتبار سے نو کروڑ کی تعداد میں وہ ہندستانی زندگی کا کافی اہم عنصر ہیں جو انتظامی امور اور پالیسی کے معاملات میں فیصلہ کن طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں مرکوز کر کے قدرت نے ان کی مزید امداد کی ہے۔ اس سیاق وسباق میں پاکستان کے مطالبے کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں ایک لمحے کے لیے بھی پورے ہندستان پر سے اپنی ملکیت اور سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اس کی تشکیل کے حق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یقینی طور پر میرے لیے یہ بزدلی کی علامت ہے کہ میں اس سے دست کش ہو جاؤں جو میرا اجدی ترکہ ہے اور محض اس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے خود کو مطمئن کرلوں۔''

اس طرح مولانا نے حقیقت کی روشنی میں صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے پاکستان کے قیام کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ بتایا۔ وہ مسٹر جناح کے دوقومی نظریے کے مخالف تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے مطالبے کو ہر نقطہ نظر سے پرکھا اور کہا:

''اگر یہ بتایا جا سکتا کہ پاکستان کا منصوبہ کسی بھی طرح مسلمانوں کے مفاد میں ہے تو میں خود اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا اور دوسروں سے بھی اسے قبول کرنے کے لیے کہوں گا لیکن صداقت تو یہ ہے کہ جب میں خود مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفادات کے نقطہ نظر سے بھی اس کا جائزہ لیتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور ہوں کہ یہ نہ تو کسی طرح ان کے لیے سود مند ہے [illegible] کو رفع کر سکتا ہے۔''

مولانا نے لوگوں کو مسلم لیگ کے نتائج سے باخبر کرتے ہوئے کہا:

''ہمیں غیر جذباتی ہو کر ان اثرات پر غور کرنا چاہیے جو پاکستان کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر ظاہر ہوں گے۔ ہندستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ان میں سے ایک ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی تو دوسری میں ہندوؤں کی۔ ہندستان کی ریاست میں ساڑے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے جو چھوٹی اقلیتوں کی شکل، میں سارے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یو پی میں سترہ فیصد، بہار میں بارہ فیصد اور مدراس میں نو فیصد ہو کر وہ ہندو اکثریتی صوبوں میں آج کی نسبت وہ مزید کمزور ہو جائیں گے جو تقریباً ایک ہزار سال سے ان علاقوں میں مقیم ہیں اور وہاں انھوں نے مسلم ثقافت اور تہذیب کے مرکز قائم کیے ہیں۔ رات بھر کی نیند سے بیدار ہونے پائیں گے کہ وہ اجنبی اور غیر ملکی بن گئے ہیں۔ صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی طور پر پسماندگی کا نشانہ بن کر وہ محض اس کے رحم و کرم پر ہوں گے جو اس وقت تک خالصتاً ہندو راج بن چکا ہوگا۔ دوسری طرف ان کی حیثیت پاکستانی ریاست میں بھی کمزور ہوگی۔ ہندستانی ریاست کی ہندو اکثریت سے پاکستان میں کہیں بھی ان کی اکثریت سے مقابلہ نہیں کیا جائے گا۔ درحقیقت ان کی اکثریت اتنی کم ہوگی کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں کی اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی قیادت کے تلے دب جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا اور پاکستان مکمل طور پر مسلم آبادی پر مشتمل رہا تب بھی وہ مسلمانوں کے مسائل کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا......''

صورت حال کا یہ تجزیہ صداقت اور حقیقت پر مبنی تھا۔ دراصل تقسیم ہند کے بعد وہی تمام واقعات ملک میں رونما ہوئے جن کا اندیشہ مولانا کو حصولِ آزادی سے قبل تھا۔ ان کی دور رس نظریں مستقبل کے نقشے کو دیکھ رہی تھیں مگر مسلم لیگ اپنے مطالبہ پر قائم رہی۔ تاہم ۱۶ رمئی کو مشن نے اپنی تجاویز کا اعلان کر دیا جو بڑی حد تک مولانا کے فارمولے کا احاطہ کرتی تھیں۔

مولانا نے کانگریس سے اسے منظور کر لینے پر اصرار کیا۔ پہلے ورکنگ کمیٹی نے اسے منظور کیا اور پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اگرچہ بائیں بازو کے رہنماؤں نے پلان پر خاصی تنقید کی مگر مولانا نے پلان کی ممتاز خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اسے کانگریس کی سب سے بڑی فتح سے تعبیر کیا کیوں کہ اس پر عمل پیرا ہو کر ہندستان اپنے آپ کو بغیر کسی خون خرابہ کے آزادی کی دہلیز پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ مولانا کے نزدیک پلان کانگریس کے مطالبات پر مبنی تھا۔ انجام کار کانگریس نے پلان کو منظور کر لیا۔ یہ مولانا آزاد کی قیادت کا آخری زمانہ تھا کیوں کہ اس کے بعد انھوں نے سات سال تک صدارت اور قیادت کے فرایض انجام دینے کے بعد خود کو اس سے سبکدوش کرا لیا اور جواہر لال نہرو ان کے جانشین منتخب ہوئے۔

مولانا آزاد ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک کانگریس کی مسند صدارت پر متمکن رہے۔ یہ اعزاز ہندستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں صرف مولانا کو حاصل ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پورے عرصے کو مولانا ہی کی قیادت کے دور سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ان کے عہد صدارت میں انفرادی ستیہ گرہ اور ہندستان چھوڑو، نامی دو تحریکیں چلائی گئیں کانگریس کے رہنماؤں نے قربانیاں دیں اور قید و بند کی صعوبتیں سہیں، کرپس اور کابینہ مشن کے ممبروں سے مذاکرات ہوئے، شملہ کانفرنس منعقد ہوئی اور مشن کا پلان منظور ہوا۔ اس پورے دور پر مولانا ہی کا اثر غالب رہا۔ بعد ازاں مولانا کو راجندر بابو اور سردار پٹیل کے ساتھ ایک پارلیمانی سب کمیٹی کا ممبر بنایا گیا جس نے عبوری حکومت کی تشکیل میں پنڈت نہرو کی مدد کی۔ اگرچہ پنڈت جی مولانا کو اپنی عبوری حکومت کا رُکن بنانا چاہتے تھے مگر انھوں نے حکومت سے باہر رہ کر ہی ملک و قوم کی خدمت کو فوقیت دی۔ وہ آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تاہم وہ زیادہ عرصہ تک باہر نہیں رہ سکے اور ۱۹۴۷ء میں تعلیم کے ممبر کی حیثیت سے انھیں حلف لینا پڑا اور حصول آزادی کے بعد بھی اپنی وفات تک وزیر تعلیم رہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے وائسرائے بننے کے بعد جب ملک کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو مولانا کو شدید صدمہ پہنچا۔ ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تقسیم کی تجویز پر غور کیا۔ مولانا نے اپنی معرکہ آرا تقریر میں تقسیم کو ملک کی بدنصیبی سے تعبیر کیا۔ انھوں نے کہا:

''ہندوستان کی تقسیم ایک المیہ تھی۔ ہم نے تقسیم کو ٹالنے کی بے پناہ کوشش کی مگر ہم ناکام رہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قوم ایک ہے اور اس کی ثقافتی زندگی بھی ایک ہی ہے اور ہمیشہ ایک رہے گی۔ ہم سیاسی طور پر ناکام ہوئے ہیں اور اسی لیے تقسیم کو منظور کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس تیقن کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری ثقافت تقسیم نہ ہو۔ اگر ہم پانی میں ایک چھڑی ڈالیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ پانی تقسیم ہو گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ پانی ایک ہی رہتا ہے اور جب چھڑی نکال لی جائے تو پانی کی تقسیم تک غائب ہو جاتی ہے۔''

بہت سے ممبروں نے تجویز کی مخالفت کی۔ ای- ڈبلیو- آر- لمبی کے الفاظ میں تقسیم ہند کی تجویز کی مخالفت خصوصی طور سے قوم پرور مسلمانوں کی جانب سے ہوئی، جنھیں یہ احساس تھا کہ کانگریس نے انھیں نیچا دکھایا ہے'' اور یہ تمام قوم پرور مسلمان یا تو مولانا آزاد کے پیرو تھے یا ان کے زیر اثر تھے۔ جب ووٹ لیے گئے تو ایک سو ستاون ممبروں نے اس کی موافقت میں، انتیس نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیے اور بتیس ممبروں نے ووٹ نہیں دیے۔ وہ غیر جانبدار رہے۔

اس طرح مولانا کی زندگی کا وہ سفر جو انھوں نے موجودہ صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں صحافت سے شروع کیا تھا تقسیم وطن اور طلوع آزادی پر ختم ہو گیا اور تقریباً پینتیس برسوں پر محیط ان کی جدوجہد تاریخ کا ایک حصہ بن کر آنے والی نسلوں کے لیے وراثت بن گئی۔

کامیاب سیاسی رہنمائی اور ابوالکلام

سیّد حسن احمد

امام الہند، مدیر الہلال والبلاغ، محبوس رانچی، زندانی کلکتہ، اسیر قلعہ احمد نگر، مصنف غ
خاطر، پیرزادہ، عالم باعمل، حبیب مشفق، مرد مجاہد، قائد قوم، غمگسارِ ملت، عزلت پسند، ادی
نقیب، انگریزوں کا باغی، صدر کانگریس، وطن کا بندۂ بے دام، وزیر تعلیم، استقلال کا ستون،
میں متنوع شخصیتیں لیے، مولانا ابوالکلام آزاد ایک سیاسی آدمی بھی تھے۔ سیاسی مفکر ہو کر
کارکن ہوئے اور پھر رہنما کے درجے پر پہنچے۔ سیاست کے مختلف معنی سہی مگر سیاست کا بنیا
تعلق طاقت و حکمرانی سے ہے اور ان سے دنیاوی غرور و تکبر و عیش و عشرت وابستہ ہیں۔ ا
لیے سیاسی کارروائی میں عموماً شور و غوغا بہت ہوتا ہے۔ مکر و فریب بھی اس کے طریقے ہیں ا
جدال و قتال بھی اس کے راستے۔ دھوم مچتی ہے، حمایت و مخالفت، عقیدت و نفرت، انبسا
طیش کی آندھیاں اپنے دامن میں قتل و خون و غارت گری و اشک و نالے لیے چلتی ہیں یا کہی
تعمیر وطن اور چمن آرائی کی مہم کامیاب ہوتی ہے۔ سیاسی معاملوں میں نظریوں اور رائے
آفرینش میں اعتدال اور عدل کم اور حرص، خوف و اشتعال کو زیادہ دخل شعوری یا غیر شعوری ط
پر ہوتا ہے۔ نتیجتاً سیاسی رہنماؤں کی خوبیوں، نقائص کی کامیابی یا ناکامیابی کے متعلق اختلا
رائے وسیع و عمیق و شدید ہو سکتا ہے۔ یہی صورت ابوالکلام کے ساتھ ہے۔

مولانا ابوالکلام دورِ حاضر کے ہندستان کے نامور ترین افراد میں ہیں۔ جیسے رام مو
رائے، سیّد احمد خان، مولانا محمود حسن، گوپال کرشن گوکھلے ہیں گاندھی جی اور لوگوں کے سات
مولانا ابوالکلام نے متحد و آزاد ہندستان کے لیے صدا بلند کی۔ اسی کی طرف ملک والوں کو بل

اور اسی کے لیے جدو جہد کی۔ ملک کو آزادی تو ملی مگر اتحاد نہیں ملا۔ کیا مولانا ابوالکلام سیاسی رہنما کی حیثیت سے کامیاب ہوئے؟ اگر ہوئے تو کتنا اور ناکامی ملی تو کس درجہ؟ یہی سوال گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے بارے میں کیا جا سکتا ہے یا مسلم لیگ کے قائدین کے بارے میں کہ وہ کامیاب رہے یا نہیں۔ چھوٹے اور بڑے ہر ایک رہنما کے بارے میں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوا۔ البتہ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے دوسرے سوال کرنے اور ان کے جواب معلوم کرنے ہوں گے۔ یعنی سیاسی قیادت کی کامیابی کیا ہے؟ اس کامیابی کے اصول نقد اور اس کی پیمایش کے طریقے اور میزان کیا ہیں؟

ایک منسلک سوال کامیامی یا ناکامیابی کے اسباب کا ہے یعنی اگر قائد کامیاب ہوا تو کیوں اور ناکام رہا تو اس کی ناکامی کی وجوہات کیا تھیں؟ مریض کے صحت یاب ہونے کی ذمے داری مریض، اس کے مرض اور ماحول پر ہے یا طبیب پر یا دونوں پر؟ رہنما اور عوام کے درمیان اگر ہم مشربی نہیں تو کتنا فصل ان کے ذہن، تمدنی و اخلاقی معیار میں ہو اور کتنا بعد ان کے اغراض و مقاصد کے درمیان ہو جس کو پاٹنا کامیاب سیاسی رہنما کے لیے ضروری ہے؟ یہ بہرحال ایک جدا مسئلہ ہے اور موضوع سخن نہیں۔

کامیابی کے سوال کے متعلق ایک دوسرا مسئلہ رہنما اور عوام کے باہمی تعلق کا ہے یعنی دونوں کے فکر و عمل میں ہم آہنگی یا بے تعلقی یا تضاد کا۔ کیا کامیاب رہنما اس ستار نواز کی طرح ہوتا ہے جو تاروں کو چھیڑتا ہے تو ساز وہی نغمے نکالتا ہے جو موسیقار کے ذہن میں ہوتے ہیں یا یہ ممکن ہے کہ ''من چہ می سرایم و تنبورۂ من چہ می سراید؟'' اسی طرح کاریگر کل کے ایک پرزے کو حرکت میں لاتا ہے تو پورا کارخانہ کاریگر کی مرضی کے مطابق چلنے لگتا ہے۔ ویسے ہی کیا کامیاب سیاسی رہنما کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مخاطب عوام اس کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہوں، وہی بات سمجھیں جو وہ سمجھائے، اسی منزل کو قبول کریں جس کا وہ اشارہ کرے؟ یا بہ الفاظ دیگر، کیا کامیاب رہنمائی کے لیے یہ کافی ہے کہ رہنما اپنا پیغام اپنے قول و فعل کے ذریعے کلی طور پر پہنچائے یا یہ ضروری ہے کہ وہ عوام میں اپنے پیغام کے مطابق تبدیلی بھی لائے؟ اس کا جواب کامیابی کے اصول طے کرنے کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے۔

سیاسی رہنما بہ اعتبار دائرۂ کار تین نوعیت کے ہو سکتے ہیں:

۱- سیاسی مفکر ہوں مگر سیاسی کارکن نہ ہوں جیسے افلاطون، ارسطو، پولی بیس، روسو، ٹومس اکیونس، ہوبس، ہیگل۔

۲- سیاسی مفکر نہ ہوں مگر سیاسی کارکن ہوں، جیسے اکثر حکومتوں کے سربراہ اور کامیاب کرسی نشین سیاست داں۔

۳- سیاسی مفکر اور کارکن دونوں ہوں جیسے سقراط، سی سیرو، جون لوک، جون اسٹوارٹ مل، کارل مارکس، لینن، ایک حد تک اقبال، گاندھی جی، ایم این رائے!

تینوں قسم کے سیاسی افراد کے لیے اصول و جزیات نقد مشترک بھی ہوں گے اور علاحدہ بھی! مولانا ابوالکلام تیسری کمیاب نوعیت کے رہنما تھے۔ ان کو پرکھنے کے لیے ان کے قلم، ان کی آواز اور ان کے عمل کو جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جیسے بجلی کو بادلوں سے اور نسیم صبح کو اس کی خنکی سے الگ نہیں کر سکتے۔ تینوں کو زیر مطالعہ لانا ہوگا اور ان کی کامیابی کے نقد کے لیے مولانا کے اقوال و افعال، ان کی صداقت و اہمیت اور عوام الناس ہندستان سے اس کے تعلق کی جانچ کرنی ہوگی۔

مولانا ابوالکلام نے جولائی ۱۹۱۲ء میں ''الامر بالمعروف والنہی عن المنکر'' سے اپنا سیاسی پیغام شروع کیا اور ۱۹۵۸ء تک اسی پر قائم رہے۔ مذہبی بنیاد مولانا کے فکر عمل کی رہی۔ گاندھی جی نے ۱۹۱۷ء میں چمپارن میں اپنا سیاسی عمل شروع کیا اور ان کے فکر و عمل کی بنیاد بھی مذہبی رہی، جس طرح دوسرے متعدد ہندستانی رہنماؤں کی رہی۔ البتہ مولانا ابوالکلام نے جن خطوط سے سیاسی و تمدنی نظام کی شکل بنائی۔ ان میں کوئی ابہام نہیں ملتا۔ سیاسی و غیر سیاسی، مذہبی اور وطنی لکیریں واضح اور صاف ہیں۔ کہیں ایک دوسرے سے اُلجھتی نہیں۔ ٹکراتی نہیں۔ مثلاً ٹومس اکیونس نے مذہبی اثر کی وجہ سے بادشاہت کو بہترین سیاسی نظام بتایا تھا۔ البتہ اس کی بادشاہت انتخابی تھی۔ مگر مولانا کے نزدیک انسانی مساوات و آزادی، جمہوری حکومت، استبداد اور بیوروکریسی سے جنگ، چاہے عیسائی، مسلمان یا ہندو کی ہو، سب سیاست میں اپنا اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی میں ان کا دین حائل نہیں

ہوتا بلکہ زندگی دوام دیتا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کے الہلال میں مولانا آزاد نے لکھا کہ:

''ملک کی ترقی اور آزادی کی ذمے داری تو مسلمانوں کے سروں پر خدائے ذوالجلال کی طرف سے ہے۔ دنیا میں صداقت کے لیے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا اسلام کا قدرتی مقصد ہے۔''

مزید یہ کہ:

''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرضِ دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔'' (الہلال: کلکتہ، دسمبر ۱۹۱۸ء)

ملک کی اقتصادی حالت بیان کرتے ہوئے ان کا نشانہ جابر و قابض شہنشاہیت کے استبداد کی طرف تھا:

''اس زرعی ملک کے کاشتکار تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ ریلوے کی توسیع کے لیے انگلستان کو ٹھیکے دیے جا رہے ہیں، ملک کی تمام دولت ستر ہزار سرخ رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی ہے، مگر ملک کے فاقہ مست تعلیم اور حفظ صحت کے انتظام سے محروم ہیں، نمک بھی ملتا ہے تو محصول دے کر، تعلیم بھی ملتی ہے تو گھر بار بیچ کر۔''

''نمک بھی ملتا ہے تو محصول دے کر'' ۱۹۱۲ء کی کہی ہوئی بات آگے چل کر مارچ ۱۹۳۰ء میں ڈانڈی مارچ کی سیاسی وجہ بنی۔

جون ۱۹۲۷ء میں جب الہلال دوبارہ نکلا تو وہ اپنے ۱۹۱۲ء کے مقاصد پر قائم و دائم تھا۔ البتہ اب دنیا اور دنیا کے ساتھ ہندستان گیارہ بارہ برس آگے بڑھ چکا تھا اور تبدیلی حالات نے سفر میں نہیں لیکن منزل کے محل میں ضرور تبدیلی کر دی تھی۔ پہلے دعوت کی ضرورت اس لیے تھی کہ راہ کھلے اور سفر شروع ہو۔ اب کہ دروازہ کھل چکا تھا اور رہروانِ شوق رسم و راہ سفر سے ناآشنا رہے تھے، اس کی صدائیں اس لیے مطلوب ہیں کہ راہ کی مشکلیں حل کی جائیں اور سعی و طلب

کے جو قدم اُٹھ چکے ہیں وہ بے راہ روی سے محفوظ رہیں۔ وقت کی ضروریات کے مطابق تین موضوع اصل قرار دیے گئے:

۱- ملک کی موجودہ سیاسی زندگی کے عملی مسائل۔

۲- مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا موجودہ ذہنی اور عملی انتشار...... اور اس کے عملی مسائل ومباحث۔

۳- مسلمانانِ ہند کی قومی و اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور اس کے اہم مباحث۔ (مولانا ابوالکلام آزاد- الہلال کے آئینے میں: ایم اے، ملک زادہ، لکھنو،۱۹۷۲ء، ص ۱۳۰)

ستمبر ۱۹۱۳ء سے ضمانت کے نام پر بڑی بڑی مالی ضربیں لگا کر حکومت نے نومبر ۱۹۱۴ء میں الہلال بند کرا دیا۔ نومبر ۱۹۱۵ء سے شائع ہو کر البلاغ مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا کی نظر بندی کے ساتھ بند ہو گیا۔ الہلال نومبر ۱۹۱۴ء میں بند ہوا تھا۔ ۱۲، ۱۳ برس کے بعد دعوت حق دینے پھر سامنے آ گیا مگر قریب چھ ماہ بعد ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ایسا بند ہوا کہ پھر نہ چھپا لیکن حکومت کی دارو گیر کے باوجود الہلال اپنا کام کر گیا تھا۔ اس کی اشاعت ۲۶ ہزار تک ہو گئی تھی۔ قارئین ملک کے مسائل اور ایشیا و یورپ کے حالات سے روشناس ہو کر سیاسی سوالات کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ کانپور کی مسجد کے انہدام کو الہلال نے ایک نئے سیاسی رُخ سے پیش کیا۔ یہ آواز خواجہ حسن نظامی کی صدا سے مختلف تھی۔ مسجد کے ایک حصے کی شہادت اور پھر مسلمانوں کی خوں ریزی میں، مجسٹریٹ ٹائلر کے سپاہیوں کی بندوقوں کی گولیوں میں، لیفٹیننٹ گورنر جیمس مسٹن کے غرور اور طعن میں، خاک وخون میں لتھڑی لاشوں میں مولانا ابوالکلام کو وہ ستون کمزور ہوتا ہوا نظر آیا جس پر برطانیہ کی حکومت قائم تھی۔ انھیں اس کا خوف نہیں ہوا کہ ''مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش میں مقتول ومجروح ہوئے، کہ یہ اُن کی ملی خصوصیت ہے۔'' بلکہ انھیں اس کا ''خوف تھا کہ حکومت صوبہ متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی تھی، اس سے وہ خود تو مجروح نہیں ہو گئی۔'' الہلال نے سوال کیا:

''برسٹل اور منچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں آتشبار ہتھیاروں سے کام لیا

گیا ہے؟''

''کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانوی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، با چشم نم و با دل پر غم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بے کسی کا نشان تھا، کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی تاکہ مسجد کی منہدم دیوار پھر سے تعمیر کرے۔'' (الہلال: کلکتہ)

سنگینوں اور بندوقوں کے ہیبت ناک نظارے سے یہ مجمع ڈرا نہیں ''جیمس مسٹن نے مسلمانوں کے جوش دینی اور ولولہ اسلامی کو جھوٹا کہا'' زیر خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا اور ''بزور اس جوش کو فرو'' کرنے کی دھمکی دی۔ ''فرزندان اسلام بڑھے اور انھوں نے مقتل حام میں جا کر جسمانی پردہ جو فرماں روائے صوبہ کے سامنے حائل تھا، اُلٹ دیا۔'' پھر الہلال نے واقعہ کانپور کی کڑیاں برطانوی سامراج کی عالمگیر طاقت، سازش و خونریزی سے ملائیں جس سے وہ ملک والوں کو روشناس کرتے رہے تھے، یعنی:

''مسلمانانِ عالم نے ہر گوشہ سے ہمارے پاس اپنے مصائب و آلام کی آغشتہ خون اطلاعات کا ہدیہ بھیجا تھا۔ ہم شرمندہ تھے کہ ہمارے پاس ان تحائف کے لیے جو سامان تھا، ان میں خون کے قطرے نہ تھے۔ اب ہم شرمندہ نہیں۔ اے مسلمانانِ عالم! ہمارے بہے ہوئے خون، کٹی ہوئی رگوں اور تڑپتی لاشوں کا ہدیہ قبول کرو۔'' (الہلال: کلکتہ)

ہندستان کے عوام نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے تحریروں اور تصویروں کے ذریعے یہ دیکھا کہ ان کا سفید فام حاکم اور اس کے یونانی اور دوسرے حلیف بلقان و ترکی و طرابلس اور یورپ میں صدیوں پرانی مسلمان بستیاں اُجاڑ رہے ہیں اور مردوں، عورتوں، بچوں کے خون سے زمین لال کر رہے ہیں۔ ان مظالم کی روداد بطور واقعے کے یورپ، ترکی، مصر وغیرہ کے اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ یونان کے وزیراعظم کی پارلیمنٹ میں غیر منصفانہ تقریریں بھی الہلال کی گرفت سے نہیں بچتی تھیں۔ الہلال دعوتِ جہادِ جنگ آزادی، فی سبیل اللہ نکلا تھا اور اس کا اثر عوام الناس پر نمایاں تھا جیسا کہ چندوں کی یورش اور ملک گیر تحریک خلافت اور ترک

موالات سے ظاہر ہوا تھا۔ اگر مولانا ابوالکلام کا کام الہلال والبلاغ والہلال تک ہی رک جاتا تو بھی وہ کامیاب سیاسی رہنما کا درجہ حاصل کر لیتے۔

مسلمانوں کو مخاطب کرنے کے علاوہ وہ پورے ملک کے پارسی، سکھ، عیسائی مسلمان ہندوؤں کے کثیر مسائل کے حل کی ملکی کوششوں میں شریک رہے۔ سب سے بڑی جماعت کانگریس کے اکثر فیصلوں کی تشکیل میں مؤثر طور سے حصہ دار رہے۔ ان کے صدارتی خطبوں، تحریروں اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی اصولوں کے ساتھ ساتھ جزویات اور تفصیلات پر اُن کی نظر حاوی تھی۔ وہ نہرو رپورٹ پر شفیع داؤدی صاحب کی ترمیمات ہوں یا ایڈلٹ سٹریج کا سوال، ہندستان کی تاریخ کی وضاحت ہو یا فاشزم اور نازیزم کی جرأت بڑھانے کے لیے ابی سینیا، اسپین، چیکوسلواکیہ اور البانیہ کی بھینٹ، فروری ۱۹۴۰ء کا وائسرائے ہند کا کمیونک اور چیمبرلین کی ۲۴ر فروری ۱۹۴۰ء کی تقریر ہو یا دوسری جنگ عظیم میں ہندستان کی شرکت کا سوال، ہر ایک پر مولانا کی صائب اور واضح رائے کانگریس اور ملک کے لیے ہدایت کی روشنی کا کام کرتی تھی۔ (۱) وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور صدر متعدد سال سے تھے۔ مگر ذاتی طور سے ان عہدوں سے زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ بقول پنڈت سندرلال:

> ''ظلمت و تاریکی کے اس دور میں مولانا کی ذات مشعل ہدایت و رہنمائی تھی۔ گاندھی جی کے بعد مولانا آزاد ہی کی شخصیت ایسی تھی کہ جس کی طرف ہم مشکل کے وقت رجوع کرتے تھے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد–تحریک آزادی و یک جہتی: مرتبہ خان عبدالودود خاں، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۱)

اور جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا:

> ''کانگریس کی تجاویز و عزائم کی تراش خراش اور وضع قطع میں آپ کا زبردست ہاتھ ہمیشہ مصروف کار رہا ہے۔ آپ صدر ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ممبر، آپ کے مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے پس پردہ دانش و تدبر اور فہم فراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں تر ہوتی جاتی ہے۔'' (ایضاً: ص ۱۸)

اسی طرح مہادیوڈیسائی صاحب کے مطابق:

''گاندھی جی سیاسی زندگی کے انتہائی خطرناک مراحل پر ہمیشہ مولانا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔'' (ایضاً: ص ۲۱)

جس طرح انھوں نے ۱۹۲۷ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد کانگریس کے اندر ''تبدیلی پسند'' Changers اور ''معمول پسند'' No changers گروہوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی، اسی طرح کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب لانے کی کوشش میں سرگرم عمل رہے۔ وسط جون ۱۹۴۰ء میں کانگریس کی صدارت سنبھالنے کے بعد مولانا ابوالکلام نے صدر مسلم لیگ مسٹر جناح کو تجویز بھیجی کہ ہندوستان کے تمام صوبوں اور مرکز میں کسی ایک پارٹی کی وزارت کے بجائے، کانگریس اور مسلم لیگ پر مشتمل مخلوط وزارتیں بنائی جائیں۔ مسٹر جناح نے یہ کہہ کر یہ تجویز مسترد کردی کہ ''تم کو کانگریس نے شوبوائے کی طرح کانگریس کا صدر بنایا ہے۔'' مسترد کرنے والے نے یہ نہیں سوچا کہ انکار کرنے سے نقصان کس کا ہوا۔ یہ توہین آمیز الفاظ ملک بھر میں پرزور طریقے پر اُچھالے جاتے رہے۔ البتہ سیّد سلیمان ندوی کے مطابق:

''اسوۂ یوسفی رکھنے والے کی زبان پر نہ حرف شکایت آیا نہ کلمۂ ملامت، نہ ناوک دشنام۔ جب مولانا کے سامنے کسی نے صدر مسلم لیگ کے نازیبا و غیر مناسب الفاظ پر ناراضگی کا اظہار کیا تو بحوالہ آغا شورش کاشمیری، ان کا جواب:

''ہر شخص اپنے لب و لہجہ کا مختار ہوتا ہے۔ مسٹر جناح نے اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔'' (ایضاً: ۲۸)

اس سے پہلے ۱۹۱۶ء میں ان کی رانچی کی نظر بندی کے بارے میں علامہ سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفی کے درجے پر ممتاز ہوئی۔ جس عزم و استقلال اور قوت ایمانی کے ساتھ، مولانا نے یہ زمانہ بسر کیا ہے۔ وہ آئمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ شاید سب کو معلوم نہ ہوگا کہ

انھوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کر دیا اور اعانت نظر بنداں کا ماہوار عطیہ بھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانے میں ان کو جو مالی دقتیں پیش آئیں وہ صرف عبادی الشکور کے رمز میں پنہاں ہیں۔"

(ابوالکلام آزاد: مرتبہ عبداللہ بٹ، لاہور، ۱۹۴۳ء، ص ۵۹)

ایک طرف یہ توکل علی اللہ اور دوسری طرف دینی جلال ایسا کہ:

"رات کو ان کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بنا پر وہ نماز عشاء کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے اسے گوارا نہ کیا۔ حکومت سے اجازت چاہی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو برملا اعلان کر دیا کہ فریضۂ الٰہی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آ سکتے۔"

(ایضاً: ص ۵۹، ۶۰)

مولانا ابوالکلام کو رانچی میں چار سال کی نظر بندی کے بعد ۱۹۲۰ء میں رہا کیا گیا اور جلد ہی حکومت کے خلاف ان کی تقریروں کے بعد جرم بغاوت میں گرفتار کر کے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ اس جرم کے لیے انگریزی حکومت میں سزا پھانسی تھی یا کالا پانی۔ ملزم نے اپنے بیان میں مجسٹریٹ سے کہا:

"مجھ پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ کیا بغاوت اس آزادی کی جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میں باغی ہوں لیکن ساتھ یہ بھی یاد دلاتا چلوں کہ اس کا نام قابل احترام حب الوطنی ہے۔ میں مسلمان ہوں اور میرے یقین کے لیے وہ بس ہے جو میرے اللہ کی کتاب اور میرے نبی کی شریعت نے بتایا ہے۔"

(قول فیصل: کلکتہ، البلاغ پریس، ۱۹۲۲ء، ص ۷۷)

"میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں

کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام نہ رکھ لیے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے، اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز تسلیم نہیں کرتا اور اپنا مذہبی، انسانی اور ملکی فرض سمجھتا ہوں کہ اس محکومی سے ملک وقوم کو نجات دلاؤں۔" (ایضاً: ص ۴۸، ۴۹)

اس کے بعد کی دلیل میں دین اسلام اور جمہوریت کے بارے میں مولانا ابوالکلام کے فکر کی وضاحت ہوتی ہے:

"جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی مسلمان حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں جو قوم کی رائے اور انتخاب سے وجود میں نہ آئی ہو۔ تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمان کے لیے اجنبی بیوروکریسی کیا حکم رکھتی ہے۔

اگر آج ہندستان میں ایک خالص مسلم حکومت قائم ہو جائے، مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو یا چند حاکموں کی بیوروکریسی ہو تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اُس وقت بھی میرا یہی فرض ہوگا کہ اس کو ظالم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔" (ایضاً: ص ۵۱، ۵۲)

"جن مسلمانوں کے مذہبی فرایض میں یہ بات داخل ہو کہ موت قبول کر لیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں، ان کے لیے دفعہ ۱۲۴- الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہوسکتا۔" (ایضاً: ۵۶)

پھر قیدی نے کہا:

"زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس جرم بغاوت کا مجرم ہوں، بلکہ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی۔" (ایضاً: ص ۸۰)

گاندھی جی نے بمبئی کرانیکل میں لکھا:

''مولانا آزاد کا یہ بیان تحریک آزادی کی تاریخ میں بے مثال، ولولہ انگیز اور عہد ساز ہے۔ اس بیان سے ہم نے ہندستان کی جنگ آزادی نصف سے زیادہ جیت لی۔ حاکم و جابر قوتوں کا زعم استبداد اس بیان سے پاش پاش ہو گیا ہے۔ غلام اور مضمحل قوموں کے لیے یہ بیان آبِ حیات ہے۔ ہندستان، ایشیا اور افریقہ کی غلام قومیں مولانا کو سلام کرتی ہیں۔'' (خان عبدالودود خاں، محولہ بالا، ص ٦٦)

جب وہ انگریزی حکومت کو جائز تسلیم نہیں کرتے تھے تو اس سے کوئی آسانی مانگنا، کسی مہربانی کی درخواست کرنا بھی اس ہندستانی رہنما کی غیرت کے خلاف تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء کو ابوالکلام احمد نگر کے قلعے میں قید کر دیے گئے۔ اہلیہ کی علالت کی اطلاعیں تواتر سے آنے لگیں:

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم بہ چہ کار خواہی آمد

جیلر نے کہا کہ آپ درخواست دے دیں جو فوراً بمبئی بھیج دی جائے گی۔

برطانوی سامراج اور جرمن واطالوی سامراجیت کے رویوں اور طریقوں میں فرق تھا۔ قرین اغلب تھا کہ ان کی درخواست بخوشی منظور ہوتی، زندان خانے کے قفل کھل جاتے اور کانگریس کے صدر جا کر مریضہ سے رُخصتی ملاقات کر سکتے۔ جواہر لال نہرو آئے اور اس بارے میں گفتگو کی مگر ابوالکلام حکومت سے مرحمت کی استدعا کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ دل کا سکون چلا گیا مگر روزانہ کے فرائض کی ادائیگی کرتے رہے۔ آخر ایک دن تار اور اخبار لا کر ان کی میز پر رکھا گیا جن میں وہی خبر تھی جو ان کے دل میں تھی۔

ماہ وسال کی گردش کے درمیان حریت کی آواز نہیں بدلی۔ ۲ر مارچ ۱۹۴۲ء کو لاہور میں ایک اجتماع سے مولانا ابوالکلام نے کہا:

''میں کل لاہور آیا تو مجھے ۱۹۲۱ء کا زمانہ یاد آ گیا جب کہ میں نے جمعیۃ علماء کے جلسے کی صدارت کی تھی۔ اس وقت میرے عزم وایمان کی جو

صورت تھی اس میں اَب تک ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہوئی۔ وقت کے تقاضوں سے بعض باتوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے، لیکن جن چیزوں کی بنیاد ایک ٹھوس عقیدے اور حقیقت پر ہو وہ نہیں بدلتے۔...... ہندستان غیر ملکی اقتدار کے پنجے میں جکڑا ہوا ہے......لیکن اب یہ پنجہ ٹوٹنے والا ہے۔

یہ خطرناک جنگ جب بھی ختم ہوگی برطانیہ عظمیٰ ''عظمیٰ'' نہیں رہے گا۔ ہندستان بھی آزاد ہوگا۔ آج کا چین بدل چکا ہے۔ آج کا روس دنیا کی بہت بڑی طاقت بن جائے گا۔ برطانیہ محض انگلستان تک محدود رہ جائے گا۔ اس لیے وزیراعظم برطانیہ مسٹر چرچل کے تمام دعوے کھوکھلے ہیں۔ مسلمانوں کو اس فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ انگریز بہادر بچ نہیں سکتا نہ ہمیں بچا سکتا ہے۔ اسے بوریا بستر باندھ کر یہاں سے جانا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے ہمیں مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟ میں آنے والے زمانے کو کمزوری اور تذبذب سے نہیں دیکھتا بلکہ عزم، ہمت اور حوصلے سے دیکھ رہا ہوں جو قوم اپنے آپ کو بچانے پر قادر نہ ہو، اس کو تحفظات نہیں بچا سکتے۔ کاغذ پر لکھے ہوئے قانون محفوظ نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے۔ اگر دس کروڑ کے بجائے مسلمان دس لاکھ بھی ہوتے اور ان کے دل میں یہ خیال ہوتا کہ وہ مرنے کے لیے نہیں، زندہ رہنے کے لیے ہیں، تو کوئی قوم ان کو نہیں مٹا سکتی۔ مسلمانوں کی یہ (دوسری بڑی) اکثریت ہندستان کی قسمت کے تمام سیاسی واقتصادی وتمدنی فیصلوں میں برابر کی حق دار اور حصے دار ہے۔ (ایضاً: ص ۷۸،۷۹)

حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ عوام الناس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ کتنے خوفناک دن اور رات سامنے آ رہے ہیں۔ حکومت انگلستان نے ایک انسان دوست، با اصول اور تجربہ کار حاکم اعلیٰ یعنی وائسرائے ہند کو لندن واپس بلالیا اور اس کی جگہ ایک سنگ دل، نمایشی اور عیار صفت حاکم بھیج دیا۔ اس نے کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے چند مہینوں میں وہ منوالیا جس کے خلاف وہ افراد بیس تیس سال سے ڈٹے ہوئے تھے۔ یعنی کٹا ہوا ہندستان اور کٹا ہوا پاکستان۔ بحث و جھگڑے کے بعد زمین بانٹنے، کاٹنے، لینے دینے کے بارے میں کچھ طے ہوا۔ مگر شکایتیں ہر طرف باقی رہیں۔ اقتدار منتقل ہونے لگا۔ نئے حاکموں کی کوٹھیاں سجنے لگیں۔ مگر عوام پر پاس پڑوس کے دیہاتوں اور شہروں کے راستے کے، اپنے ہی ملکوں کے دو ٹانگوں والے اور دس انگلیوں والے ان گنت مہیب درندے دانت نکالے جھپٹ پڑے۔ ماں بہنوں، بیٹیوں کی عزت برباد ہوگئی، بچے مار ڈالے گئے، مردوں کی ہڈیاں اور گوشت اُٹھانے والا نہیں رہا۔ ساز و سامان لٹایا جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ سفید حاکم کی بیگانگی و سرد مہری اور ہمارے سیاسی رہنماؤں کے خود غرضانہ فیصلوں نے دونوں نئے ملکوں میں ان گنت لوگوں کو خون کے آنسو رُلا دیے۔ بے شمار زندگیاں طویل خاموش چیخ میں منجمد کر دی گئیں۔

مولانا ابوالکلام اپنے موقف میں کمزور نہیں پڑے نہ ان کا اصول بدلا، نہ یقین! سیاسی زلزلے اور غم کے سیلاب سے ان کا عمل پیہم اثر پذیر نہیں ہوا۔ البتہ آواز میں درد کا ایک نیا رنگ آ گیا:

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکست قیمتِ دل کی صدا کیا

تقسیم ہند کے بعد آزاد ہندستان کے وزیر ہو کر جامع مسجد دلی کے باہر پناہ گزین کیمپ میں فرش پر زخم خوردہ، کٹے ہوئے گروہوں کے درمیان بیٹھ رہتے۔ ایک روایت کے مطابق لوگوں کی صورتیں دیکھتے اور ہاتھوں کو ملتے۔ دل میں نفرت و سختی نہیں، نرمی اور مرحمت تھی۔ احساس فرض مضبوط تھا۔ انھوں نے وہ آواز بلند کی جس نے شمالی ہند کے بہت سے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم اس ملک میں روک لیے۔ دلی کی جامع مسجد میں مسلم عوام کے اجتماع

سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''ابھی کچھ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا...... یہ ستون جس پر تم نے بھروسا کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہا ہے لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھارا بھروسا تھا وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمھارے نزدیک فقدان ہمت کا نام ہے۔

میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں اضافہ میری خواہش نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ ہندستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔ اب ہندستان کی سیاست کا رُخ بدل چکا ہے۔ اب یہ ہمارے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ ہر اس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

میں نے ہمیشہ کہا اور آج بھی کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اُٹھا لو اور بدعملی ترک کر دو۔ یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے پر آمادہ کرو۔ پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں؟

آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟

ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بے جا تھا، اسی طرح آج تمھارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔

مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانوں کے چہرے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمھیں جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔

اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو انھیں اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب کے ایک اُمی کی معرفت فرمایا ''جو خدا پر ایمان لائے اور پھر اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم ہے۔''

پھر مولانا نے بدلے ہوئے حالات میں وہی بات کہی جو وہ انگریزوں کی سلطانی میں کہتے آ رہے تھے اور جو نئے ہندستان میں فرقہ پرستی کا واحد کارگر جواب تھا اور ابھی تک ہے:

''میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا۔

میں کہتا ہوں کہ جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمھارے ہی قافلے کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم خود بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔ (ایضاً: ۸۳تا۸۸)

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد ہندستان میں ہندی مسلمانوں کے لیے سیاسی منشور کے یہ ہدایتی اصول تھے جن کا پیغام مولانا نے بہ آواز بلند دیا۔ شروع سے اخیر زمانے تک اُسی حکم الٰہی ''الامر بالمعروف والنہی عن المنکر'' پر عمل کرنے کی سعی بلیغ کرتے رہے۔ ایک معمولی رہنما اس جگہ ہوتا تو کہتا ''تم نے اس وقت میری بات پر دھیان نہیں دیا، اب سنو! جاؤ کانگریس میں شامل ہو جاؤ۔ سب سے بڑی پارٹی ہے اور وہی تمھیں بچائے گی۔'' مگر مولانا نے ہارے ہوؤں کی بے کسی کا فایدہ نہیں اُٹھایا بلکہ کہا کہ ''اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گردو پیش کی زندگی خود فراہم کرو'' جس کا نسخہ ''اعمال صالحہ'' میں ہے۔ انھیں علم ہوگا کہ اگر مسلمان خوف وانتشار یا حرص کی وجہ سے کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوتے ہیں تو وقت بدلنے پر اسے چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ مگر سوچ سمجھ کر اور صحیح ارادے سے کسی سیاسی جماعت میں جائیں گے تو اسے جلدی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی وجہ سے ۲۷/دسمبر ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک عظیم اجتماع سے وہ کہہ چکے تھے:

> ''مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ غیر فرقہ وار سیاسی جماعتوں میں شامل ہوں جو سب کی مشترک سیاسی واقتصادی آزادی کی نقیب ہوں۔'' (ایضاً: ص ۱۶)

کیا سارا زورِ قلم، اعجاز بیان لاحاصل رہا؟ مولانا ابوالکلام کے فکر و گفتار و کردار کی دولت، ان کا سارا سرمایہ عمل بے کار گیا؟ اگر یہ سب بیکار جاتا تو اتنا سب کچھ جو بچا وہ کیسے بچتا؟ پھر تو مولوی طفیل احمد کی ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' جیسی کتاب بھی بیکار لکھی گئی ہوتی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ اور بہت کچھ نہ ہوتا اور بہت، کچھ بچا۔ صحیح سیاسی اور تمدنی اصول اور سلامت روی کی روایتیں، طریقے زندہ رہے اور ان پر عمل کرنے والی بڑی خلقت خدا زندہ رہی۔ مسلمان اور ہندو دونوں جن کی سیاسی ساخت ددرستگی میں مولانا کا بھی حصہ تھا۔ بہ ایں ہمہ ان کی بات نہیں مانی گئی۔ ان کی تجویزیں مسترد ہو گئیں۔ ان کا متحد ہندوستان کا سیاسی مقصد حاصل نہ ہوا۔ اس میں وہ ناکام رہے۔ ان کی محدود سیاسی ناکامی میں خارجی عناصر کے علاوہ، کتنا حصہ ان کے اور مسلم لیگی رہنماؤں کے ذہنی فرق کا تھا۔ یعنی:

تو اور آرائش خم کاکل

میں اور اندیشہاے دور دراز

کتنا ان کی کم آمیزی اور انا کا اور کتنا عوام کی اس کیفیت کا کہ:

جس حال میں ہیں اسی میں ہیں شاداں

یہ کہنا آسان نہیں۔ مگر سیاسی رہنما کی کامیابی یا ناکامی کی جانچ کے اصول جن کا ذکر اُ آچکا ہے، ان کے مطابق دو متبادل میزان بن سکتے ہیں:

(الف)

۱- رہنما کی سو فیصد یا زیادہ ترباتِ عوام قبول کرلیں۔

۲- اس پر عمل کریں۔

۳- رہنما کی زندگی میں اس کے اصول ونظریات کے مطابق سیاسی نظام قائم ہو جائے۔

۴- رہنما کی موت کے بعد طویل نہیں تو خاصی مدت تک اس کا دیا ہوا انتظام قائم رہے۔

میزان کی اس فہرست میں قاید کے فکر یا پیغام کی حقیقت ونوعیت شامل نہیں ہے۔ اس لیے یہ نیک اور شری، سعد اور شقی دونوں طرح کے سیاسی رہنماؤں کی کامیابی یا ناکامی کے لیے پیمانہ بن سکتی ہے۔ البتہ خیر وشر کی تعریف وتوصیف کا انتخاب جویاے راز کو خود کرنا ہوگا کیوں کہ عجب نہیں کوئی ''جنون کا نام خرد'' رکھ لے اور ''خرد کا جنون''۔

دوسرے میزان میں سیاسی فکر یا پیغام کی حقیقت واہمیت سرفہرست ہے:

(ب)

۱- رہنما کے سیاسی فکر وپیغام کی صحت ودرستگی۔

۲- پیغام کے مطابق یا برخلاف رہنما کا عمل۔

۳- فکر وپیغام کا ملک وبیرونِ ملک اس طرح پھیل جانا جس طرح ہواؤں اور حیوانات کے ذریعے جنگل، باغ اور چمن سے پھولوں اور پھلوں کے بیج کرۂ ارض پر خشکی اور تری میں

بکھر جاتے ہیں۔

۴- پیغام کا ملک یا ملکوں کے سیاسی فکر و عمل، دستور اور اداروں پر اثر انداز ہونا۔

۵- جلد یا بدیر سیاسی فکر و پیغام کا دلوں میں اُترنا اور اس کے مطابق انفرادی یا جماعتی سیاسی فکر و عمل اور سیاسی نظام کا بننا۔

۶- ایسے سیاسی نظام کا بننے کے بعد طویل مدت تک قائم رہنا۔

دوسرے میزان (ب) کی فہرست میں کلیدی عنصر پیغام کی صحت ہے۔ اس پیغام کے اپنے منزل مقصود یعنی مخاطب کے قلب و ذہن میں جانشین ہونے کے لیے زمان و مکان کی سخت قید نہیں ہے۔ جس طرح ہر بیج کو پودا بننے اور ہر پودے کو درخت بننے میں ایک سا وقت نہیں لگتا اور جس طرح نباتات کا پھولنا پھلنا صرف مالی اور بیج پر نہیں بلکہ مٹی، مہر عالم تاب، ہوا، پانی پر بھی منحصر ہے، اسی طرح سیاسی رہنما کی کامیابی، ناکامی، اس کے فکر کی پذیرائی اس کی وسعت، نظام کا استحکام اور اس کا ثبات، اس کا نتیجہ، سختی یا آسانی، خوشی یا غم، عزت یا ذلت کا۔ ان سب کے ظاہر ہونے کا تعلق رہنما اور اس کی فکر کی درستگی یا نقص، سعادت یا شقاوت سے ہے۔ کیوں کہ یہ سلسلہ ایک بڑے نظام کاینات کا ایک عنصر اور اس کے تابع ہے۔ کامیابی کی یہ شرط نہیں کہ سیاسی مفکر و رہنما اپنی زندگی میں اپنے فکر کی مقبولیت اور سیاسی نظام کا قیام دیکھے۔

ایک طرف کرد مول، ابراہیم لنکن، لینن، جمال الدین اسد آبادی (افغانی) مصطفیٰ کمال پاشا، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو، ہوچی من اور دوسری طرف ہوبس، روبسپیر، ہیگل، ہٹلر، مسولینی، بٹستا، سوموزا اور مارکوس کی کامیابی کی جانچ کے لیے اصول نقد و میزان ایک قسم کے نہیں ہو سکتے۔ کیا پیغام کے حق و صالح و درست ہونے کا فوری کامیابی سے لازمی تعلق ہے؟ کیا ضروری ہے کہ فکر و پیغام درست و صالح ہو تو زمانہ حال میں مقبولیت و کامرانی بھی حاصل کرے اور اگر شقاوت و فساد کا ہے تو ناکام رہے؟ کیا ہیگل کا یہ کہنا صحیح ہے کہ:

"جو موجود ہے وہ درست ہے اور جو درست ہے وہ موجود ہے۔"

"What is actual is rational and what is rational is actual"

درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ نہ صرف ادیان کی بلکہ میدان سیاست کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحت و درستی پیغام اور اس کی کامیابی میں زمان و مکان کی بندش نہیں بلکہ انکار اور ایذا رسانی کے طریقے عام رہے ہیں۔ اس کے برخلاف آمرانہ سیاسی قائد تیزی سے عنان گیر اور قابض ہوئے ہیں اور ان کا اور ان کے سیاسی نظام کا خاتمہ بھی نسبتاً جلد ہوا ہے۔ ایسے ظالم حکمران قدیم، یونان و روما کے رہے ہوں یا قرونِ وسطیٰ کے یا دوسری جنگ عظیم کے پہلے اور بعد یورپ، لاطینی امریکہ، ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے، ان کی حکمرانی فلورنس کے سیزر بورژیا اور اسپین کے فرینکو کی طرح چند مستثنیات کے علاوہ دیرپا نہیں رہی۔ برخلاف اس کے جمہوری نظام کا ثبات صدیوں میں گنا جا سکتا ہے۔ ہٹلر ۱۹۳۳ء میں ہنڈنبرگ کے ذریعے چانسلر بن کر حکومت پر قابض ہوا اور ۱۹۴۵ء میں اپنے تہہ خانے میں زہر کھا کر مر گیا۔

خود مولانا ابوالکلام خوب واقف تھے کہ انھوں نے کیا کہا اور کیا کر کے دکھایا۔ اپنی تصانیف کے اوراق منتشر ہونے دیے۔ عزیز شریک حیات سے موت کے وقت رُخصت نہیں ہوئے۔ اس کے عوض ان کے ہم وطنوں نے ان کو کیا جواب دیا؟ ان کے ہم وطن مسلمان اور ہندو دونوں تھے اور بحیثیت ہندستانی ان کی ذمے داری مولانا کی طرف برابر کی تھی۔ دونوں نے انھیں مایوس کیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کے بعد بھی انھوں نے میدان نہیں چھوڑا اور فرض کی ادائیگی کرتے رہے۔

ہندی مسلمان جنھوں نے مولانا ابوالکلام کی آواز پر ۲۲-۱۹۲۱ء میں انگریزی حکومت کی نوکری، خطابات اور کالج کی تعلیم چھوڑ دی تھی۔ جنھوں نے ۱۹۳۵ء کے دستور کے مطابق انتخابات میں کانگریس کو نو صوبوں میں کامل یا بڑی اکثریت دلانے میں حصہ لیا تھا۔ وہ ۱۹۴۰ء سے کسی اور راستے کی تلاش میں تھے۔ انجام کار وہ کہاں آگئے تھے؟ جب یہ تاریخی موڑ سامنے آ رہا تھا، اس وقت پھر یعنی ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو ایک بیان میں مولانا نے مسلمانانِ ہند کو آگاہ کیا:

> ''(اللہ کی) زمین کو پاک اور ناپاک کے درمیان تقسیم کرنا بھی اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ پاکستان کی اسکیم ایک طرح سے مسلمانوں کے لیے شکست کی علامت ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد ۹

کروڑ سے زیادہ ہے اور وہ اپنی اس زبردست تعداد کے ساتھ ایسی مذہبی ومعاشرتی صفات کے حامل ہیں کہ ہندستان کی قومی ووطنی زندگی میں پالیسی اور نظم ونسق کے تمام معاملات پر فیصلہ کن اثر ڈالنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ پورا ہندستان میرا ہے۔ یہ بدترین بزدلی کا نشان ہے کہ میں اپنی میراث پدری سے دست بردار ہوکر ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر قناعت کرلوں۔

جب پاکستان بن جائے گا تو کیا ہوگا؟ ہندستان دوریاستوں میں تقسیم ہوجائے گا۔ایک ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی دوسری میں ہندو اکثریت۔ ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے تین کروڑ سے زائد ہوگی اور وہ بہت چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی صورت میں پورے ملک میں بکھر کر رہ جائیں گے۔یعنی آج کل کے مقابلے میں وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اور زیادہ کمزور ہوجائیں گے۔ یہاں ان کے گھربار اور بودوباش ایک ہزار سال سے چلی آرہی ہے اور یہاں انھوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کے مشہور اور بڑے بڑے مراکز تعمیر کیے ہیں۔

ہندو اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک دن اس اچانک صورت حال سے سامنا پیش آئے گا کہ ایک صبح آنکھ کھلتے ہی وہ اپنے آپ کو اپنے گھر اور وطن ہی میں پردیسی اور اجنبی پائیں گے۔ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہوں گے اور ایک ایسی حکومت کے رحم وکرم پر ہوں گے جو خالص ہندو راج بن گئی ہوگی۔

پاکستان میں خواہ مسلمانوں کی مکمل اکثریت کی حکومت ہی کیوں نہ قائم ہوجائے، اس سے ہندستان میں رہنے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہرگز حل نہیں ہوگا۔ دو ریاستیں ایک دوسرے کی مدمقابل بن کر ایک

دوسرے کی اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتیں۔
اس سے صرف یرغمال اور انتقام کا راستہ کھلے گا۔ عالمی معاملات میں بھی
پاکستان کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر پائے گا۔" (ایضاً:۸۲)

چار سال پہلے، انھی ہندستانی مسلمانوں کے ایک دوسرے اجتماع کے سامنے ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو لاہور میں انھوں نے کہا تھا:

"میرے نزدیک ہندستان میں مسلمانوں کی حیثیت اقلیت کی نہیں بلکہ
دوسری بڑی اکثریت کی ہے اور یہ اکثریت ہندستان کی قسمت کے تمام
سیاسی واقتصادی وتمدنی فیصلوں میں برابر کی حقدار اور حصے دار ہے۔"
(ایضاً)

مگر ۱۹۴۸ء کے ہندستانی مسلمان ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۶ء کے ہندستانی مسلمانوں سے مختلف تھے۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء میں بہت فرق ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب کہ معلوم ہوتا تھا کہ شمالی ہند میں سکھ، مسلمان اور ہندو پر آسمان دور اور زمین سخت ہے، ان کی جان نہ اپنے گھر میں محفوظ تھی نہ راستے میں۔ مولانا کی ہمدردی سبھوں کے ساتھ تھی۔ گاندھی جی کو انھوں نے رائے دی کہ "پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزیں کو ہندستان میں پوری ہمدردی سے بسایا جائے۔"

ہندستان کے مسلمانوں کو اُس وقت انھوں نے اپنے درد و درد آشنا دل کی آواز سنائی۔ جو بات ایک مخالف ان کی رہنمائی کی ناکامی کے بارے میں کہہ سکتا تھا۔ وہ انھوں نے دلی کی جامع مسجد میں ۱۹۴۸ء میں شکستہ و ہراساں مسلمانوں کے مجمع سے خود کہی:

"تمھیں یاد ہے!
میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اُٹھایا اور تم
نے میرے ہاتھ قلم کر دیے، میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں
کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔
حتیٰ کہ پچھلے برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغ جدائی دے گئی
ہے۔ اس کے شباب میں ہی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر

جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا۔" (ایضاً: ص ۸۲، ۸۳)

ایک رہنما بزبان خود کہہ رہا ہے کہ اس کے مخاطب نے سنی ان سنی کر دی۔ مگر کیا سیاست کی اس وادی پر خطر میں مولانا ابوالکلام اکیلے مسافر تھے جن کے پاؤں کانٹوں نے زخمی کیے؟ اس بحر ناپید کنار میں کیا وہ تنہا ناخدا تھے جن کے بیڑے کو بے رحم طوفانوں نے ساحل مقصود سے دور نامہربان دلدل کے بیچ لا پھینکا؟

حکیم سقراط (۴۶۹-۳۹۹ ق م) نے ایتھنس کی سیاست میں نمایاں حصہ لیا اور اعلیٰ منصبوں تک پہنچے۔ ان کے بارے میں علم سیاسیات کے اعلیٰ ترین مفکرین میں سے ایک یعنی جون اسٹوارٹ مل نے لکھا ہے:

"وہ عظیم شخصیتوں کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے، جو انھیں اور ان کے عہد کو بہترین طریقے پر جاننے والے ہیں۔ ان کے مطابق سقراط اس عہد کے اعلیٰ ترین انسان تھے۔ علاوہ ازیں، آنے والے عہدوں میں وہ انسانیت کے معلموں کے معلم رہے، ان کی عظمت و شہرت میں دو ہزار سالوں سے زیادہ عرصے سے ابھی تک اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے انسان کو خود ان کے ہم وطنوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ وہ بھی ایک عدالتی کارروائی کے بعد۔"

(آزادی، نمائندہ حکومت اور محکومی نسواں: جون اسٹوارٹ مل "آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ص ۱۹۵۴ء، ص ۳۲۔)

خود مولانا نے علی پور جیل میں مقدمے میں اپنے بیان میں اس کا ذکر اس طرح کیا:

"عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے سچا انسان تھا۔" (علی جواد زیدی، انوار ابوالکلام مرتبہ:

جشن بہار کشمیر، سری نگر، ۱۹۵۹ء، ص ۱۷۵)

ارسطو، جس نے ساری زندگی ایتھنس والوں کو سیاست وادب واخلاقیات کی تعلیم دی۔ اسے اخیر عمر میں چیل سٹن میں پناہ لینی پڑی۔ مملکت روما کے قانون سائنس، رہنما، رکن کونسل، سی سیرو کو جلا وطن ہونا پڑا۔ اخیر میں سی سیرو نے آمریت کی مخالفت کی اور اسے قتل کر دیا گیا۔ جو کن کوک کی مجلس قانون ساز اور انتظامیہ کی علاحدگی کے نسخے کے مطابق دستوری دوا انگلستان میں نہیں بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بنی۔ مونٹسکیو اور ٹوک وِیل کی باتوں پر فرانس کے اہل سیاست نے کان نہیں دھرے۔ کارل مارکس کے مشقت کے پسینے اور خون دل سے سینچے ہوئے پودے نے انگلستان اور جرمنی میں نہیں بلکہ اقتصادی اور سیاسی طور سے دور افتادہ ملک روس میں جڑ پکڑی۔ مولانا محمد علی جوہر نے بھی صدا بلند کی کہ مجھے آزادی دو یا قبر کے لیے زمین! شاید ان کے دل کی آواز کو شرف قبولیت بخشا گیا اور وہ بجائے اپنے غلام ملک واپس پہنچنے کے بیت المقدس میں پیوند زمین ہوئے۔ گاندھی جی، جون فنر، جیرالڈ، کینیڈی اور مارٹن لوتھر کنگ کی باتیں تو بہت نزدیک کی ہیں۔ مولانا ابوالکلام پر جو گزری وہ نئی بات نہیں تھی:

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پس زنداں کبھی رُسوا سر بازار

البتہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے بالآخر اپنے ظلم وستم وکذب کا اعتراف کیا تھا اور تائب بھی ہوئے تھے۔ مگر جہاد آزادی کی دعوت دینے والے رہنما کے دینی بھائیوں نے کوئی اجتماعی آواز نہیں اُٹھائی۔ ان دشنام طرازیوں کی تلافی کرنے کو نہیں اُٹھائی۔ جوان کے چھوٹے بڑے لیڈروں کا شغل برسوں رہا تھا۔ البتہ پاکستان کے ایک ادیب احمد حسین کمال نے انفرادی طور پر پاکستان بننے کے پچیس سال بعد مولانا ابوالکلام کے قول کی صداقت کا اعتراف کیا اور پوچھا کہ:

> ”کیا اب وہ وقت نہیں آگیا ہے کہ برصغیر کی مسلمان ملت پچیس سال کی محرومیوں اور ذلتوں کے بعد اپنے مسترد کیے ہوئے مسیحائے ملت کی فکر ودعوت کی طرف رجوع کرے؟“

(مولانا ابوالکلام آزادؒ نے برصغیر پاک و ہند اور بنگلا دیش کے بارے میں کیا کہا تھا؟[1] ڈاکٹر احمد حسین کمال، کراچی و پاکستان: ۱۹۷۴ء، ص ۱۲)

مولانا ابوالکلام کو ان کے رفیق کار ہندو رہنماؤں نے عزت و احترام و آرام سے رکھا۔ ان کے لیے آنکھیں بچھائیں۔ ہندستان کی پارلیمنٹ میں ان کے سخت کلمات سنے اور ان کی رائے مانی۔ مگر ۱۹۴۷ء میں ملکی عوام اور رہنماؤں نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ مسلمان عوام کے ایک حصے اور اس کے نمایندوں نے تو ان کی بات ماننے سے انکار کر ہی رکھا تھا۔ خود ان کی سابق ورکنگ کمیٹی کے متعدد ہندو رہنماؤں نے زندگی بھر کے مشترکہ نصب العین سے منھ موڑ لیا۔ کانگریس کے ہندو لیڈر اپنے صدر کی وہ بات بھول گئے جو انھوں نے دلی میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو اپنے خطاب میں کہی تھی:

> ''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور (دہلی کے) قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے۔ بشرطے کہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا، کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

مسلمان اور ہندو دونوں ہی نے اس صلاح کار کی بات نہ سنی۔ خون سے سرحدوں کی لکیریں کھینچی گئیں۔ لاکھوں کی سسکیوں کے درمیان ہندستان اور پاکستان کے نئے حکمرانوں کے قصر حکمرانی اور ایوان عشرت کھڑے کیے گئے۔

کانگریس بڑی پارٹی تھی۔ اس کے رہنماؤں کا دائرۂ اثر مسلم لیگ کے اثر سے زیادہ تھا۔ کانگریس کے اشتراک کے بغیر ماؤنٹ بیٹن یا مسلم لیگ الگ الگ یا مل کر بھی ہندستان میں نئی

---

(۱) اس رسالے کا نام ''مولانا ابوالکلام آزاد...... سوانح و افکار'' ہے لیکن اس کا ٹائٹل مذکورہ بالا نام سے مزین و مشہور ہے۔

سیاسی اسکیم نافذ نہیں کر سکتے تھے۔ چاہے وہ ملک کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹنے کی یا بول گنائزیشن کی اسکیم ہی کیوں نہیں ہوتی۔ کانگریس کے ہندو رہنما فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے مگر ۱۹۴۷ء میں انھوں نے یہ نہیں کہا کہ ہمیں تقسیم منظور نہیں، یہ نہیں کہا کہ ''ہم آزادی لیں گے اور صرف متحدہ ہندستان لیں گے'' جلدی میں ہم ملک اور ملک کے لوگوں کا نقصان نہیں کریں گے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم ماؤنٹ بیٹن پلان کا بائیکاٹ کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے ۲۸-۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کا کیا تھا۔ ہم ماؤنٹ بیٹن تجویز کی مخالفت کرتے ہیں جس طرح کہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی مخالفت کی تھی اور جس میں متعدد مسلمان رہنما بھی شریک تھے۔ ابراہم لنکن نے ۱۸۶۵ء/ ۱۸۶۱ء تک ایک بڑی جنگ اس لیے لڑی تا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اتحاد کو قائم رکھیں اور غلامی قانوناً ختم کریں۔ مگر کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے انگریز حکمرانوں سے تو دوستی کر لی مگر ملک کے باشندوں کو آپس میں ایک دوسرے کو کاٹنے، لوٹنے کے راستے پر چلا دیا۔ جب فیصلے کا وقت آیا تو کانگریس کے رہنما، پچھلی روایتوں کے برخلاف، امن اور ملک کی سالمیت کے لیے کسی قربانی کے راستے پہ چلنے کو تیار نہیں ہوئے۔

سودا خمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو دے سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا!

پاکستان کی تجویز کو مان لینے کے جواز میں پنڈت نہرو اور دوسرے رہنماؤں کا کہنا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ مگر بقول مولانا ابوالکلام انھوں نے اس خیال کو درست نہیں سمجھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے ''ماؤنٹ بیٹن تجویز'' مان لی تو تاریخ یہی کہے گی کہ ہندستان کی تقسیم مسلم لیگ نے نہیں کانگریس نے کرائی۔ ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ بڑی ذمے داری کانگریس کی تھی۔ کانگریس ایک

سال تو کیا ایک مہینہ بھی ماؤنٹ بیٹن پلان کی مخالفت نہ کر سکی!(۱)

ادنیٰ درجے کے ہندو مسلمان رہنما اور اخبارات تو عوامی منافرت بڑھا ہی رہے تھے۔ تقسیم کی اسکیم مان لینے کی وجہ سے ہندو مسلم تنازع، دشمنی اور غیظ و ہیجان میں تبدیل ہو گیا۔ ملک میں گاندھی جی کے علاوہ کوئی نہ رہا جس کی بات قاتل سنتے۔ جو سیاسی، جانی، مالی، تمدنی، معاشی نقصان ہوا اس کے لیے کسی ایک فرد، یا کسی ایک فرقے یا کسی ایک سیاسی پارٹی کو ذمے دار اور حصے دار ٹھہرانا ممکن نہیں۔ میدان سیاست میں مختلف مذاہب اور خیالات کے رہنما، عیسائی، پارسی، سکھ، مسلمان، ہندو اور دوسرے سبھی شریک تھے۔ سبھی اپنے قول و فعل میں آزاد، مقتدر اور ذمے دار تھے۔ مگر جو تعداد اور سیاسی وزن میں جتنے زیادہ تھے اتنی ہی زیادہ ان کی ذمہ داری تھی۔ اس لیے قومی و جماعتی سود و زیاں اور سیاسی کامیابی اور ناکامی دونوں میں شریک کار رہنماؤں اور حالات کا کتنا کتنا حصہ تھا اس کا حساب کرنا بھی ضروری ہے۔ انگریزی حکومت کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ ہندستان کو دو نہیں دس ٹکڑوں میں بانٹنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ البتہ کانگریس کے رہنما کہتے تھے کہ وہ پورے ملک کے مفاد کی حفاظت کرتے ہیں۔ پارسی، سکھ، عیسائی، مسلمان، ہندو اور سبھوں کی۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں کا دعویٰ تھا کہ وہ مسلمانوں اور ان کے مفاد کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ جو کہتے تھے وہی کرتے تو جو راستہ انھوں نے اختیار کیا اس سے بہتر راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ اس بات کو قطعاً وہ نہیں سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہوش سنبھالا اور ہندستان و پاکستان میں سماج کے ان طبقوں کے ہو رہے تھے جنھوں نے آزادی کے بعد ترقی و مالی صنعت کے پھل کھائے۔

کیا مولانا ابوالکلام نے ۱۹۴۶ء میں اختیاری طور پر کانگریس کی صدارت کے کارگرترین

---

(۱) ماؤنٹ بیٹن ۱۷/مئی ۱۹۴۷ء کو تقسیم ملک کا اپنا پلان منظور کروانے گئے تھے۔ ۲۹/مئی کو لوٹے۔ ۳۰/کو اپنے عملے کی میٹنگ کی، ۳۱/کو قومی رہنماؤں کو صورت حال سے مطلع کیا، ۳/جون کو تقسیم ملک کا اعلان کر دیا۔ کسی کانگریسی رہنما نے ملک کی عدم تقسیم کے مؤقف کو چھیڑا ہی نہیں۔ اس پر بحث کی نوبت ہی نہ آئی۔ ماؤنٹ بیٹن کی لندن روانگی سے پہلے ہی تقسیم کے فیصلے پر کانگریس اور لیگ کے رہنما اور اقلیت کے نمائندے متفق ہو چکے تھے۔ مرتب

عہدے سے دستبردار ہو کر دوسرے افراد کی رائے اور فیصلے کی صحت پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا؟ کیا جمہوری طریقے کے مطابق دوسروں کو عہدے دے کر، جمہوری اقدار کی خاطر یا شاید استغنا اور عزلت پسندی کے رجحان کے مطابق اپنا غالب و کار آفریں ہاتھ ہٹا لینے سے بات بن کر بگڑ گئی؟ کیا عالم دین سے نیک نیتی میں اجتہادی غلطی ہوئی؟ اور ینٹ لونگ مینس کے ذریعہ مہر شدہ تیس صفحات کے ساتھ نومبر ۱۹۸۸ء میں شائع کتاب انڈیا ونس فریڈم کے مطابق مولانا کو اس بات پر افسوس اور غم تھا کہ انھوں نے یہ سمجھ کر اب کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کیبنٹ مشن پلان کو مان چکی ہیں اور کام آسان ہو گیا ہے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں خود کانگریس کی صدارت سے دستبرداری کا اعلان کیا اور ساتھ ساتھ جواہر لال نہرو کا نام تجویز کیا۔ اگرچہ مولانا نے ۱۸/اگست ۱۹۴۶ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ بلوا کر اور کیبنٹ مشن پلان کی غیر مشروط منظوری کا اعادہ کرا کر پنڈت جواہر لال نہرو کی غلطی کا ازالہ کرا دیا تھا۔ مگر اس کے بعد ''ہمہ عقل و خرد بے کار دیدم'' لیکن یہ سوال زیر بحث نہیں اور مزید برآں اس پر رائے زنی نکتہ بعد الوقوع سے زیادہ نہیں ہوگا۔

بہرحال مولانا ابوالکلام کے لیے سیاست کا کوئی اور راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ ''الامر بالمعروف والنہی عن المنکر'' پر عمل کرتے رہیں۔ یہ اُنھوں نے کیا۔ یہی ان کی کامیابی کا راز اور کامیابی کا پیغام تھا۔ جنگ آزادی کی صف اوّلین میں رہے۔ صلح دامنی کا ہاتھ بڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد ملک زیر و زبر ہو گیا۔ صفیں اُلٹ گئیں۔ ساتھیوں نے تھک کر آخر ساتھ چھوڑ دیا۔ خان عبدالغفار خان کو نئے ملک کے نئے حکمرانوں نے قید کر لیا مگر مولانا ابوالکلام پرانے ملک میں پرانے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے یقین کے ساتھ اپنی جگہ بلند و بالا، درخشاں و فروزاں قطب مینار کی طرح قائم رہے۔ تقسیم کے بعد روٹھ کر یا پسپا ہو کر گھر نہیں بیٹھ گئے بلکہ از سرِ نو تعمیر میں منہمک ہو گئے۔ آزادی کے بعد حکومت کی ذمے داری قبول کر کے انھوں نے مسلمانانِ ہند کی ڈوبتی کشتی کو کنارے لانا چاہا اور حکومت کی پالیسی کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کی۔

بطور وزیر تعلیم ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نئے نصب العین بنانا، فنی راہیں روشن کرنا اور

تعلیم کے اعلیٰ میعار کو ملک میں عام کرنا، یہ بنیادی کام ان کی قیادت میں ہوئے۔ امپیریل لائبریری کی جگہ نئے قانون کے مطابق نیشنل لائبریری قائم ہوئی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے دائرہ کار اور اختیارات کی توسیع ہوئی، نیشنل فزیکل اور کیمیکل لیباریٹریاں، ساہتیہ اکادمی اور دوسرے تعلیمی وتہذیبی ادارے قائم ہوئے اور ثمر آور ہوئے۔ افلاطون نے تعلیم کے رموز اور معنی بتائے تھے اور اس کو ریاست کا سب سے اہم کام بتایا تھا۔ مولانا ابوالکلام اور پنڈت نہرو نے مل کر جس تعلیم کے پودے لگائے آج وہ مضبوط تناور درخت بن گئے ہیں۔ اس تعلیم میں نئی سائنس اور ٹیکنالوجی شامل تھی۔ آج ہندستان ان رہنماؤں کی وجہ سے تعلیم کے میدان میں دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں موجود ہے۔

قدرت کا ایک اعجاز تھا یا کسی کی نیتوں کی برکت کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مٹی میں نہیں مل گئی، بلکہ دستورِ ہند میں اس کا نام لکھا گیا اور اسے ایک قومی اہمیت کا ادارہ مانا گیا۔ ایک مرکزی یونیورسٹی بن کر رہی۔ ایک انسانی ذریعہ اس مددغیبی کا مولانا ابوالکلام تھے۔ ایک طرف یونیورسٹی کے مخالفین کے سامنے ان کا استقلال اور دوسری طرف یونیورسٹی کے ساتھ ان کا حسن اخلاق۔ مسلم یونیورسٹی کے کچھ طلبہ نے اس بزرگ کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر بے ادبی کی تھی۔ مگر جب مولانا کے ہاتھ میں طاقت آئی تو گستاخیوں کی سزا دینے کی بجائے ادارے پر نظر مرحمت فرمائی اور طلبہ پر شفقت۔ نوجوانی کے دنوں میں مولانا کا خانہ دل سیّد احمد خان کی عقیدت ومحبت سے معمور تھا۔ وہی محبت بالغ نظر ہو کر نفرت کے تلخ چھینٹوں سے زیادہ مستحکم ثابت ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد سیاسی طور پر صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ ان کے ہم وطن ہندوؤں کے بھی رہنما تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے ان کے سیاسی فکر کی بنیاد مذہبی تھی اور دوسرے رہنماؤں کی بھی۔ دوسری طرف ایسے متعدد رہنما تھے جن کے سیاسی فکر کی بنیاد غیر مذہبی تھی مگر مذہبی ہو کر بھی ابوالکلام غیر مذہبی یا سیکولر رہنماؤں سے جمہوری سیاست کے باب میں کسی بات میں کم نہیں تھے۔ شہری آزادی، مذہبی یا اخباروں اور اداروں کی آزادی کا سوال، وفاقی حکومت اور صوبجاتی خودمختاری کا مسئلہ، مشترک رائے دہندگی اور رائے دہندگی بالغان کا سوال یا

اسمبلیوں میں فرقہ وارانہ نمایندگی کے تناسب کا مسئلہ، اُس زمانے کے مختلف سوالات پر مولانا کی رائے جمہوری قدروں اور اصولوں کے مطابق تھی)۔ علاوہ ازیں جزویات و تفصیلات میں اختلاف رائے تو مذہبی اور غیر مذہبی سیاسی رہنماؤں کے درمیان آپس میں کم نہیں ہوتا ہے۔

مولانا ابوالکلام کی نظر اس زمانے کی سماجی اور اقتصادی حقیقتوں پر بھی تھی۔ اگر چہ وہ ان کو سیاسی طاقت کے زیرنگیں سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ہندستان کے زرعی ملک ہونے کی بات اُٹھائی۔ نمک پر محصول کے خلاف لکھا اور ہندستان کی دولت کاروبار کے ذریعے انگلستان لے جانے پر اعتراض کیا۔ یہی مسئلہ دادا بھائی نوروجی منظر عام پر لائے تھے اور اسی کو کانگریس نے مستقبل میں حل کیا۔ ابوالکلام کانگریس کے ممبر تھے اور اس کے اہم زرعی اور اقتصادی اصلاحی فیصلوں میں شریک رہے۔ بعض مبصرین فی زمانہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ابوالکلام کو ہندستان میں اقتصادی اور سماجی طاقتوں کا شعور نہیں تھا۔ اگر ایسی چھپی ہوئی طاقتیں تھیں جن کے نام نہیں معلوم تو وہ طاقتیں بھی اس وقت سیاسی طاقت کی جنگ کے زمرے میں آتی تھیں۔ اس سے باہر نہیں تھیں۔ ایسے مبصر اس کہاوت کی یاد دلاتے ہیں کہ نوعمر لڑکا باپ کے کندھے پر کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ ہم باپ سے بڑے ہیں۔

یقین کامل کے ساتھ عمل پیہم رہا۔ محبت ان کی فاتح اعظم تھی۔ ابوالکلام کی وجہ سے نہیں بلکہ محبوب کی قدرت سے۔ محبت حقیقی تو رب العزت سے ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے اس کی مخلوق سے۔ یہ محبت اپنے آپ ہی میں فاتح اعظم ہے۔ البتہ اس صفت کا اظہار افراد اور قوموں میں اس وقت تک نہیں ہوتا ہے جب تک وہ اپنے نفس کی حالت نہیں بدلتیں۔

هرگز نه میرد آنکه دلش زنده شد به عشق

ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

خلقت کے اسی باہمی تعلق کی حقیقت کو قدیم سیاسی مفکرین نے مختلف ناموں سے پہچانا ہے اور اُردو میں سیاست پر مضمون میں ان الفاظ کے استعمال کا یہ ایک جواز ہے۔

مولانا ابوالکلام تقسیم کو روکنے میں کامیاب نہیں رہے مگر جو ان کے سیاسی پیغام کو صحیح مانتے ہیں ان کے لیے مندرجہ بالا پیمانے (ب) کے مطابق وہ کامیاب سیاسی رہنما تھے اور کامیابی

کے لیے مذہب کا کلیہ بھی یہی ہے کہ اپنا پیغام اخلاص سے پہنچانا اور اس کے لیے سعی کرنا۔ وہ اپنا پیغام پرزور قول و فعل کے ذریعہ باشندگانِ ملک تک پہنچاتے رہے۔ ان کا پیغام ان کی موت کے تیس سال بعد بھی زندہ ہے اور اس کی کامیابی کی واضح نشانیاں مختلف رنگوں اور صورتوں سے آشکارا ہیں۔ ان کا اثر دیر سے آنے والا مگر گہرا اور دیرپا تھا۔ ہندستان سیاسی طور سے ۱۹۵۰ء میں انڈیا یا بھارت بنا مگر ساتھ ساتھ اس کے دستور میں زیادہ تر ہندو معماروں نے دانش مندی اور فراخ دلی سے اس میں مذہبی رواداری کا یا سیکولر عنصر بھی شامل کیا۔ بنیادی حقوق بغیر تفریق مذہب دیے گئے۔ اقلیتوں نے تعلیمی اور تمدنی حقوق دستور ہند کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ میں لکھے گئے۔ اگر ہندستان کی نئی بزم مئے میں تشنہ لبی کا بڑا سبب ساقی کی بدلی ہوئی نظریں ہیں تو ایک حد تک اس میں مسلمانوں کی کوتاہ دستی کو بھی دخل ہے۔

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو خود بڑھ کر اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ہندستان کے رہنماؤں کے اس سیکولر مزاج کی ساخت و پرداخت میں اکیلے مولانا ابوالکلام نہیں بلکہ جنگ آزادی کے دوسرے مسلمان اکابر اور رہنماؤں کا بھی ہاتھ تھا۔ ۱۸۵۷ء سے ہی مسلمان اور ہندو ساتھ ساتھ آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ مسلمان رہنماؤں مثلاً مولانا محمود حسن، ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی، مولانا حسین احمد مدنی، خان عبدالغفار خان کی موجودگی سے ہندو مسلمان، رہنماؤں دونوں میں ہندستان کے لیے مذہبی رواداری کی بنیادی سیاسی اہمیت کا احساس پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں مولانا اخیر تک کانگریس کی فیصلہ کن مجلس (ہائی کمانڈ) کے بااثر رُکن رہے۔ اس لیے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر مولانا آزاد کانگریس میں سرگرم عمل نہ ہوتے اور سات سال تک اس کے صدر نہ ہوتے تو کیا کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان فاصلہ اور زیادہ بڑھا ہوا ہوتا، ہندو اور مسلمانوں میں اختلاف اور عناد اور زیادہ مہلک ہوتا اور ان کا خون اور آنسو ملک میں اور زیادہ بہتا؟

آج بھی اُردو کے شکستہ پر و نیم جان ہونے کے باوجود ۱۹۴۷ء کی بنائی نئی سرحدوں کے دونوں طرف مولانا آزاد پر لکھا جا رہا ہے۔ ان کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے ان کے

افکار کاغذ پر سے نکل کر زبانوں تک پہنچیں۔ وہاں سے پھیل کر دلوں میں جا بیٹھیں۔ ان کے پیغام کی سچائی پر پھر سے غور کیا جائے۔ حالت اور تقاضائے وقت کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ ہو سکتا ہے عوام کی اجتماعی جمعیت بیدار ہو۔ وہ اجتماعی طور پر فلاح و نجات کا راستہ تلاش کریں اور انھیں عمل صالح کے علاوہ دوسرا راستہ نظر نہ آئے۔ ممکن ہے پھر اُنھیں الہلال کی پیشانی پر لکھے ہوئے لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کی تفسیر سمجھ میں آئے۔ امن و خوشحالی کی بستیاں اپنے لیے اور دوسروں کے لیے تعمیر کریں۔

مولانا آزاد......ایک عظیم سیاسی رہنما

اکبر علی خاں

مولانا کی رہنمایانہ اور مجاہدانہ زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) پس منظر و تیاری (۲) جنگ اور فتح (۳) بعد جنگ اور استحکام

مولانا احمد محی الدین ابوالکلام آزاد۔ تمام دنیا کے مایہ ناز فرزند۔ مولانا خود اپنے آباؤ اجداد کا وطن دہلی بتاتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے کے بہت پہلے سے ان کے آباؤ اجداد دہلی میں رہتے تھے اور علم و رشد کی خدمت انجام دیتے تھے۔ جاہ و عزت کی خواہش نہیں کی، لیکن سب ہی ان کی عزت کرتے تھے۔ بطور خاص اس کی تعلیم دیتے تھے کہ عبودیت خدا کے سوا کسی کو سزاوار نہیں۔ سلسلہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک معمول رہا۔

مولانا کے والد شیخ خیر الدین نے عنفوان شباب ہی میں علوم دینی و عقلی میں زبردست دست گاہ پیدا کر لی تھی۔ جب انیسویں صدی عیسوی میں دہلی کی حالت دگرگوں نظر آئی تو اپنا مقام چھوڑنا مصلحت خیال کیا اور خود جلاوطنی اختیار کی تا کہ اپنا کام جاری رکھیں۔ اس لیے حجاز کا رُخ کیا۔ مکہ اور مدینہ میں موصوف کے سب گرویدہ ہو گئے۔ اس وقت تک شیخ متاہل نہیں ہوئے تھے۔ مفتی مدینہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی دختر عقد میں دی۔ قیام زیادہ تر مکہ میں رہا لیکن قسطنطنیہ اور قاہرہ وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ حکومت ترکی نے اعزاز دیے اور معقول وظیفہ مقرر کیا۔ حکومت مصر نے بھی بے حد قدر کی۔ شیخ خیر الدین کو دو لڑکے اور تین لڑکیاں تولد ہوئیں۔ مولانا آزاد اپنے بھائی اور بہنوں میں چھوٹے تھے۔

مولانا کی ولادت ایام حج ۱۸۸۸ء میں بمقام مکہ ہوئی اور پانچویں سال خانہ کعبہ میں

تسمیہ خوانی کی رسم ادا ہوئی۔ ۱۸۹۳ء میں شیخ نے یہ محسوس کیا کہ ہندستان کے حالات تقریباً اعتدال پر ہیں اس لیے خود عاید کردہ جلاوطنی کو خیر باد کہا اور وطن کے لیے واپس ہوئے۔ کچھ روز بمبئی میں قیام کیا لیکن مستقل سکونت اور اپنی سرگرمیوں کے لیے اس وقت کے دارالحکومت کلکتہ کو پسند کیا۔ یہاں بھی ان کے معتقدین کا ہجوم شروع ہوگیا۔ شیخ خیرالدین کو اپنی اولاد ذکور و اناث کی تعلیم و تربیت کا بے حد خیال تھا۔ اولاد کو اساتذہ کے علاوہ خود بھی تعلیم دیتے تھے۔ بچوں کو جب لکھنا پڑھنا آجاتا تھا تو وہ ان کے آیندہ سبق کے لیے خود تیار ہو کر آنے کے لیے کہتے اور خود اس پر جرح و قدح کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے فہم و ادراک میں زبردست صلاحیت پیدا ہوجاتی تھی۔

مولانا کو جیسے ہی لکھنا پڑھنا آیا جو چیز ہاتھوں میں آجاتی، اسے پڑھ ڈالتے۔ خدائے تعالیٰ نے حافظہ زبردست دیا تھا، ہر ایک چیز محفوظ ہوجاتی تھی۔ والد کی مجالس میں شریعت و طریقت کے درس بھی ہوتے تھے اور ان پر بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ مولانا نے والد سے بطور خاص الٰہیات و معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ اُردو، عربی و فارسی خاندانی و موروثی تھیں۔ عربی کے لیے تو کہا جاسکتا ہے کہ شیر مادر کے طور پر حاصل ہوئی۔ مولانا کے ذہن کی تشکیل میں ان کی والدہ کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ بقول مولانا وہ زبردست عالمہ تھیں۔ مکہ و مدینہ میں خواتین کی مجالس میں تقریریں اور وعظ کرتی تھیں جو بے حد مقبول ہوتے تھے۔ ہندستان میں بھی خواتین ان سے مستفید ہوتی تھیں اور وہ مشکل مسائل کو بھی بہ آسانی سمجھا دیتی تھیں۔ مولانا کو مشرقی علوم میں کم سنی سے ہی کافی مہارت ہوگئی تھی۔ اسی زمانے میں انگریزی سیکھنے کا شوق ہوا۔ شدبد کسی سے سیکھی ہوگی لیکن والد کے طریقہ تعلیم کی وجہ سے انگریزی سمجھنے کی صلاحیت لغت کے ذریعے سے اچھی پیدا کر لی اور مغرب کے علوم کو بھی چھان ڈالا۔ مغربی علوم اور فنون کا تنقیدی مطالعہ کیا۔ گھر میں ترکی و مصر کے عربی اخبار اور کتابیں آتی تھیں۔ وہ مغربی جدوجہد سے واقفیت پیدا کرتے۔ قرآنی تعلیم تو کہا جاسکتا ہے گھٹی میں تھی اور گھر میں ہر شخص اس کا عملی نمونہ تھا، جس کی وجہ سے خدمت خلق کا خاص جذبہ پیدا ہوگیا۔ مولانا نے کم عمری ہی میں دارالاخبار اور دارالمباحث قایم کیے جو چھوٹے پیمانے پر چلتے اور بارہ تیرہ سال کی عمر ہی میں رسالوں میں

مضامین روانہ کیے جو صرف قبول ہی نہیں بلکہ بڑی قدر کے ساتھ پڑھے گئے اور ۱۹۰۳ء میں ایک رسالہ لسان الصدق جاری کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے اس سے قبل ہی راہ نمائی اور مجاہدہ شروع کر دیا تھا۔ لسان الصدق سے مولانا کی شہرت عظیم ہو گئی۔ شبلی اور حالی و دیگر اہل نظر یہ خیال کرنے لگے کہ لسان الصدق کا ایڈیٹر جید عالم ہی نہیں بلکہ بڑی عمر کا اور تجربے والا ہوگا۔ ایسے ہی مراتب کے ساتھ مولانا سے مراسلت کرتے مگر ایک اہم تحریک کی مولانا نے اس کم عمری میں راہ نمائی کی وہ ''انسائیکلو پیڈیا'' اُردو میں تیار کرنے کی ضرورت و اہمیت ہے۔ اُردو میں سب سے پہلے اس کی تحریک پیش کرنے والے مولانا ہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے کیسی غائر نظر سے مغربی علوم کو دیکھا اور بلا کسی تعصب کے اس کو اُردو ادب کے لیے تیار کرنے کی پرزور تحریک پیش کی۔ یہ معترضہ جملوں کے طور پر لکھ دینا ضروری ہے کہ مولانا شبلی اور دیگر علماء نے اس تحریک کو اُٹھایا مگر کچھ نہ ہو سکا۔ آزاد انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد نے ۱۹۷۳ء، ۱۹۸۴ء تک دس سال مسلسل کوشش کے ذریعے کل ہند اساس پر اس کی تکمیل کی اور مولانا کی آرزو پوری ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد ۱۹۰۸ء میں مغربی ایشیا اور مصر و عراق کا سفر کیا۔ ارادہ یورپ جانے کا بھی تھا لیکن بعض اسباب کی بنا پر سفر ختم کر دیا اور واپس آ گئے۔ اس سے قبل انھوں نے انجمن حمایت اسلام، لاہور اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ کے اجلاسوں میں شرکت کی اور حالی، شبلی اور وحید الدین سلیم وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ سب مولانا کی کمسنی دیکھ کر حیرت میں رہے، بہت سے علمائے دین علماء دین اور اہل علم سے دوستی ہو گئی۔ ۱۹۰۶ء میں مشہور عالم عبداللہ عمادی سے ملاقات ہوئی، وہ بھی مولانا کی کم سنی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اسی سال مولانا لکھنؤ کی انجمن میں ''مذہب اور عقل'' پر تقریر کرنے کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ ۱۹۰۶ء اور ۸-۱۹۰۷ء میں تقریباً ایک سال مولانا نے اخبار وکیل، امرتسر کی ادارت فرمائی اور اس سے پہلے مولانا شبلی کے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ میں تقریباً ۶ ماہ علامہ شبلی کی معاونت کر چکے تھے۔

مولانا کے والد کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ مریدین اور معتقدین نے مولانا کو ان کے والد کے خلیفہ اور جانشین کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ مولانا نے کچھ عرصہ مرشدانہ زندگی کے گزاری،

لیکن وہ اس خاندانی روایت کو مستقل طور پر نہ گزار سکے۔ مریدوں نے اپنے مرشد کو بڑی رقمیں پیش کیں۔ مگر یہ کہہ کر لینے سے انکار کیا کہ وہ اپنے ہی عزیزوں کو جو مستحق ہیں دیں۔ دوسری جدت یہ کی کہ مریدین کو دست بوسی سے منع کیا۔

اس زمانے تک مولانا نے خود علوم مشرقی و مغربی کا گہرا مطالعہ اور اپنی زندگی کے چند اصول مقرر کر لیے جو قرآن کے گہرے مطالعے نے ان کے دل پر نقش کر دیے گئے۔ مولانا خود اپنی تحصیل علم کے متعلق حسب ذیل تفصیل بیان کرتے ہیں:

> ''علم وعمل کی راہوں میں آج قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں، جو کچھ قدیم ہے مجھ کو ورثے میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں۔''

جنگ آزادی:

مولانا نے علم وفکر کے منازل طے کرنے کے بعد علمی زندگی گزارنے اور قوم وملت کی رہنمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس شوق نے انھیں سیاسی میدان میں لا کھڑا کیا اور آئندہ زندگی انھوں نے خدمت قوم وملت میں گزار دی۔ مولانا کو قرآن پاک سے زبردست عشق تھا اور اس کے زبردست اصول جن پر آج پوری دنیا عمل پیرا ہے مولانا کے دل میں نقش کالحجر ہو گئے۔ مولانا کے الفاظ میں وہ حسب ذیل ہیں:

> ''میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے جو نوع انسانی کو چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزاد بادشاہوں اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی

کی طاقت ور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت نہیں ہے وہ قبضہ ہے لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق خود طاقت ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسبی مراتب یک قلم ختم کر دیے اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قوم، رنگ معیار نہیں بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے سب کام اچھے ہیں۔ انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب انگلستان سے گیارہ سو سال پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہیں بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مورخ گبن کے لفظوں میں وہ اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا۔"

ان مقاصد کو نشر کرنے کے لیے مولانا نے ۱۹۱۲ء میں ہفتہ وار الہلال جاری کیا جو طوفان کی طرح ہندستان میں پھیل گیا۔ مضامین کی بلندی اور مقبولیت کا اندازہ "آنجہانی کرپلانی" سابق صدر کانگریس کے اس بیان سے ہوتا ہے:

"میں انھیں (مولانا آزاد کو) ۱۹۱۳ء سے جانتا ہوں۔ میری یہ واقفیت ان کے اخبار الہلال کے ذریعہ ہوئی۔ وہ زمانہ ہندستانی صحافت کے درخشاں دور کا تھا۔ تلک، بپن پال اور آروبندو اور دوسرے بہت سارے لکھنے والوں کا دور، مولانا کی صحافت کا پایہ بہت بلند تھا۔ اسی زمانے میں میں بہار کے کسی کالج میں تاریخ کا پروفیسر تھا۔ میرے لیے ایک عجیب وغریب سی بات تھی کہ ایک نوجوان جو کسی جدید یورپی زبان سے واقف نہ ہو کس طرح ہم عصر داخلی اور بین الاقوامی سیاسی حالات پر اس تیقن کے ساتھ بحث کر سکتا ہے جو ایک بالغ نظر اور مشاق ماہر کا کام ہے۔ وہ ہندستان کی آزادی کے مسئلے پر عام طور پر استعماریت اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے تعلق سے بحث کیا کرتے تھے۔ ان کی

رائے میں برطانوی شہنشاہیت کی زنجیروں سے ہندستان کی نجات کے لیے یہ شرط مقدم تھی کہ پہلے ان زنجیروں کو توڑا جائے جن میں اسلامی ممالک کو مغربی اقوام خصوصاً برطانیہ نے جکڑ رکھا ہے۔ ان کو آزاد کرانا ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے۔"

ان خیالات کی عظیم اشاعت ایسے الفاظ میں کی جاتی تھی کہ ان پر قانونی گرفت نہیں ہو سکتی۔ حکومت کے حامی اخبار پانیر نے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا کہ مقدمہ چلائے بغیر مولانا کو قید کر دیا جائے۔ اخبار الہلال کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ بار بار مولانا کے دفتر کی تلاشی لی گئی۔ کاغذات ضبط کر لیے گئے۔ جب کوئی قابل گرفت چیز نہیں ملی تو مولانا کو ڈیفنس ایکٹ کے تحت رانچی (بہار) میں نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا اخباری جہاد کے ساتھ ایک اور اہم علمی جہاد میں مصروف تھے۔ قرآن پاک کو انسان کی آزادی، اخوت، صداقت، توحید باری اور وحدت انسانی اور صداقت کا ضابطہ مانتے تھے۔ اس کی تشریح کی اشاعت کتابی شکل میں کرنا چاہتے تھے۔ الہلال کے ساتھ اس کا بھی مسودہ تیار کرتے جاتے تھے۔ وہ ضائع کیا گیا اور ۱۹۱۶ء میں مولانا کو نظر بند کر دیا گیا تو البلاغ بھی جاری نہ رہ سکا، پریس بند ہو گیا اور پولیس کے پے در پے چھاپوں نے علمی ذخیرے کو تباہ کر دیا۔ پہلی عالمی جنگ ختم ہونے کے بعد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا کو رہا کیا گیا۔

ترکِ موالات:

رہائی کے وقت خلافت کی تحریک جاری تھی اور ملک کے قاید اس ارادے سے دہلی میں جمع ہوئے کہ وائسرائے سے مل کر ہندستان پر کی گئی قیود کم کرائیں۔ مولانا بھی پہنچ گئے اور گاندھی جی سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی اور قایدین نے وایسرائے سے ملاقات اور گفت وشنید کا ارادہ کیا۔ گاندھی جی نے اسی موقع پر انگریز سے مقابلے کے لیے ترک موالات (یعنی Non Cooperation) کی تجویز پیش کی، جو بعد کی ۲۷ سالہ زندگی میں سیاست کا اہم ترین اصول بن گیا تھا۔

ترک موالات کا پر جوش نظارہ علی گڑھ کالج میں میرا دیکھا ہوا ہے۔ جس کے تفصیلی نقوش آج بھی میری آنکھوں میں ہیں۔ اس وقت میں وہاں تعلیم پا رہا تھا۔ گاندھی جی، مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور دیگر قایدین علی گڑھ آتے رہتے تھے، طلب نے پر جوش ان کا استقبال کیا لیکن انتظامیہ تعلیمی اسٹرایک میں بہت بڑی رکاوٹ بنی رہی لیکن جامعۂ ملیہ انتظامیہ کی رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے بھی قایم ہوگئی۔

تب برطانوی حکومت سے تعلق توڑ کر تعلیم جاری رکھنی ضروری تھی، میں بھی جامعہ ملیہ کے پہلے بیچ (Batch) میں شریک ہوگیا۔ ملک میں ترک موالات کے زبردست مظاہرے علاحدہ علاحدہ طرح ہوتے رہے۔ گاندھی جی جن کی خدمات جنوبی افریقہ میں بے مثال رہی تھیں، انھیں ترکِ موالات کی تحریک میں آخر تک بہت اہمیت حاصل رہی۔ ہندو مسلم اتحاد کے لاجواب مظاہرے ہر جگہ دیکھنے میں آئے، حکومت برطانیہ کی تشویش بھی بڑھنے لگی۔ ۱۹۲۱ء کے آخر میں مولانا آزاد اور سی آر داس کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا، قانون کی گرفت میں نہ آئے تھے، الزام بدل کر لگایا، آخر الزام بغاوت کا لگایا، وہ بھی چسپاں نہیں ہوا۔ ترک موالات کے تحت مولانا نے ڈیفنس نہ کرنے کا ارادہ کر لیا اور آخر میں جو بیان دیا اس سے حکومت کی عدالتوں کو زبردست ٹھیس لگی۔ مولانا نے تحریری بیان میں برطانوی حکومت کو ناجائز بتایا اور ہندستان کے آزاد رہنے کے حق کو واضح حق جتایا۔ یہاں یہ مناسب ہوگا کہ اس کے چند اقتباسات پیش کروں۔ مولانا نے اپنا بیان کتابی شکل میں ''قول فیصل'' کے عنوان کے تحت شائع کیا۔ اقتباسات حسب ذیل ہیں:

۱- میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر قوم اور ہر فرد کا پیدایشی حق ہے۔

۲- میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔

۳- میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا۔ میں اس فرض کی تعمیل سے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴/ الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں جب تک بول سکوں گا ایسا ہی کہتا رہوں گا۔

۴- مسٹر مجسٹریٹ! اب میں کورٹ کا زیادہ وقت نہ لوں گا، ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا اور تمھارے حصے میں وہ کرسی! ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد اپنا فیصلہ لکھتے رہو۔ کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے، وقت اس کا جج ہے، وہ فیصلہ لکھ چکا اور وہی فیصلہ آخری ہوگا۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

مجسٹریٹ نے مولانا کو دو سال قید کی سزا سنائی۔ مولانا نے عدالت کا فیصلہ سن کر کہا:

''یہ تو اس سے بہت کم ہے، جس کی مجھے توقع تھی۔''

ترک موالات کی تحریک اور مولانا و دیگر قایدین کی تقاریر سے ہندو مسلم اتحاد کی سارے ملک میں لہر دوڑ گئی۔ حکومت ہند نے ایک طرف قایدین کو قید کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔ تقریباً ۱۹۲۷ء تک اتحاد مستحکم رہا، لیکن ملک کے دشمن نے تفریق پیدا کرنے کی ممکنہ کوشش کی اور ملے ہوئے اور فرقہ واری انتخاب کا سوال پیدا ہوا، اس کے علاوہ اور مزید واقعات اختلاف کے پیدا ہوئے۔

وحدت انسانی کے زبردست حامی اُن کے اس خیال میں لغزش نہیں آئی اور ملک کے اتحاد پر پوری قوت سے ڈٹے رہے، ان کے یہاں آزادی سے زیادہ عزیز ہندو مسلم اتحاد تھا، کیا ہی اچھے الفاظ میں انھوں نے اپنے اس جذبے کا اظہار کیا:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطے کہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا! کیوں کہ سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

اس کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے خلاف ناخوشگوار واقعات ہوتے گئے۔ اگر چہ مولانا اور بہت سے قایدین اس سے متاثر نہیں ہوئے، لیکن آزادی کا جذبہ کیا ہندو اور کیا مسلمان دونوں میں بھڑکتا گیا۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۴۰ء میں مولانا کو دوسری بار کانگریس کا صدر منتخب کیا

گیا۔ ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات سے آزادی کی جنگ کا علی الاعلان کام شروع ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں مولانا اور ان کے ساتھیوں نے ایک نیا اور زیادہ مؤثر موڑ دیا۔ ۱۹۴۲ء ''ہندستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کی، ۱۹۳۹ء سے دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی تھی۔ مولانا اور قایدین گرفتار بھی کیے جاتے رہے اور چھوڑے بھی گئے، چھ سات سال تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس عرصے میں مولانا کانگریس کے مسلسل صدر رہے، جنگ نے برطانوی حکومت کو کافی کمزور کردیا تھا لیکن ان کی سیاست اور حکمت عملی برابر کام کرتی رہی۔ کیبنٹ مشن روانہ کیا تاکہ منتقلی حکومت کا طریقہ کار مقرر کیا جاسکے۔ مولانا اور اکثر قایدین تقسیم ہند کے مخالف تھے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی حکمت عملی کام کرگئی۔ آزادی تو مل گئی مگر مولانا کے سوا تمام قایدین اکثر بادل نخواستہ تقسیم کے لیے رضامند ہوگئے۔ مولانا پارٹی ڈسپلن کے سخت پابند تھے کہ پارٹی کے احکام کی پابجائی پر کوئی حرف نہ آنے دیا، اس دردانگیز المیہ پر مولانا نے جو تقریر کی اس سے ان کی بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی اور جوش عمل، غیرمعمولی صلح پسندی کے جذبے کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ مولانا کی تقریر کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

> ''میں یہاں کسی پر ملامت کرنے نہیں آیا ہوں، جو ہونا تھا ہوا، اب مستقبل کی فکر کیجیے، وقت کے داغوں کو تازہ کرنے سے کیا فایدہ؟ ملامت کے قابل کوئی نہیں، صرف میں مستحق ملامت ہوں، خود میں اس قدر نااہل تھا کہ اس طوفان کو نہ روک سکا۔ ملک کو آزادی تو مل گئی جس کو ایک عظیم الشان فتح کہا جاسکتا ہے، لیکن ملک کی تقسیم ہوگئی۔''

استحکام بعد جنگ:

ملک آزاد ہونے کے بعد مولانا کی ذمے داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ آزادی کو مستحکم بنانے اور اقوام عالم میں ہندستان کو ممتاز کرنے کی ذمے داری سر پر آگئی۔ کابینہ میں مولانا نے محکمہ تعلیم کا انتظام اپنے ذمہ لیا، ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مشہور عالم فلسفی، لیس، رادھا کرشنن کی نگرانی میں مستند علماء سے ''مشرقی اور مغربی فلسفے کی تاریخ'' لکھائی، ظاہر ہے یہ کتاب عالم گیر اخوت کو مستحکم کرنے میں بے حد مفید ثابت ہوئی اور اس کی وجہ سے ہندستان کا

وقار دنیا میں بڑھ گیا اور عالم اہل ہند کی وسیع النظری کا معترف ہو گیا۔ وزارت تعلیم کا جائزہ لیتے ہی ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر کو سائنٹیفک میاں پور کمیٹی کا صدر بنایا گیا اور اس کی اہم تجاویز یہ ہیں:

۱- سائنس اور حرفیات کے شعبوں میں جن پر ابھی تک کام نہیں ہوا ہے مخصوص نصاب کی تعلیم اور تحقیقات کا کام کیا جائے۔

۲- موجودہ اداروں میں اگر گنجایش ہو تو تعلیم اور تحقیقات تعلیم کے کاموں میں توسیع۔

۳- بعض موجودہ پولی ٹیکنک اداروں میں تعلیم کا اعلیٰ انتظام۔

۴- بعض موجودہ تعلیمی اداروں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ۔

بنگلور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ میں کئی نئے اور ضروری متعینہ شعبوں میں اضافہ کیا گیا، تعلیمی نظام میں جو خرابیاں تھیں ان کا استیصال کیا اور وہ طریقے اختیار کیے جن سے یکجہتی کو قوت پہنچے اور ممالک ترقی یافتہ سے آگے نہ بڑھیں تو کم از کم پیچھے نہ رہیں، نصابی کتب میں منافرت پیدا کرنے والے اجزا خارج اور حقیقت پرستی اور محبت بڑھانے والی چیزیں داخل کرائیں، صنعتی اور سائنسی علوم میں ملک بہت پیچھے تھا، اس کی جانب فوری اور مؤثر اقدام کیا، کھڑک پور میں ایک زبردست فنی ادارہ انتہائی سرعت اور استحکام کے ساتھ قایم کیا۔ اگر مولانا کی پر جوش اور زبردست تحریک نہ ہوتی تو اس ادارے کا افتتاح جولائی ۱۹۵۰ء میں نہ ہو سکتا تھا، جو آج مایۂ ناز ہے اور جو کام کیے گئے مولانا نے ۱۹۵۰ء میں جو کچھ کیا اس پر انھی کے الفاظ سے روشنی پڑتی ہے۔ ''فنی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے جو لائحۂ عمل تیار کیا گیا ہمارے پیش نظر تھا۔ وہ چار اعلیٰ حرفتی اداروں کا قیام نیز موجودہ اداروں کی تقویت تھی، وزارت تعلیمات کے ابتدائی فیصلوں خود مولانا کے یعنی یہ عزم بالخیر تھا کہ ملک میں اعلیٰ فنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں بہم کی جائیں تاکہ خود ہم اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جو ملک سے باہر جاتی تھی، خود ملک میں تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ میں اس دن کا منتظر تھا اور اب بھی ہوں، جب ہندستان میں فنی تعلیم کی سطح اتنی بلند ہو جائے کہ ہندستان لوگ اس غرض سے آئیں تاکہ یہاں پر اعلیٰ فنی اور سائنسی تعلیم و تربیت حاصل کریں، مولانا کی جدوجہد و گہری دلچسپی کی وجہ سے مرکز کا تعلیمی بجٹ جو ۱۹۴۷ء میں دو کروڑ تھا، چند ہی برس میں تیس کروڑ کا ہو گیا

اور ہر قسم کی تعلیم کی چہل پہل انتہائی تیزی سے بڑھ گئی، لارڈ پیتھک جو ۱۹۴۷ء سے قبل کیبنٹ مشن کے صدر بن کر آئے تھے۔ وہ دوبارہ کسی کام سے ۱۹۵۷ء میں آئے تھے۔ موصوف نے مولانا کی عملی اور علمی خدمات اور اوصاف کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا:

> ''گزشتہ سال دسمبر ۱۹۵۷ء میں مولانا آزاد نے مجھے اور میری بیوی کو اپنے مکان نئی دہلی میں مدعو کیا تھا۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے میری دلچسپی کی بہت سی معلومات فراہم کیں، اور مجھے بتایا کہ لوگ ہندستان میں نوشت وخواند کی تعلیم کس تیزی سے حاصل کر رہے ہیں۔ عورتوں میں تعلیم کیسی پھیل رہی ہے اور قصبوں اور دیہاتوں میں مدارس کی تعداد کس سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب میں کیبنٹ کے قائد کی حیثیت سے گیا تھا تاکہ حکومت کی منتقلی کا انتظام کیا جا سکے تو میں اپنے قیام کے دوران اُن سے ہر روز ملا کرتا تھا، وہ اس زمانے میں کانگریس کے صدر تھے اور انھیں ایک ممتاز فاضل اور اہل علم کی حیثیت سے ایک اہم اور بعض دفعہ مشکل فریضے ادا کرتا ہوا دیکھا تھا، میں نے ان کی سیرت وعقل کے متعلق بڑی اچھی رائے قایم کی اور ان کا رویہ باوقار اور بہت مدبرانہ تھا۔''

یہ امر روز روشن کی طرح روشن ہے کہ آج ملک نے اقوام عالم میں دماغی آلات کی تیاری کی جو صلاحیت پیدا کر لی ہے، اس کی مستحکم بنیاد مولانا نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے رکھ دی تھی اور آج ملک نے اپنے دماغ کا قابل قدر انتظام خود ساختہ ہتھیاروں اور جہازوں کی تیاری سے بھی کر لیا ہے۔

آخری منزل:

۱۹۵۸ء کے فروری کے تیسرے ہفتہ میں غالباً مولانا کی دماغ کی شریان پھٹ گئی اور بے ہوش ہو گئے۔ اس زمانے میں میں دہلی ہی میں تھا اور اپنی آنکھ سے غم بھرے مناظر دیکھتا رہا۔ تمام دہلی پر اُداسی چھا گئی، خبر تیزی سے ملک میں پھیل گئی۔

مولانا کی قیام گاہ پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔فون پر کیفیت معلوم کرنے والوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ پنڈت نہرو پرائم منسٹر کے دن میں کئی چکر ہو جاتے تھے۔ منٹ منٹ کی خبر رکھتے تھے، علاج وتدابیر کوئی کام نہ آسکا۔ آخر ۲۲ فروری رات دو بجے مولانا کی پاک روح جسد خاکی سے رُخصت ہوگئی۔ نہرو صاحب کو اطلاع ہوئی تو فوراً ڈریسنگ گون میں پہنچے۔فون کے ذریعہ تمام انتظامات کے احکام جاری ہوئے۔ جامع مسجد میں صوفی سرمد شہید کے مشہور مقبرے کے قریب جگہ کا انتخاب ہوا، عجیب اتفاق یا کرامت کہیے مولانا نے اکیس بائیس برس کی عمر میں سرمد شہید پر جو مضمون لکھا تھا اس میں حسب ذیل الفاظ لکھے تھے:

''گلدستہ تو بن نہ سکا مگر چند پتوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں لے آیا ہوں کہ مشہد سرمد پر جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں''

مولانا کو سپرد خاک کرنے کے جب سارے انتظامات مکمل ہو گئے، جسم پورے فوجی اعزاز سے سپرد خاک کیا گیا۔ نہرو صاحب نے قبر میں اُتارنے میں خود حصہ لیا، چہرہ رنج وغم سے سرخ ہو گیا تھا، آنکھیں بار بار نم ہو جاتی تھیں جن کو صاف کرتے جاتے تھے، آخری رسومات ادا کیے گئے۔ مولانا کی خوبی کو نہرو صاحب نے پارلیمنٹ میں جس طرح بیان فرمایا اس کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

''آج ہم ایک عظیم المرتبت انسان کی رحلت پر ماتم کر رہے ہیں، جو ایک نہایت قوی عقل اور نورانی فراست کا مالک تھا اور ایسی حیرت انگیز استعداد کا حامل تھا کہ فوراً کسی بھی مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ جب ہم ایک ایسے رفیق دوست، ساتھی، قاید، اُستاد، خواہ کسی بھی نام سے انھیں یاد کیجیے، محروم ہو جاتے ہیں تو ہماری زندگی اور عمل وحرکت میں ایک مہیب خلا پیدا ہو جاتا ہے، جس خاص عظمت کے مولانا حامل تھے، اس کا ہندستان میں یا کسی اور مقام میں بدل یا ظہور ثانی ممکن نظر نہیں آتا۔''

مولانا کی حیات کے متعلق مضمون اس مصرع پر ختم کرتا ہوں۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

کاروان حریت کا امام......ابوالکلام

خورشید مصطفیٰ رضوی

عالم اسلام کی عظیم المرتبت شخصیت اور ہندستان کے بطل جلیل حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش پر آج ایک صدی بیت رہی ہے اوران کی یاد تازہ کر کے ہم اپنے ایمان وعمل کی تاریک دنیا میں صبح صادق کی نمود دیکھنے کے آرزومند ہیں لیکن جب اُن پر قلم اُٹھتا ہے کہ تو ہمیں مصر کی اس بڑھیا کی بے اختیار یاد آتی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی خریداری کے لیے اپنی کل متاع ایک سوت کی اَٹیا لے کر گئی تھی۔

متاعِ جان و ایماں لائے ہیں بہر خریداری
عجوزِ مصر کی مانند بازاروں میں ہم بھی ہیں

مولانا کی زندگی کے ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ میں صد ہزار نیرنگیاں! یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سا رنگ زیادہ شوخ اور گہرا ہے۔ وہ عزم واستقلال کا دیو قامت پیکر جس نے اپنے فن خطابت اور زورِ قلم سے دلوں کو مسخر کر کے جادو جگایا۔ سیاست پر جس نے حق وصداقت کی مہر لگائی، فراست جس کے در کی کنیز تھی، علم وفن جس کے خدام تھے، صحافت میں جس نے نئی روح پھونک دی، ادب وتاریخ کو جس نے نور بخشا، آزادیٔ وطن کی تحریک کو جس نے حق و باطل کی جدوجہد اور مسلمانانِ ہند کے لیے فریضۂ جہاد بنا دیا۔ وہ ان حاملانِ بصیرت میں سے تھے جن کا ظہور زمین وآسمان کی صدیوں کی گردش کے بعد ہوتا ہے۔ چمن کے وہ دیدہ ور جسے پیدا کرنے کے لیے نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روئی تھی۔

چودہ پندرہ سال کی نوعمری میں ہی وہ دین ووطن کے لیے سربکف ہو کر میدانِ عمل میں

نکل آئے اور بنگال کی انقلابی تحریکوں سے وابستہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں جب عمر کی صرف اٹھارہ ہی منزلیں طے کی تھیں، اپنے اُن ہم مذہبوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے پکارنا شروع کر دیا جنھیں ۱۸۵۷ء کی جانبازیوں کے بعد انگریزی حکومت کی شاطرانہ پالیسی نے اپنے سرسیّد جیسے وفاداروں کے ذریعے یہ کہہ کر سلا دیا تھا کہ تم تعلیم کی لاش اپنے کاندھوں پر اُٹھا لو، اپنے ہی جیسے غلاموں یعنی ہندوؤں سے اپنے حقوق چھین لینے کے لیے نبرد آزما ہو جاؤ۔ انگریز کے سائے کو رحمت سمجھو، عزم و ہمت کی تمام بلند آہنگیاں جو تمھارے مذہب اور چودہ سو سالہ تاریخ کا ورثہ ہیں، طاق پر رکھ دو کہ تم اقلیت ہو۔ خوف کرو اور سہم جاؤ کہ اکثریت تمھیں پامال کر دے گی۔

مولانا ابوالکلام کی زبان و قلم نے ان توہمات کو توڑ کر بت شکنی کا معجزہ دکھایا۔ مذہب و سیاست کے جہل آشنا تصورات کو تارِ عنکبوت کی طرح صاف کر کے تہلکہ برپا کر دیا۔ مسلمانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کی، مایوسی اور بے یقینی کی کیفیت سے نجات دلا کر ادائے فرض کے لیے جہادِ آزادیٔ وطن کے میدانوں میں کھڑا کر دیا۔ وہ نہ صرف ہندستان میں قافلہ آزادی کے سالارِ اعظم، فرزندانِ توحید کے امام الہند اور جدید ہندستان کے معماروں میں شامل ہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں آزادی اور اصلاح کی جو تحریکیں یا ایشیا اور افریقہ کی سرزمین پر بیداری کے جو آثار نظر آتے ہیں، ان میں جمال الدین افغانی کے ساتھ ہی مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں، علم و عمل اور مجاہدانہ اندازِ نظر کا رنگ شامل ہے۔

تاریخ اسلام کا ایک واقعہ ہے کہ عہد فاروقی میں کسی حاکم نے اپنے ماتحتوں پر بے جا سختی کی۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اللہ نے تو لوگوں کو آزاد پیدا کیا ہے، تم نے غلام کب سے بنا لیا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حریت آفریں قول ہمیشہ مولانا آزادؒ کے سامنے رہتا تھا اور جہاں کہیں انسانیت ظلم و غلامی کے شکنجوں میں نظر آتی وہ بے چین ہو جاتے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کی دلیرانہ پاکیزگی تمام عالم کے کاروانِ حریت کی روح کو تابندگی اور سرشاری عطا کرتی رہے گی۔

برطانوی استبداد نے اُن کی آواز دبانے کے لے مختلف طریقے اختیار کیے مگر یہ آوازِ

جرس اس بلا کی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں رسالہ ''الہلال'' جاری کر کے ''آزادی یا موت'' کا وہ صورِ اسرافیل سنایا جس نے خفتگانِ خوابِ غفلت کو بیدار کر دیا، فرزندانِ توحید کو دین محمدی علیہ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے ساز پر آزادیٔ وطن کا نغمہ سنایا۔ آزادی اور حق طلبی کی صدائیں بلند کیں۔ الجہاد فی سبیل الحریت کا لافانی درس دیا اور بتایا کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کی جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لیے ایک فرضِ دینی اور جہاد فی سبیل اللہ! بار بار پکار کر کہا کہ ''ہندستان لرزتا ہے، کون ہے جو اُس کو تھامے۔ ہندستان مضطرب ہے، کون ہے جو اس کو تسکین دے۔ ہندستان وقف فریاد ہے، کون ہے جو اس کی فریادرسی کو آمادہ ہو؟ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔ آزادی کی راہ میں قربانی اور جاں فروشی اُن کا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔ اس میدان کے مرد وہ جاں فروشانِ الٰہی اور مجاہدین حق پرست ہیں جن کے سر گردنوں پر نہیں بلکہ ہتھیلیوں پر رہتے ہیں۔''

غلامانہ ذہنوں کا خیال تھا کہ شیشہ و سنگ کی آزمائش میں شیشہ چور چور ہو جائے گا لیکن مولانا آزادؒ کہتے تھے کہ حق کی طاقت شیشے کو وہ قوت عطا کرے گی کہ اس سے ٹکرا کر پتھر کیا لوہا بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ان کی تحریروں میں جو ایک مضطرب اور بے چین آواز فضاؤں میں گونجی وہ صدائے ربانی نظر آتی تھی جس نے مسلمانوں کے دلوں میں توحید و ایمان کو راسخ کر کے طرابلس کے مظلوموں کے لیے تڑپ پیدا کر دی۔ ترک شہیدوں کے لیے ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو گرائے اور ذہن پر ضربِ کلیمی لگا کر خود اعتمادی اور خودشناسی کی شمعیں روشن کر دیں۔

دین و وطن کے اُفق پر ''الہلال'' کے طلوع کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''شیشہ و سنگ'' کی آزمائش کا نازک وقت آ گیا۔ برطانوی قہر و غضب کی بجلیاں گریں۔ ضمانت طلب ہوئی اور بالآخر دو سال بعد ''الہلال'' بند کرنا پڑا لیکن حق کی آواز اور طاقت دبائے نہ دب سکی اور ۱۹۱۵ء میں ''البلاغ'' جاری ہوا۔ چھ ہی ماہ بعد اس کو بھی بند کر دینا پڑا اور مولانا کو کلکتے سے باہر کر کے رانچی میں قید کر دیا گیا جہاں سے جنوری ۱۹۲۰ء میں رہائی ملی۔

طرابلس اور بلقان کے واقعات پر مولانا کی صداؤں سے دینی جمعیت اور قومی غیرت و

شعور کا جو گنبد مینا تیار ہوا اس کی چوٹی پر چڑھ کر انھوں نے وطنی آزادی کا وہ صور پھونکا جس سے برطانوی جبر واستبداد کی بنیادیں ہل گئیں۔ مسلمانانِ ہند کو، جو انگریز کے وفاداروں کی دی ہوئی ''اصلاح وتعلیم'' کی افیون سے مخمور اور نڈھال تھے، اس مجاہدانہ صدا نے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔
یہ آزادی کا وہ اعلانِ حق تھا جو سب سے پہلے مولانا نے مردانہ وار بلند کیا اور اُس وقت کیا جب حکومت کی نظر میں یہ سب سے بڑا جرم تھا جس کی پاداش میں مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۸ء میں جیل کی چکیاں چلائیں اور چند سال بعد آزادیٔ وطن کے دو اور مردانِ مجاہد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (علی برادران) سامنے آئے۔ مہاتما گاندھی اُس وقت تک ہندستان نہیں آئے تھے، افریقہ میں تھے اور پنڈت نہرو لندن میں زیرِ تعلیم تھے۔

رانچی سے مولانا آزاد رہا ہوئے تو ملک ایک اور آزمائش کے لیے تیار تھا۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ حکومت کے ایک نئے آرڈی ننس یعنی رولٹ ایکٹ کے خلاف غم وغصہ اس قدر شدید تھا کہ جلیانوالہ باغ امرتسر میں ہزاروں جانیں بے دریغ اس احتجاج میں پامال ہو گئیں (اپریل ۱۹۱۹ء) اُدھر ترکی کا مسئلہ خلافت مسلمانانِ ہند کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وزیر اعظم فرانس اور لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ کی تائید سے یونانیوں کو اناطولیہ پر قبضے کی اجازت دی گئی۔ یونان نے حملہ کر دیا۔ دنیائے اسلام میں ہر جگہ انگریز کے خلاف نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ صلح کانفرنس جو کبھی لندن اور کبھی پیرس میں ہوئی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی۔ اُدھر انگریزوں نے ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء کو استنبول پر قبضہ کر لیا۔ اُن کا منشا ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹانا تھا۔ معاہدہ سیورے کے ذریعے ترکی کی آزادی سلب کر لی گئی، عربوں کو انگریزوں کی غلامی عطا کر دی گئی اور دنیائے اسلام میں ہلچل مچ گئی۔ مہاتما گاندھی میدان میں آ چکے تھے۔ ملک کو ایک ایسے کاروانِ سالار کی ضرورت تھی جو ان تمام مسائل کو لے کر کھڑا ہو اور مردانہ وار رہنمائی کا حق ادا کرے اور یہ جگہ پر کر دی، ابوالکلام آزادؔ نے، جو مسلمانانِ ہند کو پھر پکار رہا تھا کہ:

''وہ اپنے پیچھے انسانی شرف وجلال کی ایک تاریخ رکھتے ہیں۔ وہ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ انسانی استبداد کی غلامی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں نہ کہ خود اپنی گردنوں کا زیور بنائیں۔ قدرتی طور پر اُن کا یہ فرض

تھا کہ ہندستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندستان کی تمام قومیں اُن کے پیچھے ہوتیں کیوں کہ ان کے پاس اسلام تھا اور اسلام آگے رہنے کے لیے ہے۔''

انگریز کے وفادار جو شیطانی اندیشے مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کر کے انھیں راہِ آزادی سے ہٹانا چاہتے تھے انھیں یہ مردِ مجاہد پھر للکار کر کہہ رہا تھا کہ:

''طاقت محض تعداد نہیں اور نہ صرف ہاتھوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی قوت ہے، جو اس کے اخلاق، اس کے کیریکٹر، اس کے اتحاد اور دراصل خشیت الٰہی اور اعمالِ حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلام کی طاقت کبھی وابستہ دامِ قلت و کثرت نہیں رہی اور اب بھی جن دلوں میں اسلام ہو وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے۔

اے اخوانِ غفلت شعار! نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں۔ میں مسلسل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کو آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میں تسلیم نہیں کرتا کہ کانگریس یا کسی بھی جماعت کی کوئی تجویز ان خطرات کو رد کر سکتی ہے۔ آج کتنی ہی تجویزیں کوئی پاس کر دے کل جب وقت آئے گا تو ان تجویزوں کی رائی برابر بھی کوئی قیمت نہیں ملے گی۔ ہوگا وہی جو ایک جماعت اپنے عزم و ہمت سے حاصل کر سکے گی۔ میں ایک لمحے کے لیے تسلیم نہیں کر سکتا کہ مسلمان کسی راہ میں خوف اور شک کی تاریکی ساتھ لے کر چل سکتے ہیں۔ اُن کے لیے ہر گوشے میں ایمان و یقین کی روشنی موجود ہے۔ نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم۔

مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت کی راہ نمائی قبول کی اور اعلان کیا کہ ''اگر مسئلہ خلافت پر مسلمانوں کے دل رنجیدہ ہیں تو ہندو اُن کے ساتھ شریک ہیں'' خلافت کمیٹیاں پورے ملک میں قائم ہو گئیں، کانگریس کے تمام ہندو لیڈر مسلمانوں کے ہم نوا تھے اور شانہ بشانہ جدوجہد کر

رہے تھے۔ مہاتما گاندھی نے الٹی میٹم دیا کہ ''مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق حل کرا دیجیے ورنہ میں پہلا شخص ہوں گا جو علم بغاوت بلند کرے گا۔''

اگست ۱۹۲۰ء میں تمام ہندستان جاگ گیا تھا۔ حلف لیے گئے، جلسے ہوئے، مادرِ ہند پر قربان ہونے کا عہد کیا گیا۔ اس دن کا آغاز خود مہاتما گاندھی نے اپنے امتیازاتِ خصوصی، تمغے اور خطاب واپس کر کے کیا اور وائسرائے کو لکھا کہ ''ان اعزازات اور تمغوں کو میں کیسے استعمال کر سکتا ہوں جب کہ مسلمان بھائی اس ظلم کے نیچے کراہ رہے ہیں جو ان کے مذہبی جذبات کے ساتھ کیا گیا۔'' ساتھ ہی مہاتما گاندھی نے ترک موالات (نان کوآپریشن) کا پروگرام پیش کیا۔ مولانا یہ تجویز پہلے ہی ''الہلال'' میں پیش کر چکے تھے۔ پانچ سو علمائے اسلام نے ترکِ موالات کا فتویٰ دیا۔ ہندستان کے علماء عالم اسلام کے علماء سے کہیں آگے رہے، انھوں نے سیاست اور تحریک آزادی میں پورا حصہ لیا ہے۔ مولانا آزاد کو علماء کے سرتاج کی حیثیت حاصل تھی اور ۱۹۲۱ء میں انھیں لاہور میں ''امام الہند'' کا خطاب دیا گیا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے فرمایا کہ الہلال نے علماء کو بھولا ہوا فرض یاد دلایا۔ یہ آواز اب ملک کے کونے کونے میں گونجی، وطن کے عوام کو بلا لحاظ مذہب و ملت پکارا اور اس سرزمین کے ہزارہا بہادر سپوت سربکف ہو کر نکل آئے۔ انھی میں ایک بہادر نوجوان پرکاش نرائن تھا، جو مولانا کی تقریروں سے متاثر ہو کر میدانِ عمل میں آیا اور آزادی کے متوالے جوانوں کی رہنمائی کرتا رہا۔(۱)

امام حریت نے خمکدۂ توحید کے متوالوں کو مخاطب کر کے کہا:

''وہ پاک اور مبارک وقت تمھارے سامنے کب آئے گا؟ آج ہر سچے محبّ وطن کا فرضِ منصبی ہے کہ اُس روپے کو ولایت نہ جانے دے جو انگلستان کے سرمایہ داروں اور انگلستان کے گھمنڈ کو پال رہا ہے۔ اگر ہندو صرف ہندستان کی آزادی کے لیے کوشش کر رہے ہیں تو مسلمانوں کے لیے دنیائے اسلام کی آزادی ہے اور تمام کرۂ ارض میں

1- Rajmohan Gandhi: Eight lives , p.230

آج اسلام اوراس کی چودہ سوسالہ عظمت مٹانے والی طاقت برطانیہ کی سرمایہ داری ہے۔ یہی ہندوستان برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں بے پناہ ہتھیار ہے۔ اسی ہتھیار نے باسفورس پر خون کی ندیاں بہائیں، مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ اسی نے سمرنا، شام اور فلسطین کے مسلمانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کیے۔ آج برطانیہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے جو دشمنانِ اسلام کا ساتھ دیتا ہے وہ دراصل انھی میں سے ہے۔ اگر طاقت ہوتی تو اپنی آرزوؤں کو اپنے دل سے نکال کر رکھ دیتا۔ بلکہ میری تو خواہش یہ ہے کہ اپنے خون آلودہ اور زخم خوردہ دل کو آپ کے سامنے رکھ دوں۔"

بمبئی میں تمام رہنماؤں کا جلسہ طلب کر کے متفقہ طور پر اعلان کیا گیا کہ "ہم یہ رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بات ہر ہندستانی کی قومی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ بحیثیت سویلین کے اور بطور ایک قومی سپاہی کے ایک ایسے نظامِ حکومت کی نوکری کرے جس نے ہندستان کو اقتصادی، اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے قعر مذلت میں ڈال دیا ہے اور جس نے قومی مقاصد کے حصول کو کچلنے کے لیے پولیس اور فوج استعمال کی اور جس نے فوج کے سپاہیوں کو عرب، مصر، ترکی اور دیگر ملکوں کی آزادی پامال کرنے کے لیے استعمال کیا، جنھوں نے ہندستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ہر شہری اور سپاہی کا فرض ہے کہ وہ گورنمنٹ سے تعلق منقطع کر لے۔"

قوم ووطن کے جن مجاہد صفت رہنماؤں نے یہ صدا بلند کی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

"مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزادؒ، حکیم اجمل خاں، لاجپت رائے، موتی لال نہرو، مسز نائیڈو، عباس طیب جی، راجگو پال آچاریہ، ڈاکٹر انصاری، راجندر پرشاد، حسرت موہانی، جے رام داس دولت رام وغیرہ

یہ صدائے حق وطن کے بام ودر سے ٹکرا کر اس طرح بلند ہوئی کہ ترک موالات کے ہزاروں طلبہ حکومت کے تعلیمی اداروں کو چھوڑ کر باہر آ گئے جن میں سب سے آگے علی گڑھ کے طلبہ جن کی قیادت کر رہے تھے ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریۂ ہند) جامعہ ملیہ اسلامیہ

اور کاشی ودیا پیٹھ کا قیام ہوا، علماے اسلام نے ہندستان کو دارالحرب قرار دیا۔ غیور فرزندانِ توحید احکامِ خداوندی کے آگے سرنگوں ہو گئے اور اٹھارہ ہزار غیرت مند اس سرزمین سے ہجرت کر کے آزاد ملکوں میں جا بسے۔ اس تمام جہادِ آزادی کے رہنما تھے مہاتما گاندھی اور مولانا آزادؒ۔

مولانا آزاد کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا جس میں ''قولِ فیصل'' کے عنوان سے اپنے بیان میں ببانگِ دہل اعلان کیا کہ:

> ''موجودہ حکومت ظالم ہے۔ میں نے یہ کہا ہے جب میں یہ سمجھتا ہوں تو اس کی زندگی بڑھانے کے لیے کیسے کہہ سکتا ہوں اور اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔''

ملک کی قومی تنظیم انڈین نیشنل کانگریس نے اُنھیں صدر منتخب کیا (۱۹۲۳ء) اور اب وہ تمام ملک میں قافلہ آزادی کے سالارِ اعظم تھے۔ کانگریس کے ایک اہم رہنما اور سابق صدر آچاریہ کرپلانی نے لکھا ہے کہ ''جب اس تنظیم پر آڑا وقت آیا، انتشار کی نوبت آئی تو وہ واحد شخصیت مولانا ابوالکلامؒ تھے جس نے جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا اور نئے سرے سے اتحاد و تنظیم کی بنا ڈالی۔'' (Rajmohan Gandhi: Eight Lives)

اُن کی فراست اور تدبر کی بے انتہا اور لاتعداد مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جب انھوں نے تمام قومی رہنماؤں کی صحیح سمت میں رہنمائی کی ہے۔

۳؍ مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال نے خلافت کا خاتمہ کر دیا اور ترکی دیگر حکومتوں کی طرح ایک دنیوی حکومت رہ گئی۔ ساتھ ہی، ہندوستان میں بھی خلافت تحریک کا خاتمہ ہو گیا لیکن اس تحریک نے مسلمانوں میں ایک عظیم وطنی جذبہ پیدا کیا۔ اُن کو محسوس ہوا کہ وہ ایک طاقت ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوا کہ اس طاقت کے استعمال کے لیے ملک کی تمام جماعتوں اور افراد سے اتحاد لازمی ہے۔ گویا تحریک خلافت کی گود میں تحریک آزادیٔ وطن نے نیا جنم لے لیا۔

مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ''ینگ انڈیا'' میں لکھا:

> ''اگر میں کوئی پیغمبر ہوتا اور میں جانتا کہ تحریکِ خلافت کا یہ انجام ہوگا

تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اُسی انہماک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی۔" (تحریک خلافت: عدیل عباسی، ص ۲۵۴)

لیکن تحریک خلافت کے بعد ایک اور خطرناک رُخ بھی سامنے آیا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ فرقہ وارانہ رجحان کی نمود تھی۔ کیوں کہ شاطرانِ برطانیہ بھی ان حالات کا رُخ موڑنے کی تاک میں بیٹھے تھے اور بالآخر ملکی سیاست کی بساط پر شطرنج کے وہ مہرے پھینکے اور چالیں چلیں کہ

اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

اپنے چند ہندو وفاداروں کو بتایا گیا کہ جن مسلمانوں کے اجداد قدیم زمانے میں مذہب تبدیل کر کے دایرۂ اسلام میں آ گئے تھے آج انھیں پھر سے ہندو بناؤ کہ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ مسلمان پٹھوؤں سے کہا گیا کہ تبلیغ دین کا کام شروع کرو اور ہندوؤں کو مسلمان بناؤ کہ یہ ہے اسلام کی خدمت۔ چنانچہ تحریک خلافت کے گرفتار شدہ لیڈروں میں سے ایک کو پراسرار طور پر رہا کر دیا گیا جس نے رہا ہوتے ہی وائسرائے سے ملاقات کی اور پھر یہ شرڈھایا کہ شدھی اور سنگھٹن کی صدا لگائی۔ اِدھر یہ خنجر قومی اتحاد کے سینے میں اُتارا گیا تو اُدھر تبلیغ کے تیروں نے مادرِ وطن کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔ ہندوؤں کی ایک زہریلی خفیہ تنظیم راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ RSS بھی اسی دور (۱۹۲۵)ء کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اب کہاں کی آزادی اور کیسی حریت، سب دھری کی دھری رہ گئی۔ کئی جگہ فسادات کرائے گئے اور نہ صرف عوام بلکہ لیڈرواں میں بھی انتشار اور اختلاف کا بیج بو دیا گیا۔ گاندھی جی اور ابوالکلام چیختے اور چلاتے رہے مگر یہ انتشار کا عفریت تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے کر بڑھتا ہی چلا گیا اور فرقہ پرست لیڈروں کے حوصلے بلند ہونے لگے۔ اُدھر بعض ہندو فرقہ پرستوں کی زبان سے ایسی تقریریں کرا دی گئیں جن سے مسلمانوں کے دلوں میں خوف، اندیشے اور تفکرات بڑھتے چلے گئے۔ مسلمانوں کے فرقہ پرست رہنماؤں نے بھی، جو اپنی لیڈری کی دکانیں حکومت کی سرپرستیوں میں چمکا چکے تھے، اشتعال وافتراق کی آگ برسانا شروع کر دی۔

ابوالکلام آزاد کا دامن خود اپنوں کی دست درازیوں سے تار تار ہونے لگا، طرح طرح

کے وسوسے، شکوک اور مطالبے سامنے آنے لگے۔ اس مردِ حق آگاہ نے انھیں پکار پکار کر کہا:

'کیا مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی ریاست کی ایک ایسی ہی جنس بن کر رہ جائیں کہ جو ہمارے جی کا ڈر نکال دے، ہمیں خرید لے؟ اسی بازار میں اُنھوں نے کبھی قوموں کی قسمتیں خریدی تھیں۔ اگر آج اس قابل نہیں رہے کہ دوسروں کی متاع ہمت خرید سکیں تو کم از کم خود اپنی ہمت کو اس ارزانی کے ساتھ فروخت کرتے نہ پھریں۔''

اُنھیں آگاہ کیا:

''مسلمانوں نے جوں ہی معاملے کو اس شکل میں دیکھا اُنھوں نے اپنی ہستی فنا کردی۔ کیا آٹھ کروڑ انسانوں کے لیے جن کی تیرہ صدیوں کی تاریخ ابھی دنیا نے فراموش نہیں کی، اس سے زیادہ کوئی توہین و تذلیل ہوسکتی ہے کہ وہ کانگریس یا کسی ملکی انجمن سے اس کے خواہش مند ہوں کہ ہمارے جی کا ڈر نکال دو تو ہم آزادیٔ وطن کی راہ میں جنبش کریں؟ دنیا میں جماعتی حقوق کا تحفظ خود اعتمادی کی رُوح سے ہوتا ہے نہ کہ ہمت فروشی کی اندیشہ ناکی سے۔''

بارہا اُس کی زبان اور قلم نے واضح کیا:

''سوال یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو اپنے سیاسی مستقبل کا جو مقدمہ بنانا چاہیے اس کی بنیاد عزم و یقین پر ہونی چاہیے یا خوف و تشکیک پر۔ میں کہتا ہوں عزم و یقین پر۔ لوگ کہتے ہیں کہ انھیں شک اور خوف پر۔ سارا اختلاف اسی اصل کا ہے۔''

مگر اب یہ آواز فرقہ پرستوں کے نقار خانے میں طوطی کی صدا تھی۔ اب مسلمانوں کو یقین دلایا جارہا تھا کہ وہ ملک کے باقی عوام سے الگ ''قوم'' ہیں۔ ان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ سب سے کٹ کر علاحدہ ہوجائیں۔ اب وہ نفرت کی بنیاد پر جمع کیے جارہے تھے اور آخرکار تقسیم وطن کا شوشہ چھوڑ کر انھیں ایک اور وطن دشمن راہ دکھادی گئی کہ تم اپنے مذہب کی جلوہ باریوں

سے اہل وطن کو راغب نہ کر سکے تو آؤ اسے خنجر بنا کر سرزمین وطن کے سینے میں بھونک دو۔ اسے نشتر بنا کر دلوں کو ہمیشہ کے لیے چیر دو۔ نتیجہ کچھ بھی ہو، تمھارے لیڈروں کو تخت و تاج تو میسر آ جائے گا۔ اسلام دلوں کو جیتنے کے لیے آیا تھا، تم اسلام کے نام پر زمین جیت لو اور پھر اپنے اعمال کا جلوہ اس طرح دکھاؤ کہ برطانوی استبداد کے غلام بن کر آزادی کے باوجود اُن کے اشاروں پر ناچو، نہ خود چین سے بیٹھو نہ دوسروں کو بیٹھنے دو!

ہوا وہی جو منشائے اربابِ اقتدار تھا۔ دین و وطن کے ازلی دشمنوں کی تمنائیں بر آئیں، دلوں میں افتراق اور انتشار کی بنیادیں پڑ گئیں، وطن کی فضائیں تقسیم وطن کے خوف سے لرزنے لگیں اور زمین و آسمان فرقہ پرستوں کی اشتعال انگیزیوں سے کانپ اُٹھے۔ ہاں! خوش تھے تو صرف دشمنانِ وطن انگریز اور ان کے وفادار کہ جن کی پچاس سالہ کوششوں سے بوئے ہوئے بیج کا درخت برگ و بار لا رہا تھا۔

کانگریس نے پھر ابوالکلام آزاد کو اپنا صدر منتخب کیا۔ (۱۹۴۰ء بمقام رام گڑھ) تو رام کے گڑھ میں اُس نے پھر ایک بار رام و رحیم کی داستان سنائی:

> ''ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اُس کی سرزمین مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی ہے۔ ان قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے

خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دے۔ ہم نے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا۔"

برطانوی سامراج کو للکار کر صاف کہا:

"ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اُسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقصد بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہتے۔"

اپنے ہم مذہبوں کو ایک بار پھر خون آلودہ اور زخمی قلب وجگر کی گہرائیوں سے آواز دی:

"میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج مجھ سے اختلاف ہے۔ میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا، مگر میں اُن سے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا کہ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمت کا معاملہ ہے۔ ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کر لیں، وہ اس کے سوا کوئی بھی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔"

۱۹۴۲ء میں پھر وطن کے عوام موت وحیات سے بے نیاز ہو کر کشمکش سے دوچار تھے۔ انگریزوں سے صاف کہہ رہے تھے کہ "ہندستان چھوڑ دو" اور اس جدوجہد کے کارواں سالار

تھے مولانا ابوالکلام آزاد، جنھیں دوسرے لیڈروں کے ساتھ ہی پھر گرفتار کرلیا گیا اور چھوڑا گیا ۱۹۴۵ء میں، جب کہ وطن کی آزادی کے لیے تجاویز پیش ہونے لگیں۔ انگریز کے کاسہ لیس مسلمان لیڈر سامراج کے سامنے سربسجود تھے اور دامن پھیلا کر بھیک مانگ رہے تھے کہ تم جاتو رہے ہو، ہمیں کس پر چھوڑے جاتے ہو۔ خدارا ملک کو تقسیم کرکے تو جاؤ۔

اس درمیان میں، شملہ کانفرنس اور کیبنٹ مشن وغیرہ کے ذریعے بات چیت ہوتی رہی۔ تقسیم وطن پر فرقہ پرستوں کا اصرار دیکھ کر مولاناؒ نے ایک ایسا فارمولا پیش کیا جس سے مسلمانوں۔ کے خدشات دور ہوتے اور حقوق کو پورا تحفظ مل رہا تھا اور ملک بھی تقسیم نہ ہوتا مگر اب یہ سننے اور سوچنے کی فرصت اور ضرورت کسے تھی۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جب مذہب کے خنجر سے وطن کی سرزمین کے ٹکڑے کیے جانے لگے۔ ابوالکلام آزاد کی تمام کوششیں بے سود ہوکر رہ گئیں اور آخر کار کانگریس کے تمام لیڈر یہاں تک کہ گاندھی جی بھی وطن کو خوں ریزیوں سے بچانے کے بہانے تقسیم کی تجویز ماننے پر مجبور ہوگئے۔ مردِ حق آگاہ ابوالکلامؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، خان عبدالغفار خان، مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے دردمند عمایدین وطن اور علمائے اسلام کی آخری جدوجہد بھی وطن کے بٹوارے کو روک نہ سکی تو اس مردِ مجاہد کا احساس زخمی ہوگیا، اس کے قلب کی گہرائیوں سے دھواں اُٹھا، اس کے نظریات کا دامن تار تار اور جگر فگار تھا۔

مذہب کی بنیاد پر زمین کی تقسیم کا کرشمہ شاطرانِ برطانیہ نے صرف اسی زمین پر نہیں، فلسطین میں بھی عرب و اسرائیل کی صورت میں دکھایا ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں اس نوکِ نشتر کی کارگزاری کے اثرات پڑے وہاں خون کے فوارے اُبل پڑے۔ لاکھوں انسان قتل و غارت اور بے خانماں ہوئے۔ مذہب کے اختلاف نے بے بس انسانوں کے گروہوں کو اِدھر سے اُدھر کیا، مسلمانوں کے فرقہ پرست لیڈروں نے راہِ فرار اختیار کی اور ملک کے اُس ٹکڑے میں جا بسے جو اسلام کے نام پر انھیں بخشا گیا تھا۔ ہندستان کی سرزمین فرزندانِ توحید کے لیے تنگ ہوگئی، زمین و آسمان تاریک نظر آئے، کل جو زمین صدیوں سے اُن کا وطن تھا آج ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کا سورج اُنھیں وہاں اجنبی بلکہ غدار بنا کر اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ دہلی کے بام و در بھی

ان کے خون سے لالہ زار تھے اور وہ ''ہجرت'' کے مقدس نام پر فرار کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور!

ایسے عالم میں اس زخم خوردہ احساس اور خون آلود قلب سے آخری صدا نکلی۔ مقام تھا دہلی کی جامع مسجد اور خطاب تھا انھی برگشتگانِ راہِ حق، یعنی اپنے پریشان حال ہم مذہبوں سے:

> ''میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور کہاں کھڑے ہو؟ آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اُٹھالو اور بے عملی کو ترک کردو۔ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے۔ یہ جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں یہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا۔ اِنھیں بھلاؤ نہیں۔ اِنھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے بھی ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔''

آزادیٔ وطن کے بعد ملک نے ابوالکلام آزادؒ کے ذہن و فکر کی تابانیوں سے فیض اُٹھایا۔ اپنے اس سپوت کی گراں بہا خدمات سے عز و افتخار پایا، وطن کے سرگرم اور بیدار قافلوں نے اس کی رہنمائی میں کامرانی اور فلاح کی منزلوں کو چھولیا۔ وہ نئے ہندستان کی آبرو اور اس کے سیکولر کردار کا معمار تھا۔ ابوالکلامؒ جو ایشیا کی رُوح کا آخری ترجمان تھا۔ جو ولی اللہی فکر اور ابن تیمیہ کی بصیرتوں کا آخری وارث تھا۔ ابوالکلامؒ، جو شمس الائمہ اور مجدد الف ثانی کی پرجلال اور پرعظمت روحوں کا جیتا جاگتا پیکر تھا، جو صورِ قیامِ قیامت تھا جو صدیوں کے بتوں کو توڑ دینے والا بت شکن تھا۔ جو ہندستان کے سر پر وقار و عظمت کا تاج تھا اُس پر لکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اتنا کہ قلم اسی ایک موضوع کے لیے وقف کیا جائے اور ایک طویل مدت تک اس میں مشغول رہ کر بھی اپنی بے بضاعتی اور ہیچ مدانی کے اعتراف کی خاموشی پر مجبور ہو جائے۔

آزاد......معمار اتحاد و آزادی

سیّد علی جواد زیدی

مولانا ابوالکلام آزادؔ کی شخصیت میں کئی خصوصیتیں بہ یک وقت اس طرح جمع ہوگئی تھیں کہ بعض اوقات ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ یہی حال مولانا کی سیاست کا بھی تھا۔ اگر وہ صرف سیاست داں ہوتے تو تعین و تبصرے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی لیکن وہ عالم و محدث و فقیہ و مفسر بھی تھے اور فلسفی و ادیب و شاعر بھی۔ وہ صحافی تھے مگر ادب کی سرحدوں سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا، ادیب تھے مگر اپنے ادب کو وقف صحافت کیے رہے اور پھر ادب و صحافت دونوں ہی کو اپنی سیاست کا تابع اور آلہ کار بنا لیا۔ اس طرح جب اُن کی سیاسی زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مولانا کی علمی، ادبی اور صحافتی زندگی کا جائزہ لینا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر حضرت مولانا کی صحیح اہمیت اور عصر آفریں عظمت کا صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ کیونکہ اُن کی صحافت کا مقصد بھی اُن کے سیاسی نظریات کی ترویج و تبلیغ تھا اور اُن کے ادبی جوہر پاروں کا مطمحِ نظر بھی یہی تھا۔ حد یہ کہ تفسیر قرآن مجید اور خطبات دینی سے بھی حضرت مولانا نے یہی کام لیا۔ وہ کوئی نہ کوئی گوشہ اپنے تمام اعمال و افعال میں خدمت سیاست کا ضرور نکال لیتے تھے۔ سیاست اُن کی زندگی بن گئی تھی اور اُن کے سارے وجود پر حاوی ہوگئی تھی۔ پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ وہ نرے سیاسی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی پرورش و پرداخت، اُن کی تعلیم و تربیت ایک بالکل ہی مختلف طریقے پر ہوئی تھی۔ اگر اُن کے پہلو میں وہ دل نہ ہوتا، جو تھا اور اگر ان کے بالائے دوش وہ ذکی الحس، دُور بیں اور مآل آشنا دماغ نہ ہوتا جس کی جلوہ باریوں نے ہماری تاریخ کا رُخ ہی موڑ دیا تو وہ زینت افروز بوریائے فقر و شاہراہ تصوف و فراز منبر ہو جاتے

یا پھر قرطاس وقلم کی خدمت میں مصروف ہو کر اجتہاد کی نئی نئی دلیلیں نکالتے رہتے۔ وہ عالم و صوفی ومفسر وفقیہ ومحدث وادیب شاعر وصحافی سب کچھ ہوتے لیکن سیاست داں نہ ہوتے۔ کیونکہ طبعاً وہ کم آمیز، گوشہ نشین اور نازک طبع واقع ہوئے تھے لیکن وہ تاریخ کے تیز دھارے کے بیچ میں آ گئے اور پھر ظالم موجوں کی طوفاں خیزی میں انھیں ایثار وقربانی کے وہ جلوے نظر آئے کہ وہ سرتاپا سیاست بن گئے۔ یہ انقلاب کیسے ہوا؟ اس کی ایک داستان ہے اور ہمارے نوجوانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس داستان کو اچھی طرح جانیں اور سمجھیں کیونکہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اصلی محرکات اور نامشتہر عصری مقتضیات سے نگاہیں ہٹتی جائیں گی اور صرف پیش پاافتادہ تاریخی واقعات سامنے رہ جائیں گے۔

مولانا سن ستاون کے تقریباً تیس برس بعد، اپنے وطن اصلی ہندستان سے دُور مکہ معظمہ میں باب السلام کے قریب محلہ قدوہ میں (۱۸۸۸ء) پیدا ہوئے۔ وطن سے یہ دُوری بھی سیاسی حالت کا نتیجہ تھی۔ غدر سے پہلے جب ہندستان کی حالت دگرگوں ہوئی اور سلطنت واقتدار کی بنیادیں بالکل ہی متزلزل ہوگئیں تو علماء کا ایک گروہ بے حد برداشتہ خاطر ہوگیا اور ہندستان سے ہجرت کر کے قافلہ بہ قافلہ حجاز جانے لگا انھیں میں مولانا آزاد کے والد کے نانا مولانا منور الدین بھی تھے۔ نانا ہی کے ساتھ مولانا کے والد مولانا خیرالدین بھی گئے۔ ان دونوں حضرات کے علم وفضل کی بنا پر وہاں کے کبار مشائخ سے ان کے تعلقات ہو گئے اور شیخ حرم، شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی سے مولانا خیرالدین کی شادی بھی ہوگئی۔ اسی ''قران السعدین'' سے مولانا آزاد کی صلاحیت علمی کا خمیر پیدا ہوا۔

یہ خاندان صرف گوشہ نشین علماء کا خاندان نہیں تھا بلکہ یہ لوگ بے حد سیاسی اثر ورسوخ کے بھی مالک تھے اور مغل بادشاہوں کی عظمت سے بھی خائف نہیں ہوتے تھے۔ آپ کے خاندان ہی کے ایک فرد مولانا جمال الدین تھے، جنھوں نے شہنشاہ اکبر کے امام وقت ہونے کے محضر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بعد میں ہجرت کر کے مکہ چلے گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے شیخ محمد نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کرنا درحقیقت ناجائز اور حرام ہے۔ اسی طرح مولانا آزاد کے پرنانا، قاضی سراج الدین پنجاب کے قاضی القضاۃ اور نائب

السلطنت نورالدین کے مشیر تھے اور سکھ فوجوں کے خلاف کئی معرکوں میں شریک ہوئے اور بالآخر ملتان کے معرکے میں مارے گئے۔ مولانا منورالدین بھی سکھوں اور مرہٹوں کی فوجوں میں قید رہے۔ پھر بہ مشکل دلی پہنچے۔ چھ برس بعد اپنے والد قاضی سراج الدین کے قتل کیے جانے کی خبر پائی تو قصور جا کر گھر والوں کو دلی لائے اور یہیں آباد ہو گئے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ان کو رُکن المدرسین بنا دیا گیا۔ رکن المدرسی اُس زمانے کی وزارت تعلیم تھی۔ انھوں نے بھی بادشاہ کے سامنے بھرے دربار میں ڈولے کی رسم کی ممانعت کی جب کہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خود اس دن محل میں ایک ڈولا آیا ہے۔ اسی طرح بہادر شاہ پر جب شیعیت کا رنگ چڑھنے لگا تو انھوں نے شدید مخالفت کی۔ جب مولانا کے والد اور نانا ہندستان سے ہجرت کر کے حجاز گئے تو وہاں کے ذی اثر علماء سے بھی ان کے گہرے تعلقات ہو گئے۔

قیام مکہ کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد مولانا کے والد کو قسطنطنیہ جانے کا اتفاق ہوا، جہاں سلطان عبدالمجید نے ان کا اور ان کے تمام متعلقین کا وظیفہ مقرر کر دیا اور وہ وہاں دو برس رہ پڑے۔ اسی زمانے میں شریف مکہ نے بغاوت کی۔ پھر مولانا ہی نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی۔ مولانا (خیرالدین) نے شام و عراق وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ آخر میں شریف مکہ سے بھی شدید اختلافات ہو گئے۔ وہابی تحریک کی بھی انھوں نے شدید مخالفت کی تھی اور شیعہ جماعتوں سے مقابلہ و مناظرہ کیا تھا اور اُن کی مخالفت کے سلسلے میں بھی کچھ سیاسی پیچیدگیاں مول لے لی تھیں۔ غرض اس خاندان کی تاریخ ایک جدوجہد طوفانی کی تاریخ ہے جس کی خصوصیات میں جرات گفتار، عزم محکم، سرفروشی عشق اور غرور استغنا شامل تھیں۔ سلطنتوں سے وابستگی بھی رہی تو فقر و استغنا کے ساتھ۔ اس کا اقرار خود مولانا نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''میں نے اُن گودوں میں پرورش پائی ہے جن کا فخر و شرف حیات دنیوی پر نہیں بلکہ فقر و مسکینی پر رہا ہے اور فقر اپنا خاندانی ورثہ ہے۔''

لیکن طریقوں اور خیالوں کے باوجود مولانا کی طبیعت بالکل ہی مختلف تھی۔ ایک تو مولانا کے خاندان والے صرف علماء کے حلقے میں رہ کر سیاست برتتے تھے جس کا دائرہ مذہبیات و اسلامیات کے خطوط سے کہیں نہ کہیں جا ملتا تھا اور یہ سب کے سب مذہب کے معاملے میں

بے حد سخت گیر اور بالکل قدامت پسند تھے لیکن مولانا نے اپنی روش ابتدا ہی سے مختلف رکھی۔ خود لکھتے ہیں کہ:

''میری پیدائش ایسے خاندان میں ہوئی جو علم مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی سنبھالا نہیں تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے تھے۔ ..... میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدت مندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا، بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آ کر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔''

(غبار خاطر، لاہور، مکتبہ احرار (۱۹۴۷ء، تیسرا مکمل ایڈیشن)، ص ۱۱۴-۱۱۳)

یہ کیفیت صرف پیری و مریدی کے بیرونی مظاہر تک محدود نہ تھی بلکہ اس خلش کی جڑیں دور دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ خود مولانا ہی کا قول ہے کہ:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہے کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں اُن کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ برابر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقاید و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں بیک وقت متزلزل ہو گئیں اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں:

ہیچ گہہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت

دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم''

(ایضاً: ص ۳۳-۱۳۲)

شک کی یہی چبھن تھی کہ جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کر دیا تھا مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچا دیا۔'' (ایضاً: ص ۱۳۴)

غرض مولانا آزاد ہر طرف گئے۔ ممنوع شاہراہوں کی طرف بھی اور عام گزرگاہوں پر بھی۔ ایام جوانی میں ایک سال پانچ ماہ کا زمانہ ایسا بھی گزرا جو مولانا کے خیال میں گمراہی کا زمانہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

''گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو اور فسق خود بھی ایک کامل قسم ک الحاد ہے...... لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کارِ رازِ ما بفکرِ کارِ ما

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

(تذکرہ: کلکتہ، البلاغ پریس، ۱۹۱۹ء، ص ۲۹۴-۲۹۳)

غرض اپنی غفلت پرستیوں کا یہ حال تھا، لیکن اُدھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ دوسرا ہی ہو چکا تھا۔ ناگہاں جاذبہ توفیق الٰہی پردۂ عشق مجاز میں نمودار ہوا...... بلاشبہ یہ لغزش تھی، لیکن اُس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اُسی تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی راہ نما بن جائے تو کیوں نہ ہزاروں استقامتیں اس پر قربان ہوں۔'' (ایضاً: ص ۹۶-۲۹۵)

جس وقت مولانا تحقیق و تجسس، تلاش و جستجو، علم و ایمان کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے اُس وقت سے لے کر آخر تک مولانا کا یہی وطیرہ رہا کہ کسی چیز کو جانچے اور پرکھے بغیر قبول نہ کرنا۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ ان کا دوسرا طریقہ یہ بھی تھا کہ جب راہ نظر آ جائے تو پھر عقوبتوں

کا خیال کیے بغیر اور ستایش و صلے کی تمنا کیے بغیر اُس راہ پر چلنا بلکہ صرف اسی راہ پر چلتے رہنا۔ تقلید کی راہوں پر قدم نہیں اُٹھتے تھے بلکہ خود سوچتے اور خود سوچ کر راہ نکالتے، چاہے وقت کی ٹولیاں کسی طرف جائیں اور زمانے کے قافلے کوئی سمت کیوں نہ اختیار کریں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہو، مگر میرا معاملہ بالکل انوکھا رہا۔ جس جنس کی مانگ عام ہوئی وہ میری دوکان میں جگہ نہ پاسکی۔ لوگ بازار میں دوکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر جہاں خریداروں کی بھیڑ ہو۔ میں نے اپنی دوکان لگائی تو وہاں جہاں گاہکوں کا گزر کم ہو سکے۔ مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔''

اور اس مقام بلند تک پہنچنے کے لیے انھیں (انھیں کے بقول) دلدلوں اور جھاڑیوں سے گزرنا پڑا، زنجیریں توڑنا پڑیں اور اُمنگوں اور اُمیدوں کے دفتر اپنے ہاتھوں جلانا پڑے لیکن یسا نہیں ہے کہ ان تمام راہ رویوں اور جہاں پیمائیوں میں ان کے یہاں کوئی سمت یا کوئی راہ نہیں تھی یا وہ مذہب کے معاملے، روح مذہب اور اس کے مسلمات کی طرف سے بھی غافل تھے۔ ترجمان القرآن میں انھوں نے یہ بات بہت واضح طور سے لکھی ہے کہ ''کامل ستائیس برس تک قرآن میرے شب ورز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے اور اس کی ایک ایک سورۃ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔'' اسی طرح مولانا آزاد نے کانگریس کے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب

میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی، اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔"

مختصر یہ ہے کہ مولانا کے مذہبی ماحول، اُن کے خاندانی حالات، اُن کی تعلیم و تربیت سب نے مل جل کر انھیں مذہبی روایات تو ضرور دیں لیکن قدامت پسندی، کٹر پن، تنگ نظری اور ضد اُن میں پیدا نہ ہو سکی۔ اس کا سبب اُن کی تحقیق اور وسعت مطالعہ تھا، اس کی عادت انھیں بچپن ہی سے تھی۔ اُنھیں جو کچھ ملتا وہ پڑھتے اور تلاش کر کے پڑھتے۔ پھر اُن کا ذہن خود نئے گوشے نکالتا، نئے شبھے اُبھارتا اور ان کا حل ڈھونڈتا۔ اس طرح ان میں قدیم و جدید کا ایک نہایت ہی دل آویز امتزاج ہو گیا۔

خوش قسمتی سے اُن کے والد کے قسطنطنیہ، شام، حجاز و مصر وغیرہ سے پہلے ہی تعلقات تھے۔ دوران تعلیم میں خود مولانا نے ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی تو انھیں ایک نئی اسلامی تحریک کے قریب آنے کا موقع ملا۔ یہ علامہ جمال الدین افغانی کی تحریک آزادیٔ مشرق و اتحاد اسلامی تھی۔ اس نے مشرق کو خواب گراں سے جھنجھوڑا اور یورپی استعمار کی چال بازیوں اور ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عرب و عجم اپنی آزادی تیزی سے کھوتے جا رہے تھے۔ یورپ سے اسلامی حکومتوں کے قدم اُکھڑ چکے تھے۔ ترکوں کا بیڑہ غرق کیا جا چکا تھا اور ہندستان میں بھی مغلیہ حکومت دم توڑ چکی تھی۔ غرض سارے عالم اسلام پر ایک یاس انگیز اضطراب چھایا ہوا تھا جو موت کے سکوت سے کم نہ تھا۔ اسے افغانی نے محسوس کیا اور پھر انھوں نے صور قیامت پھونکا۔ وہ خود تو آگ میں پھاندے ہی مگر انھوں نے سارے مشرق میں ایک نئی آگ کے شعلے بھڑکا دیے۔ یہ آزادی کی آگ تھی۔ اس تحریک کی خصوصیت یہ تھی کہ تنگ نظری نہیں تھی بلکہ آزادی اور مساوات کے بنیادی اصولوں پر قائم تھی اور بین الاقوامیت کا پہلو لیے ہوئے۔ اس لیے مشرق کے سیاست دانوں نے پہلی بار اپنے ہی ملک کی چھوٹی چھوٹی ریشہ دوانیوں، اندرونی رقابتوں سے بلند ہو کر بین الاقوامی سیاسی محرکات و عوامل کا تجزیہ کرنا سیکھا۔ افغانی کا انتقال ۱۸۹۷ء میں یعنی آزاد کی ولادت کے تقریباً دس سال بعد ہو گیا اس لیے

آزاد نے افغانی کے اسی آخری دور کو ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھا تھا اور گھر میں اسی کا چرچا سنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانی کی تحریک نے اسی آخری دور میں زیادہ زور پکڑا تھا۔ رفتہ رفتہ شیخ افغانی کی تحریک ہندستان میں بھی پھیل چکی تھی اور کلکتہ اس کا مرکز بن چکا تھا۔ چنانچہ شیخ کے مقالوں کا پہلا مجموعہ مقالات جمالیہ اسی کلکتہ سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ جب مولانا تین چار برس کے سن میں حجاز سے اپنی والدہ کے ساتھ ہندستان آ کر کلکتہ میں مقیم ہوئے ہوں گے تو ضرور ہی شروع سے اس نئی تحریک کے چرچے سنے ہوں گے۔ اس ابتدائی تاثر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ شیخ عبدہ کو اہل ہند سے روشناس کرانے کے لیے مولانا نے الہلال کے صفحات سے بہت کام لیا۔ خود الہلال پر شیخ کے عروۃ الوثقیٰ کی چھاپ موجود ہے۔

جمال الدین کے خیالات نے مولانا کے دل و دماغ کو یورپی استعمار کی عالمگیر ریشہ دوانیوں سے واقف کرایا۔ ادھر خود بنگال میں ۱۹۰۵ء کے قریب خلفشار برپا ہوا۔ لارڈ کرزن نے یہ دیکھ کر کہ بنگال میں سیاسی بیداری عروج کو پہنچ رہی ہے وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل تفریق پیدا کرنے کے لیے تقسیم بنگال کی تجویز نافذ کر دی۔ بنگال کے ہندوؤں پر سے برطانوی اعتماد اُٹھ گیا اور اب بنگال کے مسلمانوں کی تالیف قلوب کی جانے لگی۔ اس تقسیم نے سارے بنگال میں آگ لگا دی اور کئی خفیہ انقلابی جماعتیں قائم ہو گئیں۔ انھیں انقلابیوں میں ایک شیام سندر چکرورتی بھی تھے۔ ان سے مولانا کی ملاقات ہوئی پھر انھیں کے ذریعے وہ دوسرے انقلابیوں اور خود شری آربندو گھوش سے ملے۔ مؤخر الذکر کے اخبار ''کرم یوگی'' نے بھی مولانا کے خیالات کو بے حد متاثر کیا اور مولانا انقلابی سیاست کی گود میں چلے گئے۔

اس زمانے میں انقلابی جماعتوں میں صرف متوسط طبقے کے ہندو ہی شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلابی اپنی جماعتوں میں مسلمانوں کو لیتے گھبراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ حکومت برطانیہ آج کل مسلمانوں کی جانب لطف وعنایات کا ہاتھ بڑھا رہی ہے اس لیے مسلمان تحریک انقلاب میں سچے دل سے شریک نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے جب مولانا بھی شیام سندر چکرورتی کی وساطت سے ان انقلابیوں میں شامل ہوئے تو شروع شروع میں ان پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا تھا اور اہم ترین رازدارانہ مشوروں سے الگ ہی رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی

لیکن مولانا نے مصر، ایران اور ترکی وغیرہ کی انقلابی تحریکوں سے وابستہ مسلمانوں کی مثالیں دے کر یہ واضح کرنا چاہا کہ اگر وہاں کا مسلمان برطانوی شہنشاہیت کا مقابلہ کر سکتا ہے تو یہاں کے مسلمان بھی پیچھے نہ رہیں گے۔ بشرطے کہ دوستانہ طریقے پر ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی عرصے میں مولانا مسلمانوں میں بھی کام کرتے رہے اور انھوں نے نوجوانوں کی ایک مختصری ایسی جماعت تیار کر لی جو سیاسی اعتبار سے مولانا کی ہم نوا تھی۔ اب مولانا نے اپنے انقلابی دوستوں کو یہ مشورہ دیا کہ انقلابی تحریک کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس کو حدود بنگال و بہار سے نکال کر ہندستان بھر میں پھیلایا جائے۔ انقلابی شروع میں ہچکچائے کیونکہ اُن کی کارروائیاں خفیہ ہوا کرتی تھیں اور تحریک کے پھیلنے اور شاخوں کے بڑھنے سے انھیں یہ اندیشہ تھا کہ رازداری باقی نہ رہ سکے گی لیکن مولانا انھیں برابر آمادہ کرتے اور اُکساتے رہے، یہاں تک کہ دو برس کے اندر اندر شمالی ہند اور بمبئی کے کئی اہم شہروں میں خفیہ جماعتیں قائم ہو گئیں۔ کچھ ہی دنوں بعد مولانا کو عراق، مصر، شام اور ترکی کے سفر پر جانا پڑا۔ عراق میں مولانا کچھ ایرانی انقلابیوں سے ملے۔ مصر میں مصطفیٰ کامل پاشا کے حامیوں سے ملاقات ہوئی اور ترکی میں نوجوان ترک تحریک کے کچھ لیڈروں سے شناسائی ہوئی۔ اسلامی ممالک کے ان انقلابیوں کی ملاقات نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ان سب نے اس بات پر بڑی حیرت کا اظہار کیا کہ ہندی مسلمان وطنی تحریکوں سے علاحدہ ہی نہیں تھے بلکہ اکثر مخالف بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان تحریکوں میں تو مسلمانانِ ہند کو ہراول دستوں کا کام دینا چاہیے تھا۔ یہ برطانیہ کے حلقہ بگوش کیوں کر ہو گئے؟ مولانا نے یہ سفر ۱۹۰۸ء میں کیا تھا۔ اختتام سفر کے بعد وہ اس پرجوش ولولے سے ہندستان آئے کہ مسلمانوں کو ملک کی سیاست میں عملی حصہ لینے کی زبردست تحریک کو ضروری سمجھا۔

صحافت سے مولانا کی دل بستگی نئی نہیں تھی۔ ادبی رسائل میں تو بہت پہلے سے لکھنے لگے تھے اور اس سے پہلے ہی لسان الصدق، نیرنگ عالم، وکیل اور الندوہ وغیرہ کے ادارتی فرائض بھی انجام دے چکے تھے، لیکن یہ سب ابتدائی نقوش تھے اور ۱۹۰۸ء سے پہلے پہلے یہ دور ختم ہو چکا تھا۔ اس پر چھ سات برس کی جو مدت گزری اور خیالات میں جو انقلابی رجحانات نمایاں

ہوئے تو صحافتی میدان میں بھی اسی جوش و ولولے، عزم و دلیری، طوفاں دوستی اور اثر آفرینی کے مظاہرے کے لیے مولانا کی بے چین طبیعت بے چین تر ہو گئی۔ اس طرح الہلال کے سنگ بنیاد رکھے جانے کے لیے مناسب فضا تیار ہوئی۔ مولانا کے دل میں جو جوش و خروش اس وقت کروٹیں لے رہا تھا اُسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن اس کا کچھ اندازہ خود مولانا ہی کے قلم کے چند جواہر پاروں سے کیا جاسکتا ہے:

''آہ! تمھاری غفلت سے بڑھ کر آج تک دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی اور تمھاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے۔ آہ! تم ایسے نہ تھے۔ آہ! میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمھارے دلوں کے اندر اُتر جاؤں اور کس طرح ہو کہ تمھاری روحیں پلٹ جائیں اور تمھاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقلمند ہیں۔ تم کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو اور کیوں تمھاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو۔ پر نہ تو راست بازی کی راہ تمھارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہی کے نقش قدم چھوڑتے ہو۔''

شعلہ و برق میں لپٹا ہوا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو لے کر میں پہاڑیوں پر چڑھ جاتا۔ اُس کی صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگان خواب کو ذلت و رُسوائی سے بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اُٹھو بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ اب تمھارا خدا تم کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت دینا چاہتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ نغمہ اور اس نغمہ کا آتشیں آہنگ اُردو صحافت کیا اُردو ادب نے بھی اس سے پہلے نہ دیکھا تھا، نہ سنا تھا۔ مسلم سیاست اب بھی افراتفری اور پراگندگی کا شکار تھی۔ برطانوی

سامراج تقسیم کرو اور حکومت کرو کے اصول پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خلیج کو وسیع سے وسیع تر کر دینا چاہتا تھا۔ اگر چہ مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی لیکن اُس کی ساری سیاست کی بنیاد دراصل برطانیہ دوستی پر تھی۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ تو وہ تھا جو سر سیّد کی تعلیمات سے متاثر ہو کر یا تو سیاسیات سے بالکل ہی کنارہ کش تھا یا کھلم کھلا تاج برطانیہ سے وفاداری کو جزو ایمان سمجھنے لگا تھا اور ارباب حکومت وقت ''اولی الامر'' اور ''امیر المومنین'' کے اسلامی تصورات و خطابات کے مستحق سمجھے جانے لگے تھے۔ مسلمان اپنی غلامی سے گویا مطمئن کیے جا رہے تھے اور مستزاد یہ تھا کہ اُن کو اپنے ہم وطنوں سے ایک علاحدہ اکائی کے طور پر نہ صرف پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی بلکہ اُن کی ذہنی نشو ونما، ساخت و پرداخت ہی اس نہج پر ہو رہی تھی کہ وہ قوم کے اندر ایک قوم بننے میں اپنی نجات سمجھنے لگیں۔ ہندوؤں کو غاصب حقوق سمجھیں اور برطانیہ کو اپنے حقوق کا محافظ۔ کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو ترکی اور مصر و عراق پر نظریں جمائے ہوئے تھے لیکن انھیں بھی سیاسی عوامل و محرکات کی خبر نہیں تھی۔ وہ تو ایک مبہم سے مذہبی لگاؤ کی وجہ سے ان ممالک کے معاملات سے دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں کچھ اس پر برہم بھی تھے کہ یورپ کی طاقتیں ان ممالک اسلامی میں ریشہ دوانیوں سے اسلامی ممالک کو مضمحل اور بے جان کر رہی تھیں لیکن ایک تو انھیں کوئی راہِ فرار و راہ مقاومت نظر نہ آتی تھی، دوسرے اس برہمی کے سوتے بھی صرف مذہبی اختلافات سے پھوٹتے تھے اور کوئی سیاسی حل یا تحریک اُن کے سامنے نہ تھی۔ جب غفلت کے یہ گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے اُس وقت الہلال کی بجلی کڑکی۔ یہ ایک دردمند کی کراہ بھی تھی اور ایک مجاہدانہ للکار بھی!

الہلال کی آتش نوائیوں نے ملک بھر میں ایک آگ لگا دی۔ اگر چہ جس طبقے میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے مولانا نے الہلال کا اجرا کیا تھا۔ اس سے کسی مالی تعاون کی توقع نہیں تھی اور وہ خود بھی صاحب دلق و گلیم ہی تھے، لیکن شانِ استغنا کا یہ عالم تھا کہ جب الہلال کے لیے ایک ہندستانی والی ریاست نے ایک گراں قدر رقم کا چیک بھیجا اور یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ وہ یہ رقم ہر ماہ بھیجتے رہیں گے تو مولانا نے یہ پیشکش یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ الہلال کا قلم کسی قیمت پر بھی بک نہیں سکتا۔ جنگ بلقان کا معاملہ ہو یا مسجد کانپور کا، ہر وہ واقعہ جو اُس دور کے مسلمانوں

کو مذہبی یا ثقافتی بنیادوں پر بے چین کرتا تھا۔ مولانا اُسے فوراً سیاسی تحریک میں تبدیل کرتے، برطانوی استبداد کی ریاکاریوں کے رُخ سے نقاب اُلٹتے اور حکومت وقت کے خلاف بغاوت کے جذبات اُبھارتے۔ اس طرح آگ پھیلتی گئی اور ایک طبقہ ایسا پیدا ہوتا گیا جو مولانا کے سیاسی نظریات سے قریب تھا۔ یہ طبقہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا نہیں تھا بلکہ قدیمی علوم سے آگاہی رکھنے والوں اور عالموں کا تھا۔ مولانا نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ فرقہ پرستیوں کے قلعے میں کہیں سے شگاف تو نمودار ہوا۔ یہ دیکھ کر حکومت کی سراسیمگی بڑھتی گئی اور وہ زبانِ الہلال کو بند کرنے پر تل گئی۔ الہلال کی اشاعت ۲۶ ہزار تک پہنچ چکی تھی اور ایک ایک کاپی پورے پورے دائروں میں گردش کرتی تھی۔ اس طرح لاکھوں انسان اس کے لیے گوش برآواز ہو چکے تھے۔

شروع شروع میں اسی ہردلعزیزی کے باعث حکومت کو قانونی کارروائی کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ بھی ہوئی لیکن پانی سر سے اُونچا ہوتا جارہا تھا اور آخر کار حکومت کے نزدیک وار کرنے کا بھی وقت آپہنچا کیوں کہ مسلمانوں میں رفتہ رفتہ آزادی پسندوں اور حکومت پرستوں کے دو واضح گروہ بنتے جارہے تھے۔ حکومت پرستوں میں مسلم لیگ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بہت سے کرتا دھرتا شریک تھے۔ یہ لوگ کھلم کھلا مخالفت پر اُتر آئے لیکن آخر رجعت پسندوں کو ہی شکست کھانا پڑی اور مسلم لیگ ہی کو مجبور ہو کر اپنا نصب العین ''ذمہ دار حکومت'' قرار دینا پڑا۔ واقعات کی اس رفتار پر حکومت کی سراسیمگی فطری تھی۔ چناں چہ حکومت نے پریس ایکٹ کے ماتحت الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ الہلال کے لہجے کی تلخی کم نہ ہوئی تو یہ ضمانت ضبط اور دس ہزار کی مزید ضمانت طلب کر لی گئی۔ اسی زمانے میں (۱۹۱۴ء) جنگ عظیم چھڑ گئی اور مولانا نے انتہائی بے خوفی سے سامراج کی بدعنوانیوں کی قلعی کھولنا شروع کر دی۔ نہ صرف حکومت کے سنسر کا محکمہ بلکہ تمام انگریز دوست حلقے تلملا اُٹھے۔ اخبار پانیر جو اس زمانے میں الہ آباد سے نکلتا تھا چیخ اُٹھا اور اس نے ایک اڈیٹوریل میں حکومت کو الہلال کی تحریروں کے خلاف کارروائی کرنے پر اُکسایا۔ دارالعلوم میں اس اخبار کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر مولانا نے بھی مزید ضمانت دینے کا ارادہ ترک کر کے الہلال کو بند ہی کر دیا اور اُس کی جگہ البلاغ جاری کیا اور اب وہی کام البلاغ سے لینے لگے جس کے لیے الہلال کو وقف

کر رکھا تھا۔ ذرا لہجہ میں تبدیلی ضرور کر دی۔ حکومت نے بھی پینترا بدلا اور پریس ایکٹ کی بجائے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو حرکت میں لائی اور اس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے ماتحت مولانا کا داخلہ یوپی، دہلی، پنجاب، سی پی اور بمبئی وغیرہ صوبوں میں بند کر دیا گیا۔ اب وہ صرف بنگال اور بہار میں نقل وحرکت کر سکتے تھے لیکن ۲۳؍مارچ ۱۹۱۶ء کو بنگال سے بھی دیس نکالا مل گیا۔ اب صرف بہار کے دروازے کھلے رہ گئے تھے۔ چنانچہ ۵؍اپریل کو آپ رانچی پہنچے۔ ایک مہینے کے اندر ہی اندر آپ کو وہاں نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا کی نظر بندی سے ہندستان بھر میں ایک تہلکہ مچ گیا اور ساٹھ ہزار سرکردہ افراد کے دستخطوں سے حکومت کے سامنے مولانا کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا لیکن ظاہر ہے کہ یہ ٹھکرا دیا گیا۔ نظر بندی کا یہ سلسلہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک قائم رہا یعنی جب تک جنگ عظیم ختم نہ ہوئی مولانا کو رہا نہ کیا گیا۔

مولانا کی نظر بندی ہندی مسلمانوں کی سیاست میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک بہت بڑے طبقے کے جذبات وفاداری کو اس سانحے سے دھکا لگا اور مسلمانوں کی خاصی تعداد سامراج سے نبرد آزمائی کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔ اس میں زوال ترکی سے بھی بڑی مدد ملی۔ جب ۱۹۱۸ء میں ترکوں کو شکست ہوئی اور اتحادیوں نے ترکی کے حصے بخرے کر ڈالے تو مسلمان چیخ اُٹھے اور احیاء خلافت کی تحریک چلنے لگی۔ اب انھوں نے پہلی بار بڑے درد و کرب سے محسوس کیا کہ سلطنت برطانیہ مسلمانوں کی دوست نہیں بلکہ صرف اپنے سامراجی مفاد کی دوست ہے۔ ملک کے طول وعرض میں مسلمان احیائے خلافت کے لیے منظم ہونے لگے تھے۔ اگرچہ یہ اتحاد خالص مذہبی بنیادوں پر وجود میں آ رہا تھا لیکن چونکہ عملی طور پر یہ برطانیہ دشمن جذبہ میں تبدیل ہو چکا تھا اس لیے اس کی سیاسی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مختلف حصوں میں خلافت کمیٹیاں قائم ہونے لگی تھیں۔

اس وقت مولانا تو نظر بندی میں دن گزار رہے تھے اور وہاں تصنیف وتالیف میں مشغول تھے لیکن اسی زمانے میں مہاتما گاندھی ہندستان کے سیاسی پلیٹ فارم پر آ چکے تھے اور چمپارن کے کسانوں کی تحریک کے سلسلے میں بہار میں آنا جانا ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے مولانا سے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن حکومت بہار نے اجازت نہیں دی۔ اس طرح مولانا اور مہاتما میں

۲۰؍جنوری ۱۹۲۰ء سے پہلے ملاقات نہ ہو سکی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا خلافت کمیٹیوں کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔ اسی دوران وائسرائے کے پاس ایک وفد لے جانے کی تجویز ہوئی۔ میمورنڈم پر مولانا نے دستخط تو کر دیے تھے لیکن وفد میں اس لیے شریک نہ ہوئے کہ ان کے خیال میں معاملہ اب عرضداشتوں کی حد سے گزر چکا تھا۔ اس سلسلے میں دلی میں جو اجلاس ہوا تھا اس میں مہاتما گاندھی نے بھی شرکت کی تھی اور انھوں نے خلافت کے مسئلے میں مسلمانوں سے تعاون پر مکمل آمادگی ظاہر کی تھی۔ دلی کے جلسے میں گاندھی جی کے علاوہ لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی عمائد نے بھی شرکت کی اور مسلمانوں سے پورا اتفاق کیا۔

اس طرح سیاسی محاذ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے عظیم الشان اتحاد عمل کا پس منظر تیار ہوا۔ وائسرائے کے یہاں جو وفد گیا تھا وہ ناکام پلٹا کیوں کہ وائسرائے نے یہ کہا کہ وہ خود تو کچھ نہیں کر سکتے لیکن اگر مسلمان کوئی وفد لندن لے جانا چاہتے ہیں تو وہ پوری سہولتیں مہیا کریں گے۔ اس ناکامی کی فضا میں پھر ایک جلسہ اگلے اقدام کے تعین کے لیے طلب کیا گیا۔ اس میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی موجود تھے۔ مہاتما گاندھی نے اس اجلاس میں ترک موالات کا پروگرام پیش کیا۔ اُنھوں نے تعلیمی اداروں، عدالتوں اور قانون ساز مجلسوں کے بائیکاٹ اور ملازمتوں سے استعفیٰ کا مشورہ دیا اور خطابات کے واپس کرنے کی بھی تلقین کی۔ مولانا خود راوی ہیں کہ اس پروگرام پر سوائے اُن کے کسی نے فوراً اتفاق نہیں کیا۔ حکیم اجمل خاں نے سوچنے کے لیے وقت چاہا۔ مولانا عبدالباری نے کہا کہ اس بنیادی سوال پر وہ مراقبہ و مکاشفہ کے بعد کوئی رائے دیں گے اور علی برادران نے کہا کہ وہ مولانا عبدالباری کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔ مولانا آزاد کے لیے فیصلے اس لیے مشکل نہ تھا کہ پہلے ہی سے کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے اور الہلال میں ایک بار لکھ بھی چکے تھے۔ پھر انقلابیوں سے قدیم وابستگی نے بھی انھیں عملی اقدامات کے لیے پہلے سے آمادہ کر رکھا تھا۔

۲۹؍فروری ۱۹۲۰ء کو پراونشل خلافت کانفرنس کے اجلاس کلکتہ میں مولانا نے ترک موالات کا پروگرام پاس بھی کرایا۔ ۳۰؍مئی ۱۹۲۰ء میں بنارس میں کانگریس کمیٹی نے ترک موالات کی تجویز پیش کی۔ عوامی پلیٹ فارم سے پہلے پہل میرٹھ خلافت کانفرنس میں گاندھی جی نے ترک

موالات کا پروگرام پیش کیا۔ پھر ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں یہ تجویز پیش ہوئی۔ محرک گاندھی جی تھے اور موید ابوالکلام آزاد، صدر اجلاس لاجپت رائے تھے۔ وہ خود اور سی آر داس دونوں ہی مخالف تھے۔ بپن چندر پال بھی حق میں نہیں تھے لیکن تجویز کھلے اجلاس میں پاس ہوگئی۔ یہی وہ اجلاس ہے جب مسٹر محمد علی جناح کانگریس سے بالکل علاحدہ ہوگئے۔ اب راہیں مختلف ہو چکی تھیں۔ اب قربانی و عمل کی منزلیں سامنے تھیں! اب تحریک کو ملک بھر میں پھیلانے کا سوال تھا۔ اس کے لیے مہاتما گاندھی کے علاوہ مولانا آزاد، علی برادران، حسرت موہانی، ڈاکٹر کچلو اور حاجی احمد صدیق کھتری کو مقرر کیا گیا۔

اب کانگریس سے عملی تعاون کا قریب سے موقع ملا اور مولانا نے اس قربت اور ہم آہنگی کو استوار و مضبوط بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد گاندھی جی سے اُن کے تعلقات میں گہرائی آتی گئی اور ہر کوئی ایک دوسرے کی عظمت کا معترف ہوتا گیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''۱۹۲۰ء کی ۲۰ر جنوری کو دہلی آیا تو حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ اس دن سے آج تک ...... کے یہ دن ہم پر ایسے گزرے کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے...... اس طویل مدت میں بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور اُن میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی۔ انھوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا لیکن اس پوری زندگی میں کوئی وقت ایسا نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود اُن کی عظمت کی جو رسّی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی ہم کبھی اُس سے باہر نہ ہو سکے۔

......میری گردن کی رگیں سخت ہیں۔ میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے تو پہلے میرا ذہن اُس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لے۔ چناں چہ جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا لیکن اس

کے بعد اُن کی ہر چیز نے اُن کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کر دیا
اور جو دن گزرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا گیا۔"

اور گاندھی جی نے مولانا کے بارے میں فرمایا کہ:

"مجھے ۱۹۲۰ء سے قومی کام میں مولانا آزاد کے ساتھ وابستہ رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اسلام کے بارے میں اُن سے زیادہ معلومات کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ عربی زبان کے وہ بہت بڑے عالم ہیں۔ اُن کی دیش بھگتی۔ اسی طرح پختہ ہے جس طرح اُن کا اسلام میں عقیدہ! وہ انڈین نیشنل کانگریس کے اعلیٰ ترین سردار ہیں۔ ہندستانی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔"

چنانچہ مولانا نے اپنے شب و روز قومی کاموں کے لیے وقف کر دیے۔ جاگنا، سونا، اُٹھنا، بیٹھنا سب قومی کاموں کے لیے ہوتا تھا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اپنے علمی اور ثقافتی معمولات اور نوشت و خواند کے عادات بھی اس ہیجان کی نذر کر دیے۔ بس دورے کرنا، تقریریں کرنا، ترک موالات کے لیے لوگوں کو اُبھارنا، منظم کرنا اور سارے ملک کو ایک تحریک میں منسلک کرنا یہی ان کا مطمح نظر رہ گیا تھا۔ اس دور کی اگر تفصیل لکھی جائے تو خود ایک مستقل باب بن جائے لیکن اُن کی سرگرمیوں کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے چند اشارے ضروری ہیں۔

ملک کو عدم تعاون کے لیے تیار کرنے کے لیے مولانا نے طول و عرض پورے ملک میں دورے کیے۔ کبھی کبھی علی برادران بھی ان دوروں میں شریک ہو جاتے تھے۔ اس وقت کانگریس کے علاوہ خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلماء ہند بھی مولانا کی سرگرمیوں کا خاص محور تھی۔ خلافت کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں کلکتہ سے بمبئی تک اور شمال سے جنوب تک کا سفر کر کے شرکت کرتے لیکن چندہ وغیرہ کا جمع کرنا یا اسی طرح کے کام علی برادران وغیرہ کیا کرتے تھے، مولانا تحریک کی سمت کا تعین اور برطانوی استعمار کی شکست کے بارے میں زیادہ سوچتے اور تدبیریں کرتے۔ آگرہ، میرٹھ اور کلکتہ کی خلافت کانفرنسوں کی صدارت مولانا ہی نے فرمائی۔

پراونشل خلافت کانفرنس میں ''مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب'' کے نام سے جو پر مغز خطبہ آپ نے پڑھا وہ ایک سیاسی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ خلافت کے سلسلے میں جو تقریریں مولانا نے کیں، متحدہ قومیت اُن کا مرکزی نقطہ تھا۔ چنانچہ خطبہ آگرہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''ہندستان کے لیے، ہندستان کی آزادی کے لیے، صداقت وحق پرستی کے بہترین فرایض ادا کرنے کے لیے ہندستان کے ہندو مسلمان کا اتفاق اور اُن کی یکجہتی ضروری ہے۔''

آگے چل کر اور بھی وضاحت کر دی:

''ہندستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور ایک نیشن بن جائیں۔''

''آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد جو سب سے بڑی آواز ہو سکتی ہے وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی۔ اس وجود مقدس نے جو صلح نامہ لکھا بجنسہ یہ اُس کے الفاظ ہیں:

ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں، ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔''

اُس کے بعد مولانا نے اس امر کی وضاحت بھی کر دی کہ سامراج کے خلاف جو جنگ ہے وہ صرف وطنی ہی نہیں بلکہ ایک عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ برطانوی سامراج نے نہ صرف ہندستان بلکہ سارے ممالک اسلامی کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو مخصوص طور سے مخاطب کر کے کہا کہ اُن کے لیے برطانیہ سے کسی قسم کی مصالحت کرنا نہ صرف یہ کہ وطن دشمن بلکہ اسلام دشمن عمل ہے۔ چنانچہ مولانا کا ۱۹۲۱ء والے جلسہ آگرہ کا خطبہ صدارت گواہ ہے:

''ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہو جانا چاہیے کہ جب تک انگریز گورنمنٹ، برٹش گورنمنٹ اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آ جائے، مسلمانوں کے معاملات شرعی کو پورا نہ کر دے، عراق کی سرزمین اُس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے، جب کہ ایشیائے کوچک میں اُس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں نہ اُٹھالی جائیں، ہندستان کو آزادی نہ دی جائے اُس وقت تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، اس وقت تک اس کے لیے جائز نہیں کہ صلح وصفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔''

عدم مصالحت اور ترک تعاون کے اس شدید تقاضے میں مولانا بہت شدید تھے۔ انھوں نے لکھا کہ:

''وہ (مسلمان) تمھارے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے، وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کر لے، بچھوؤں کے ساتھ صلح کر لے مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا۔''

اسی طرح جمعیت علماے ہند کے اجلاس لاہور (۱۹۲۱ء) میں اعلان کیا کہ:

''مسلمانوں کے لیے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں، پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں۔ وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں۔''

ہم لوگ جو آج اُسی ہیجان انگیز اور طوفانی دَور سے دُور آ چکے ہیں، اب بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان تحریروں نے کس کس طرح اُس زمانے میں آگ لگا دی ہوگی! مولانا کے سامنے اُن کا مطمحِ نظر بہت ہی واضح تھا اور وہ اس جنگ کو برطانیہ اور مسلمانانِ ہند کی جنگ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ جنگ آزادیٔ ہند کے تصور اور تخیل کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خلافت کمیٹیوں کے لیے بھی یہی مسلک قرار دیا:

''خلافت کمیٹیاں اگر پوچھتی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کو آزادیٔ ہند کا پورا محاذ صرف اپنے ہی سرمایے سے فراہم کر دینا چاہیے تاکہ جب مورخ کا قلم اُٹھے تو اعتراف کرنا پڑے کہ ہندستان اپنی آزادی کے لیے کسی جماعت کا اس قدر مرہونِ منت نہیں ہے، جس قدر پیروانِ اسلام کا۔''

مولانا آزاد کی روح کی بے تابی انھیں ایک قدم بھی رُکنے نہیں دیتی تھی۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ پنجاب کا جب تیسری بار دورہ شروع کیا تو لاہور اور امرتسر میں جلسوں اور تقریروں کی ممانعت تھی۔ مہاتما گاندھی نے اُن امتناعی احکام کی اس لیے خلاف ورزی نہیں کی کہ انھوں نے پروگرام کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دیا تھا، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر خلاف ورزی کی کہ انھیں ذاتی اور شخصی طور پر خلاف ورزی کرنے کا حق حاصل ہے اور پھر گاندھی جی نے بھی اُن کے اس طرزِ عمل کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ مولانا نے جمعہ کو شاہی مسجد لاہور میں ایک ہنگامہ خیز تقریر کی جس پر سول اینڈ ملٹری گزٹ بلبلا اُٹھا اور اُس نے ''صحن مسجد میں باغیانہ تقریر'' کے عنوان سے ایک اداریے میں حکومت سے قانونی کارروائی کا مطالبہ کیا۔ ایک ہی ہفتہ بعد مولانا نے ایسی ہی تقریر امرتسر میں بھی کی اور پھر کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے سی آئی ڈی رپورٹوں کو للکارا۔ ''یہ سی آئی ڈی کے رپورٹ بیٹھے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ حرف بحرف قلم بند کریں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔'' اور واقعتاً مولانا نے پھر دہلی میں جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی کے جلسوں میں ایسی ہی تقریریں کیں۔ حکومت کا پیمانہ صبر لبریز ہو ہی رہا تھا کہ پرنس آف ویلز کی آمد ہند کے سلسلے میں بائیکاٹ کی تحریک چل پڑی اور اُس نے مولانا کی گرفتاری کا فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ کی خبر پر مولانا نے جو بیان دیا وہ قابل نقل ہے۔

''گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بڑے بوجھ سے نجات دے دی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں انھیں کیا معلوم

کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ محمد علی، شوکت علی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو سب کا سفر پورا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا۔ اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک آخری مگر فتح مند میدان اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہوں۔" (قول فیصل: کلکتہ، البلاغ پریس، ص ۳)

پھر علی پور جیل میں مقدمہ شروع ہوا۔ اُس میں مولانا نے ایک تاریخی بیان دیا جو "قول فیصل" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ بیان طویل ہے اور اُس کے نقل کا نہ یہاں موقع ہے نہ گنجایش لیکن اس بیان کے مطالعے سے مولانا کی سیاسی بصیرت، استحکام عزم اور ہمت و جرأت کا واضح پتا چلتا ہے۔ اس یادگار بیان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"یقیناً میں نے کہا اور میرا اقرار صاف اور واضح ہے کہ موجودہ حکومت محض ایک ناجائز حکومت ہے۔"

"اصطلاحات" اور "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی نہیں پیدا کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے۔" (ایضاً. ص ۴۹)

"یقیناً میں نے کہا ہے کہ موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سفید کو سیاہ کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو میرے علم میں کوئی نہیں۔ میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے۔ اگر باز نہیں آ سکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا

ہے!" ایضاً:

"اسلام کی تعلیم اُس کی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔"

(ایضاً، ص ۶۳، ۶۴)

"میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اُس کے اختیار میں ہے بلا تامل مجھے دے د...... مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا...... میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈینو برونو (Gardino Brano) کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔" (ایضاً: ۸۰)

"زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمھارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشرِ عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔" (ایضاً)

جج نے سزا کا حکم سنا دیا اور مولانا کو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جیل میں رہنا پڑا۔ یہاں سی آر داس وغیرہ اُن کے ساتھی تھے۔ سی آر داس کو صرف چھ ماہ کی سزا ہوئی تھی اس لیے وہ پہلے ہی رہا ہو گئے اور کانگریس کے اجلاس گیا کے صدر ہوئے۔ اجلاس گیا میں کانگریس کے اندر شدید اختلاف رونما ہوا۔ جو "تبدیلی پسند" اور "معمول پسند" (Changers and no changers) نامی گروہوں میں مستقل صورت اختیار کرنے لگا۔ ایک طرف گاندھی جی اور ان کے ساتھی تھے جو ترکِ موالات کے پروگرام کو جاری رکھنا چاہتے تھے اور دوسری جانب سی آر داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں تھے جو کونسلوں میں داخل ہو کر آئینی محاذ پر جنگ کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر مؤخر الذکر گروہ نے "سوراج پارٹی" کے نام سے ایک الگ جماعت تیار کر لی اور کونسلوں کے انتخابات کی تیاریاں کرنے لگے۔ جب مولانا جیل سے رہا ہوئے تو اُنھوں نے کانگریس کے شیرازہ کو منتشر ہوتا ہوا دیکھا۔ آپ نے فوراً دونوں گروہوں میں مصالحت کی

سعی شروع کر دی۔ چنانچہ اس مسئلے کو طے کرنے کے لیے کانگرس کا خصوصی اجلاس دلی میں (۱۹۲۳ء) طلب کیا گیا۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا آزاد نے کی۔ اُس وقت اُن کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ اس طرح مولانا آزاد کانگریس کے سب سے کم سن صدر ہوئے جہاں سی آر داس، موتی لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری ایسے جلیل القدر قائدین موجود ہوں وہاں نظر انتخاب کا نوجوان ابوالکلام آزاد پر پڑنا اس بات کا ثبوت ہے کہ کانگریسی حلقے آپ کی اصابت رائے اور ہردلعزیزی کے قایل تھے۔

اس وقت صرف کانگریس کا اندرونی انتشار نہیں تھا بلکہ قربانی گاؤ، شدھی، تبلیغ اور اس طرح کے مسایل کو لے کر حکومت برطانیہ کی شہ پر فرقہ پرست بھی پوری قوت سے میدان میں اُتر آئے تھے۔ مولانا آزاد نے فرقہ واریت پر بھی اجلاس دلی کے خطبہ صدارت میں بھر پور وار کیا۔

> ''آج ہمیں ہندستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ ہے انڈین نیشنل کانگریس''

غلطی ہوگی اگر اسے صرف اپنی پارٹی کی حمایت سے تعبیر کیا جائے کیونکہ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ انھوں نے ۱۹۱۱ء سے بلند کرنا شروع کر دیا تھا جب وہ کانگریس میں شامل نہیں تھے بلکہ اپنے ہم مذہب فرقہ پرستوں سے مصروف جنگ تھے۔ ۱۹۲۳ء کے اجلاس کانگریس میں انھوں نے اپنے ایمان واعتقاد کا اعلان ولولہ انگیز الفاظ میں کیا:

> ''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطے کہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

جیل سے واپسی پر مولانا نے شیرازۂ اتحاد کو درہم برہم پایا اور مخصوص گاندھی جی اور اُن کے ہم خیالوں کو بے حد پریشان و متفکر دیکھا۔ گاندھی جی نے اتحاد کی خاطر ۲۱ دن کا برت رکھا۔ چنانچہ مولانا آزاد ہی کی کوششوں سے دلی میں ہندو اور مسلمان لیڈروں کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوا اور اُن لوگوں نے ہندو مسلم اتحاد کے قایم کرانے کے لیے کوششیں کرنے کا عہد کیا اور مہاتما گاندھی نے اپنا برت ختم کیا۔ اس کے بعد ملتان کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی تحقیقات کے لیے جو کمیٹی بنی اس میں موتی لال نہرو کے ساتھ مولانا بھی شریک تھے۔ پھر ناگ پور میں موتی لال نہرو کے ساتھ اُنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں سمجھوتا کرایا، بمبئی اور کلکتہ میں بھی بڑے بڑے اجتماعات کی قیادت اور اتحاد کی تلقین کرتے رہے اور ۱۹۲۷ء میں شملہ کی اتحاد کانفرنس میں بھی پیش پیش رہے اور سرگرم حصہ لیا۔ بہت سے ساتھی جیسے محمد علی، شوکت علی وغیرہ آخر میں راستہ کترا گئے مگر مولانا نے آخر دم تک اپنا راستہ نہیں بدلا۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں کلکتہ میں مولانا کی زیر صدارت ایک جلسہ ہوا اور کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ ابتداے ۱۹۲۸ء میں مولانا نے لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور دہلی وغیرہ مقامات کا دورہ کیا۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی کامیابی بڑی حد تک مولانا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ابھی مولانا آزاد جیل ہی میں تھے کہ پنڈت مدن موہن مالویہ، سی آر داس اور مولانا سے جیل میں ملنے آئے۔ وہ حکومت اور کانگرس کے مابین مصالحت کرانا چاہتے تھے۔ سی آر داس اور مولانا نے یہ تجویز منظور کر لی کہ اگر تمام گرفتار شدگان کو چھوڑ دیا جائے اور ایک گول میز کانفرنس کر کے ہندستان کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی پرخلوص کوشش کی جائے تو بائیکاٹ کا پروگرام ختم کیا جا سکتا ہے لیکن اس تجویز کو گاندھی جی نے ٹھکرا دیا اور کہا کہ رہائی غیر مشروط ہونا چاہیے۔ اسے حکومت نے نہ مانا اور مصالحت کی بات چیت ختم ہو گئی۔ بائیکاٹ زوروں پر ہوا اور مولانا نے اس میں زبردست حصہ لیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا جماعتی ضبط پسندی کے قائل تھے اور قومی معاملات میں ضد کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔

۱۹۲۹ء سے کانگریس کی تحریک آزادی نے نیا رُخ اختیار کیا۔ اب ہندستان نے یہ

اعلان کر دیا کہ مکمل آزادی سے کم پر وہ رضامند نہیں ہو سکتا اور حکومت کو ایک سال کی مہلت دی گئی کہ اگر اس دوران میں مطالبہ آزادی منظور نہیں کیا گیا تو سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی۔ حکومت اپنی جگہ اڑی رہی اور اُس نے سال کے اندر کوئی اقدام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ایک سال کے عرصے میں کانگریسی حلقے آنے والی تحریک کی تیاریاں کرتے رہے جس میں مولانا شریک رہے۔ جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹیوں کے علاوہ ایک نیا ادارہ ''نیشنلسٹ پارٹی'' کے نام سے وجود میں آچکا تھا، جس کا پہلا جلسہ الٰہ آباد میں ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اور تصدق احمد خاں شروانی اس کے روح رواں تھے۔ یہ فرقہ پرستی کے خلاف ایک اور اعلان جہاد تھا۔ نہرو رپورٹ اور دوسرے عوامل کی بنا پر حقوق کی تقسیم کے سوال نے اس وقت خاصی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اس نئی کروٹ کا انسداد کرنا تھا اس لیے ۶؍جنوری ۱۹۳۰ء کو مولانا اور ڈاکٹر انصاری نے ایک مشترکہ بیان نیشنلسٹ پارٹی کی جانب سے شائع کیا کہ ''چونکہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع ہو چکی ہے اس لیے حقوق کی تقسیم کا سوال پس پشت ڈال دینا چاہیے۔ لڑائی کے وقت حقوق کی تقسیم کا ذکر، خواہ وہ حقوق کتنے ہی منصفانہ کیوں نہ ہوئی نامناسب اور بے محل ہے۔ اس لیے کانگریس کے فیصلہ لاہور کے بعد حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ حقوق کی تقسیم کی جگہ آزادی کی لڑائی لے لے۔'' ۳۱؍مارچ ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے لڑائی کا اعلان کر دیا اور ۶؍اپریل سے ستیہ گرہ کے پروگرام پر زور و شور سے عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ستیہ گرہ کے لیے مولانا نے ہندستانی عوام کو علی العموم اور مسلمانوں کو علی الخصوص للکارا۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بنگال، پنجاب اور سرحد ایسے صوبوں میں بھی لاکھوں مسلمانوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور ہزاروں گرفتار ہوئے۔ اب قانون شکنی شروع ہوئی۔ نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں گاندھی جی مئی کے مہینے میں گرفتار ہو گئے۔ چوں کہ یہ پہلے سے معلوم تھا کہ گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لیے جب ایک ڈکٹیٹر گرفتار ہو جاتا تھا تو گرفتاری سے پہلے کسی دوسرے کو ڈکٹیٹر مقرر کر جاتا تھا۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۰ء میں سردار پٹیل کی گرفتاری کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد ڈکٹیٹر مقرر ہوئے لیکن کل گیارہ دن کی ڈکٹیٹری کے بعد آپ کو کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کی گرفتاری پر ہندستان گیر ہڑتال ہوئی۔ مولانا کو اس بار

چھ ماہ کی سزا ملی۔

سال کے خاتمے تک حکومت نے کارروائیوں کا رُخ بدلا اور ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں کرنے لگی۔ اس لیے گاندھی جی اور ممبران ورکنگ کمیٹی کی رہائی ضروری تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۱ء میں یہ لوگ رہا کردیے گئے۔ یہ رہائی گاندھی، ارون گفت وشنید اور بالآخر گاندھی۔ اُرون معاہدے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کی رو سے سول نافرمانی مشروط طور پر ملتوی کردی گئی اور اسی سالہ کراچی کانگریس میں گاندھی جی کو گول میز کانفرنس کے لئے کانگریس کا نمایندہ منتخب کیا گیا۔ گاندھی جی اگست میں لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے ہی رجعت پسندوں کو اُبھارا جارہا تھا اور جداگانہ انتخاب کے نعرے بڑے زوروشور سے بلند کیے جا رہے تھے۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ یہ بیرونی اقتدار کے اشارے پر کیا جارہا ہے اور ایسے وقت کا انتخاب کیا گیا ہے جب کہ گول میز کانفرنس کا انعقاد ہونے ہی والا تھا۔ اس لیے مولانا نے مسلمانوں کے صحیح موقف کو دنیا پر واضح کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے ۷ر جولائی کو بمبئی میں مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد کرلیا اور اس پلیٹ فارم سے بھی مشترکہ انتخاب کی حمایت کرائی اور رجعت پسندوں کی قلعی کھول کے رکھ دی۔ پھر ۱۸ر جولائی کو ''یوپی مسلم نیشنلسٹ کانفرنس'' کے پلیٹ فارم سے مولانا نے یہی آواز زوردار طریقے پر بلند کرائی۔ اکتوبر کے مہینے میں پنجاب میں قوم پرور مسلمانوں کی کانفرنس منعقد ہوئی اور آپ اُس کے صدر منتخب ہوئے لیکن خرابی صحت کی وجہ سے نہ جاسکے۔ اسی سال ۲۹ر جولائی کو آپ کشمیر کے فسادات کے سلسلے میں سری نگر بھی تشریف لے گئے۔

گول میز کانفرنس کا حشر پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اتمام حجت مقصود تھا۔ چنانچہ گاندھی جی ناکام لوٹے اور جنگ آزادی کی تیاریاں ازسرنو ہونے لگیں۔ اس موقع پر مولانا نے ''قوم پرور مسلم کانفرنس'' کی جانب سے ایک پرزور بیان شائع کرکے مسلمانوں سے اپیل کی کہ کانگریس جو تحریک عنقریب شروع کرنے والی ہے اس میں تن من دھن سے شامل ہوں۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۳۲ء کو ہندستان کے مسلمان زعماء کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس نے فیصلہ کیا کہ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں جو کمیٹیاں بنی ہیں ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔

مقاطعہ کا پروگرام چلتا رہا۔ ۱۵رفروری ۱۹۳۲ء کو قائم مقام ڈکٹیٹر سردار سردول سنگھ کویشر کی گرفتاری پر مولانا آزاد قائم مقام ڈکٹیٹر بنائے گئے۔ پھر ۲۶رفروری ہی کو آپ پر حکومت نے یہ حکم تعمیل کرایا کہ آپ سول نافرمانی کی تحریک میں ایک مہینے تک کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتے، لیکن بھلا مولانا کب ماننے والے تھے انھوں نے کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور دلی میں نظر بند کر دیے گئے۔ نظر بندی کا سلسلہ مئی تک رہا۔ ادھر رجعت پسند فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے میں مصروف تھے ہی کہ کمیونل ایوارڈ نے ہلچل مچا دی۔ مولانا نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ مولانا محسوس کر رہے تھے کہ فرقہ وارانہ اتحاد بہت ضروری ہے۔ اس لیے انھوں نے رہائی کے بعد اتحاد کے لیے کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی اور اس سلسلے میں اتنا کام کیا کہ صحت برباد کر لی۔ ۱۶را کتوبر کی ''آل پارٹیز مسلم کانفرنس'' جو لکھنؤ میں منعقد ہوئی تھی اس سلسلے کی اہم کڑی تھی۔ پھر الٰہ آباد میں ایک اتحاد کانفرنس ہوئی جس میں تمام فرقوں کے زعماء نے ایک مشترک لائحہ عمل بنا بھی لیا لیکن انگریزی حکومت کی شہ پر فرقہ پرست مخالفت کرتے رہے۔ مولانا بھی برابر ان لیڈروں کو بے نقاب کرتے رہے۔

۱۹۳۱ء کے بعد ستیہ گرہ ملتوی ہوتی رہی، مگر گرفتاریاں جاری رہیں۔ تشدد کا دور دورہ بدستور رہا۔ حکومت کی طرف سے عارضی طور سے اپنے مصالح کے ماتحت کبھی کبھی التوائے تشدد ہو جاتا تھا لیکن یہ بہت ہی عارضی ہوتا تھا۔ کانگریس کی تحریک جواب ایک متوسط طبقے کی ہی تحریک نہیں رہ گئی تھی بلکہ رفتہ رفتہ اشتراکی خیالات کے اثرات کو بھی قبول کرتی جا رہی تھی، کسانوں اور مزدوروں کی تحریک بن چکی تھی بالخصوص یوپی میں جواہر لال نہرو، گووند بلبھ پنت، رفیع احمد قدوائی، تصدق احمد شیروانی، پرشوتم داس ٹنڈن وغیرہ کی قیادت میں عدم ادائیگی لگان کی زبردست تحریک اُبھر چکی تھی، جس کے اثرات بہار تک پھیل رہے تھے۔ سرحد میں خدائی خدمتگار، خان عبدالغفار خاں کی قیادت میں نہایت ہی جوش وخروش اور ضبط وتنظیم کے ساتھ ایک پرامن تحریک چلا رہے تھے۔ بنگال کے نوجوان تشدد وعدم تشدد کے خط فاصل کی پروا کیے بغیر سامراج سے برسر پیکار تھے اور ان تینوں صوبوں میں ہنگامی قوانین اور آرڈی ننسوں نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ قید خانے بھرے جا رہے تھے، لاٹھی چارج، تازیانے، فائرنگ،

نظر بندیاں، سیاسی جماعتوں پر پابندیاں اور اُن کا خلاف قانون قرار دیا جانا روز روز کا دستور بن گیا تھا۔ ہمارے لیڈر کبھی جیل میں جاتے اور کبھی باہر آتے، تحریک چل رہی تھی، اسمبلیوں کا بائیکاٹ بھی جاری تھا۔

لیکن اسی عرصے میں آیندہ انتخابات کے لیے تیاریاں بھی ہونے لگیں۔ مولانا کو شروع ہی سے قانون ساز جماعتوں کے انتخابات سے دلچسپی نہ تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ آزادی کی لڑائی اسمبلیوں میں نہیں بلکہ اسمبلیوں کے باہر لڑی جانا چاہیے۔ یہ خیال انھیں کا نہیں تھا بلکہ اور بھی بہت سے افراد کا تھا جنھیں بعض لوگ انتہا پسند اور بعد میں بائیں بازو والے کہنے لگے۔ یہاں یہ یادرکھنا ضروری ہے کہ مولانا کبھی باقاعدہ طور سے ''بائیں بازو والوں'' میں شامل نہیں ہوئے بلکہ اُن کا شمار گاندھی جی کے ساتھیوں اور ''داہنے بازو والوں'' میں ہی ہوتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ دونوں گروہوں کے درمیان ایک درمیانی کڑی تھے اور آپ کی یہ حیثیت برابر قائم رہی۔ آپ نے کبھی بھی کانگریس کے اندر کسی ایک بازو، جتھہ یا گروہ سے اپنے کو وابستہ نہیں کیا۔ غرض اختلافات کے باوجود مولانا نے انتخابات لڑنے کے لیے کوشش کرنے والوں کو روکا نہیں، کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ آزادی کے لیے اگر یہ محاذ بھی قایم ہوگیا تو کچھ زیادہ برا تو نہیں ہے۔ شاید تحریک کو کچھ سہارا ہی ملے گا۔ اس خیال سے مولانا نے انتخابات کے سلسلے میں کسی کوشش اور سعی سے دریغ نہیں کیا بلکہ پٹنہ کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پارلیمنٹری امور کے لیے جو سب کمیٹی بنائی گئی اس کی ممبری بھی قبول کر لی۔ انتخابات لڑے گئے اور کانگریس کی کامیابی نے مخالفین کو انگشت بدنداں کر دیا۔ یہ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کامیابی میں مولانا کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔

چوں کہ پارلیمنٹری محاذ پر تحریک کی بات چل پڑی ہے اس لیے یہ بتاتے چلنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا۔ اس کے دو حصے تھے، (۱) وفاقی (۲) صوبہ جاتی۔ پہلے صوبہ جاتی حصہ پر عملدرآمد ہونے والا تھا۔ حکومت اور اُس کے کاسہ لیس اس کو صوبہ جاتی خودمختاری کا نام دیتے تھے، لیکن درحقیقت یہ کوئی خودمختاری نہیں تھی۔ اتنے تحفظات تھے اور گورنر کے خصوصی اختیارات کی فہرست اتنی

طویل تھی کہ صوبائی وزارتوں کے اختیارات بے معنی سے ہو گئے تھے۔ اس آئین کی ہندستان میں شدید مخالفت ہوئی اور کوئی بھی گروہ، سوائے مفادات خصوصی رکھنے والوں کے، اس سے خوش نہیں تھا۔ احتجاج پر احتجاج ہو رہے تھے کہ ایسا آئین ہندستانیوں پر اُن کی مرضی کے خلاف لادا جا رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ صوبوں میں جو انتخابات ہونے والے تھے اُن سے کنارہ کشی تو ناممکن تھی، کیونکہ پھر برطانوی حکومت یہی ڈھنڈھورا پیٹتی جیسے کہ وہ پیٹا کرتی تھی کہ ہندستان کی رائے عامہ کانگریس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لیے انتخابات کی مہم میں شرکت پر کوئی خاص اختلاف رائے نہیں تھا۔ البتہ یہ بحث چل پڑی تھی کہ آئین کے صوبہ جاتی حصے کے نفاذ کے بعد کانگریس کو صوبوں میں وزارت قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس میں اختلاف رائے اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ خود ورکنگ کمیٹی میں دو رائیں تھیں۔ جواہر لال نہرو مخالفین میں سب سے نمایاں تھے لیکن مولانا موافقین میں بابو راجندر پرشاد اور سردار پٹیل کے ساتھ تھے۔ ۱۹۳۶ء میں فیض پور کے اجلاس کانگریس میں یہ مسئلہ قطعی طور سے طے نہیں ہو پایا مگر انتخابات سر پر آ گئے تھے اس لیے لوگ انتخابی مہم میں مشغول ہو گئے۔

نتائج کے اعتبار سے یہ مہم شاندار رہی۔ گیارہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں کانگریس نے اکثریت حاصل کر لی۔ دو اور صوبوں یعنی آسام اور صوبہ سرحد میں اگرچہ کانگریس اکثریت میں نہیں تھی لیکن اور جماعتوں کے مقابلے میں اس کے ممبروں کی تعداد زیادہ تھی۔ بہرحال چھ صوبوں میں تو واضح طور سے صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ وہاں کانگریس کے تعاون کے بغیر وزارتیں قائم ہی نہیں ہو سکتی تھیں، اس لیے وزارتوں کی تشکیل کے مسئلے نے خاصی اہمیت اختیار کر لی۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں دلی میں منتخب ممبران کانگریس اور زعمائے کانگریس کا ایک کنونشن طلب کیا گیا اور اس کنونشن میں یہ قرار پایا کہ وزارتوں کے قیام سے پہلے گورنروں سے یہ عہد لیا جائے کہ وہ وزارت کے کاموں میں وزراء کے مشوروں پر عمل کریں گے اور اپنے تحفظات کا استعمال نہ کریں گے۔ اس یقین دہانی کے بعد کانگریس وزارتیں قبول کر سکتی ہے لیکن جب گورنروں سے اس یقین دہانی کا مطالبہ کیا گیا تو انھوں نے انکار کیا۔ چنانچہ کانگریس نے بھی وزارتوں کی تشکیل سے انکار کر دیا۔

بہر حال یہ صورت قطعی اور آخری نہیں تھی۔ گفت وشنید کے دروازے بند نہیں ہوئے تھے اور بالآخر چند مہینوں کے بعد وائسرائے کے ایک توضیحی بیان شائع کر دینے پر کانگریس نے وزارتیں قبول کر لیں۔ اب کانگریس پر پارلیمنٹری محاذ پر بڑی ذمے داریاں آ گئی تھیں۔ وزیروں کا انتخاب، پالیسی کا تعین، دوسرے انتخابی مسائل، ان کے لیے ایک علاحدہ پارلیمنٹری بورڈ قایم کیا گیا جس کے ممبر مولانا آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ مولانا آزاد کے سپرد بنگال، بہار، یوپی، سندھ اور صوبہ سرحد کے پارلیمنٹری معاملات تھے۔ اس کے علاوہ مسلمان وزرا کے انتخاب کے مسئلے پر اور دوسرے ایسے تمام معاملات پر جس کا تعلق مسلمانوں سے ہو، مولانا کی راے ضرور لی جاتی تھی اور اس کی قدر کی جاتی تھی۔

اس دور میں کئی اہم امور آپ نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ صوبہ سرحد میں کانگریس وزارت کا قیام اور اسی طرح صوبہ آسام میں سعد اللہ وزارت کے خاتمہ کے بعد مشترکہ کانگریسی وزارت کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سی پی میں ڈاکٹر کھرے اور صوبائی کانگریس میں اختلافات ہوا اور ڈاکٹر کھرے نے جماعتی ضبط کی پروا نہ کرتے ہوئے گورنر کا سہارا ڈھونڈا اور اپنی نئی وزارت قائم کی۔ مولانا کو اس امر کی تحقیقات سپرد کی گئی۔ ڈاکٹر کھرے قصوروار ثابت ہوئے اور انھیں وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ پھر کانگریس پارٹی نے پنڈت ردی شنکر شکلا کو لیڈر منتخب کیا۔ اس طرح وزارتی محاذ پر موقع پرستی کی بدولت جو پہلا رخنہ نمودار ہوا تھا اُسے مولانا نے بروقت بند کیا۔ اسی عرصے میں سندھ میں کانگریس پارٹی اور اللہ بخش وزارت کے مابین زمین کا لگان بڑھانے کے مسئلہ پر اختلاف ہو گیا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر اس اختلاف کے سبب کو دور کیا۔ کچھ دنوں بعد سکھر بند کے مسئلے پر ان دو جماعتوں میں پھر اختلافات رونما ہوئے اور مولانا کو ایک یادداور مسائل کے سلجھانے کی سعی کرنا پڑی۔ اُدھر بہار میں کچھ دنوں پہلے کسانوں اور زمینداروں کے مابین ایک پرشور کشمکش رونما ہوئی تھی۔ بالآخر مولانا ہی کے مساعی سے یہ قضیہ طے ہوا۔ اسی طرح بہار میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے مسئلے نے نازک صورت حال اختیار کر لی تھی۔ سیاسی قیدیوں نے ہزاری باغ جیل میں بھوک ہڑتال کر رکھی تھی اور کانگریس وزارت کے خلاف ایک عام بے چینی سی پیدا ہو چلی تھی۔ مولانا کی

مداخلت کی بدولت بھوک ہڑتال ختم ہوئی۔ سرحد میں بھی فروری ۱۹۳۸ء میں وہاں کی صوبہ کانگریس کمیٹی اور وزارت کے مابین اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ آپ پشاور تشریف لے گئے اور دونوں گروہوں کے مابین مصالحت کرا کے اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرائی۔ ۱۹۳۸ء ہی میں لکھنؤ میں تحریک مدح صحابہ و تبرا چل پڑی اور شیعوں اور سنیوں میں اس مسئلے میں اختلافات اتنے بڑھے کہ آپس میں کشت و خون کی نوبت پہنچ گئی اور تحریک کے سلسلے میں دس بارہ ہزار افراد جیل گئے۔ باہمی سمجھوتے کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ پھر مولانا خود بہ نفس نفیس لکھنؤ تشریف لائے اور طرفین کے زعماء و علماء سے گفت و شنید کر کے سب سے پہلے تو ایجی ٹیشن بند کرایا۔ مصالحت فوری طور پر تو نہیں ہو سکی، لیکن ان کی کوششوں کی وجہ سے فضا میں سکون ضرور پیدا ہو گیا۔ کیونکہ مولانا مسئلے کی نزاکت کے باوجود دونوں جماعتوں میں احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور اگر کوئی ایسا تھا جو دونوں کے مابین مصالحت کی گفتگو کر سکے تو وہ انھیں کی ذات تھی۔

بنگال میں سیاسی نظر بندوں کی رہائی کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ سارے صوبے میں ایک عالم بے چینی تھی۔ گاندھی جی نے اس مسئلے کے حل کی طرف توجہ کی اور بنگال پہنچے۔ وہاں وزرائے بنگال اور گورنر بنگال سے گفت و شنید ہوئی جس میں مولانا نے بھی حصہ لیا اور اس گفت و شنید کے نتیجے میں ہزاروں قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی عمل میں آئی۔ بنگال میں صوبہ کانگریس کمیٹی کے جھگڑے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور شدت اختیار کرتے جاتے تھے۔ مولانا کی کوششوں سے سبھاش چندر بوس اور بدھان چندر رائے کے درمیان مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔

پارلیمنٹری محاذ پر اور بھی چند امور پیش آئے۔ چنانچہ مئی ۱۹۳۸ء میں بمبئی میں تمام کانگریسی صوبوں کے وزرائے اعظموں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں مزدوروں اور کسانوں کے مسائل، زراعتی امور، تعلیمی اور سماجی بہبودی وغیرہ کے بارے میں ایک مشترکہ پالیسی کی تشکیل کی گئی۔ تمام مذاکرات میں مولانا شریک رہے اور جو مشترکہ پالیسی بنی اُس کی تشکیل میں مولانا کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہاں واردھا تعلیمی اسکیم پر غور وخوض کیا گیا۔ اس کے کچھ

دنوں بعد مولانا نے بہار میں ''ہندستانی کمیٹی'' کے اجلاس کی صدارت بھی فرمائی تھی۔ اس کمیٹی نے ہندستانی لغت، قواعد اور زبان کے بارے میں غور و خوض کیا تھا۔ بعد میں یوپی حکومت کی جانب سے عربی اور فارسی زبانوں کے تعلیمی نصاب میں مناسب تغیر و تبدل کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی مولانا ہی کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔ اس طرح ہندستان کی وزارت تعلیم کا بار سنبھالنے سے بہت پہلے اس وقت بھی جب آزادی صرف ایک خواب کی حیثیت رکھتی تھی مولانا نے ہندستان کے تعلیمی مسائل سے گہری اور عملی دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ آنے والے واقعات کی پرچھائیاں پہلے ہی سے نظر آنے لگتی ہیں!

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ہم سرسری طور پر کانگریس کو جماعتی طور سے اور کانگریسی وزارتوں کو اندرونی طور سے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس کا تذکرہ کر رہے تھے اور یہ دکھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ مولانا نے کس طرح جماعتی اتفاق اور ملکی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے لگاتار کوششیں کیں۔ اس میں شک نہیں کہ اتحاد ان کا محبوب ترین نعرہ تھا اور اس نعرہ کو عملی شکل دینے کے لیے وہ کوئی قربانی بڑی نہیں سمجھتے تھے۔ اس عرصے میں پرانی قیادت اور نوجوان قیادت کے مابین ایک رسہ کشی جاری تھی۔ نئی قیادت میں لوگ عام طور سے بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے مگر نظریات میں بہت سے فروعی مسائل بھی تھے۔ نئی قیادت کے لیڈر پنڈت نہرو، سبھاش چندر بوس اور جے پرکاش نرائن وغیرہ تھے لیکن یہ سب کسی ایک کڑی میں منسلک نہیں تھے۔ سبھاش چندر بوس کے خیالات سراسر باغیانہ تھے اور وہ اگرچہ اشتراکیت کی بات چیت کرتے تھے، لیکن ان کی اشتراکیت، آمریت سے بھی صلح کر لیتی تھی۔ جے پرکاش نرائن کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے روح رواں تھے۔ اس کے علاوہ بنگال میں اشتمالیوں اور دہشت پسندوں کے بھی کچھ گروہ تھے، کچھ آزاد قسم کے مزدوروں، کسانوں، نوجوانوں اور طالب علموں کے بھی ادارے تھے اور کچھ آزاد خیال کانگریسی بھی تھے جو کانگریس کی پرانی قیادت سے بیزار تھے۔ ہری پورہ کانگریس کے نئے سبھاش بابو کی صدارت کے بعد اس کشمکش نے زور پکڑنا شروع کیا۔ خود ہری پورہ میں پہلے مولانا کا نام صدارت کے لیے پیش ہوا تھا لیکن چونکہ سبھاش بابو نے انتخاب لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا اس لیے مولانا نے اپنا نام واپس لے لیا۔

ایک بار جب دی-کے-اے-آئی-سی-سی کے اجلاس میں سبھاش بابو صحت کی خرابی کی بنا پر شرکت نہ کر سکے تو مولانا ہی نے صدارت کی۔ بہر حال قدیم و جدید کی کشمکش جاری رہی، اگر چہ ابھی تک واضح گروہ نہیں بن پائے تھے۔

کانگریس کا اگلا اجلاس تری پورہ میں ہونے والا تھا اور صدر کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ ہائی کمان آپ کو صدر بنانا چاہتی تھی اور آپ نے منظوری بھی دے دی تھی لیکن بعد میں صحت کی خرابی کی بنا پر آخر میں آپ نے معذوری ظاہر کی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مجبور ہو کر ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا۔ اس تجویز کے محرکین میں مولانا بھی تھے۔ ورکنگ کمیٹی کے ارکان نے سبھاش چندر بوس سے درخواست کی کہ وہ الیکشن نہ لڑیں اور انتخاب کو بلا مقابلہ ہو جانے دیں لیکن وہ اس پر رضا مند نہ ہوئے اور بالآخر پہلی مرتبہ کانگریس کی صدارت کے لیے ایسا مہتم بالشان الیکشن ہوا۔ اس میں سبھاش چندر بوس کامیاب ہوئے۔ گاندھی جی نے ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیہ کی شکست کو اپنی شکست قرار دیا اور اسے اپنی پالیسی پر عدم اعتماد کا ووٹ سمجھے۔ ہائی کمان کے بارہ ممبروں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ ان میں مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے جس طرح ستیا رامیہ کی صدارت میں کوشش کی تھی اس کے بعد ان کا ہار جانا، ان کی شکست ہی تھی لیکن گاندھی جی سمیت ملک کے تمام اہم لیڈروں کے استعفیٰ سے ملک میں ہلچل سی مچ گئی اور مصالحت کی کوششیں ہونے لگیں۔ چنانچہ تری پوری میں مصالحت کی ایک ناکام کوشش بھی ہوئی۔

یہاں سلسلہ بیان کو روک کر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس عرصے میں مسلم لیگ نے ایک نئی زندگی حاصل کر لی تھی۔ پہلے تو چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر اُلجھن ہوئی۔ مثلاً یوپی میں مسلم وزیروں میں خلیق الزماں اور نواب اسماعیل کو لیا جائے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ ہو یا اور دوسری فرقہ وارانہ جماعتیں، ان کے سامنے کوئی بڑے مسائل تھے ہی نہیں۔ وہ تو چھوٹے چھوٹے مسائل پر فتنہ و فساد برپا کرتی رہتی تھیں۔ بڑے بڑے مسائل تو اقتصادی اور سماجی تھے، اگر ان میں اُلجھنیں ہوتیں تو پھر نفاق کے لیے میدان کہاں ملتا، غریبی، تنگدستی، بے کاری، مرض، یہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی میں امتیاز کہاں کرتے تھے؟ اس لیے فرقہ وارانہ جماعتیں جان

بوجھ کرنشستوں، ملازمتوں، وزارتوں کے جھگڑے لے کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ خلیق الزماں وغیرہ کی وزارت سے مایوسی نے انھیں اور ان کے ہم نواؤں کو اور زیادہ شدت سے فرقہ پسند بنا دیا۔ ایک موقعے پر مولانا نے انھیں کانگریس وزارت میں شمولیت پر آمادہ بھی کرلیا تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس شمولیت سے فرقہ پرستوں کا زور ٹوٹ جائے گا۔ وقتی طور سے شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن کانگریس وزارتیں جو زرعی اصلاحیں اور سماجی قوانین بنا رہی تھیں اُس کے پیش نظر راجہ محمود آباد، راجہ پیر پور، راجہ سلیم پور اور دوسرے لیگی لیڈروں کو اس سے کون روک سکتا تھا کہ وہ اور نمائشی لیڈر پیدا کر کے فرقہ پرورانہ نعرے لگوائیں اور فضا میں تکدر پیدا کرائیں۔ اب تو ان کو ایک نادر موقع یہ ہاتھ لگا تھا کہ کانگریس کئی صوبوں میں برسر اقتدار تھی۔ اس لیے اس پر فرقہ پرستی کا الزام تراشنے لگے۔ نوکر شاہی اور سامراجی طاقت اُن کی پشت پناہی پر تھی۔ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرانا اور پھر کانگریس کو موردِ الزام گردانا، یہی اُن کا بہترین مشغلہ رہ گیا تھا۔ ان لوگوں نے پیر پور کمیٹی بنائی اور جھوٹے سچے الزاموں کی ایک فہرست تیار کردی۔ بنگال کے وزیر اعظم مسٹر فضل الحق نے یہ بھی الزام تراشا کہ کانگریسی اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں پر بہت ظلم کیے گئے مولانا نے مسٹر فضل الحق کو چیلنج کیا کہ ''وہ ایسے کسی بھی ایک کانگریسی صوبے کا نام بتائیں جہاں مسلمانوں کو تنگ کیا گیا ہو اور اگر ان کے لگائے ہوئے الزام صحیح ثابت ہوئے تو میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کی ساری شکایتیں دور کرانے کی کوشش کی جائے گی لیکن میری یہ صاف رائے ہے کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہیں۔'' مولانا سے زیادہ واقعات کو کون جان سکتا تھا۔ کانگریس پارلیمنٹری کے ایک ممبر کی حیثیت سے وہ تمام معاملات اُن کے سامنے پیش ہوتے تھے جس میں فرقہ واریت کا شائبہ بھی ہوتا ہو۔ جو مولانا کی افتادِ طبیعت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر انھیں یقین ہو جاتا کہ کہیں ناانصافی ہوئی ہے تو وہ فوراً اس کا انسداد کراتے۔ وہ جھجکنے اور ڈرنے والوں میں نہیں تھے۔ یہ بات اب راز نہیں ہے کہ انھوں نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ وہ ایسے مسئلے پر استعفیٰ تک دینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر مسلم لیگ کی الزام تراشی میں ذرا بھی اصلیت کو دخل ہوتا تو وہ ضرور ثبوت مہیا کرتی اور کم از کم مولانا کو مستعفی ہی کرا دیتی لیکن وہاں تو مقصد ہی ہنگامہ آفرینی تھا اور برطانوی حکومت کی ہاں میں

ہاں ملا کر یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگریس پر مسلمانوں کو اعتماد نہیں ہے۔ اس لیے مسلم لیگی عناصر اس آگ کو بھڑکاتے اور ملک کی فضا کو بد سے بدتر بناتے رہے۔ خود مولانا کی ذات کے خلاف ایک مہم شروع کردی۔ مولانا کلکتہ میں نماز عید کی امامت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ مسلم لیگیوں نے امامت کے خلاف مہم شروع کردی۔ مسئلہ ''عید کمیٹی'' کے سامنے پیش ہوا اور اُس نے فیصلہ کیا کہ مولانا ہی نماز پڑھائیں گے لیکن مولانا اپنی ذات کی بنا پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی جنگ اصولی تھی اور اس میں ذاتیات کو دخل نہیں تھا۔ اس لیے عید کمیٹی کے فیصلے کے باوجود آپ نے امامت سے علاحدگی اختیار کی۔ اس سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کو سخت رنج پہنچا لیکن آپ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ مسٹر جناح نے مولانا کو کانگریس کا ''شوبوائے'' کہا۔ مسلم لیگی پلیٹ فارم اور پریس میں مولانا کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی برپا کیا گیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ نے اسٹیشن پر آپ کے سامنے اخلاق سوز مظاہرے کیے، لیکن یہ کوہِ سکون و متانت اپنی جگہ غیر متزلزل رہا اور اس نے اپنے لیے جو راہ متعین کرلی تھی اس سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بالکل برحق فرمایا کہ:

> ''وہ (مولانا) ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اپنے ہم مذہبوں کی تلخ و ترش تنقیدوں کے درمیان بھی وہ ایک غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ملک کے ہر طبقے میں اُن کو یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ تمام پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے اُن سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بے خوف، بلا جھجک، غیر جانبدار اور ٹھوس مشورہ دیتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں دوبارہ کانگریس کے صدر منتخب ہونے پر انھوں نے ہماری توقع کے عین مطابق غیر معمولی سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور حب الوطنی کا ثبوت دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرقے وارانہ کشیدگی نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی اور نتیجے میں ایک آزاد مسلم مملکت کی

حیثیت سے پاکستان کا مطالبہ کیا جانے لگا تھا۔"

اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے ماتم نشین ہندستان کے جذبات، بالخصوص مسلمانانِ ہند کے جذبات کی کیا خوب ترجمانی کی ہے کہ:

"ہم نے کیا کچھ ان کا دل نہ دکھایا لیکن اس وقار کے پتلے نے کبھی کسی کے خلاف ایک جملہ نہ کہا۔ سب کچھ گزر جاتا تھا اور وہ اس کی پروا بھی نہ کرتے تھے، لیکن کلمہ حق کہنے میں انھوں نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ مولانا کم آمیز تھے لیکن کمرے میں بیٹھ کر سب کے ساتھی تھے۔ جو بات ہم کہنا چاہتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے اُس کے کہنے کی جرأت مولانا ہی میں تھی۔ صدر جمہوریۂ ہند نے صحیح کہا کہ" وہ قلم جس سے موتی بکھرتے تھے، بجلیاں بھی چمکتی تھیں اور وہ ہونٹ جس سے پھول برستے تھے چنگاریاں بھی نکلتی تھیں۔ سچ کو روشن کرنے اور باطل کو دبانے کے لیے وہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن مشعل باقی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس سے روشنی لیں۔"

سابق صدر کانگریس یو-این دھیبر نے مختصر سے لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا:

"گاندھی جی نے ہندو فرقہ پرستی کے خلاف اور مولانا مرحوم نے مسلم فرقہ پرستی کے خلاف جس طرح محاذ آرائی کی وہ آیندہ نسلوں کے لیے ایک زندہ مثال ہے کہ جب انسان عزم اور تہیہ کے ساتھ کسی مقصد کی طرف چل پڑتا ہے تو اُس راہ میں کیسی کیسی کٹھن منزلوں سے ہنستا کھیلتا گزر جاتا ہے۔"

یہ تو خیر ہندستانِ عزیز کی عزیز ہستیاں تھیں۔ انھیں ان الفاظ میں اعتراف کرنا ہی چاہیے تھا لیکن یہ مولانا کی حق و صداقت پرستی کا کرشمہ ہے کہ پاکستان کے ممتاز عالم اور صحافی مولانا غلام رسول مہر نے بھی کھلے دل سے اعتراف کیا:

"اُن کی زندگی میں استقامت کی ایک اور نادر مثال ملتی ہے، جب ہم

مذہبوں کی اکثریت نے ان کے سیاسی مسلک سے اختلاف کیا، میرے علم کے مطابق وہ اپنے لیے ۱۹۱۲ء میں جو راہِ عمل طے کر چکے تھے اس پر مدت العمر بے خوف لومۃ لائم قایم رہے۔ بیچ میں اکثر ایسے مرحلے آئے کہ بڑے بڑے دعویداران عزم و ہمت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے، انھوں نے اپنا مسلک بدلنے کے لیے معقول دلائل بھی فراہم کر لیے، لیکن مولانا کے نزدیک صحیح، مفید اور بہترین راستہ وہی تھا جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھیں بیشمار قربانیاں کرنی پڑیں، کم و بیش سولہ سال قید و بند میں گزارے، اُن کے نہایت اہم دینی و علمی مشاغل کو سخت نقصان پہنچا۔ وہ مسائل معاش بھی بالکل تباہ ہو گئے جو انھوں نے اپنی طبیعت کے ذوق کے مطابق اختیار کر لیے تھے اور جن میں وہ سب سے زیادہ کامیاب تھے لیکن ان تمام قربانیوں سے گراں بہا قربانی یہ تھی کہ اُن کی ہر دلعزیزی کی متاع عظیم جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بدولت عنفوانِ شباب ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ جس طرف نکلتے تھے لوگ اپنی آنکھیں اُن کے لیے بچھانے پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کے لیے جو مسلسل و متواتر عقیدت کی گرم جوشیوں کا اظہار ہوتا رہا وہ کسی مسلمان رہنما کو نصیب نہ ہوئیں اور یہ غیر معمولی ہر دلعزیزی اُنھیں اُس وقت حاصل تھی جب اُن کی عمر بارہ اور تیس کے درمیان تھی۔ خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ اُن سے محبت و عقیدت کاملاً بے غرضانہ تھی، یعنی وہ اُن رہنماؤں میں نہ تھے جنھیں مختلف گروہوں نے صاحب اختیار و اقتدار و فتح باب مقاصد کا ذریعہ سمجھ لیا ہو لیکن انھیں پیش نظر مقاصد کے لیے استقامت و عزیمت کی راہ میں ہر دلعزیزی کی متاع عظیم بھی قربان کرنی پڑی اور وہ جس شے کو حق نہ

سمجھتے تھے اس سے بال برابر بھی رغبت نہ رکھتے۔ یہ قربانیاں ذکر و بیان
میں بہت دل پسند معلوم ہوں لیکن اس پر عمل سہل نہیں۔ نظیریؔ کیا خوب
کہہ گیا ہے:

نیست آساں برصف آتش زدن
می نماید گرچہ از پروانہ خوش

ایسا نہیں ہے کہ مولانا نے ہم عصروں کی دست درازیوں اور چیرہ دستیوں پر خاموشی کسی خوف سے اختیار کی ہو۔ خوف کو تو وہ کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے بلکہ اس عظیم الشان صبر و سکوت میں اُن کے سوچے سمجھے ہوئے اصول کو دخل تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک مشہور عالم دین کو، جنھوں نے مولانا کی تفسیر سورۂ فاتحہ پر مناظرانہ رنگ میں ایرادات کیے تھے، لکھ بھیجا تھا کہ:

اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"چوں کہ آپ لکھتے ہیں، کسی وجہ سے انھوں نے مناظرانہ اسلوب اختیار کیا ہے، اس لیے براہِ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجیے۔ میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے۔"(۱)

۱- ایک مشہور عالم دین سے اشارہ حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ انھوں نے ترجمان القرآن کے پر اپنی تفسیر میں دو اعتراض کیے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے مولانا مطلع کیا اور یہ بھی لکھا کہ آپ فرمائیں تو متعلقہ کتاب (تفسیر، خدمت میں بھیج دوں۔ اس کے جواب میں مولانا نے جو خط لکھا تھا۔ اس ذیل کا اقتباس نقل ہوا ہے لیکن جب میر صاحب نے اپنی طرف سے بعض سوالات کیے تو ان میں حضرت سیالکوٹی کے اعتراض بھی نقل کر دیے تھے اور مولانا نے بے تکلف جواب دیا۔ مہر مرحوم نے مولانا کا جواب سیالکوٹی دکھایا اور انھوں نے اسے تسلیم کر لیا۔ مہر مرحوم نے اس سے مولانا کو مطلع کیا اور ان سے اجازت کے لیے لکھا کہ آپ کے اس خط کو شائع کر دیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت سیالکوٹی کی تنقید سے جو لوگ متاثر ہوئے ہیں، ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ مہر مرحوم نے مولانا کو لکھا تھا:

پورا خط چھاپنے کی اجازت دے دیجیے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں عوام کی سہولت کے لیے آیات کا ترجمہ ساتھ لکھ دوں۔ مولانا محمد ابراہیم (سیالکوٹی) والا حصہ بھی الگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ مولانا ممدوح تمام معاملات کو درست تسلیم کر چکے ہیں اور وہ اپنی تفسیر میں جو کچھ لکھ چکے تھے۔ اس کی تلافی کی بھی یہی ایک مناسب صورت تھی کہ بعد کے حالات پیش کر دیے جاتے!

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا مزید لکھتے ہیں:

”۱۹۱۸ء سے میں نے جن میں باتوں کا عہد کیا ہے، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا، نہ اُس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دوں گا۔“

اسی طرح پنجاب کے ایک سیاست داں نے ایک بیان میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک بالکل بے اصل تھیں۔ اس سلسلے میں مولانا نے مولانا غلام رسول مہر کو ایک خط میں لکھا کہ:

”اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اُس وقت تھا جب الہلال نکلتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے کیسے الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اُسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آ جاتا ہے۔ میں چونک اُٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں برا نہ کہوں۔“ (نقش آزاد: ص ۱۳۲، خط مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۳۷ء)

(باقی حاشیہ پچھلے صفحہ سے) چناں چہ مولانا نے اجازت دے دی۔ میں نے انقلاب کے پورے صفحے پر مکتوب چھاپ دیا اور آیات کے ترجمے کے لیے تمہید میں تصریح کر دی۔ (نقش آزاد (مجموعہ خطوط مولانا آزاد): بنام و مرتب مولانا غلام رسول مہر) لاہور، کتاب منزل، ۱۹۵۸ء، ص ۵۴)

حضرت مولانا سیال کوٹی نور اللہ مرقدہ نے اپنے اعتراضات سے نہ صرف رجوع کر لیا تھا، بلکہ جب ہوشیار پور کے ایک دوسرے نکتہ چیں نے اپنی ایک تحریر کی ان سے توثیق چاہی تو وہ اس کے مانع ہوئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس شخص کو جو خط لکھا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اسے اپنے ایک نوٹ کے ساتھ روز نامہ انقلاب لاہور میں چھاپ دیا تھا۔ یہی مضمون سہ روزہ زمزم، لاہور میں ۲۳ ستمبر ۱۹۴۵ء میں نقل ہوا۔ یہ مضمون میرے سامنے ہے۔ حضرت سیال کوٹی رحمہ اللہ نے انھیں لکھا تھا:

”آپ نے جو قدم اُٹھایا ہے، وہ غلط بھی ہے اور نامناسب بھی! غلط اس لیے کہ جو نتیجہ آپ اُن عبارات سے نکالنا چاہتے ہیں، مولانا ابوالکلام صاحب نے ان کے متعلق اپنی معذرت و برأت کئی سال ہوئے کر دی تھی جو اخبار انقلاب، لاہور میں پرچہ ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ میں شائع ہو گئی تھی۔ ان تصریحات کے خلاف آپ کوئی فتویٰ ان کے خلاف صادر نہیں کر سکتے اور یہ امیر علمائے کرام سے مخفی نہیں اور نامناسب اس لیے ہے کہ ”بشرو ولا تنفرو الحدیث، (متفق علیہ، مشکوٰۃ صفحہ ۳۱۵) کے مقتضی کے خلاف ہے۔ (زمزم۔ لاہور، ۲۳ ر ستمبر ۱۹۴۵ء، ص ۳)

اس سے مولانا کے بلند مرتبے، اُن کی نفس کشی، اُن کی ذاتی رزم آرائی سے نفرت، اُن کی اصول دوستی، اُن کی دروغ دشمنی اور ان کی حق آ گاہی پر کتنی روشنی بیک وقت پڑ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی کھلم کھلا مولانا پر مطاعن کی بارش کرتے رہے اور چھوٹی طبیعتوں والے تو گالی گلوچ سے بھی باز نہیں آئے لیکن تقریباً چالیس برس کی قوم پروری کی طویل تاریخ میں مولانا کے زبان یا قلم سے ایسا کوئی جملہ، کوئی لفظ نہیں نکلا جو تہذیب و متانت کے خلاف ہو۔ ہاں جب اصول کی جنگ چھڑی تو مولانا نے دلائل و براہین کے دریا بہا دیے اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے لمحوں میں وہ انداز گل افشانی گفتار دیکھنے اور سننے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

چنانچہ اسی زمانے میں یہ اصولی بحث چھڑ بھی گئی۔ یہ دوقومی نظریے اور اقلیت واکثریت کی بحث تھی۔ یہ سوال پہلے سے چل رہا تھا اور مولانا نے صاف لفظوں میں مسلم لیگ کے بارے میں بیسوں برس پہلے ہی علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ:

> ''مسلمانوں نے اس (پالیٹکس) کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اُس کے آگے بھیک مانگنے کے لیے روئیں اور مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں، بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے......
>
> بے شک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے، جس کو کفر کہا تھا اُس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتویٰ دینا پڑا لیکن کیونکر؟ اپنی قوت سے، اپنے دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے؟ نہیں بلکہ:
>
> ان ہم بسعی غمزدۂ کردم شکارِ دوست
>
> پہلے جن کے حکم سے گمنامی کے غاروں میں چھپے تھے، اب انھیں کے حکم سے باہر نکلے تاکہ مندر میں جا کر اُن کے آگے سربسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا

نام ''لیگ'' رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی؟ اگر تم ایک کھلونے کا پتلا لے کر اُس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے تا کہ اپنے دونوں ہاتھ ہلا کر تالی بجائے تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا؟

نادانو! چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو! شاید ہی آج تک دنیا میں کسی قوم نے پالیٹکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہوگی جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ تم نے اے چاندی اور سونے کے پوجنے والو! تم نے کی۔ تمھارا وجود یکسر سیاست کی تحقیر اور تمھارے اعمال اُس کی معزز پیشانی پر ایک کلنگ کا ٹیکہ ہے۔ تم نے غلامی کا ایک بتکدہ بنایا اور اُس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے سجدے کا سر جھکایا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں، تم دلدل میں اپنے پاؤں ڈال کر کود رہے تھے تا کہ اور خسف و غرق ہو، لیکن قوم کو کہتے تھے کہ ہم میدانوں میں دوڑ رہے ہیں۔ تم خود گمراہ تھے پر اس پر بس نہ کی اور پوری قوم کو گمراہ کرنا چاہا......

سوال چھت کا نہیں بلکہ ان اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں۔ یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد تو ٹیڑھی نہیں؟ پالیٹکس ایک آگ ہے جو خود بھڑکتی ہے اور پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ وہ برف کا گلاس نہیں ہے جو کسی سرد مہر ساقی کی بخشش پر موقوف ہو۔ اوّلین گمراہی یہ تھی کہ برسوں کی موت کے بعد زندگی کی کروٹ لی بھی تو اپنی اُمنگ، اپنے جوش اور اپنی کسی قوت کے اعتماد پر نہیں، بلکہ محض کسی کے اشارۂ چشم اور جنبش دست دعوت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پالیٹکس غلامی کی ایک دوسری شکل بن گیا اور راہِ مقصود سے باز رہنے

کے لیے ایک کھلونے کا کام دینے لگا۔ پھر اس کے بعد ساری قوت اس پر صرف کی جانے لگی کہ گورنمنٹ سے مراعات طلب کی جائیں اور جس طاقت کو گورنمنٹ کے مقابلے میں خرچ ہونا تھا اُس کو ہندوؤں کے مقابلے میں صرف کیا جائے۔ یہ اُس خمار کے لیے ترشی کا ایک پورا جرعہ ثابت ہوا۔ اصل شے قوم کا یہ محسوس کرنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے نہ کہ کسی لکڑی کے سہارے، لیکن مراعات کی طلب جب پیدا ہوگی خواہ اُس کا کچھ ہی نام رکھا جائے، یقیناً اپنی قوت کی جگہ محض معطی کے احسان وکرم پر اعتماد ہوگا۔ بے شک مسلمانوں کو اپنے حقوق قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اس کی ہونی چاہیے کہ درخت اپنی جگہ پر مضبوط ہو۔ تم درختوں کے سائے میں آرام وراحت لیتے ہو، لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تمھارے باورچی خانوں میں کون سی شے جلتی ہے؟ وہ بھی درخت ہے، لیکن جو درخت اپنی قوت نشوونما سے محروم ہو جاتا ہے اُس کو کاٹ کر چولھے ہی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ پس زندگی صرف قوت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہے نہ کہ کسی کی چوکھٹ۔

''ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے......

ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی قوت ہے جو اُس کے اخلاق، اُس کے کیریکٹر، اُس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیت الٰہی اور اعمال

حسنہ سے پیدا ہوتی ہے......

بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آ گئے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی یہی نصب العین (آزادی) اپنے لیے تجویز کرنا چاہیے مگر مشکلات راہ سے گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شراب کڑوی ہے، نشہ و سرور کے انتظار میں حلق و دہن کو کون و بدمزہ کرے؟ لیکن اب ہم ان سے کیا کہیں کہ کوئی گھونٹ حلق سے نیچے اُترا ہی نہیں۔ کسی طرح منہ بنا کر ایک جرعہ اُتار لیجیے پھر پوچھیں گے کہ کڑوی ہے یا میٹھی؟

اے اخوان غفلت شعار! نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں؟ یہ مقتل سیاست ہے، مشہد آزادی و حریت ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ یہ آپ سے کس کم بخت نے کہا ہے کہ اس خارزار میں قدم رکھیے؟ یہاں آیئے گا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے، ہر لمحے مصائب کا نزول ہوگا۔ آپ مشکلات سے گھبرا رہے ہیں، حال آں کہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے، یہاں ہوس پرستوں کا گزر نہیں، اس میدان کے مردوہ سرفروشانِ الٰہی اور مجاہدین حق پرست ہیں، جن کے سر گردنوں پر نہیں ہتھیلیوں پر رہتے ہیں......

''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند غلامی و استبداد کے توڑنے کے لیے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں یقین کیجیے کہ وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف ہیں جس کے لیے دراصل

سب سے پہلے آپ کو اُٹھنا تھا۔" (الہلال، مقالہ: الجہاد و فی سبیل الحریت: ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۱-۷)

مدتوں بعد رام گڑھ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے جب کہ گنگا جمنا کا کتنا پانی بہہ چکا تھا اور دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی، مولانا مرحوم اُسی طرح اپنی جگہ پر اٹل رہے۔ کانگریس اجلاس رام گڑھ کی صدارت کرتے ہوئے ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ:

"(پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کے) اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے اُبھاری گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہے اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلاؤں گا کہ اگر اس معاملے کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنی چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند، لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیے۔ برطانوی سامراج نے ہندستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے اُن میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں مگر ابھی تک اُس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی۔"

(خطبات آزاد: دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۹۲-۲۹۱)

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بات مولانا نے اُس وقت کہی تھی جب مسلم لیگ "دو قومی نظریے" کا زور و شور سے پرچار کرنے لگی تھی۔ مولانا نے اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو یاد دلایا کہ یہ مسٹر

جناح اور اُن کے ساتھیوں کے دماغ کی اُپج نہیں ہے بلکہ لارڈ ڈفرن اور سر کالون نصف صدی پہلے ہی اس کا بیج بو گئے ہیں۔ یہاں مجھے ایک ضمنی سی بحث یاد آ رہی ہے جو مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر اقبال میں چل پڑی تھی۔ اس میں بعد کو علامہ اقبال سہیل بھی شریک ہو گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ ''قوم'' کا مفہوم کیا ہے۔ کیا ''قوم'' کی بنیاد مذہب ہے؟ چونکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی بار بار مذکور ہوا ہے، اس لیے مسلم حلقوں میں اس بحث سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جن لوگوں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ اس سے ہمیشہ ایک خاص علاقہ یا ملک میں بسنے والے ہی مراد لیے گئے ہیں مثلاً یہ ارشاد کہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (یعنی ہم نے ہر قوم میں رسول اُسی کی زبان میں بھیجے) یا وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (یعنی ہم نے ہر قوم میں ہدایت کرنے والے بھیجے) اگر یہاں قوم سے مذہب مراد لیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ہر مذہب میں رسول اور ہادی آئے جب کہ منشاء قرآن یہ ہے کہ ہر خطے اور قوم میں رسول اور ہادی آئے لیکن مسلم لیگ کا دو قومی نعرہ تعلیم اسلام پر تو مبنی نہیں تھا۔ مذہب کو کبھی بھی اور کہیں بھی بنائے قومیت نہیں مانا گیا۔ پھر ہندستان ہی میں یہ نعرہ کیوں اُٹھا؟ یقیناً ہمیں مولانا کی اس تاریخی تنقیح سے متفق ہونا پڑے گا کہ اس کی وجہ صرف یہ تھی انگریزی حکومت کے بوئے ہوئے تخم تخریب کی آبیاری یہاں کے مفاد پرست لیڈر کر رہے تھے۔ یہ نئی قوم جو بنائی جا رہی تھی اس کا ایک سرا مغرب میں اور ایک سرا مشرق میں تھا، پھر بھی صرف اتحاد مذہب کی بنا پر اُس کو کھینچ تان کے ایک کیا جا رہا تھا۔ آج مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک دوسرے سے الگ اور ایک غیر فطری اتحاد کی تصویر بنے، نئے نئے مسائل سے دوچار ہیں اور پنجاب اور بنگال بٹ چکے ہیں۔ یہ برطانوی ساحر کی چالبازیاں ہیں، لیکن اصلی قصوروار برطانوی سیاست دان نہیں بلکہ وہ قایدین ہیں جنھوں نے قصداً یا سہواً اس جال میں پھنسنا گوارا کیا اور وہ یہاں تک کیسے پہنچے؟ وہی خوف اور شبہات کا جال بچھا دیا گیا۔ اقلیت اور اکثریت کا بھوت کھڑا کر دیا گیا۔ جو نقطہ ہائے اتحاد تھے وہ ایک ایک کر کے محو کیے گئے اور معمولی معمولی اختلافات کو ہوا بنا کے پیش کیا گیا۔ مولانا کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ اگر یہ تیسری طاقت درمیان میں نہ ہوتی تو یہ مسئلہ چشم زدن میں طے ہو جاتا۔ مگر یہ طاقت تو ہر وقت، ہر جگہ موجود تھی، جب ذرا آگ بجھنے

لگتی تو یہ ہوا دینے کو آگ بڑھتی۔ افسوس یَہ ہے کہ نہ صرف مسلمان جو اقلیت میں تھے بلکہ اکثریت والے ہندو بھی اس جال میں گرفتار تھے۔ چناں چہ ہندو فرقہ پرستوں میں مہاسبھا وغیرہ بالکل مسلم لیگ کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ اگر مسلمان ذرا متزلزل ہوتے تو یہ ہندو فرقہ پرست آگ بھڑکاتے یا پھر سکھ اور عیسائی فرقہ پرست آگے بڑھتے۔ قوم پروروں کی طرح، فرقہ پروروں کی بھی اپنی برادری الگ تھی۔ ہندو فرقہ پرست، مسلم فرقہ پرست، سکھ فرقہ پرست بظاہر ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے لیکن ایک دوسرے کے مفاد کو اور بالخصوص اپنے مشترک آقا برطانوی سامراج کے مفاد کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں صاف صاف لکھا ہے کہ:

> ''برسرِ عام ہندو اور مسلم فرقہ پرست ایک دوسرے کو کتنا ہی برا بھلا کیوں نہ کہیں، وہ اسمبلی میں اور اسمبلی کے باہر بھی ہر جگہ رجعت پسند قوانین کے پاس کرانے میں حکومت کی مدد کرتے ہیں۔''

آگے چل کر جواہر لال نہرو نے مسلم قوم یا مسلم نیشن کے بارے میں دوٹوک بات کہی ہے:

> ''پس، مسلم نیشن کی بات کرنا ایسا ہے گویا نیشن یا قوم کی سی کسی شے کا وجود ہی نہیں ہے، صرف ایک مذہبی رشتہ کا وجود ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آج کل کے مفہوم کی قوم کو بڑھانے ہی نہ دینا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے کہ موجودہ تہذیب کو ترک کر دینا چاہیے اور ہمیں ازمنہ وسطیٰ کے طریقوں کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے یا تو مطلق العنان حکومت یا بیرونی حکومت اور سب سے بڑھ کر اس کا مفہوم ایک ذہن کی جذباتی کیفیت کے سوا اور کچھ بھی نہیں یا پھر ایک ایسی شعوری یا غیر شعوری خواہش ہے جو حقائق اور بالخصوص اقتصادی حقائق کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی۔''

بہر حال، برطانوی سامراج چاہتا تھا کہ اس قسم کا ایک نیشن وجود میں آئے اور مسلم لیگ

دُہراتی تھی کہ ہندستان میں مسلم اور ہندو دو قومیں ہیں اور ڈاکٹر مونجے کی طرح کے ہندو بھی ہاں میں ہاں اس طرح ملاتے تھے کہ مسلمان تو ہندستان میں صرف مہمان ہیں اور مہمان ہی کی طرح رہ سکتے ہیں۔ یہ وہ ہندو مہا سبھا ہے جو اپنی نیشنلزم کو کانگریس کی نیشنلزم سے بھی افضل گردانتی تھی۔ دونوں ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے تھے اور ایک دوسرے کے شریک کار لیکن ایک واضح فرق تھا۔ تاریخی اعتبار سے مسلم لیگ کا نعرہ زیادہ رجعت پسندانہ اس لیے تھا کہ اُس سے برطانوی سامراج کو شہ مل رہی تھی۔ مولانا آزاد نے رام گڑھ کے خطبۂ صدارت میں اس امر کو واضح کیا کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہم ہندستانی قومیت کا جزو لاینفک ہیں اور ہمارے اسلامی شعار میں اور متحدہ قومیت میں کوئی خدا واسطے کا بیر نہیں ہے۔ اُن کا یہ اقتباس تاریخی اہمیت اختیار کرگیا ہے، اس لیے اُس کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

> ’’میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ، میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم، متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر

عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا!

ہندستان کے لیے قدرت کا فیصلہ یہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ انھیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا......

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔

ہماری گیارہ صدیوں کو مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی

گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جاسکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں چل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔

ہماری اس ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تجسس ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔'' (خطباتِ آزاد: ایضاً، ص ۳۰۰-۲۹۷)

آج یہ سوچنا بے سود سا ہے کہ اگر مولانا کی رائے مسلم لیگ نے مان لی ہوتی تو ہم آج کہاں ہوتے اور تاریخ ہمارے لیے کیا کچھ لکھ چکی ہوتی لیکن مولانا نے شرط بلاغ پوری کر دی۔ انھوں نے مسلم لیگ کو اس کی راہ سے باز رکھنا چاہا۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں وہ مسٹر جناح سے بمبئی میں ملاقی ہوئے اور مسلم لیگ کے مابین سمجھوتا کرانے کی کوشش کی۔ ۲۸ر جنوری کو بمبئی میں گاندھی جی اور مسٹر جناح میں ملاقات ہو بھی گئی اور گفتگوے مصالحت کا آغاز ہوا لیکن بے نتیجہ رہا۔ مئی میں سبھاش چندر بوس نے، جو اُس وقت صدر کانگریس تھے، پھر مصالحت کی گفتگو کی لیکن مسٹر جناح نے نہایت ہی بے لچک رویہ اختیار کیا بلکہ کانگریسی زعما پر ناروا حملے کرنا

شروع کیے۔ اس سے مولانا کو سخت رنج پہنچا اور انھوں نے ۹ رجون ۱۹۳۸ء کو ایک بیان شائع کیا کہ:

''ایسے وقت میں جب کہ لیگ اور کانگریس کے مابین مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور کانگریس اپنے عزیز مقصد ہندو مسلم اتحاد کے لیے اتنا آگے بڑھ چکی ہے، ایک دوسرے پر علانیہ الزام تراشی اور عام جلسوں میں بے کار کے مسائل چھیڑنا زیب نہیں دیتا۔ کم از کم سردار لیڈروں کو اپنی پوزیشن اور وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کے ایسے پرجوش اظہار سے باز رہنا چاہیے۔ یہ رنج کی بات ہے کہ پچھلے دنوں میں مسٹر جناح کی تقریروں کے جو حصے اخباروں میں شائع ہوئے ہیں اُن میں خلاف توقع طور پر الزام تراشی سے کام لیا گیا ہے۔''

مسلم لیگی نقار خانے میں اس شیریں نوا طوطی کی یہ آواز کون سنتا۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی اور پنڈت نہرو پھر مسٹر جناح سے ملے لیکن ہندو مسلم مسئلے کا حل نہ نکلا، کیوں کہ مسٹر جناح کے خیالات میں اس طرح کوئی لچک نہیں تھی جس طرح برطانوی حکومت کے مزعومات میں۔ بعد میں بھی گاندھی جی نے مسٹر جناح سے گفت و شنید کی، اور حضرات نے بھی مصالحت کی کوشش کی لیکن اب جناح صاحب نے یہ رویہ اختیار کر لیا تھا کہ جب تک پاکستان کا نظریہ کانگریس تسلیم نہیں کر لیتی، اُس وقت تک گفتگو بے کار ہے۔ پاکستان کا تسلیم کر لینا، کانگریس کی طویل تاریخ کے منافی تھا اور ہماری تحریک حریت کے عزائم کے خلاف تھا۔ یہ ایسی شرط تھی جس کا پورا کرنا ناممکن تھا۔ جو لوگ پاکستان کے مخالف تھے وہ ہندو ہی نہیں تھے بلکہ تمام قوم پرور مسلمان اور بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد اس کے شدید ترین مخالف تھے۔ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے بلکہ مسئلے کو اور اُلجھا دے گا اور خلیج پاٹنے کے بجائے اور وسیع کر دے گا لیکن برطانوی نوکر شاہی مسلم لیگ کی شہ پر تھی۔

مولانا آزاد نے اپنی تحریروں اور مذاکرات میں لیگ کی رجعت پروانہ اور نقصاں رساں پالیسیوں کا پردہ برابر فاش کیا۔ اُن کے نزدیک لیگ کی سیاست پر تین دور گزرے تھے:

(۱) پہلا دور تو وہ تھا جب ۱۹۰۶ء میں لیگ نواب مشتاق حسین کی کوششوں سے وجود میں آئی اور اُس نے برطانوی وفاداری کا بیڑا اُٹھایا اور ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم جماعتوں کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اُس کے خیال میں اسی طرح ''مسلم حقوق'' کا تحفظ ہو سکے گا اور ملازمتوں وغیرہ میں مناسب نمائندگی مل سکے گی۔ اسے ہم خالص وفاداری اور فرقہ واریت کا دور کہہ سکتے ہیں، یہ وہ دور تھا جب کہ لیگی سر فیروز شاہ مہتا جیسے معتدلین کو بھی باغی اور غیر وفادار کہتے تھے۔ اس زمانے میں برطانیہ لیگ کو کانگریس کے مطالبات کے مقابلے میں جواباً پیش کرتی تھی۔

(۲) دوسرا دور وہ تھا جب کانگریس کی سیاسی کوششوں اور جدوجہد کی بدولت حکومت برطانیہ نے بالاقساط کچھ اصلاحیں نافذ کیں اور لیگ نے یہ محسوس کیا کہ دھیرے دھیرے کانگریس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتی جا رہی ہے تو اُس نے بھی سیاسی چولا اوڑھا، لیکن سیاسی جدوجہد سے اب بھی الگ رہی۔ مارلے منٹو اصلاحات اور مانٹفورڈ اسکیم کے نفاذ کے دوران یہ بات ثابت ہوگئی کہ لیگ دراصل اس دور میں بھی برطانوی حکومت کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چل رہی تھی۔

(۳) تیسرا دور پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوتا ہے جبکہ مسٹر جناح نے کانگریس سے الگ ہو کر لیگ کی قیادت سنبھالی تھی۔ لیگ کا خمیر تو بدل نہیں سکتا تھا ایسے ظاہری طور سے کوئی تبدیل نہیں ہوئی۔ یہ جماعت علی العموم بے حس و حرکت رہتی۔ ہاں جب یہ دیکھتی کہ کانگریس اور حکومت میں کوئی ٹکر ہو رہی ہے یا سمجھوتے کی فضا تیار رہی ہے تو پہلے تو خاموش تماشائی بنی رہتی اور پھر اس سیاسی کشمکش سے پورا فایدہ اُٹھانے کی کوشش کرتی۔ جب حکومت اور کانگریس کے مابین مذاکرات ناکام رہتے تو مسٹر جناح کوئی بیان دے دیتے کہ چونکہ حکومت اور کانگریس میں مصالحت نہیں ہو پائی اس لیے لیگ کی اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ اس کی ضرورت تو اُس وقت ہوتی جب صلح کے آثار صاف نظر آنے لگتے اور پھر فرقہ وارانہ آواز اُٹھا کر روڑا اٹکانے کی کوشش کی جاتی۔ اگست ۱۹۴۰ء کی برطانوی پیشکش ہو یا ۱۹۴۰ء میں کرپس کی پیشکش، یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ گویا آزادی میں جتنی دیر ہوتی اور سیاسی معاملات جب

تک اُلجھے رہتے، لیگ مطمئن رہتی لیکن مصالحت کی فضا تیار ہوتے ہی لیگ آگے بڑھتی اور فرقہ وار مطالبات پیش کر کے اُلجھنیں پیدا کرتی۔ ظاہر ہے کہ شروع سے آخر تک اُس کی یہ حکمت عملی صرف برطانوی سیاست کو فائدہ پہنچا رہی تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں صورت حال کچھ بدلی۔ چین اور امریکہ کی حکومتوں کی جانب سے دوران جنگ میں برطانوی سیاست دانوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ ہندستان کے مطالبہ آزادی کو پورا کرنے کی طرف قدم بڑھائیں۔ دوسری طرف ہندستان کی برّی اور بحری فوجوں اور ملازمتوں میں سیاسی ہمدردیاں رکھنے والے بڑھ رہے تھے اور ایک عام بے چینی نے سارے ماحول کو گھیر لیا تھا۔ اس طرح بین الاقوامی دباؤ اور اندرونی حالات کے تقاضوں نے برطانیہ پر یہ بات پوری طرح واضح کر دی تھی کہ اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیے اور اُسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لیگ یا دوسری رجعت پسند جماعتوں کا سہارا لے کر اب زیادہ دنوں تک یہ گاڑی گھسیٹی نہیں جا سکتی تھی، اس لیے اب ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس نئی صورت حال کا مظاہرہ شملہ کانفرنس میں ہو گیا، جب کہ سیاسی سطح پر کانگریس اور حکومت کے مابین مفاہمت کی شکل نکل آئی اور سوال یہ پیدا ہوا کہ وائسرائے کی ''ایگزیکیوٹو کونسل'' میں کون کون لوگ لیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں کانگریس اور لیگ سیاسی جماعتوں کی حیثیت سے اپنے اپنے نمائندے بھیجتی اور کوئی رُکاوٹ نہ رہ جاتی۔ ٹھیک اُس وقت مسٹر جناح نے ایک نہایت ہی ناقابل قبول سوال اُٹھایا کہ لیگ کے سوا اور کوئی جماعت مسلم نمائندہ نہیں بھیج سکتی۔ گویا جناح صاحب اپنی ہی جماعت کے لیے نہیں بلکہ کانگریس کے لیے بھی یہ فیصلہ کرنا چاہتے تھے کہ کون جائے اور کون نہ جائے۔ یہ سوال مسٹر جناح نے اُس وقت اُٹھایا جب کہ مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے اور ظاہر ہے کہ کانگریس کی فہرست میں صدر کی موجودگی ضروری تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابتدائے وجود سے لے کر انتہا تک لیگ کی ایک منفیانہ پالیسی رہی اور وہی اس کے بقا کی ضامن تھی۔ بس ایک ہی کام تھا اس کے سامنے اور وہ یہ کہ آزادی کی منزل قریب نہ آنے پائے۔ جب اُسے بالکل ہی قریب آتے دیکھا تو لیگ والوں نے نئے نئے نعرے ایجاد کرنا شروع کیے۔ جن میں ایک تو وہی تھا جس کا ابھی شملہ کانفرنس کے

سلسلہ میں بیان ہوا۔ دوسرا اس سے بھی زیادہ نقصان رساں اور دیرپا ثابت ہوا۔ وہ تھا پاکستان کا نعرہ۔ اس منزل پر پہنچنے میں جن عناصر کو دخل تھا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن مولانا کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ گاندھی جی نے مسٹر جناح کو غیر معمولی اہمیت دے رکھی تھی۔ وہ بار بار اُن سے مصالحت کی کوشش کرتے تھے اور اگر چہ ان کو مسلم عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن گاندھی جی کے بار بار مسٹر جناح سے ملنے اور مصالحت کی کوشش کرنے سے مسلم عوام کے دلوں پر بھی یہ اثر پڑا کہ جناح صاحب میں ضرور غیر معمولی صلاحیتیں ہوں گی جبھی تو گاندھی جی کی سی عظیم الشان شخصیت بھی انھیں کی طرف ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لیے رجوع کرتی ہے۔ میرے خیال میں مولانا کا تجزیہ سرسری سا ہے۔ کیونکہ مسٹر جناح ایک طبقے کے نمائندہ تھے۔ یہ تھا مفاد پرستوں کا طبقہ۔ اس طبقہ کو حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ اسی حمایت کی وجہ سے مسٹر جناح کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی، کیونکہ وہ جب چاہتے حکومت اور مفاد پرستوں کے تعاون سے آزادی کے پہیے کے آگے رکاوٹ رکھ سکتے تھے اور اس روڑے اور رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے مسٹر جناح سے گفت وشنید ضروری ہو جاتی تھی۔ شخصیات کو سیاست میں دخل ضرور ہے لیکن اقتصادی اور سماجی عوامل ہمیشہ شخصیات سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اگر مہاتما گاندھی، مسٹر جناح سے بار بار نہ ملتے اور ان کو قائداعظم نہ لکھتے جب بھی مسٹر جناح برطانوی حکومت کے سہارے اہمیت حاصل کیے رہتے۔ بہر حال لاہور رزولیوشن نے جو بعد میں ''پاکستان رزولیوشن'' کہا جانے لگا ایک نئی صورت حال پیدا کر دی تھی اور جس وجہ سے بھی ہو مسٹر جناح نے ایک غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ سب مسلمان لیگی ہو گئے تھے۔ الیکشن نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ملک میں قوم پرور مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب **India Devided** میں صاف لکھا ہے کہ آزاد مسلمانوں نے لیگ کے مقابلے میں جو انتخابات لڑے ان سے یہ بات بالکل ہی ظاہر ہوگئی کہ یہ جماعت اتنی ناقابل اعتنا نہیں تھی جتنی کہ ظاہر کی گئی تھی۔ جتنے مسلم ووٹ پڑے تھے اُن میں سے بعض صوبوں میں قوم پرور مسلمانوں نے چوتھائی اور بعض صوبوں میں ایک تہائی ووٹ پائے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں تو تیس فیصدی کے قریب ووٹ قوم پروروں نے

حاصل کیے تھے۔ یہ ووٹ خالصتاً لوجہ اللہ تھے۔ یہ سوچ سمجھے ووٹ تھے۔ یہ ہندستان کی آزادی کے حق میں ڈالے گئے ووٹ تھے جنھیں تہدید، حکومت کی حمایت، مذہبی جنون، زر و گوہر کی بارش اور مفاد پرستوں کی سازش کوئی بھی متزلزل نہ کر سکا تھا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد ایک مذہبی جنون میں بہہ گئی تھی اور دوقومی نظریے کی دلدل میں پھنس گئی تھی۔ مولانا اس کے شدید ترین مخالف تھے، جس کے مزید ثبوت کے لیے صرف اُن کا ایک بیان اور پیش کروں گا جو انھوں نے ۱۵ر پریل ۱۹۴۶ء کو دیا تھا:

> ''مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم بنائی ہے میں نے اُس پر ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ ایک ہندستانی کی حیثیت سے میں نے جانچنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے اثرات بہ حیثیت مجموعی ہندستان کے مستقبل پر کیا پڑیں گے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے یہ پرکھنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی قسمت پر یہ اسکیم کس طرح اثر انداز ہوگی۔ اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ یہ بحیثیت مجموعی صرف ہندوستان ہی کے لیے ضرر رساں نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے علی الخصوص نقصان دہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اتنے مسائل حل نہیں کرتی ہے جتنے کھڑے کر دیتی ہے۔
>
> میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی اصطلاح ہی سے میرا ضمیر بغاوت کرتا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ دنیا کے خطوں کی پاک اور ناپاک میں تقسیم غیر اسلامی ہے اور روح اسلام کے منافی ہے۔ اسلام ایسی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ''اللہ نے ساری دنیا کو میرے لیے مسجد گاہ بنا دیا ہے۔''
>
> اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے پاکستان شکست خوردگی کا ایک نشان بن گیا ہے اور یہودیوں کے مطالبہ وطنیت کی مثال کو سامنے رکھ کر وجود

میں لایا گیا ہے۔ یہ اس اقرار کے مترادف ہے کہ مسلمان مسلم ہندستان میں اپنی جگہ باقی نہیں رکھ سکتے اس لیے وہ ایک گوشے میں، جو اُن کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو، گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے کم از کم میں ایک لمحے کے لیے بھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوں کہ سارے ہندستان کو اپنی مملکت سمجھنے اور اس کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کی تشکیل میں حصہ لینے کے حق سے دستبردار ہو جاؤں۔ مجھے تو یہ بزدلی کی صریح نشانی نظر آتی ہے کہ میں اپنی وراثت کو ترک کر دوں اور اُس کے ایک ادنیٰ سے جزو پر ہی اکتفا کر لوں۔

جیسا کہ بخوبی معلوم ہے مسٹر جناح کی پاکستان اسکیم اُن کے دو قومی نظریہ پر مبنی ہے۔ اُن کا قول یہ ہے کہ ہندستان میں مذہبی اختلافات کے اعتبار سے کئی قومیں ہیں۔ ان میں سے دو بڑی قومیں، ہندو اور مسلم دونوں کے لیے علاحدہ قوموں کی حیثیت سے علاحدہ علاحدہ ریاستیں بھی ہونا چاہییں۔ جب ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامسن نے مسٹر جناح کی توجہ اس امر کی جانب دلائی کہ ہندستان کے ہزاروں قصبوں، دیہاتوں اور قریوں میں ہندو اور مسلمان پہلو بہ پہلو رہتے چلے آئے ہیں تو مسٹر جناح نے کہا کہ اس سے اُن کے اختلاف قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مسٹر جناح کے نزدیک ہر شہر، قصبہ اور دیہات میں دو قومیں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ ہیں اور انھیں دو ریاستوں میں تقسیم ہی ہو جانا چاہیے۔

میں مسئلے کے تمام پہلوؤں سے قطع نظر کر کے صرف مسلم مفاد کے نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ پاکستان کی

اسکیم کسی طرح بھی مسلمانوں کے لیے مفید ہے تو میں ذاتی طور سے اس کو قبول کرنے اور دوسروں سے بھی اس کے منوانے کے لیے آمادہ ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اس اسکیم کا مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفادوں کے نقطہ نظر سے بھی جائزہ لیتا ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ یہ اسکیم کسی طرح انھیں نہ تو فایدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ اُن کے خوف اور شبھے کو دور کرسکتی ہے۔

آؤ ہم بالکل غیر جذباتی ہو کر یہ سوچیں کہ اگر پاکستان کی اسکیم پر عمل کیا گیا تو اُس کے عواقب کیا ہوں گے۔ ہندستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا، جن میں سے ایک میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی اور ایک میں مسلمانوں کی۔ ریاست ہندستان میں ۳ ۱/۲ کروڑ مسلمان چھوٹی چھوٹی اقلیتوں میں سارے ملک کے طول وعرض میں بکھرے ہوئے موجود رہیں گے۔ یوپی میں ۱۷ فی صدی، بہار میں ۱۲ فیصدی، مدراس میں ۹ فیصدی رہتے ہوئے، وہ آج کے ہندو اکثریت کے صوبوں میں آج کے مقابلے میں کمزور ہو جائیں گے۔ ان علاقوں میں ہزاروں برس سے وہ وطن بنا کر رہے ہیں اور یہاں انھوں نے مسلم ثقافت و مذہب کے مشہور مراکز بنائے ہیں۔ جب وہ ایک دن سو کر اُٹھیں گے تو یہ دریافت کریں گے کہ اپنے اسی وطن میں وہ غیر ملکی اور بیرونی ہو گئے۔ صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی طور سے پسماندہ ہونے کے باعث، وہ ایک ایسے راج کے رحم و کرم پر رہیں گے، جو غیر مخلوط قسم کا ''ہندو راج'' ہی ہو سکتا ہے:

دو ریاستیں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ ہو کر ایک دوسرے کی اقلیتوں کے مسئلے کو حل نہیں کرسکتیں بلکہ بدلے اور انتقام کی فضا پیدا کر کے یرغمال (Hostage) کا ایک مشترکہ طریقہ رائج کریں

گی۔ اس لیے پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں کرتی۔
جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں اُن کے حقوق کا اس اسکیم کے تحت تحفظ نہیں ہوسکتا اور پاکستان کے شہریوں کی حیثیت سے انھیں ہندستانی یا عالمی معاملات میں وہ حیثیت کبھی حاصل نہیں ہوگی جو ہند یونین جیسے عظیم ملک کے شہری کی حیثیت سے حاصل ہوسکتی ہے......"

لیکن جب عوامی جنون طاری ہو، جب ''مذہب خطرے میں ہے'' کی آواز بلند کی جا رہی ہو، جب صرف ایک منفیانہ نقطہ نگاہ اپنا لیا گیا ہو تو عقل اور دلیل کی بات کون سنتا ہے؟ مولانا کہتے اور سمجھاتے رہے، تمام قوم پرور مسلمان مخالفت کرتے رہے، گاندھی جی اور کانگریس تقسیم کو روکنے کے لیے ہر ممکن راہِ عمل اختیار کرتے رہے لیکن برطانوی حکومت کی شہ، مفاد پرستوں کی ریشہ دوانیوں، مسٹر جناح کی ضد اور لیگی لیڈروں کی تنگ نظری نے کوئی دوسرا اور معقول حل سوچنے اور نیا راستہ اختیار کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بالآخر ملک تقسیم ہو کے رہا اور لوگوں نے دیکھا کہ مولانا کی رائے کہاں تک صائب اور دور اندیشی پر مبنی تھی۔ تقسیم کے طفیل میں قتل و غارت کا جو طوفان اُٹھا، بربریت کا جو ننگا ناچ ہوا اور جس طرح کنبے اور خاندان تباہ و برباد ہوئے اس کی یاد کم از کم موجودہ نسل کے ذہنوں سے تو آسانی محو نہیں ہوسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نے تقسیم کو روکنے کے لیے پوری کوشش کی اور آخر وقت تک کوشش کرتے رہے لیکن مسلم لیگ نے عارضی حکومت کے دوران میں جو رویہ اختیار کیا اس کے بعد یہ بالکل واضح ہوگیا تھا کہ یہ لوگ کسی مشترکہ اقدام کے لیے ذہنی طور سے تیار نہیں ہیں اور خواہ مخواہ کے روڑے اٹکانا ہی فرض جانتے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو اتحادِ عمل اور اشتراک کار کی کیا اُمید رہ جاتی ہے۔ اسی لیے بادلِ ناخواستہ کانگریسی قائدین بھی رفتہ رفتہ تقسیم کے لیے تیار ہو گئے۔ اگر تقسیم کو تسلیم کر کے آزادی کا دن قریب آ سکتا اور قومی حکومت کے راستے کی رُکاوٹیں دور ہو سکتی تھیں تو دو معائب میں سے کم ترعیب کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اسی لیے سردار پٹیل کی طرح کے تقسیم کے زبردست مخالف بھی، بالآخر تقسیم پر راضی ہو گئے۔ یہاں تک کہ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا نے بھی مجبوراً تقسیم کو تسلیم کر لیا۔

تقسیم ہی میں ہندستان کے سیاسی مسائل کا حل نظر آیا۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔ ساری قومی روایت، تاریخی اور جذباتی وابستگی اس فیصلہ کو قبول کرنے سے پس و پیش کرتی تھی۔ فرقہ واریت کے خلاف طویل جنگ بے سود ہو رہی تھی اور دماغ و دل کی دنیائیں ہلی جا رہی تھیں لیکن اس راہ کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں رہ گئی تھی کیونکہ آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قیمت بھی دینا گوارا تھا۔ کانگریس نے خطرہ مول لیا اور بدرجہ مجبوری خطرہ مول لیا۔ مولانا نے بھی ایک ضبط پسند رُکن کانگریس کی حیثیت سے اس جماعتی فیصلہ کو قبول کیا۔ اُن کے دل میں کانٹا ضرور کھٹکتا رہا۔ پھر بھی وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو دل کی اس کھٹک کو رائی کا پہاڑ بناتے۔ یہ بالکل ہی غیر جمہوری طریقہ ہوتا۔ جب جمہور نے ایک فیصلہ، بادل ناخواستہ ہی سہی، ملک کے مفاد آزادی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کرلیا تو مولانا نے بھی اس فیصلہ کے آگے سر جھکایا۔

ملک کی تقسیم سے پہلے جیسا کہ میں شروع میں بھی اشارہ کر چکا ہوں، حکومت برطانیہ نے گفت وشنید کے ایک باب کا آغاز کیا تھا۔ چونکہ یہ دور مولانا کی صدارت کانگریس کا دور تھا اس لیے گفت وشنید کو کامیابی سے آگے بڑھانے کی ذمہ داری مولانا ہی کے سر پر آ پڑی۔ ایک طرف برطانیہ کے بہترین سیاسی دماغ تھے اور دوسری طرف مولانا۔ اس جگہ مولانا کی سیاسی سوجھ بوجھ، اصابت رائے اور قوت فیصلہ کی داد نہ دینا ناممکن ہے کہ انھوں نے مذاکرات میں تن تنہا حصہ لیا اور کانگریس اور ملک کے نقطہ نظر کو اس انداز سے پیش کیا کہ مخالف اور موافق سب لوہا مان گئے۔ یہاں تفصیلات میں جانے کا تو موقع نہیں ہے لیکن یہ گفت وشنید جس پس منظر میں شروع ہوئی اُس کا اعادہ ضروری ہے۔

۱۹۳۹ء ہی میں جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے اور کانگریس نے اجلاس تری پورہ (مارچ ۱۹۳۹ء) میں برطانیہ کی اُس خارجی پالیسی سے علاحدگی کا اعلان کر دیا تھا جس کے ماتحت برطانیہ ہمیشہ فسطائی طاقتوں کا ساتھ دیتا رہتا تھا اور جمہوریتوں کا گلا گھونٹتا تھا۔ کانگریس فسطائیت اور شہنشاہیت دونوں سے بیزار اور امن وآزادی کی ہواخواہ تھی۔ گاندھی جی عدم تشدد کے حامی تھے اور ساری دنیا کے جنگ دشمن اُن کی طرف نظریں جمائے تھے۔ گاندھی جی اس بات پر بار بار زور دیتے تھے کہ ہندستان کو جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ وہ تو یہاں تک کہتے

تھے کہ اگر جنگ میں شریک ہو کر آزادی ملے تو وہ اُس کو بھی پسند نہیں کرتے لیکن کانگریس کے ارباب حل وعقد میں مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کے مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ سامراج فسطائیت اور نا تسیت کا ایک کیمپ بن گیا ہے اور جمہوریتوں کا دوسرا۔ ایسی حالت میں آزاد ہند کو جمہوریتوں کا ساتھ دینا چاہیے، لیکن اگر ہندستان کے پاؤں میں غلامی کی بیڑیاں پڑی رہیں تو ظاہر ہے کہ جنگ کے مساعی میں ساتھ دے کر ان بیڑیوں کو اور مضبوط کرنا تھا۔

لیکن یہاں ابھی امکانات پر سوچا ہی جا رہا تھا کہ ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور وائسرائے نے ہندستان کو رائے عامہ کے استصواب کے بغیر ہی جنگ میں جھونک دیا۔ اس کے بعد آرڈیننس وغیرہ بنا دیے گئے اور صوبوں کی محدود خود مختاری محدود کر دی گئی۔ چنانچہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ایک طویل تجویز پیش ہو کر پاس ہوئی:

> ''اگر جنگ کا مقصد موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنا اور سامراجی مقبوضات، نو آبادیات اور خصوصی مفادات و مراعات کا باقی رکھنا ہے تو ہندستان کو اس جنگ سے کوئی سروکار نہیں ہے، لیکن اگر جمہوریت اور عالمی جمہوری نظام کے قیام کا سوال ہے تو ہندستان قدرتی طور پر دلچسپی رکھتا ہے۔ آج آزادی نا قابل تقسیم ہے اور سامراج بالادستی کو برقرار رکھنے کی جو کوشش بھی دنیا کے کسی حصے میں ہوگی اس سے لامحالہ نئی تباہی آئے گی۔''

اس تجویز میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا گیا بلکہ گفت و شنید کا دروازہ کھلا رکھنے کے لیے پہلے برطانوی حکومت سے مقاصد جنگ کے اعلان کا مطالبہ کیا گیا تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ جمہوریت اور نظامِ نو کے بارے میں برطانیہ کیا چاہتا ہے اور خود ہندستان پر اس جمہوریت اور نئے نظام کا کہاں تک اطلاق ہوتا ہے۔ کیا ہندستان میں بھی سامراج کا خاتمہ ہوگا اور آزاد حکومت قائم ہوگی۔ تجویز میں کہا گیا تھا:

''اعلان کی کسوٹی دراصل حالات موجودہ میں اس پر عمل درآمد ہی ہے
کیوں کہ حال ہی سے آج کے اقدامات کی تشکیل اور مستقبل کی تعیین
ہوگی۔ خطرہ بڑھتا جارہا ہے اور تشدد اور تشدد کے خطرات کا سایہ ساری
دنیا پر پھیل چکا ہے۔ اگر اسے روکا اور ختم نہ کیا گیا تو ازمنہ سابقہ کی
ساری قیمتی وراثت برباد ہو کر رہ جائے گی۔ اس بھیانک خطرے کا
یورپ اور چین میں سدباب کرنا ہے لیکن اس کا اُس وقت تک خاتمہ
نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے بنیادی اسباب یعنی فسطائیت اور
سامراج کا خاتمہ نہیں کیا جاتا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ورکنگ
کمیٹی اپنا پورا تعاون دینے کو تیار ہے۔''

اسی نازک زمانے میں کانگریس کی صدارت کا چناؤ ہوا اور مولانا آزاد، ایم این رائے کے مقابلے میں منتخب ہو گئے اور نئی ورکنگ کمیٹی بنی جس میں جواہر لال بھی شامل ہوئے جو سبھاش بوس کے استعفیٰ کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد کی ورکنگ کمیٹی سے الگ رہے تھے۔ شمولیت جنگ کے مسئلے پر ورکنگ کمیٹی کے ممبران میں اختلافات بڑھتے گئے۔ شروع میں مولانا کے ساتھ جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راج گوپال آچاریہ اور خان عبدالغفار خاں تھے لیکن ڈاکٹر راجندر پرشاد، آچاریہ کرپلانی اور شنکر راؤ دیو، گاندھی جی کے ہم خیال تھے۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں پونہ میں اے آئی سی سی کے اجلاس میں دو رزولیوشن پاس ہوئے۔ ایک میں اعلان کیا گیا کہ حصولِ آزادی کے لیے کانگریس عدم تشدد ہی کے طریق کار کو اپنائے رہے گی۔ دوسری تجویز میں کہا گیا تھا کہ جمہوریت اور نازیت کی جنگ میں ہندستان کی جگہ جمہوری کیمپ ہی میں ہے لیکن جب تک آزادی نہ ملے، ہندستان کا جنگی مسائل میں تعاون ناممکن تھا لیکن اس سے معاملات طے نہیں ہوئے بلکہ بالخصوص دوسرے رزولیوشن کے پاس ہو جانے پر گاندھی جی کے ہم خیال ممبران کانگریس نے اپنا استعفیٰ ہی مولانا کے پاس بھیج دیا۔ صرف جواہر لال نہرو، آصف علی، راج گوپال آچاریہ اور ڈاکٹر محمود، مولانا کے ہم خیال رہ گئے لیکن چوں کہ فوری طور پر جنگ میں بھی شرکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے استعفیٰ بھیجنے والے ممبران

بھی مولانا کے کہنے پر ورکنگ کمیٹی سے فوری طور پر علاحدہ نہیں ہوئے۔

اگست ۱۹۴۰ء میں برطانیہ نے گفت وشنید کی طرف پہلا جھجکتا قدم اُٹھایا اور وائسرائے نے مولانا کو اس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا کہ وائسرائے کی اگزیکیوٹیو کاؤنسل میں توسیع کردی جائے ورکانگریس بھی شریک حکومت ہو جائے۔ مولانا نے اپنے معاونین کار کے استمزاج کے بغیر ہی یہ پیشکش ٹھکرا دی کیوں کہ کانگریس کے مطالبہ آزادی اور کاؤنسل کی توسیع میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔

یہاں سلسلۂ واقعات کو باقی رکھنے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ گاندھی جی اس کے پہلے وائسرائے سے مل چکے تھے اور اس کے بعد بھی وائسرائے سے ملے لیکن اُن کا مقصد ہی اور تھا۔ وہ یہ کہتے جاتے تھے کہ برطانیہ اسلحوں کے بجائے روحانی طاقت سے جرمنی کا مقابلہ کرے۔ انھوں نے برطانوی پبلک کے سامنے ایسی تجویز بھی دوبار رکھی لیکن جنگ کے دوران میں ہتھیار ڈالنے کی بات کون سنتا!

وائسرائے کی تجویز سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اس وقت برطانیہ آزادی کی بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے جنگ میں تعاون وعدم تعاون کی بحث صرف نظری رہ گئی تھی اور اب کسی نئی تحریک کی بات سوچی جانے لگی تھی کیونکہ جب دنیا اُتھل پتھل ہو رہی ہو تو کوئی زندہ سیاسی جماعت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ مسئلہ یہی تھا کہ ہندستان کو اُس کی مرضی کے خلاف جنگ میں کیوں جھونک دیا گیا۔ اس پر کانگریس کی دونوں ہی جماعتیں متفق تھیں کہ یہ صریحی زیادتی ہے۔ اس لیے اس کے خلاف احتجاجاً مہاتما گاندھی نے ''انفرادی سول نافرمانی'' کا آغاز کیا۔ مولانا اس تحریک میں حصہ بذاتہٖ نہیں لے پائے تھے کیوں کہ وہ اس تحریک کو چلانے میں مصروف تھے لیکن حکومت کب چوکنے والی تھی۔ وہ پنجاب سے واپس آ رہے تھے کہ الٰہ آباد اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے وقت مولانا نے ''انفرادی ستیہ گرہی بننے سے پہلے ہی گرفتاری کے مخصوص اعزاز'' پر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ گرفتاری کے بعد دو برس کی سزا ہو گئی۔

جنگ اور نازک صورت حال اختیار کرتی گئی۔ جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کر

دیا اور ۱۹۴۱ء ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ جاپان نے پرل ہاربر پر دھاوا بول دیا۔ اب امریکہ بھی براہ راست جنگ میں آ گیا اور حقیقی معنوں میں عالمگیر جنگ ہوگئی۔ جاپان کو ابتدا میں جلد جلد کامیابیاں ہوئیں اور سنگاپور اور ملایا کی فتح کے بعد برما کے آزادی سے محروم ہو جانے کا مطلب یہ ہوگیا تھا کہ جنگ خود ہندستان کی سرحدوں تک آ پہنچی تھی۔ صدر روزولٹ نے برطانیہ پر زور ڈالنا شروع کیا کہ ہندستان سے معاملات طے کر کے ہندستان کے عوام کو بھی مساعی جنگ میں تہہ دل سے شریک ہونے کا موقع دے۔ خود برطانیہ نے خطرہ کو محسوس کیا ہی ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ چینی لیڈر بھی ہندستانی آزادی کے خواہاں تھے۔ بہرحال جو بھی محرکات رہے ہوں، حکومت نے مولانا اور پنڈت جواہر لال نہرو کو دسمبر ۱۹۴۱ء میں رہا کر دیا۔

اسی دوران میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ سبھاش چندر بوس جو جنگ کی ابتدا ہی سے مساعی جنگ کی کھلم کھلا مخالفت کی پاداش میں قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے یکایک ہندستان سے خفیہ طور پر نکل گئے اور جرمنی اور جاپان سے آزادئ ہند کی مہم چلانے لگے۔ اُن کی غیبت کا پتا پہلے پہل ۱۹۴۱ء کے یوم آزادی کو چلا۔ مارچ ۱۹۴۲ء سے اُن کی تقریریں برابر براڈ کاسٹ ہونے لگیں۔ جرمنی، جاپان، اٹلی سے ہندستانی میں نشریات بڑے التزام سے ہونے لگے۔ ملک میں ایک طرف گرفتاریوں اور ظلم و تشدد کا سلسلہ جاری تھا اور دوسری طرف سبھاش بوس کی کارگزاریاں اور خود جنگ کی نوعیت نے مل جل کر ہندستان کے عوام کو برطانیہ سے بے حد متنفر کر دیا تھا اور خود کانگریس میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو برطانیہ کی شکست تک کا تصور کرنے لگا تھا۔ امریکہ متاثر تھا ہی، چین جو ہمارا اہم سرحد بھی تھا، کچھ اور بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ سپہ سالار چیانگ کائی شیک اور ان کی اہلیہ فروری ۱۹۴۲ء میں ہندستان آئے اور یہاں کے ارباب بست و کشاد سے ملے۔ ان کی گفت و شنید سے یہ اندازہ ہوا کہ اُن کے خیال میں خاتمہ جنگ کے بعد ہندستان کو آزادی مل جائے گی۔ البتہ اُن کے نزدیک مکمل آزادی کی بجائے ڈومی نین اسٹیٹس کے قبول کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو مخصوص طور سے چیانگ کائی شیک سے ملے۔ مولانا نے صدر کانگریس کی حیثیت سے کہا کہ اگر دورانِ جنگ میں ڈومینین اسٹیٹس مل جائے اور اس کا یقین دلایا جائے کہ ہندستانی نمایندوں کو آزادانہ

اور ذمے دارانہ کام کرنے کا موقع ملے گا تو برطانوی تعاون کی پیشکش کانگریس کے لیے قابل قبول ہوگی۔ چیانگ کائی شیک کے اس کہنے پر کہ دوران جنگ میں سو فیصدی ذمے داری دینا تو شاید برطانیہ کے لیے ممکن نہ ہو، مولانا نے کہا کہ ''اصل سوال جنگ کے خاتمہ کے بعد آزادی کا ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے اور عملاً اس کے بروے کار آنے کا یقین ہو جائے تو دورانِ جنگ کے لیے ایسی شکل نکل سکتی ہے جو برطانیہ اور ہندستان دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔''

چیانگ کائی شیک ایک اہم اتحادی نمایندے اور چار بڑوں میں شامل تھے۔ خود ہندستان میں وہ حکومت ہند کے مہمان تھے۔ اُن کا آنا جس مقصد سے تھا وہ برطانوی حکومت کے علم میں تھا، اس لیے چیانگ کائی شیک نے ساری گفتگو ضرور ہی برطانیہ کے کانوں تک پہنچائی ہوگی اور میرا خیال ہے کہ اس گفتگو سے کافی برف پگھلی، کیوں کہ دنیا کو معلوم ہوگیا کہ اگرچہ مہاتما گاندھی عدم تشدد کے فلسفے سے دم بھر کے لیے بھی دست بردار نہیں ہو سکتے، لیکن کانگریس من حیث الجماعت بشرطہا وشروطہا مساعی جنگ میں حصہ لینے سے گریز نہیں کرے گا۔ اب برطانوی پروپیگنڈے کے لیے اتحادی کیمپوں میں بھی گنجائش نہیں رہ گئی اور اسی لیے وہ کانگریس سے گفت وشنید کا آغاز کرنے پر مجبوری ہوئی۔ غالباً جو چیز اور بھی معاون ہوئی وہ یہ تھی کہ برطانوی مدبر، سر اسٹیفورڈ کرپس، آغازِ جنگ کے بعد ہندستان آئے تھے اور یہاں کے مختلف قائدوں سے ملے تھے جس میں مولانا بھی شامل تھے۔ اُس وقت بھی یہ امر معلوم تھا کہ مہاتما گاندھی اس بات پر کسی طرح رضامند نہیں تھے کہ ہندستان جنگ میں شریک ہو لیکن مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور دوسرے قائدین کا یہ خیال بھی عام ہو چکا تھا کہ اگر ذمے داری حقیقی طور پر دی جائے تو ہندستان مساعی جنگ کو آگے بڑھانے میں پورا حصہ لے گا۔ کرپس نے مولانا سے براہِ راست یہ سوال کیا تھا کہ کیا مہاتما گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود کانگریس نہرو، آزاد طرزِ خیال اپنا لے گی۔ مولانا نے یقین دلایا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ غرض، اندرونی اور بیرونی طور پر ضرور ایک ایسی فضا تیار ہوگئی تھی جس میں برطانوی رجعت پسندوں کے لیے مزید حیلہ بازی ممکن نہیں تھی۔

غرض مارچ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ کی جانب سے سر اسٹیفورڈ کرپس ہندستان آئے

اور اپنے ہمراہ برطانوی کابینہ کی تجویز بھی لائے۔ ۲۹ر مارچ ۱۹۴۲ء کو مولانا آزاد اور کرپس کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی۔ کرپس کی لائی ہوئی پیشکش کا خلاصہ یہ تھا کہ دوران جنگ میں موجودہ وائسرائے کونسل مستعفی ہو جائے گی اور اس کی جگہ خالص ہندستانی کونسل بنے گی جس کو ہندستان کی سیاسی پارٹیاں تشکیل دیں گی۔ برطانوی حکومت یہ اعلان کرے گی کہ جنگ کا خاتمہ ہوتے ہی ہندستان کی آزادی کے مسئلے پر غور ہوگا۔ ویسے ایک آئین ساز اسمبلی کو مستقبل کے بارے میں ایسا آئین تیار کرنے کے اختیارات دینے کا بھی ذکر تھا جس کے ماتحت ہندستان کے مختلف صوبوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے ہندیونین میں شامل ہوں چاہے علاحدہ رہیں۔ مولانا نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا تھا اور یہ اجلاس مذاکرات کے خاتمہ تک جاری بھی رہا۔ ۲۹ر مارچ سے ۱۱ر اپریل تک گفت وشنید ہوتی رہی۔ شروع سے ایک بنیادی مسئلہ یہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا کہ یہ کاؤنسل ایک کابینہ کی طرح کام کرے گی یا نہیں یعنی وائسرائے کو صرف ایک آئینی سربراہ کی حیثیت ہوگی یا اس سے زیادہ؟ ضمنی طور پر یہ سوال بھی اہم بن گیا کہ ممبر دفاع کے اختیارات کیا ہوں گے؟ کیا دفاع کی ساری ذمے داری کمانڈر ان چیف پر ہوگی اور اگر ہوگی تو دفاع کی پالیسیوں کی تشکیل وغیرہ میں اور جنگی مساعی کو آگے بڑھانے میں ممبر دفاع شریک مشورہ رہے گا یا نہیں؟ خود انڈیا آفس کا سوال بھی تھا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو وہی اہمیت حاصل ہوگی جو کامن ولتھ سکریٹری کو ہے یا اس کے اعلیٰ اختیارات کا سایہ بدستور کاروبار حکومت پر پڑتا رہے گا؟ پہلی ملاقات کافی اُمید افزا تھی اور اسٹیفورڈ کرپس نے مولانا کے ذہن پر یہ نقش چھوڑنا چاہا تھا کہ دوران جنگ میں تفصیلی آئینی تبدیلیاں تو ممکن نہیں ہیں لیکن عملی طور پر یہ حکومت اُسی طرح چلے گی جیسے آئینی جمہوری حکومتوں کو چلنا چاہیے، یعنی اصلی اختیار کابینہ کے پاس ہوگا جس کے مشوروں پر وائسرائے، کمانڈر انچیف اور انڈیا آفس سبھی چلیں گے لیکن بعد میں خود وائسرائے کے رجعت پسند مشیروں اور رجعت پسند برطانوی سرکار کے دباؤ میں آکر کرپس کو رنگ بدلنا پڑے اور ''چنیں وچناں'' میں بات چیت ہونے لگی۔ اس کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ کانگریس کافی آگے جانے کو تیار ہوگئی تھی اور اس میں پنڈت نہرو کا بہت بڑا حصہ تھا۔ کیوں کہ وہ اس جنگ کے فسطائیت دشمن پہلو کو بخوبی

دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ مگر برطانیہ کے رجعت پسند ہندستان کو باقاعدہ ذمے داریاں دیتے ڈرتے اور ہچکچاتے تھے اور چرچل کا خیال تو معلوم ہی تھا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے کریا کرم کی صدارت کرنے کے لیے وزیر اعظم نہیں ہوئے تھے۔ غرض مذاکرات ناکامیاب رہے لیکن مولانا نے اس خوبی سے بات چیت کو آگے بڑھایا تھا کہ کوئی تلخی پیدا نہ ہونے پائی۔

جن امور پر ہندو برطانیہ میں اختلاف ہوا تھا اگرچہ اس کا تعلق براہِ راست برطانوی پس وپیش سے تھا لیکن اُس میں صوبوں کی علاحدگی کا سوال بھی آ گیا تھا۔ کانگریس کسی حصے کو یونین میں اُس کی مرضی کے خلاف رکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ حالات ایسے پیدا کیے جائیں کہ مختلف علاقے اور حصے باہم دگر مل کر رہنے اور وحدت قومی کو باقی رکھنے کی بات سوچیں۔ کرپس کی پیشکش کے مان لینے کے معنی یہ تھے کہ ایسا موقع ملے بغیر پہلے ہی سے انھیں حق علاحدگی دے دیا جائے۔ آپس میں مل جل کر کام کرنے کا کوئی موقع نہ دینا، یہاں کے رجعت پسندوں اور تقسیم پروروں کو گڑبڑ پیدا کرنے کی آزادی دینے کے مترادف تھا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ آزادی کے راستے میں صاف یہی روڑا ہے کہ مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان مان نہیں لیا جاتا۔ ان میں راج گوپال اچاریہ آگے آگے تھے۔ انھوں نے تو اپنے اس اختلاف کو پبلک بھی بنا دیا اور مدراس کانگریس لیجسلیچر پارٹی میں اس مفہوم کا رزولیوشن بھی پاس کر دیا کہ اگر حق علاحدگی کا تسلیم نہ کرنا، قومی حکومت کی تشکیل میں مانع ہے تو اسے بلا تامل تسلیم کر لینا چاہیے کیوں کہ دو شروں (غلامی اور علاحدگی) میں یہ کمتر شر ہے۔ مولانا نے اس پر صدر کانگریس کی حیثیت سے راج گوپال آچاریہ سے باز پرس کی۔ وہ اپنی رائے پر اڑے رہے اور بالآخر ورکنگ کمیٹی سے مستعفی بھی ہو گئے۔ بہر حال اُن کی طرزِ فکر کے لوگ کانگریس میں کم ہی تھے کیوں کہ اپریل کے آخر میں الہ آباد میں جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اس میں ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی تصدیق کر دی گئی۔

اسی زمانے میں ہندستان پر جاپانی حملے کا خطرہ بڑھ گیا تھا اور حکومت یہ تیاریاں کرنے لگی تھی کہ اگر ایسا حملہ ہو تو وہ کس تنظیم کے تحت پسپا ہو گی۔ یہاں تک کہ حملہ ہو جانے کے بعد پلوں کو اُڑانے اور کارخانوں وغیرہ کے برباد کر دینے کے منصوبے بھی بنائے گئے۔ ملک میں

ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو جاپانی فتوحات سے خوش تھا۔ کانگریس نے صاف صاف بتا دیا تھا اور مولانا نے الٰہ آباد کے اجلاس کل ہند کانگریس کمیٹی میں کھلے طور پر اعلان کر دیا تھا کہ جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جائے گا کیوں کہ ایک کی غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی کچھ لوگوں کا دماغ ناصاف تھا۔ اس کی مزید وضاحت ضروری تھی اور خود حملے کے خطرے کا مقابلہ کرنے کی تیاریوں کا سوال تھا لیکن یہ سب سوال ثانوی حیثیت اختیار کرنے لگے کیوں کہ کرپس مشن کی ناکامی سے ہندستانیوں کے دل و دماغ کو شدید ضرب پہنچی تھی اور لوگ غم و غصے میں جوابی کارروائی کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ خود کانگریس کے لیے بھی یہ ناممکن تھا کہ مذاکرات کی ناکامی کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے۔ مہاتما گاندھی بھی اب ایک عوامی تحریک کے آغاز کے بارے میں سوچنے لگے تھے اور انھوں نے ''ہندستان چھوڑ دو'' کی تحریک کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں تیار بھی کر لیا تھا۔

۵ر جولائی ۱۹۴۲ء کو جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے مولانا واردھا پہنچے تو گاندھی جی نے پہلے پہل مولانا سے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کا تذکرہ کیا۔ ویسے تو شروع جنگ سے وہ تحریک چلانے کے خواہشمند تھے لیکن گاندھی جی اس وقت کسی تحریک کے لیے آمادہ نہیں تھے اور اب جب گاندھی جی تحریک چلانے کی بات سوچنے لگے تو ابوالکلام آزاد پس و پیش میں پڑ گئے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ جب جاپان ہندستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہو اُس وقت حکومت برطانیہ کسی تحریک کو برداشت نہیں کرے گی اور سب لیڈر جیلوں میں بند کر دیے جائیں گے اور پھر خدا جانے تحریک کیا رنگ اختیار کرے۔ مہاتما جی کے بعض رفقا کا خیال یہ تھا کہ دشمن کے دروازے پر موجود ہونے کی وجہ سے شاید حکومت برطانیہ کوئی عاجلانہ اقدام نہ کرے اور تحریک کو باقاعدہ اور منظم طور پر چلانے کا موقع مل جائے۔ ان اختلافات نے یہاں تک طول کھینچا کہ گاندھی جی نے مولانا کو یہ خط لکھ بھیجا کہ دونوں میں اختلاف اتنے بڑھ گئے ہیں کہ دونوں کا ایک ساتھ مل کر کام کرنا ناممکن ہو گیا ہے اور یہ خط پا کر مولانا استعفیٰ دینے پر تیار ہو گئے لیکن پھر سردار پٹیل نے گاندھی جی پر زور ڈالا کہ معاملات کا اس حد تک جانا بالکل ہی نامناسب ہے۔ مہاتما گاندھی کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ یہ محسوس کر لیتے تھے کہ بڑھا ہوا قدم

پیچھے ہٹا لینا چاہیے تو وہ پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن صبح کو انھوں نے مولانا کو بتایا کہ وہ اُس خط کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ عظمت کردار کی یہ نمایاں مثال تھی جو گاندھی جی نے پیش کی۔ چونکہ اختلافات اصولی تھے اس لیے صفائی بھی جلد ہوگئی۔ بہر حال یہ طے ہو گیا تھا کہ تحریک چلانا ہی پڑے گی اور باقاعدہ بحث و مباحثہ کے بعد ورکنگ کمیٹی نے رزولیوشن پاس کیا جو بعد میں ''ہندوستان چھوڑو تجویز'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس رزولیوشن میں صاف لفظوں میں کہا گیا تھا کہ جب تک برطانوی اقتدار کا ہندستان سے خاتمہ نہیں ہوتا اُس وقت تک مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ یہ رزولیوشن سابقہ تجویزوں کے مقابلے میں ذرا گرم تھا پھر بھی اس کی تشکیل اس نوعیت سے کی گئی تھی کہ اگر حکومت تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہے تو کانگریس بھی آگے بڑھ سکتی تھی۔ آخری فیصلہ ۷/اگست کو ہونے والے کل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ہونا تھا۔

۱۴/جولائی اور ۷/اگست کے مابین تین ہفتے کا وقفہ تھا اور اگر حکومت برطانیہ میں عملی دوراندیشی ہوتی تو وہ نتائج مابعد کو بچا سکتی تھی اور گفت و شنید کا آغاز کر کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہندستان میں بھی اور برطانیہ میں بھی حکومت کی باگ ڈور رجعت پسندوں اور تقسیم پسندوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے مصالحت کے دروازے جو پہلے ہی سے بند ہو چکے تھے اس رزولیوشن کے پاس ہو جانے کے بعد اور بھی زور سے بند کر لیے گئے۔ حد یہ ہے کہ میرا بہن (سابق مس سٹینڈ، ایک برطانوی امیرالبحر کی صاحبزادی) جو بھولا بھائی ڈیسائی کے کہنے پر وائسرائے سے ملنا چاہتی تھی، کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وائسرائے نے ملنے سے انکار کر دیا اور اُن کے پرائیویٹ سکریٹری بھی ملے تو انھوں نے حکومت کا یہی منشا ظاہر کیا کہ حکومت ایسی جماعت کے کسی نمائندے سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی جو بغاوت کی بات کرتی ہو۔ یہ بات عیاں ہوگئی تھی کہ امتحان دار و رسن پھر سر پر آ گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ سامراجی تشدد کا ننگا ناچ کس نہج سے ہونے والا تھا۔ آخرکار وہ ۷/اگست بھی آ گئی اور ''ہندوستان چھوڑو تجویز'' پیش ہو کر ۸/اگست کی شام کو پاس ہوگئی۔ یہ رزولیوشن ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ حکومت نے تمام انتظامات پہلے

ہی سے مکمل کر لیے تھے۔ ۹/ اگست کی صبح کو مہاتما گاندھی اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران اور صوبوں کے لیڈر بھی گرفتار کر لیے گئے۔ گاندھی جی اور مسز نیڈو کو آغا خاں پیلس، پونا میں اور مولانا آزاد اور دوسرے ممبران ورکنگ کمیٹی کو قلعہ احمد نگر میں قید کر لیا گیا۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک نے سارے ملک میں ایک برقی رو دوڑا دی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بغاوت کے لیے فضا تیار تھی۔ یکا یک لیڈروں کی گرفتاری اور پھر شدید تشدد کے مظاہروں نے تحریک کا رُخ ہی موڑ دیا۔ گاندھی جی اور کانگریس اس کو بالکل ہی عدم تشدد کے اصولوں پر چلانا چاہتے تھے لیکن جب وحشیانہ ظلم وستم کے شعلے حکومت نے بھڑکا دیے تو کانگریس لیڈروں کی عدم موجودگی میں تحریک بھی تشدد کے راستے پر جا پڑی۔ بنگال، بہار، یوپی اور بمبئی میں تحریک کا بڑا زور رہا۔ جو کچھ ہوا وہ ابھی تک حافظوں میں تازہ ہے اور اس کے اعادہ کی ضرورت اس لیے بھی نہیں ہے کہ یہ زمانہ آزاد کی قید و بند کا زمانہ ہے۔

اس عرصے میں چند واقعات ایسے ضرور ہیں کہ اُن سے جیل کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے بھی متاثر ہونا ناممکن تھا۔ ۱۹۴۳ء کے آغاز میں مہاتما گاندھی نے اپنی نظر بندی ہی میں ۲۱ دن کے برت کا اعلان کیا۔ گاندھی جی کی صحت اس زمانے میں کافی گر گئی تھی۔ پھر بھی حکومت نے انھیں رہا نہیں کیا۔ گاندھی جی یہ امتحان جھیل گئے لیکن وہ بہت ہی کمزور ہو گئے تھے اور اسی بنا پر اُن کو ۱۹۴۴ء میں رہا بھی کر دیا گیا۔ مسز نیڈو بھی علالت کی بنا پر رہا ہو چکی تھیں۔ گاندھی جی ہی نے رہائی کے چند ہی دنوں بعد ایک طرف تو جناح صاحب سے خط وکتابت شروع کر دی اور دوسری طرف انھوں نے نیوز کرانکل کو ایک بیان بھی دیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر ہندستان آزاد ہو جائے تو وہ مساعی جنگ میں حصہ لے سکتا ہے۔ گاندھی جی ہندستان کی آزادی کے لیے اپنے طرزِ فکر میں تھوڑی سی عملی لچک پیدا کر لیا کرتے تھے۔ آزادی اُن کے محبوب ترین مقاصد میں تھی بالکل اسی طرح جیسے اور روحانی اور اخلاقی اقدار کا حصول!

جنگ کا نقشہ بدلتا جا رہا تھا اور اب اتحادیوں کو اپنی فتح سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس لیے اب برطانیہ یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتا تھا کہ جنگ نازک دور میں ہے اور ہندستانیوں کے شانوں پر جنگ کی ذمے داریاں نہیں رکھی جا سکتیں۔ اس کے علاوہ اب برطانیہ کے لیے امریکہ کے

مشوروں کو ٹھکرانا ناممکن ہو گیا تھا اور صدر روز ولٹ کو ہندستانی عزائم سے جو دلچسپی تھی اُن کا بھی ذکر ہو چکا ہے۔ غرض تمام حالات نے مل ملا کر لارڈ ویول، وائسرائے ہند کے سفر انگلستان کے لیے مئی ۱۹۴۵ء میں فضا ہموار کی۔ وہاں سے واپسی پر شملہ کانفرنس کی تیاریاں ہونے لگیں اور جون میں مولانا رہا کر دیے گئے اور ساتھ ہی اور ممبران کمیٹی بھی۔ ان لوگوں کی رہائی کا مقصد یہ تھا کہ شملہ کانفرنس میں شمولیت کا موقع دیا جائے۔

اس گرفتاری اور رہائی کے مابین مولانا آزاد اور دوزبردست سانحوں سے دوچار ہو چکے تھے۔ ایک تو آپ کی رفیقہ حیات کی وفات اور کچھ دنوں کے بعد آپ کی ہمشیرہ کا انتقال۔

بہر حال رہائی کے فوراً بعد ہی نئی سیاسی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ۱۴ر جون کو سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مسٹر ایمری نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ہندستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے جنگ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب کی بار کانگریس اور مسلم لیگ سے حکومت بنانے کو کہا جا رہا ہے اس لیے کانگریس کو اختیار ہوگا کہ وہ کسی کو بھی (جس میں مولانا آزاد شامل ہیں) اپنا نمائندہ منتخب کرے۔ اس سے پتا چل رہا تھا کہ برطانوی حکومت کے رویے میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ آزاد کی رہائی کے دوسرے ہی دن اُن کو وائسرائے کی جانب سے گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش ہوا اور مولانا کانگریس کی جانب سے نمائندہ منتخب ہوئے۔ یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اگر چہ سیاسی امور میں برطانوی حکومت اور کانگریس کے درمیان فاصلہ کم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا لیکن مسٹر جناح نے یہ رویہ اختیار کیا کہ صرف وہی مسلمان لیے جائیں جنھیں مسلم لیگ نامزد کرے اور دوسری کوئی جماعت مسلمانوں کو نامزد نہ کرے۔ اس طرح کانفرنس ناکام ہو گئی۔ جناح صاحب مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کے صدر تھے اور اس کوشش میں تھے کہ کانگریس کو بھی وہ اسی فرقے وارانہ سطح پر لے آئیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کانگریس اپنی قدیم روایات اور اپنے قومی کردار سے کسی شکل میں بھی دستبردار نہیں ہو سکتی لیکن وہ کارواں کا راستہ تو روک ہی سکتے تھے۔ اس کانفرنس میں بھی مولانا نے ایسی بیدار مغزی سے مذاکرات میں حصہ لیا کہ مسلم لیگ کی بے جا ضد اور وطن دشمن ہٹ دنیا پر واضح ہو گئی۔

سن بیالیس کے اندولن اور بعد کے واقعات نے سارے ملک کی ذہنی ساخت بدل دی تھی۔ خوف وہراس کی جگہ ایک نئے ارادے اور ہمت نے لے لی تھی۔ اس کا نمایاں ترین پہلو یہ تھا کہ پولیس اور فوج میں جذبہ قومی از سرنو پھیل گیا۔ آزاد ہند فوج کے مقدمے اور بحریہ کے جانبازوں کے مظاہرات نے یہ بات برطانیہ پر بالکل صاف کردی تھی کہ اب ہندستان کو آزاد کردینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا ہے اور چوں کہ برطانیہ میں مزدور پارٹی برسراقتدار آ چکی تھی اس لیے وہاں کا حکمران طبقہ ماضی کو بھول جانے اور از سرنو مسائل کے سلجھانے کے حق میں تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جو بعد میں پارلیمانی وفد اور کابینہ مشن کی آمد کا باعث ہوا۔

معاملات کو سلجھانے اور مذاکرات کو فائدہ بخش نتائج تک پہنچانے میں مولانا کو جو ید طولیٰ حاصل تھا اُس کا مظاہرہ ایک بار اور ہوا۔ پنجاب میں مسلم لیگ اور وہاں کا گورنر دونوں کوشاں تھے کہ وہاں لیگ کی وزارت قائم ہو جائے لیکن خضر حیات خاں ٹوانہ اور کانگریس کے مابین مولانا نے مفاہمت کرادی اور لیگ کی بجائے ٹوانہ اور کانگریس کے تعاون سے غیر لیگی وزارت قائم ہوگئی۔ اس کا سارے ملک نے اعتراف کیا کہ مولانا نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ مفاہمت کرائی ہے۔ اسی دوراندیشی کا مظاہرہ آزاد نے کابینہ مشن سے مذاکرات کے وقت بھی کیا۔

مزدور حکومت معاملات کو نئے انداز سے جانچ رہی تھی۔ چنانچہ ۴۶-۱۹۴۵ء کے موسم سرما میں ایک پارلیمانی وفد حالات کا جائزہ لینے کے لیے ہندستان آیا اور مولانا آزاد سے کانگریس کے رویے اور ملک کے عام رجحان وغیرہ پر گفتگو کی۔ وفد یہاں سے یہ تاثر لے کر گیا کہ حالات بدل چکے ہیں اور بھارت کو پابہ زنجیر رکھنا اب ناممکن ہے۔ پھر کابینہ مشن، جو سر اسٹیفورڈ کرپس، لارڈ پیتھک لارنس اور مسٹر اے وی الیگزینڈر پر مشتمل تھا ۲۹ رمارچ کو وارد ہندستان ہوا۔ مذاکرات کافی دنوں تک ہوتے رہے۔ بالآخر ۱۶ رمئی کو کابینہ مشن نے اپنی تجاویز پیش کیں جس کے ماتحت مرکزی حکومت کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسائل کے اختیارات رہنے والے تھے۔ یہ خود مولانا آزاد کی پیش کردہ تجویز تھی جسے کانگریس کی پوری حمایت حاصل تھی لیکن کابینہ مشن نے سارے ملک کو تین علاقوں میں تقسیم کردیا۔

(الف)، (ب)، (ج) علاقہ (ب) میں پنجاب، سندھ، سرحد اور برطانوی بلوچستان شامل تھے۔ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ علاقہ (ج) میں بنگال اور آسام تھے، جہاں مسلمانوں کی خفیف سی اکثریت تھی۔ اگرچہ ہند کے علاقوں میں تقسیم کانگریس کو ناپسند تھی لیکن کابینہ مشن کی تجویز میں وحدت ہند کو وفاقی شکل میں باقی رکھا گیا تھا۔ مسلم لیگ نے تھوڑے تامل کے بعد اسے منظور کرلیا کیوں کہ جناح صاحب کے لفظوں میں اس سے زیادہ ملنا ناممکن تھا۔ کانگریس نے بھی ۶ر جون کو کابینہ مشن کی تجویز سے اتفاق کا رزولیوشن پاس کردیا، اگرچہ علاقائی تقسیم کے علاوہ اس تجویز میں عارضی حکومت کی جو تجویز مشن نے پیش کی تھی اُس سے کانگریس متفق نہیں تھی۔ مشن کی تجویز میں آئین ساز اسمبلی کی تشکیل بھی شامل تھی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۷ جولائی ۱۹۴۶ء میں کابینہ مشن کی تجویز منظور کرلی گئی اور یہیں سے پنڈت جواہر لال نہرو کی تازہ صدارت کانگریس کا آغاز ہوا۔ اس میں شک نہیں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک کا وقفہ ہماری تاریخ آزادی میں بے حد اہم رہا ہے اور اس ساری مدت میں مولانا آزاد صدر کانگریس رہے اور جیسا کہ میں ابھی مختصراً بتا چکا ہوں اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان تمام اہم واقعات کی تشکیل میں جس کی آخری کڑی کابینہ مشن کی تجویزوں کی منظوری تھی مولانا آزاد کا کتنا زبردست حصہ رہا ہے۔

بہرحال مسلم لیگ نے اپنی ۲۷ر جولائی ۱۹۴۶ء کی نشست میں کابینہ مشن کی تجویز مسترد کردی اور ۱۶ر اگست کو ''یوم راست اقدام'' کا اعلان کیا۔ حالات نے ثابت کردیا کہ یہ ''راست اقدام'' کلکتہ میں ایک شدید خونریزی کی شکل میں نمودار ہوا۔ استرداد کا سبب لیگ والوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے اس اخباری بیان کو بتایا جس میں انھوں نے اخباری نمایندوں سے یہ کہا تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں کانگریس بالکل کھلے ذہن سے جائے گی۔ مسٹر جناح نے اس کا یہ مفہوم نکالا کہ کانگریس نے صدق دل سے مشن کی تجویزوں کو منظور نہیں کیا ہے بلکہ وہ آئین ساز اسمبلی اپنی اکثریت سے اس تجویز کی بنیادی باتوں کو مسترد کردے گی۔ مولانا کی کوششوں سے ورکنگ کمیٹی نے اس کے بعد ایک تجویز پاس کی جس میں یہ کہا گیا کہ کابینہ مشن کی تجویز کو کانگریس نے غیر مشروط طور پر مانا ہے۔ اُسے اس کے بعض حصوں سے اختلاف

ضرور تھا لیکن اب جب کہ اُس نے ایک تجویز ذمے دارانہ طریقے پر مان لی ہے، تو وہ اُس پر قایم بھی رہے گی۔ لیکن زندگی میں مسٹر جناح پہلی بار راست اقدام کی باتیں سوچنے لگے تھے، انھوں نے تجویز مسترد کردی۔ ''راست اقدام'' کی جو شکل کلکتہ میں ہوئی یا نواکھالی اور بہار وغیرہ میں جو کچھ ہوا اُس کی ذمے داری سے فرقہ پسندوں کا فرار ممکن نہیں ہے۔ بنگال میں اُس وقت سہروردی وزیر اعظم تھے لیکن فوج یا پولیس نے فسادات کو فرو کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا کیونکہ اُن کو احکام یہ تھے کہ ''آمادہ رہو مگر اقدام نہ کرو''

بہر حال مسٹر جناح نے آخری وقت انکار اس لیے کیا تھا کہ اُن کے خیال میں برطانوی حکومت ان کے روڑے اٹکانے والی پالیسیوں کی اس وقت بھی حسب دستور زبردست موافقت کرے گی لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی تھا۔ بین الاقوامی اور ملکی حالات نے ایسی شکل اختیار کرلی تھی اور جنگ کے بعد کی دنیا ایسے راستوں پر چل رہی تھی کہ برطانیہ خود یہ چاہنے لگا تھا کہ ہندستان کا آزاد تعاون اُسے جس قدر جلد مل سکے اچھا ہے۔ اس لیے اب کے لیگ کو شکریہ ادا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اور چونکہ کانگریس نے کابینہ مشن کی تجویز کو کلیتاً مان لیا تھا، اس لیے وائسرائے نے ۱۲؍اگست کو جواہر لال نہرو سے وزارت قائم کرنے کو کہا۔ جواہر لال نہرو نے اتمام حجت کے لیے مسٹر جناح کو دعوت دی کہ وہ حکومت کی تشکیل میں ہاتھ بٹائیں اور پھر دونوں کے مابین ایک ملاقات بھی ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر پہلی عارضی حکومت کی تشکیل کی ذمے داری تنہا کانگریس پر عائد ہوئی جس نے مولانا آزاد، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد پر مشتمل ایک بورڈ بنادیا تھا۔ اس بورڈ نے کابینہ کے ممبران کا انتخاب کیا۔ مسلم ممبروں میں آزاد خیالات رکھنے والوں کو لیا گیا۔ مولانا آزاد سے بھی شامل ہونے کو کہا گیا لیکن انھوں نے باہر ہی رہنا مناسب سمجھا۔

لارڈ ویول شکست ماننے والوں میں نہیں تھے۔ پھر ''راست اقدام'' کے بعد حالات نے جو صورت اختیار کرلی تھی اُس کو بھی پیش نظر رکھ کر انھوں نے مسٹر جناح سے گفتگو کا آغاز کیا اور مولانا آزاد سے بھی مشورے کرتے رہے۔ کچھ قیل و قال کے بعد ۵؍اکتوبر کو لیگ نے عارضی حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور دس دن کے بعد اپنے نمایندوں کے ناموں کا اعلان کیا جس

میں جوگندر ناتھ منڈل کا بھی نام شامل تھا۔ کانگریس کی مخالفت کے جوش میں لیگ یہ بھی بھول گئی کہ اپنی پیدائش سے اُس دن تک یہی چلاتی آئی تھی کہ وہ مسلمانوں کی نمایندہ ہے اور ایک بار کانگریس سے یہ اعتراض کر چکی تھی کہ اُسے مسلم نمایندوں کے نامزد کرنے کا حق نہیں ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

لیگ کے تبدیل فیصلہ کے بعد ایک برائے نام مشترکہ عارضی حکومت وجود میں آئی۔ برائے نام اس لیے کہ لیگ یہاں صرف روڑے اٹکانے کے خیال سے آئی تھی۔ راجہ غضنفر علی نے تو صاف صاف کہا تھا کہ ''ہم عارضی حکومت میں پاکستان کی لڑائی لڑنے جا رہے ہیں'' جو محکموں کی تقسیم ہوئی اُس میں مالیات کا محکمہ لیگ ہی کو مل گیا۔ اس طرح لیاقت علی خاں کو جو وزیر مالیات تھے یہ موقع ملا کہ وہ ان محکموں کی کارروائیوں میں روڑے اٹکائیں جن کے ممبر کانگریسی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی اشتراک نہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر اختلافات کے بہانے ڈھونڈنا تھا۔ مولانا آزاد کا بعد میں یہ خیال ہو گیا تھا کہ اگر مالیات کا یہ صیغہ خود کانگریس اپنے پاس رکھتی تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ میرے خیال میں یہ معاملات کو بہت زیادہ آسان بنا کے پیش کرنا ہے۔ کوئی بھی اہم محکمہ لیگ کے پاس ہوتا تو اسی قسم کے اختلافات پیدا کرتے۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی ہی کہ کابینہ کے جلسوں کے پہلے لیگی ممبران لیاقت علی خاں کے ساتھ علاحدہ مشورے کیا کرتے تھے۔

لارڈ ویول جو چاہتے تھے کہ کابینہ مشن پلان کامیابی سے چلے اور مولانا آزاد اور ان کے ہم نوا جن کا خیال تھا کہ یہی پلان وحدت ہند کو باقی رکھ سکتا ہے، اب بھی اس کوشش میں تھے کہ لیگ اور کانگریس کے مابین جو خلیج بڑھتی جا رہی تھی اُس کے دونوں کناروں کا فاصلہ کسی طرح کم کیا جائے۔ مسٹر اٹیلی وزیر اعظم انگلستان بھی اس مسئلے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نومبر کے آخر میں لارڈ ویول اور کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کی ایک نشست لندن میں بلائی۔ کانگریس اور پنڈت جواہر لال نہرو شروع میں اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ بالآخر لارڈ ویول نے ابوالکلام ہی کو وسیلہ بنایا اور انھوں نے پنڈت جی کو رضا مند کیا۔ چنانچہ پنڈت جی، مسٹر جناح اور لارڈ ویول لندن گئے۔ وہاں علاقوں کی تقسیم میں آسام کو بنگال کے ساتھ شامل

کیے جانے کے مسئلہ پر اختلاف ہوا۔ کانگریس کا کہنا تھا کہ آسام کو شروع سے علاقہ (ج) میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا حق ہونا چاہیے۔ مسٹر جناح کا کہنا یہ تھا کہ وہ علاقہ (ج) کا آئین بن جانے کے بعد ہی الگ ہوسکتا تھا۔ ۶ر دسمبر کو برطانوی کابینہ نے ایک اعلانیہ جاری کر کے لیگ کے نظریے کی تائید کر دی لیکن لیگ کی اس سے کب تشفی ہونے والی تھی۔ اختلافات جاری رہے اور لیگ نے آئین ساز اسمبلی کا مقاطعہ جاری رکھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے بعد مولانا آزاد کو حکومت کا رُکن بنانے کی کوششوں کی تجدید ہوئی اور بالآخر مہاتما گاندھی اور پنڈت جی کے اصرار پر مولانا نے ممبر برائے تعلیمات ہونا منظور کر لیا اور ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو انھوں نے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

لیگ کی پوزیشن عجیب وغریب ہوگئی تھی۔ وہ حکومت کے اندر تھی مگر آئین ساز اسمبلی کے باہر۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا یہ صورت حال باقی رکھی جائے؟ اس پر مسٹر اٹیلی اور لارڈ ویول میں اختلاف رائے ہوگیا۔ اٹیلی کا یہ کہنا تھا کہ برطانیہ کو ہندستان سے ہٹنے کی ایک تاریخ مقرر کر دینا چاہیے۔ ویول کا کہنا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کیے بغیر انتقال طاقت نہ کرنا چاہیے۔ اختلاف نے ایسی شکل اختیار کی کہ ویول کو مستعفی ہونا پڑا۔ ویول کی روانگی کے وقت آزاد نے ایک بیان جاری کیا جس میں ویول کی خدمات کو سراہا۔ یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ اُن کا یہ اقدام اُن کے دوسرے ساتھیوں کو خوش نہیں معلوم ہوا۔

۲۴ر مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے کے عہدے کا چارج لیا۔ وہ انتقال اختیارات کے اعلان کی تاریخ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کا فیصلہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ امکانات یہی ہیں کہ برطانیہ نے تقسیم کا بھی فیصلہ کر لیا تھا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن لندن سے اس کے احکامات بھی لے کر وارد ہند ہوئے تھے۔ حق تو یہ ہے کہ خود کابینہ مشن کی تجویزوں میں تقسیم کے جراثیم موجود تھے، لیکن ایک دُھندلی سی اُمید کی کرن بھی نظر آ رہی تھی کہ شاید ایک وفاقی وحدت پر سمجھوتا ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ تقسیم کے لیے بھی فضا ہموار ہو رہی تھی۔ لیگ کے ممبران حکومت کے اندر ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے تھے کہ مشترکہ عمل ناممکن ہو رہا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اُٹھایا اور کانگریسی ممبران کو بھی اس پر آمادہ کرنا

شروع کیا کہ وہ تقسیم کو ایک ''ضروری شر'' مان کر قبول کرلیں۔ چنانچہ سردار پٹیل اور پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اب تقسیم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ خود مولانا آزاد کی روایت کے مطابق انھوں نے کانگریس کے ان دونوں قائدین کو تقسیم کے خلاف ازسرنو آمادہ کرنا چاہا لیکن یہ حضرات لیگ کو مستقل طور سے ہندستان کے مستقبل کے راستے کا روڑا بنائے رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اب مولانا نے باپو کی امداد چاہی۔ پہلے تو انھوں نے بھی تقسیم سے اختلاف کیا لیکن بعد میں جب غالباً انھیں لیگ کے رویے کا باقاعدہ علم ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ یہ صورت حال جتنی ہی جلد ختم ہو اچھا ہے تو مجبوراً وہ بھی تقسیم پر راضی ہو گئے۔ اس عرصے میں مولانا آزاد برابر اس بات کی کوشش میں تھے کہ کابینہ مشن پلان کو منظور کرلیا جائے اور وہ اس سلسلے میں کئی بار لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے بھی لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن پہلے ہی سے فیصلہ کر چکے تھے۔ اب سوال اُن کے سامنے صرف یہ رہ گیا تھا کہ ہندستان کی تقسیم کس طرز پر ہو۔ اسی سلسلے میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا بھی سوال اُٹھا۔ اس پر بھی وائسرائے کا دماغ صاف تھا۔ وہ واضح تجویزیں بنا چکے تھے اور اب برطانوی حکومت سے منوانے کے لیے لندن جا رہے تھے لیکن وہ ایسا ظاہر کرتے تھے کہ گویا اُن کے پاس کوئی واضح نقشہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے مولانا نے اُن سے اُن کی روانگی لندن سے پہلے ایک آخری ملاقات اس خیال سے کی کہ شاید وہ وائسرائے کو کابینہ مشن پلان کے لیے آمادہ کرسکیں لیکن حالات کا فیصلہ مولانا کے خوابوں اور آرزوؤں کے خلاف ہو چکا تھا۔ لندن سے تقسیم کا پلان منظور ہو گیا۔ ۳۰ر مئی کو وائسرائے لندن سے واپس آئے، ۲ر جون کو انھوں نے کانگریس اور لیگ کے نمایندوں سے بات کی اور ۳ر جون کو ایک قرطاس ابیض شائع کر دیا گیا جس میں نئی تجویزیں (یعنی ہندستان اور صوبوں کی تقسیم کی تجویزیں) شامل تھیں۔ اُسی دن ورکنگ کمیٹی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور پہلی مرتبہ سرحد کا مسئلہ سامنے آیا جہاں مسلم اکثریت کے باوجود کانگریس کی حکومت تھی اور بالآخر یہ طے پایا کہ صوبہ سرحد میں استصواب کرالیا جائے۔ ۱۴ر جون کو کل ہند کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں تقسیم کی تجویز کثرت آرا سے پاس ہوگئی۔ اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تمام انتظامات مکمل کرنے میں بے انتہا عجلت دکھائی اور تین مہینہ کی قلیل مدت میں تقسیم کو عملی جامہ پہنانے

کے لیے ساری تیاریاں کر کے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور ۱۵ر اگست کو ہندستان میں برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوا۔

اس طرح آزادی کا آغاز ہوا۔ وہ آزادی جس کی تعمیر و تشکیل میں مولانا کا زبردست حصہ رہا ہے۔ البتہ تقسیم کے وہ سب سے بڑے دشمن تھے۔ انور صابری نے تقسیم کے بارے میں مولانا کے وہ خیالات نقل کیے ہیں جو انھوں نے تقسیم سے قبل ظاہر کیے تھے:

> ''بٹوارہ قدرتی ہے یا غیر قدرتی اس بحث میں نہ پڑو۔ نیت فرنگ اس کے حق میں ہے۔ شاید وہ کامیاب ہو جائے۔ یہ فساد اُس بڑے فساد کا پیش خیمہ ہے جو موہومہ تقسیم کے بعد ہوگا۔ تم لوگ مٹ جاؤ مگر کوشش کرو کہ یہ حادثہ خونیں اور اس کے اسباب تخلیق کامران و بامراد نہ ہوں۔ اسلام کے نزدیک یہ جغرافیائی حدود، دوائر رحمت کی وسعتوں کے خلاف ہیں۔ انسانیت محبت و اخوت کی محتاج ہے۔ یہی ایک طرزِ عمل نسلی تفریقوں کو انس و مواخات کے قالب میں ڈھال سکتا ہے۔''

مولانا کے خطرات صحیح ثابت ہوئے اور اسی باعث تقسیم کو روکنے کے لیے وہ آخر تک لڑتے رہے۔ اس مخالفت میں انھوں نے مسلمانوں میں اپنی ہر دلعزیزی کھو دی اور خود اپنے ہمراہیوں اور ساتھیوں سے بھی وقتی انحراف مول لیا تھا۔ اُن کے لیے یہ ان کا اصول اوّلین بن گیا تھا کہ ہندستان کے اتحاد کو ہر قیمت پر باقی رکھا جائے۔ وہ اس کے لیے یہاں تک آمادہ ہو گئے تھے کہ اگر اس سے آزادی کی تاریخ کچھ دنوں کے لیے ٹل بھی جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ جذباتی اعتبار سے منطق ان کے حق میں تھی لیکن واقعات کی منطق ان کے مخالف تھی۔ وہ اپنی گوشہ نشینی، کم آمیزی، خوش اعتقادی، صفائے ضمیر، عزم مصمم اور یقین کامل کی بنا پر بھی اپنی رائے پر سختی سے اڑ بھی جاتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ مصالحتوں اور مفاہمتوں کے لیے وہ اپنے میں لچک پیدا کر لیتے تھے لیکن اصول کے معاملے میں وہ قدم پیچھے ہٹانا کم جانتے تھے۔ اتنی ہی دور قدم ہٹا سکتے تھے جہاں تک اُن کا تخیل و تصور ان کا ساتھ دے۔ اس طرزِ عمل نے اُن میں لچک تو کم کر ہی دی تھی، بعض اوقات داخلی عناصر سے کلیتاً کنارہ کش ہو کر وقت کے تقاضوں کے

مطابق خارجی اسباب کا فیصلہ کرنے میں بھی جھجک ہوتی تھی۔ کم از کم وہ ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ تقسیم کے مسئلے میں یہی ہوا لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ تمام اختلافات کے بعد اور لچک کی کمی کے باوجود، وہ ضدی نہیں تھے۔ تقسیم کو روکنے کے لیے اُنھوں نے ہر ممکن کوشش کی لیکن جب یہ دیکھ لیا کہ حالات کی ردوبدل ہو چلی ہے اور اب مڑتے ہوئے طوفانی دھارے کے رُخ کا موڑنا اُن کے بس سے بالکل ہی باہر ہے تو انھوں نے بادل ناخواستہ نئے حالات کے مقابلے کے لیے اپنے کو آمادہ اور تیار بھی کر لیا۔ ۱۴ر جون ۱۹۴۷ء کی کل ہند کانگریس کمیٹی میں اُن کی تقریر اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے تقسیم کے رزولیوشن کی تائید بڑے ہی ذہنی کرب اور قلبی اذیت کے ساتھ کی، لیکن کی۔ انھوں نے تقسیم کو سانحہ بتایا اور قوم کی سیاسی ناکامی پر محمول کیا لیکن اُن کو یہ بھی صاف نظر آ رہا تھا اور اُن سے زیادہ کس کو نظر آتا کہ کانگریس نے اور خود انھوں نے اس تقسیم سے ملک کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی اور اب تقسیم ناگزیر تھی۔

یہ مولانا کے کردار کا ایک خاص پہلو ہے۔ مخالفتیں انھوں نے اکثر کیں۔ خود مہاتما گاندھی سے مخالفت ہوئی جیسا کہ انھوں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تقریر کے مسودے میں لکھا ہے:

> ''غرضیکہ اس طویل مدت میں (از ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۸ء) بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور اُن میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی۔ انھوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس کیا لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود اُن کی عظمت کی جو رسّی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی ہم کبھی اُس سے باہر نہ ہو سکے۔''(۱)

اسی طرح سردار پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، پرشوتم داس ٹنڈن، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر کھرے، مولانا عبدالباری، مولانا ظفر علی خاں سے بھی اختلافات ہوئے۔ یہ سب رفیق کار تھے۔ رفقائے کار میں اختلاف رائے کا ہونا ناممکنات سے نہیں ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہر بار سردار پٹیل کی رائے غلط اور مولانا کی صحیح ہی رہتی ہو۔ عملی دنیا میں ہی نہیں بلکہ علمی دنیا

۱- یہ مسودہ الجمعیۃ کے ''آزاد نمبر'' (دسمبر ۱۹۸۵ء، صفحہ ۴۱-۴۲) میں شائع ہو گیا ہے۔

میں بھی اختلافات ہوتے ہیں۔ جو بات اہم ہے وہ اختلافات کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اختلافات رائے کے باوجود راہ عمل میں لوگ ساتھ رہتے ہیں یا نہیں۔ جن لوگوں سے بنیادی اختلافات تھے جیسے مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی اور ڈاکٹر کھرے وغیرہ ان کا ساتھ ہی نہ رہ سکا لیکن فروعات میں اختلاف، اتحاد مقصد کے منافی نہیں ہے اسی لیے سردار پٹیل اور پنڈت نہرو سے فروعی اختلافات کے باوجود تمام اہم مسائل میں اتفاق رائے رہا اور ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ تقسیم کے مسئلے کو لے لیجیے۔ اختلاف تھا اور شدید اختلاف تھا لیکن مولانا نے اتحاد و تعاون کا راستہ ترک تو نہیں کیا۔ یہی اصل چیز ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ بعض اوقات یہ اختلافات انفرادی رجحانات کی وجہ سے بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان میں ذاتی پسند و ناپسندیدگی کو بھی دخل ہوتا تھا۔ کبھی نقطہ ہائے نظر میں فرق اس لیے بھی نمایاں ہوتا کہ کوئی یہ سمجھتا کہ اشخاص کو راضی کر لینے سے تحریک کا رُخ بدل سکتا ہے لیکن اس کی نظر اس بات پر نہیں رہتی تھی کہ اب تحریک عوامی قبول کی اُس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں افراد کی رضامندی و نارضامندی سے زیادہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ بعض اوقات اس شک میں خود مولانا بھی مبتلا ہو جاتے تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی کم آمیزی کے باعث عوامی تحریکات کی دوررسی کا صحیح اندازہ فوراً کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس کی تلافی اُن کی بے پناہ ذہانت اور کانگریس کے عوامی کردار سے ہو جاتی ہے لیکن بعض اوقات اس اندازے میں وقت بھی لگتا تھا۔ بہرحال ان اختلافات کو رائی کا پہاڑ بنانا مناسب نہیں ہے۔ خود مولانا نے انھیں غیر معمولی اہمیت کبھی نہیں دی، بلکہ وہ اصل نتائج پر نظر رکھتے تھے اور ''گزشتہ راصلواۃ'' کے مقولے پر عمل کرتے تھے۔

اب اسی تقسیم کے مسئلہ کو لے لیجیے۔ یقیناً مولانا شدت سے اس کے اثرات بد کو محسوس کرتے تھے اور مخالفت کرتے تھے۔ دوسرے بھی اس احساس میں شریک تھے لیکن وہ غلامی کے طویل اثرات بد کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ اس وقت انتقال اختیارات میں اس بات کو بھی بڑا دخل تھا کہ مزدور پارٹی برطانیہ میں برسر اقتدار تھی۔ اگر مولانا کی رائے کے مطابق کابینہ مشن کے پیچھے اس بات کا انتظار کیا جاتا کہ وقت گزرنے کے بعد لیگ کے رویے میں تبدیلی ہو جائے گی تو اس کا بھی امکان تھا جیسا کہ فی الحقیقت ہوا بھی کہ مزدور پارٹی کی بجائے رجعت

پسند پارٹی دوبارہ حکومت پر قابض ہو جائے اور حالات بدل جائیں۔ عارضی حکومت میں لیگ نے اپنے رویے سے یہ ظاہر بھی کر دیا کہ تعاون کے لیے وہ بالکل تیار نہیں ہے۔ پھر آخر کس اُمید پر موجودہ موقعے کو ہاتھ سے جانے دیا جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ تقسیم کو تسلیم کر لینے کے لیے کانگریس کو بہت سے عزیز جذبات کی قربانی کرنی پڑی لیکن یہ قربانی ناگزیر تھی۔ آخر اسی ناگزیری کی بنا پر ہی تو مولانا نے بھی تقسیم اور اُس کے تمام نتائج کو عملی طور پر تسلیم کیا۔

تقسیم کے پہلے فرقہ وارانہ جذبات بے حد برانگیختہ ہو چکے تھے اور پاکستانی بنگال، بہار اور پنجاب وغیرہ میں فسادات کی ابتدا ہو گئی تھی۔ تقسیم نے اس آگ پر گھی اور تیل کا کام کیا۔ شعلے بھڑکے اور بھڑکے، یہاں تک کہ تقریباً تمام شمالی ہندستان اور وسطی ہندستان اس کی لپیٹ میں آ گئے، بربریت کا ننگا ناچ ہوا۔ انسان حیوان بن گئے تھے بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر تھے اور افسوس یہ ہے کہ یہ سب مذہب کے نام پر ہو رہا تھا، گویا قتل و غارت، بے حیائی اور ناموس ریزی کا بھی کوئی مذہب ہو۔ نتیجہ میں مغربی پاکستان تو غیر مسلموں سے تقریباً خالی ہو گیا لیکن ہندستان کے مسلمان اور مشرقی پاکستان کے ہندو اتنی کثیر تعداد میں تھے اور سارے علاقے پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو ناگزیر طور پر بڑی تعداد میں انھیں علاقوں میں رہنا تھا۔ مولانا نے اس موقعے پر بے حد سنجیدہ رویہ اختیار کیا جیسا کہ ان کا خاصہ تھا۔ وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ''دیکھا نا! میں کہتا تھا کہ تقسیم کا یہ نتیجہ ہوگا۔ اب میں کیا کروں؟ جاؤ اور اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔'' انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ انھیں مسلمانوں کے بے حد ہمدرد بن گئے جنھوں نے مولانا کی ذاتی تذلیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک کل جماعتی کانفرنس ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو آیندہ پیش آنے والے واقعات کو غیر جذباتی طور پر سمجھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس موقعے پر مولانا ہی کا مقولہ قابل نقل ہے:

> ''آپ لوگ مجبور ہیں لیکن میری راہ میرے لیے چھوڑ دیجیے اور جہاں جا رہا ہوں جانے دیجیے۔ آج نہیں، کل بتاؤں گا کہ حقیقت کیا ہے؟ خدا کا ہاتھ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے اور مستقبل سے بڑھ کر

کوئی جج نہیں ہے۔ عنقریب کھل جائے گا کہ میں کس راہ پر تھا اور آپ کہاں جا رہے تھے اور وہ مقلب القلوب اپنے بندوں کے دلوں کو میرے لیے کھولتا ہے یا آپ کے لیے؟ البتہ جن دلوں کو خدا اپنے نور ہدایت کے لیے چن لیتا ہے اُن میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ وہ آج جس چیز کو دیکھتے ہیں، تم کل دیکھو گے۔ اس معاملے میں دیکھو! جلسے میں صرف میں ہی ایک مجرم تھا جس نے مخالفت کی اور سب خاموش رہے یا سرشاریِ نفاق سے جھومتے رہے لیکن آج سیکڑوں ہیں جو سر پیٹ رہے ہیں۔ پھر یہ کیا ہے؟ کیا یہ ایک الٰہی نشانی نہیں ہے، جو حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کر رہی ہے اور بتلا رہی ہے کہ کس کی زبان اللہ کے ہاتھ میں ہے جو اُس سے کہلواتا ہے اور کس کے دل نفس کے قبضے میں ہیں جو اُنھیں ہلنے نہیں دیتا۔ پھر کیا کوئی آنکھ ہے جو دیکھے، کوئی کان ہے جو سنے اور کوئی دماغ ہے جو سوچے!''

لیکن مولانا نے گمراہوں کو جو اُس وقت اپنی ناکامی اور مایوسی کے احساس سے زخمی ہو رہے تھے، نفرت بھرے انداز میں ٹھوکریں نہیں لگائیں۔ یقیناً وہ سب سانحات و حادثات جو تقسیم کے بعد پیش آئے اس کی ذمے داری فرقہ وارانہ سیاست، بالخصوص لیگی سیاست پر تھی اور لکھنؤ میں جو اجتماع ہوا تھا اُس میں اس کا پورا موقع تھا کہ مولانا طعن و تشنیع کے نشتر تیز کرتے لیکن یہ موقع اصلاح حال کا تھا اور پرانے زخموں کو اُدھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مولانا نے ہمدردانہ تلقین کی اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ دکھایا اپنے خطبہ میں آپ نے کہا کہ:

''جو حل میں آپ کو بتا سکتا ہوں وہ میرے لیے بہت پرانا حل ہے جو ۳۹-۴۰ برس پہلے میں آپ سب کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ جو مشورہ میں دے سکتا ہوں اُس کے پیش کرنے میں میں نے کوئی کمی نہیں کی۔ میں کسی کے دل کو تو بدل نہیں سکتا اور کسی کے سر میں نیا دماغ تو رکھ نہیں

سکتا۔ میں جو کچھ کرسکتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس چیز کو میں صحیح سمجھتا ہوں اُن کے سامنے رکھ دوں۔ جہاں تک فرقہ پرستی کا تعلق ہے یہ ایک دروازے سے نہیں آئی بلکہ کئی دروازوں سے آئی ہے تو اب یہ سب دروازے بند ہونے چاہییں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان کی آزادی جس کا ہم ستر برس سے خواب دیکھ رہے تھے برباد نہ ہو اور بربادی کے کسی نئے دروازے میں نہ گھس جائے تو ہمارا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ جس دروازے سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے اُسی دروازے کو بند کردیں اور اسے ختم کردیں۔"

چنانچہ مولانا کی تشخیص کے مطابق کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو کسی علاحدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت نہیں ہے اور وہ مسلم لیگ جس کے خلاف مولانا نے زندگی بھر جہاد کیا تھا، مردہ ہو کر رہ گئی۔ اس کے دیکھنے کے لیے ملک کو بڑی قربانی دینی پڑی لیکن انجام بخیر ہوا۔ اگرچہ جنوبی ہند میں لیگ کی ایک شاخ اب بھی باقی ہے مگر اس کی نوعیت بالکل ہی بدل چکی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض ذہنوں میں شکوک اب بھی باقی تھے۔ پرانے قسم کے لیگی سمجھتے تھے کہ ان کے خوابوں کا پاکستان ان کی حالت سدھارے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اَن ہونی بات تھی اور بہت جلد ان کو معلوم ہو گیا کہ "خود غلط بود انچہ ما پنداشتیم" لیکن ان کی اس ذہنی کیفیت کے باعث ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی اُبھرا جسے مسلمانوں کی وفاداری پر شک ہونے لگا۔ یہ حالات کا فطری نتیجہ تھا۔ اس وقت سابق مسلم لیگی بے حد سراسیمہ و پریشان ہوئے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی وفاداری کا کس طرح ثبوت دیں۔ انھوں نے اپنی اس سراسیمگی کا اثر عام مسلمانوں میں بھی پھیلانا چاہا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اگست ۱۹۴۸ء کے یومِ آزادی کے موقع پر مولانا نے دلی کے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"میرے پاس مسلمانوں کے خطوط آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اگرچہ ہم حکومت ہند کے وفادار ہیں اور بار بار اپنے تعاون اور وفاداری کا

یقین دلاتے ہیں پھر بھی ہم پر شک کیا جاتا ہے۔

میرا جواب صرف ایک ہے۔ تم ایک منٹ کے لیے اس سوچ میں مت پڑو کہ دوسرا تمھارے متعلق کیا خیال رکھتا ہے بلکہ اپنے دلوں کو ٹٹولو۔ اگر تمھارے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے تو تمھیں کسی کے کہنے کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ اپنے معاملے کو صاف رکھو۔ بار بار صفائی پیش کر کے اپنی وفاداری کی قیمت نہ گھٹاؤ۔"

عام مسلمانوں اور ہندوؤں پر تقسیم کے بعد بڑا ہی کڑا وقت آ پڑا تھا۔ نوزائیدہ پاکستان میں ہندو اور سکھ اور ہندستان کے بعض علاقوں کے مسلمان قیامت انگیز واقعات سے گھبرا کر بڑی تعداد میں ترکِ وطن کرنے لگے تھے۔ مسلمانانِ دلی کا بھی یہی عالم تھا۔ بقول حافظ محمد ابراہیم اس وقت سے پہلے مولانا نے ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا:

"اُن (مولانا) کی نظریں نتائج تقسیم کے جگر خراش نقشے دیکھ رہی تھیں اور مستقبل میں بلند ہونے والی کروڑوں ماتم و فریاد کی صداؤں کو وہ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے آج ہی ان کا سکوت ٹوٹا ہے۔

تنہا مسلمانوں کی بربادی و تباہی کا تصور اُنھیں بے چین نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ ضرب تقسیم میں آنے والی پوری آبادی کے اُجڑنے کا یقین دل میں لیے مجسم اضطراب بن رہے تھے۔ یوں تو اُن کی زندگی کا سینہ ہزاروں بار آلام وغم کا گہوارہ بنا، لیکن پلکیں کبھی دل کی ترجمانی کا شرف حاصل نہ کر سکیں، لیکن ۱۹۴۷ء میں پیش آنے والے حوادث عبرت زا کے دور اندیشانہ احساس سے کبھی کبھی خون دل کا گوہر شفاف آنکھوں تک آ ہی جاتا تھا۔

یہ ایسا صدمہ تھا جو اندر ہی اندر انھیں گھلاتا رہا اور عزم و ارادے کے بل پر چلنے والی جسمانی مشین بھی اُسے برداشت کرتے کرتے تھک گئی۔"

لیکن ایسا نہیں تھا کہ غم کے اس شدید احساس نے اُن کی رگ عمل میں خون کی روانی کم کر

دی ہو۔ وہ کانگریس کے ادارہ میں پنجاب، سندھ و سرحد کے علاقے کے مسائل کی مدتوں سے دیکھ بھال کرتے آئے تھے اس لیے سب سے زیادہ وہ اس علاقہ کے سانحات سے متاثر ہوئے۔ ان کے یہاں ہمیشہ اس علاقے کی کانگریس کے ارباب حل وعقد کا جم غفیر رہتا تھا۔ بحالی کے کام میں انھوں نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی اور حکومت کے اندر اور باہر اس کے لیے برابر کوشاں رہے کہ پنجاب و سندھ وغیرہ کے لوگوں کو پھر سے بسانے کا کام جلد از جلد انجام پا جائے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فسادات دلی کے بعد جب گاندھی جی نے اپنا آخری برت رکھا تو برت توڑنے کی شرط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو لوگ ہجرت کر کے چلے گئے ہیں وہ پھر سے لا کر بسائے جائیں لیکن مولانا نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ جو لوگ ایک بار بے گھر ہو کر در بدر کی زندگی کے شدائد برداشت کر چکے ہیں اور اب کسی طرح اُنھیں پیر ٹکانے کی جگہ مل پائی ہے تو انھیں پھر سے اُجاڑنا اور اس جگہ بھیجنا جہاں یہ بھی پتا نہیں کہ اُن کے ساتھ کیا سلوک ہوگا، نہ مناسب ہے اور نا قابل عمل ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح انھوں نے پنجاب وغیرہ کے مہاجرین کے بارے میں گاندھی جی سے سفارش کر کے ان کی بحالی کے کام کو آگے بڑھایا۔ بہت سے ادیب اور شاعر جو پنجاب وغیرہ سے یہاں چلے آئے تھے اُن کی بحالی میں بھی مولانا نے بڑا حصہ لیا لیکن مولانا یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہجرت کے سلسلے کو جلد از جلد ختم ہو جانا چاہیے کیوں کہ اس کے باقی رہنے سے ایک انتشاری اور غیر یقینی کیفیت بھی باقی رہے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ۱۹۴۸ء میں انھوں نے مسلمانوں کے ایک عظیم الشان اجتماع کے سامنے دلی میں ایک یادگار تقریر کی۔ انھوں نے کہا:

> ''...... تمھیں یاد ہے! میں نے تمھیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اُٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لیے، میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض

کیا بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔

سچ پوچھو تو میں اب ایک جمود ہوں، ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں بھی رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں، یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے، میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور کہاں کھڑے ہو؟...... میں نے تم سے کہا تھا کہ دوقومی نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسا کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سنی اَن سنی کردی۔ انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف اُلٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔

یہ ٹھیک ہے وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اُس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کردیا ہے۔ پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فایدہ نہیں اور نہ اس سے اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔ اب ہندستان کی سیاست کا رُخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے

یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں؟ ہراس کا موسم عارضی ہے......

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اُس پر چل کر...... آخر کہاں جا رہے ہو، کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو (۱) مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے!

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمھارا جوش وخروش بے جا تھا، اسی طرح آج یہ تمھارا خوف وہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اُس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی

۱- مسلمانوں کے جس اجتماع میں یہ تقریر ہوئی وہ جامع مسجد دہلی میں منعقد ہوا تھا۔

حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، اُن کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔''

مولانا نے اپنی اس تقریر کے ذریعے زخموں پر نمک پاشی کیے بغیر کیسے اشاروں اور کنایوں میں تمام سیاسیات کا عطر نچوڑ کے رکھ دیا اور کس طرح اُن کو یہ بتایا کہ فرقہ واریت ہی کا راستہ سیدھا اور سچا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس نظریے کو کوئی خوف یا لالچ سے اپنائے بلکہ وہ اس پر بار بار زور دے رہے تھے کہ عقل کا یہی راستہ ہے اور تاریخ اسی کو درست مانتی اور سمجھتی ہے۔ مولانا واقف تھے کہ اکثر لوگوں کے دلوں میں دوقومی نظریہ گھر کر گیا ہے۔ وہ خوفزدہ وفاداری سے نقصان ہی پہنچائیں گے، فایدہ نہیں پہنچا سکتے۔ کیوں کہ چودھری خلیق الزماں کی طرح کے لیڈر حلف وفاداری لینے کے بعد بھی پاکستان بھاگ گئے تھے اور سبھی چوٹی کے لیڈر تھے جن کی جائز جگہ منطقی طور پر ہندستان میں ہونی چاہیے تھی، جیسے ظہیر الحسن لاری، لیاقت علی خاں، رضوان اللہ، چندریگر، راجہ محمود آباد، حسین امام۔ وہ سب یہاں کے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر جا چکے تھے اور وہاں سے وقتاً فوقتاً ہمدردی کے بیانات جاری کر کے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ عہدہ برآ ہونا تو خیر ناممکن تھا لیکن ان سے یہاں کے مسلمانوں کی وفاداری کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہونے کا ماحول ضرور بن جاتا تھا۔ مولانا اس قسم کی مشکوک وفاداری سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے کھل کر اعلان کیا کہ اگر مسلمانوں کے دلوں میں سچائی ہے تو انھیں اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کے اس کی تعمیر میں حصہ لینا ہوگا اور یہی ایک راہ تھی، جو ٹھیک اور درست تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد تعمیری پروگرام کی سب سے زیادہ اہمیت تھی اور

مولانا جس حکومت کے رُکن تھے، وہ ایک عظیم الشان تعمیری منصوبے کے ماتحت کام کر رہی تھی۔ اس دور میں شور و شغب کی ضرورت نہیں تھی۔ تقریر و تحریر کی زلزلہ خیزیوں کی حاجت نہیں تھی بلکہ خاموش اور سنجیدہ تفکر اور بے لوث عمل کی ضرورت تھی۔ اسی لیے خود مولانا نے ایسی ہی تعمیری خاموشی اور عمل کو اپنایا۔ وزارت تعلیم میں انھوں نے اپنے سامنے دو باتوں کو پیش نظر رکھا۔ ایک یہ کہ تعلیم عام ہو اور دوسرے ایسی ہو جو آزاد ملک کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے علوم و فنون کی ترقی کے لیے بھی کوششیں کیں۔ للت کلا اکادمی، سنگیت اکادمی اور ساہتیہ اکادمی کا قیام اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ آزاد ہندستان میں ادب و ثقافت کی نشاۃ ثانیہ کو کس قدر اہم سمجھتے تھے۔ غیر ملکوں میں طلبہ کا بھیجنا اور وہاں کے طلبہ کا ہندستان آنا، یہ اُس نئی ثقافتی تحریک ہی کے مظاہر تھے جس کی بنا مولانا نے ڈالی تھی۔

مولانا کی ایک اور خواہش تھی کہ مشرقِ وسطیٰ اور مشرق بعید سے ہندستان کے تعلقات دوستانہ اور برادرانہ قائم ہوں اور استوار بنیادوں پر قائم ہوں۔ اس سلسلے میں مشرق وسطیٰ کے بعض ملکوں میں مولانا سفر یورپ کے سلسلے میں تشریف بھی لے گئے اور خاطر خواہ نتائج پیدا ہوئے۔ تمام اسلامی ممالک میں آپ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور آپ کی زندگی سے وہاں کی سیاست سبق لیتی تھی۔ شروع ہی سے مولانا کا خیال تھا کہ عالم اسلامی کی غلامی اور زبردستی کا خاتمہ اُسی وقت ہوگا جب ہندستان آزاد ہو جائے گا اور مولانا یہ دیکھنے کو زندہ رہے کہ ہندستان کی آزادی نے کس طرح اسلامی ممالک کی آزادی کے لیے بھی راستہ کھول دیا۔ چنانچہ مولانا کی وفات پر تمام عالم اسلامی کے قائدین نے یک زبان ہو کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔

الحق یعلوا ولا یعلی خود پاکستان (جس کے ابتدائی ہوا خواہوں اور بانیوں نے مولانا کے حق میں دشنام طرازی ہی اپنا دستور و معمول بنا لیا تھا) اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوا کہ مولانا کی ذات فقید المثال تھی۔ چٹان لاہور، نے اُن کی موت پر لکھا کہ:

> ''ان کی موت ایک عظیم انسان ہی کی موت نہیں، ایک فقید المثال
> ادارے کی موت ہے۔ ایشیا کا سب سے بڑا مسلمان ہمیشہ کی نیند سو

گیا۔ ایک قافلہ جو نصف صدی سے بے راہ تھا، مسافروں کو گم شدہ منزلوں کا پتا دیتے ہوئے تاریخ کی شاہراہ پر چل رہا تھا، ایکا ایکی موت کی وادیوں میں داخل ہو گیا۔"

امروز کراچی نے لکھا کہ:

"مولانا آزاد کا اُٹھ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ ایک سانحہ عظیم ہے۔ اس لیے نہیں کہ دنیائے علم و کمال اُجڑ گئی، اس لیے نہیں کہ ملت اسلامیہ کا ایک عظیم فرزند اس سے چھن گیا، اس لیے نہیں کہ ایک جید ادیب و صحافی رُخصت ہو گیا بلکہ اس لیے کہ ایک ایسا دانائے راز ہم سے جدا ہوا ہے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہماری سیاسی تاریخ میں مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کو جذباتیت کا شکار نہیں ہونے دیا، بلکہ اُس کو سنجیدگی اور متانت سے روشناس کرایا۔ ایثار و قربانی، تدبر و تحمل اور عقیدے کی مضبوطی کا جو معیار انھوں نے قایم کیا وہ رہتی دنیا تک مشعل ہدایت رہے گا۔"

روزنامہ جنگ کراچی۔ نے کہا کہ:

"غیر ملکی حکمرانوں کے عظیم سیاسی و نظریاتی دباؤ کو دور کرنے میں مولانا آزاد نے جو تاریخی کردار انجام دیا ہے اُس کی مثال دوسرے چند ہی افراد سیاسی میں مل سکتی ہے۔"

روزنامہ تسنیم لاہور نے اعتراف کیا کہ:

"مسلمانوں کی بیداری میں انھوں نے جو حصہ لیا ہے اُس میں کوئی مسلمان رہنما بھی اُن کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ انھوں نے اُس وقت یہاں دعوت حق کا نعرہ بلند کیا جب کہ مسلمان رہنماؤں کا ایک طبقہ انگریزوں کی اطاعت کو قرآن و سنت سے ثابت کرتا تھا اور غلامی پر قناعت کرنے کو فلاح دارین کا ذریعہ گردانتا تھا۔ مولانا نے مسلمانوں

کو بتایا کہ مسلمان غلام رہ کر زندہ رہنے کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔
غلامی اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں اور انگریزوں سے نجات حاصل کرنا
اُن کا محض قومی فریضہ ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ بھی ہے۔''

مولانا کو خود بھی اپنے اس مقام بلند کا پورا پورا احساس شروع ہی سے تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ''الہلال'' میں تحریر فرمادیا تھا:

''یاد رکھیے کہ دنیا میں صرف سچائی اور خلوص ہی میں زندگی ہے۔ خلوص کبھی ضائع نہیں جاتا اور سچائی کبھی نہیں مرتی۔ اگر میرے دل میں سچائی کا ایک ذرّہ بھی موجود ہے تو میں ایک ایسی طاقت، ایک ایسی زندگی، ایک ایسی غیر فانی ہستی ہوں جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔''

شاعر نے بھی یہی بات کہی تھی:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا آزاد کی سیاست

ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی

باہری ملکوں سے آزاد کی واپسی کی تاریخ صحیح صحیح معلوم نہیں۔ یہ غالباً ۱۹۰۸ء کے آخری دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء کے شروع میں ان کا زیادہ وقت بمبئی میں گزرا جہاں، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وہ کسی المناک واقعے میں مبتلا ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ [۱] ان کی زندگی کے اس عہد کے بارے میں ہماری اطلاعات، بہرحال کم ہیں لیکن اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ چھ یا سات برس 'تشکیک' کے (اس میں ارتداد کا زمانہ بھی شامل ہے) صحرائے بے آب وگیاہ میں بادیہ پیمائی کے بعد آزاد اب بدل گئے تھے۔

الندوہ (اپریل ۱۹۱۰ء) میں ان کا مضمون پہلا اشارہ تھا کہ صحافی کی حیثیت سے ان کی پبلک لائف کا مشن کیا ہوگا۔ اس مضمون کا عنوان تھا ''ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہ مقصود'' اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم جس کی فوری ضرورت کے لیے اتنا ڈھنڈورا پیٹا جا چکا تھا کہ گویا مسلم معاشرے کی تمام بیماریوں کا یہی ایک علاج ہے، متوقع نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔

> ''قوم کے قدرتی لیڈر علماء تھے۔ قوم کے بڑے حصے کی باگ اُنھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ اگر خود ان کی حالت درست ہوتی تو وہ قوم کو بھی درست کرتے۔ نیا گروہ ان کے سجادے پر بیٹھا مگر وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ اپنا سا ایک گروہ اور پیدا کرے۔ پھر تعلیم کا جو نصاب تھا صرف اس لیے تھا کہ ملک میں ملازمت پیشہ گروہ کا اضافہ کردے۔ بس

ایسی حالت میں جب تک نئے علماء کا ایک وسیع گروہ ہم میں پیدا نہ کیا جائے اور علم و مذہب سے ترتیب پایا ہوا نصاب مرتب نہ ہو ہماری حالت میں حقیقی ترقی کی طرف کوئی تغیر نہیں ہوسکتا۔''(۲)

تقریباً یہی خیال، اگرچہ مختلف زور کے ساتھ الہلال میں دہرایا گیا۔ آزاد نے لکھا:

''ہم کو تو بسا اوقات یہ درد انگیز منظر مجنوں بنا دیتا ہے کہ آج مسلمانوں میں دو ہی طرح کے رہنما اور مرشدین ہیں۔ قدیم گروہ کے لیے پرانے علماء اور نئے گروہ کے لیے نئے لیڈر، دونوں مذہب سے بے خبر اور ملت کے لیے عضو مسموم، پہلا قریب رہ کر پیاسا ہے اور دوسرا پانی تک پہنچا ہی نہیں:

اِسے کشتی نہیں ملتی، اُسے ساحل نہیں ملتا

پہلا مذہبی توہمات و تعصبات و جمود میں مبتلا، دوسرا الحاد، فرنگ مآبی اور جاہ پرستی میں گرفتار ہے۔''(۳)

انڈیا ونس فریڈم (صفحہ ۸) میں آزاد لکھتے ہیں کہ باہر سے واپس آنے کے بعد انھوں نے مستقبل کا منصوبہ تیار کرنا شروع کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا جو کام وہ کرنا چاہتے ہیں، وہ پہلے اُردو میں ایک معیاری اخبار جاری کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔

''پنجاب اور یوپی سے بہت سے روزنامے اور ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ رسالے اُردو میں نکلتے تھے لیکن ان کی طباعت اور ظاہری شکل وصورت ان کے مشمولات کی طرح ہی افسوس ناک تھی۔ اُن کی چھپائی کا سارا عمل لیتھوگریفی سے ہوتا تھا، اس لیے اس میں جدید تصاویر بھی نہیں چھاپ سکتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اخبار اپنی ظاہری شکل وصورت میں پرکشش اور اپنے پیغام میں طاقتور ہوگا۔ اسے ٹائپ سے ہونا اور صرف گریفک لیتھو عمل سے چھپنا چاہیے۔'' اس کے لیے پریس وغیرہ کی تیاری میں یقیناً کافی وقت لگنا تھا لیکن پریس ان کا اپنا ہو، یہ ان کا عزم مصمم تھا، کیوں کہ اپنے ہم مذہبوں کے طرزِ فکر کو بدلنے اور ان کی کونسل کو اپنی فہم

کے مطابق اسلام کی تعلیم دینے کے لیے یہ عزم ضروری تھا اور آخر کار وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ انھیں اس کام میں ہو سکتا ہے کہ اپنے والد کے مریدوں کی مدد سے چندے کی کچھ فراہمی کرنی پڑی ہو، لیکن اس خیال کی تائید میں کوئی واضح شہادت نہیں ملتی۔ انھوں نے عطیات کے دروازے بند کر رکھے تھے، اور انھیں اشتہارات حاصل کرنے کی پروا بھی نہیں تھی، کیوں کہ بدیسی حکومت کے مظالم اور بے انصافی کے خلاف وہ ایک مقدس جنگ اسی صورت میں لڑ سکتے تھے، جب ان کا پریس آزاد ہو۔ پریس کی آزادی کی نے بھی اُن کی آزاد صحافت کا طرہ امتیاز تھی۔

یہاں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ آزاد کا اپنے پروگرام سے متعلق کیا خیال تھا اور اپنے فرقے کو اس کے مقدر کی طرف جیسا کہ اسے وہ سمجھتے تھے، لے جانے کے لائحہ عمل کے بارے میں ان کی اپنی رائے کیا تھی؟ اس کے بارے میں ہمیں ان کا کچھ کچھ خیال مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب [۴] کے ابتدائی کلمات میں ملتا ہے:

> ''۱۹۱۱ء میں جب کہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آیندہ زندگی کے لیے ایک مذہب عمل قرار دے لوں۔ اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانش مند مسافر کی طرح ہو، جس نے سفر سے پہلے راہِ منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے۔ اس وقت اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا ان میں ایک خاص مسئلہ یہ تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصے میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت، انجمنوں کے عہدوں اور اسی طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصوبوں سے یک قلم کنارہ کش رہوں گا۔ یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راہِ عمل منتخب کی تھی وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی، موجودہ زمانے کی مصلحت آمیز لیڈر شپ کی راہ نہ تھی۔ میرے سامنے اتباع و اقتدا کے لیے نوع انسانی

۔ے ان مخصوص افراد کا نمونہ تھا، جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پکارے گئے ہیں؟ اور جن کے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں 'حکمت' اور 'سنت' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں اپنی راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم و محمد (علیہما السلام) کے رہنما ہاتھوں میں دے دینے کے لیے مضطرب تھا۔ گریبالڈی، میزینی، یا گلیڈسٹن اور پارنل بننے کا عشق میرے اندر نہ تھا۔ پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشہ فقر و نامرادی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ منظر ہوتا یا انسانوں کے کسی ہجوم میں ایک پکارنے والے کی بے پروا پکار! خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوت اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست وحکومت، ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ''(۵)

یہ اور اس بیان سے جو ۲۱ رفروری ۱۹۲۲ء کو اپنے مقدمے کے اختتامیہ کے طور پر انھوں نے دیا تھا کہ ''گزشتہ بارہ سال سے میں اپنی کمیونٹی اور ملک کو اپنے حقوق اور آزادی کے مطالبے کی تلقین کر رہا ہوں۔'' صاف ظاہر ہے کہ ۱۱-۱۹۱۰ء ہی سے آزاد نے یہ طے کر لیا تھا کہ ان کی کمیونٹی کی اپنے حقوق کے حصول کی جدو جہد کے لیے ان کے مشن کی کیا نوعیت ہوگی اور اس میں ان کے اپنے اور ان کی پبلک لائف کا کیا رول ہوگا۔

بعض عرب ملکوں کی ادبی، ثقافتی اور سیاسی زندگی میں عربی صحافت کے رول سے متعارف ہونے کے سبب آزاد کو نہ صرف اُونچے معیار کا اُردو پریس قائم کرنے اور اچھے اُردو ٹائپ اور صاف ہاف ٹون تصاویر چھاپنے کا حوصلہ ہوا، بلکہ بہترین کاغذ پر ایک ممتاز ہفتہ وار نکالنے کا شوق بھی پیدا ہوا جس میں، مغرب کے جرائد کے مضامین کے اُردو ترجموں کے اقتباسات کے علاوہ، مغرب اور عرب دنیا کے اہل قلم کی اوریجنل تحریریں اور ان کے مضامین کے تراجم شامل ہوں اور اس پریس کے آزاد کردار کو قایم رکھا جائے۔ مختصراً یہ کہ بنیادی طور پر اس کا طرزِ انشاء اور اس کی پالیسی قوم پرستانہ ہوگی اور وسیع مفہوم میں اس میں اسلامی، ادبی اور سیاسی مضامین چھپیں گے۔

آزاد لبنان، شام اور مصر کے رسالے اور اخبارات پابندی سے دیکھتے تھے۔ انھیں اچھے اور معیاری جراید نکالنے کا ٹیکنیکل علم یہیں سے حاصل ہوا۔ قاہرہ سے نکلنے والے جرجی زیدان کے الہلال سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے، کچھ آسمان صحافت پر نئے چاند کی مناسبت سے اور کچھ قاہرہ کے اس رسالے کے نام کی وجہ سے انھوں نے اپنے اخبار کا نام یہیں سے لیا لیکن دونوں کے مشمولات، مقاصد اور لائحہ عمل میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء کو نکلا۔ ہر لحاظ سے یہ آزاد کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ ان کے وسایل مختصر اور معمولی تھے، لیکن مغرب کے اخبارات کے نمونے پر اُردو کے اس باتصویر ہفتہ وار اخبار کو انھوں نے مہتم بالشان انداز سے ایڈٹ کیا۔ اس کام میں بڑے عالم فاضل لوگ اور مترجم ان کے معاون تھے۔ الہلال کا مقصد اور سیاسی پیغام کیا تھا۔[۶] اسے انھوں نے ۸؍ستمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں واضح کیا ہے۔ ہمیں اسے غور سے پڑھنا چاہیے۔ ایک دوست کے خط کے جواب میں جو بعض معاملات میں ان کی رہنمائی کے آرزومند تھے، پہلے تو آزاد نے اپنے مذہبی خیالات اور تحریروں کی قدر دانی کا شکریہ ادا کیا اور پھر خط کے ان نکات کے بارے میں لکھا:

"(۱) سیاسی مباحث مذہبی تعلیم سے الگ ہونے چاہییں۔

(۲) ہندستان میں اس وقت جو پولیٹکل گروہ موجود ہیں، ان میں سے الہلال کس کا ساتھ دیتا ہے۔

پہلے نکتے کے بارے میں لکھتے ہیں "امر اوّل کی نسبت گزارش ہے کہ یہ تو جناب نے اس بنیادی اصول کو چھیڑ دیا جس پر ہم الہلال کی پوری عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو، ہم تو اسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے، اس کے سوا اور ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ ہم انھیں مذہب سے کیوں کر الگ کر دیں'؟ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو

(قرآن) کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو، ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اسی میں شامل ہے۔

افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا۔ ورنہ اپنی پولیٹکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کی اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال اور معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مگر عملاً یہ حال ہے:

''انھوں نے زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم ایمان لائے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہیں۔''

اس کے بعد آزاد نے اسلام کے توحید کے عقیدے سے متعلق لکھا ہے جس کا مطلب خدا کی تسلیم و رضا ہے اور یہ عقیدہ ہمہ وقت مسلمانوں کو یہ یاد دلاتا رہتا ہے کہ وہ بہترین اُمت ہیں اور زمین پر خدا کے خلیفہ بنائے گئے ہیں، ہر مسلمان سے توقع ہے کہ وہ اسی طرح محسوس کرے گا اور افلاس، بزدلی اور خوف کے بجائے وقار، خودداری اور ہمت و استقامت کے ساتھ رہے گا۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ دوسروں کی بھلائی چاہیں، نیکی کا حکم دیں اور برائی اور فساد کو روکیں، جو لوگ انسانوں کی بھلائی کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کی مدد کریں اور ایسے دنیاوی اقتدار کی مخالفت کریں جو لوگوں کو اپنی حکمرانی قبول کرنے اور اس کی پرستش پر مجبور کرے۔ آزاد پوچھتے ہیں کہ دنیاوی اقتدار یا حکومت کو وہ حق کیسے مل سکتا ہے جس سے خدا کے برگزیدہ پیغمبر بھی محروم رہے ہیں:

''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ پس اس کے نزدیک وہی حکومت جائز ہو سکتی ہے جو شخصی نہ ہو بلکہ کسی ملت اور قوم کے ہاتھ میں ہو۔ اسی بنا پر اس کے مشورے کا حکم دیا۔ پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انھیں

جب تک نہ مل جائے اپنے اصول مذہبی کی خاطر چین نہ لیں۔

یہ اصول ہیں جن سے ہم اپنی پولیٹیکل پالیسی تیار کر سکتے ہیں اور جس کے لیے ہمیں نہ تو ماڈریٹ ہندوؤں کی کاسہ لیسی کی ضرورت ہے، نہ اکسٹریمسٹ کی! اگر ہم ایسا کریں تو ایک اعتدال پسند اور بے خوف جماعت ہوں گے اور ہم سے کسی فریق کو ضرر اور نقصان کا خوف نہ ہوگا۔ ہم بالکل اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملک کی ترقی اور آزادی کے لیے سعی کریں گے، لیکن ہماری سعی فتنہ وفساد اور شورش اور بغاوت سے بالکل پاک ہوگی۔ قرآن نے ہم کو سکھلا دیا ہے کہ لاتفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ''امن کے بعد زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔''(۷)

''برٹش گورنمنٹ نے یقیناً ہم کو امن دیا ہے اور اس امن میں ہم آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرایض انجام دے سکتے ہیں۔ پس اب باغیانہ شر و فساد اور مغرورانہ قانون شکنی اصلاح کے بعد زمین کو آلودہ فساد کرنا ہوگا۔(۸) قرآن کریم کی یہ تعلیم ہے کہ تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان(۹)

گورنمنٹ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہم مسلمان سچے مسلمان ہو جائیں تو جس قدر اپنے نفس کے لیے مفید ہوں، اتنا ہی گورنمنٹ کے لیے نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لیے۔ اس کو بھولنا نہیں چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں، تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور جو ہاتھ قرآن سے رکا ہوا ہو وہ بم کا گولہ یا ریوالور نہیں پکڑ سکتا۔(۱۰) البتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی کو حاصل کرنے، دونوں کی تعلیم دی ہے۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں۔ ہم خدا کی مرضی اسی میں دیکھتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کو اپنے اُوپر آپ حکومت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور یورپ خود اسی اصول پر کاربند ہو کر آزاد ہو چکا ہے۔

ہم انگلستان سے آج اسی شے کے طالب ہیں جس شے کے لیے وہ خود کل تک بے قرار تھا۔

یہی الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں۔ اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی پولیٹیکل رہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اس کو یہی راہِ عمل اختیار کرنی چاہیے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم (۱۱)

اب اس طویل اقتباس کا موازنہ ایک طویل انتخاب سے کیجیے جو مولانا آزاد کے اس بیان سے لیا گیا جسے انھوں نے اپنے تاریخی مقدمے کے آخر میں جنوری ۱۹۲۲ء میں کلکتہ کے مجسٹریٹ کو دیا تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ یہاں اسی موضوع کا ایک تسلسل جسے انھوں نے الہلال کی پالیسی کے طور پر شائع کیا تھا، وہی لائحہ عمل، مذہبی تلمیحات و زبان کا وہی استعمال ہے۔ انھوں نے کہا:

''میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوش نما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے، پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے، جو نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی

اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیے اور دنیا کو یہ بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیار فضیلت نہیں بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے (۱۲) جس کے کام سب سے اچھے ہوں۔

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی بیوروکریسی کیا حکم رکھتی ہے؟ اگر آج ہندستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو یا چند حاکموں کی بیوروکریسی ہو، تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہوگا کہ اس کو ظالم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبے کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے، تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے۔ کیوں کہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے...... یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں شاہد ہیں...... وكذالك جعلنا كم امة وسطا

لتکونوا شھداء علی الناس [۱۳] بحیثیت ایک قوم کے یہی ان کا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے اور یہی ان کی قومی خصوصیت، جو ان کو تمام پچھلی اور آیندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے۔[۱۴]

اس بیان میں آزاد نے اعلان کیا کہ ''اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے، وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ مسلمان آزادی کھو کر زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔''[۱۵]

''......میں مسلسل بارہ سال سے اپنی قوم اور ملک کو آزادی اور حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری اٹھارہ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی۔[۱۶] میں نے زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہدِ شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کر دیا۔ میں اس کی خاطر چار سال تک نظر بند رہا مگر نظر بندی میں بھی میری ہر صبح و شام اسی کی تعلیم و تبلیغ میں بسر ہوئی۔ یہ تو میری زندگی کا دائمی مقصد ہے۔ میں صرف اسی ایک کام کے لیے جی سکتا ہوں۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین[۱۷]

''میں اس جرم سے کیوں کر انکار کر سکتا ہوں جب کہ میں ہندستان کی اس آخری اسلامی تحریک کا داعی ہوں جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹکل مسلک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا جہاں آج نظر آ رہے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں ایک اُردو جرنل الہلال جو اس تحریک کا آرگن تھا، یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔''[۱۸]

درج بالا اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد شروع ہی سے نیشنلسٹ تھے، لیکن مسلم (خاص طور پر پاکستانی) اور غیر مسلم مورخین، جو داخلیت، ناواقفیت یا غلط فہمی کی بیماریوں میں

مبتلا رہے ہیں، کی ایک بڑی تعداد نے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیانی وقفے میں انھیں پین اسلامسٹ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً الہلال کے پہلے ہی شمارے میں سیّد جمال الدین افغانی کی تصویر کا چھپنا ہے جو اوّل درجے کے پین اسلامسٹ سمجھے جاتے ہیں یا پھر مستقل طور پر وہ باہر کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں، خصوصاً اُن مصائب کا حال بیان کرتے ہیں جنھیں مسلمانوں نے طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جھیلا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی سے آزاد کی کھلی ہمدردی، سیاسی پیغام پر مذہب کا رنگ، الہلال اور البلاغ [۱۹] کے مضامین اور اداریے جن میں قرآن وحدیث کے مناسبِ محل وقوع حوالے ہوتے تھے اور مذہبی زبان اور علامتوں کا استعمال بھی اور بعد میں خلافت تحریک میں آزاد کا نمایاں رول بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں۔ ابھی حال میں اُن پر اساسیت پسندی (فنڈامنٹلزم) کا الزام لگایا گیا ہے جسے انھوں نے الہلال اور البلاغ کے کالموں کے ذریعے فروغ دیا اور اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی بتایا۔

اس مدت کے دوران آزاد کے مذہبی وسیاسی خیالات کا ہمارا مطالعہ دوٹوک یہ بتاتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم مورخین کی یہ رائیں غلط فہمی پر مبنی ہیں اور اس لیے ان رایوں کو صحیح نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان سے نہ صرف ایک انقلابی دین کی حیثیت سے اسلام کے بنیادی مزاج کی تفہیم و تعبیر میں غلطی کی نمائندگی ہوتی ہے بلکہ یہ رائیں مسلمانوں میں مذہبی وسیاسی بیداری کی تحریک کے اصل سیاسی مقصد کو صحیح صحیح نہیں سمجھ سکی ہیں۔ اسلام اخلاقی اور روحانی مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے اور اسی پر اپنی انسانی اور عالمگیر برادری کے تخیل کی بنیاد رکھتا ہے۔ برادری کے اس تخیل پر وہ مسلمانوں کے دائمی اور مشترک تعلق پر یقین بھی رکھتا ہے۔ آزاد مسلمانوں کی ایک ایسی برادری کے قائل بھی تھے اور اسے اٹل بھی تصور کرتے تھے اور اس لحاظ سے وہ یقیناً پین اسلامسٹ تھے۔ [۲۰] لیکن یہ پین اسلامزم افغانی [۲۱] کے اس سیاسی پین اسلامزم سے بالکل مختلف تھا، جسے برطانیہ اور دوسری یورپی طاقتیں مشرق قریب میں اپنے استعمار اور نوآبادکارانہ پھیلاؤ کے لیے ایک دھمکی تصور کرتی تھیں اور جسے سلطان عبدالحمید ایک طرف عثمانی سلطنت و خلافت کے لیے یورپی طاقتوں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی خاطر سیاسی حربے کے طور پر اور

دوسری طرف جدید ترکوں اور عرب قوم پرستوں کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ (۲۲)

مزید برآں ۱۹۰۸ء میں مغربی ایشیا کے ملکوں کے سفر کے دوران آزاد کو جو تجربہ ہوا تھا، اس نے ''بعد میں اُن کے سیاسی فکر کی تشکیل'' میں نمایاں حصہ لیا۔ رجت رے کی یہ بات ان کے درج ذیل تبصرے کی روشنی میں بمشکل ہی رد کی جاسکتی ہے:

> ''مشرقِ وسطیٰ سے وہ کوئی رجعت پرست فنڈامنٹلسٹ فلسفہ نہیں لائے، بلکہ وہ قومی انقلاب کا ایک وژن لے آئے۔ اس پر زور دینا چاہیے کہ مشرقِ وسطیٰ کے سفر کے دوران جو پین اسلامی نقطہ نظر انھیں ملا، قومیت (نیشنلزم) اس کا جزو لاینفک تھی۔ جب انھوں نے جذباتی اور علمی طور پر ترکوں، عربوں اور ایرانیوں کی اسلامی دنیا سے اپنی شناخت قایم کی، تو درحقیقت انھوں نے اُس سلگتی آرزو سے اپنی شناخت قایم کی جوان قوموں کو اور ہندستان میں ان کی قوم کو متحرک اور فعال بنائے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں آزاد قوم پرست (نیشنلسٹ) تحریک سے وابستہ رہے جب کہ بہت سے خلافتی رہنما انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف ہو گئے تھے۔ کانگریس میں رہنے کے فیصلے نے ان کی اپنی کمیونٹی کی اکثریت سے انھیں جدا کر دیا۔ انھیں یہ جدائی گوارا تھی، اور وہ اُس تاریک دور پر قانع تھے، جب ان کی اپنی دنیا پاش پاش تھی، کیوں کہ اس پر اُن کا اخلاقی ایقان مستحکم تھا کہ نیشنلزم اور اسلامی برادری ایک دوسرے کے متخالف نہیں، بلکہ دونوں ایک ہی تھے۔ اس ایقان کی بنیاد کہ اسلامی برادری کا ماننے والا اچھا نیشنلسٹ بھی ہے ان کے مشرقِ وسطیٰ کے تجربے پر تھی۔'' (۲۳)

جہاں تک آزاد کے پیغام کے مذہبی کردار کا تعلق ہے، وہ تقریباً انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندو نشاۃ ثانیہ، انیسویں صدی کے اواخر میں تلک اور بعد میں گاندھی جی جیسا تھا

جس میں سیاسی مقاصد کے لیے کامیابی کے ساتھ ہندو علامتوں کا استعمال کیا گیا تھا لیکن آزاد کی بات لایق ستایش تھی کہ انھوں نے اپنے پیغام کی مذہبیت کو سیاسی مقاصد کا رنگ بدل دینے کی اجازت نہیں دی۔ کلکتہ کے مجسٹریٹ کے سامنے ۱۹۲۲ء میں انھوں نے جو بیان دیا تھا، اس میں بھی اسی بات پر ایک بار پھر زور دیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

> ''میں بتلانا چاہتا ہوں کہ الہلال تمام تر ''آزادی یا موت'' کی دعوت تھی۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک بحث و نظر کی بنیاد ڈالی، اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر اشارہ کروں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے ہیں (۲۴) الہلال اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں، دونوں کی نئی اور طاقت ور سرگرمی اسی وقت شروع ہوئی جب دونوں میں مغربی تہذیب کی جگہ مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے پوری طرح فروغ پالیا۔'' (۲۵)

اپنی ذہنی ترقی کے لیے سر سیّد احمد خاں کا مرہونِ منت ہونے کے باوجود مولانا آزاد ہندستان میں انگریزی حکومت کی وفاداری کے، جو سر سیّد کا شعار تھا، سخت خلاف تھے (۲۶)۔ سر سیّد (م ۱۸۹۸ء) کی وفات کے بعد 'علی گڑھ پارٹی' نے ان کی پالیسی کو جوں کا توں اپنا لیا۔ نواب محسن الملک ایم اے او کالج کے سیکرٹری ہوئے تو وہ علی گڑھ کی روایتی برطانیہ دوستی کی پالیسی کے خلاف کچھ نہ کرنے کے لیے مجبور ہوئے پرنسپل موریسن اور دوسروں نے یو پی کے گورنر کے ۱۸ر اپریل ۱۹۰۰ء کے اعلان کی مخالفت کرنے پر اُن کی ہمت افزائی نہیں کی اور انھیں خاموش رہنا پڑا۔ اس اعلان کا مقصد یہ تھا کہ عدالتوں میں اُردو کے ساتھ دیوناگری رسم خط میں ہندی کا چلن بھی ہو اور حکومت کی مختلف دفتری اسامیوں پر تقرر کے لیے ہندی جاننا بھی ضروری ہو۔ یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر اینتھنی میکڈانل نے لکھنؤ میں نواب کی تقریر (اگست ۱۹۰۰ء) کو سخت ناپسند کیا، علی گڑھ گئے، کالج کے ٹرسٹیوں سے ملے اور اُن سے کہا:

> ''نواب (محسن الملک) یا تو علی گڑھ کے سیکرٹری رہیں یا انجمن اُردو

کے صدر رہیں...... وہ اس وقت تک کسی تحریک کے سربراہ نہیں ہو سکتے
جب تک کہ کالج کے سیکرٹری ہیں۔"

اسی طرح مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن قایم کرنے کے سلسلے میں نواب وقارالملک کی کوششیں بھی انگریز افسروں نے علی گڑھ کالج کی فلاح و بہبود کی خاطر ناکام بنادیں، لیکن ایک مسلم سیاسی تنظیم کے لیے اس وقت مسلمانوں کی ہمت افزائی کی گئی جب سرکار برطانیہ نے ہندو انقلابیوں اور قوم پرستوں کی احتجاجی سیاست کا مقابلہ کرنے کی خاطر اسے مناسب سمجھا۔

یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ شملہ ڈیپوٹیشن، حکم کی تعمیل تھا یا خود نواب محسن الملک کا اپنا خیال۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہندی کے حق میں حکومت کے ۱۹۰۰ء کے اعلان پر نکتہ چینی کے لیے یو پی کے لیفٹنٹ گورنر نے نواب محسن الملک کو ڈانٹا تھا اور انھیں علی گڑھ سے ایک سیاسی تحریک نہ چلانے کا پرنسپل موریسن کا مشورہ ماننا پڑا تھا۔ مگر ۱۹۰۶ء میں صورت حال بدل گئی تھی اور خالص سیاسی نوعیت کے ڈیپوٹیشن کی تنظیم کے لیے اُن کی ہمت افزائی کی گئی اور یقین دلایا گیا کہ اس سے کسی طرح بھی علی گڑھ کالج کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

طفیل احمد منگلوری اپنی کتاب میں ایک خط (مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء) کا حوالہ دیتے ہیں جسے ضلع علی گڑھ کے ایک ممتاز زمیندار، نواب حاجی محمد اسماعیل خاں نے یو پی کی موسم گرما کی راجدھانی نینی تال سے، محسن الملک کو لکھا تھا۔ نواب صاحب صوبے میں اقتدار کی کرسی تک آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ اپنے خط میں انھوں نے محسن الملک کو لکھا تھا کہ وہ وائسرائے کے سامنے ایک عرض داشت گزاریں کہ برٹش پارلیمنٹ میں ہندستان کے بجٹ کے موقعے پر جان مورلے نے اپنی تقریر میں جن آئینی اصلاحات کا ذکر کیا ہے [۲۷] وہ عمل میں آئیں تو مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ نواب نے خود محسن الملک کو لکھا یا کسی اور نے ان سے یہ خط لکھوایا۔ وہ دستاویز [۲۸] بھی جو آج ہمیں ملتی ہیں، یہ باور کرانے میں ناکام ہیں کہ حکومت وقت کی، تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا کوئی تعلق شملہ ڈیپوٹیشن سے نہیں تھا۔

جان مورلے کے نام ہندستان کے وائسرائے منٹو کا ۹ رمئی ۱۹۰۶ء کا خط موجود ہے۔ یہ

خط اوّل الذکر کے اس ارجنٹ ٹیلی گرام کے جواب میں تھا جس میں ترکوں سے جنگ کی صورت میں ہندستان کے مسلمانوں کے جذبات اور شمال مغربی سرحد پر امیر افغانستان کے ساتھ کچھ دشواری کے امکان کے بارے میں استفسار تھا۔ اس خط میں وفادار ہندستانی مسلمانوں کے ممکنہ احتجاج سے متعلق انگریز حکومت کی پریشانی کا ذکر بھی ہے[۲۹]۔ تقسیم بنگال کے خلاف تیزی سے پھیلتی سودیشی تحریک پر حکومت پہلے ہی بہت خوفزدہ تھی۔

اس پس منظر کے پیش نظر اگر کوئی پرنسپل آرچ بولڈ کے نام محسن الملک کا خط (مورخہ ۴ر اگست ۱۹۰۶ء، پرنسپل آرچ بولڈ اس وقت شملہ میں موجود تھے) پڑھے تو دلچسپی کی حد تک یہ بات واضح ہو جائے گی کہ کالج کا سیکرٹری (محسن الملک) کالج کے انگریزی پرنسپل کو جسے مسلمانوں کے حقوق کی بہ نسبت برٹش مفاد کے تحفظ کی زیادہ فکر تھی، اپنی فکرمندی میں شریک کرنے کے لیے کس قدر بے تاب ہے! برٹش حکومت کا ارادہ تھا کہ قانون ساز کونسلوں میں پرسنل حق رائے دہندگی کے ساتھ انتخاب کے اصول پر عمل کرے۔ محسن الملک اس سے خوفزدہ تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ چوں کہ برٹش حکومت ہندوؤں کی احتجاجی سیاست کے دباؤ کی وجہ سے اپنی روایتی پالیسی سے ہٹ رہی ہے، اس لیے اس پالیسی کی مخالفت ضروری ہے۔ اپنے خط میں انھوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ موجودہ حالات میں نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جائیں گے، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی طرف ہمدردانہ توجہ کی جائے۔ محسن الملک کا یہ خط اس استفسار پر ختم ہوتا ہے:

> "......اس لیے کیا آپ (آرچ بولڈ) مجھے مطلع فرمائیں گے کہ مسلمانوں کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کرنا اور گزارش کرنا مناسب ہوگا کہ وہ اس معاملے میں مسلمانوں کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لیے ایک ڈیپوٹیشن کے حاضر ہونے کی اجازت دیں۔"[۳۰]

وائسرائے کے سیکرٹری، ڈنلپ اسمتھ کے نام آرچ بولڈ کے پراسرار خط (۹ر اگست

۱۹۰۶ء) کے ایک اقتباس سے تقسیم بنگال سے پیدا ہونے والی ایک خاص صورت حال کے بارے میں سامراجی انگریز کے طرزِ فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آرچ بولڈ لکھتے ہیں:

''میں نے نواب محسن الملک کو لکھا ہے کہ جب تک میرا خط نہ پہنچے وہ کچھ نہ کریں اور سیّد حسین بلگرامی بھی میرے خط کا انتظار کریں۔ ایک خیال رہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم جو کچھ بہتر سے بہتر کر سکتے ہیں اُس میں آپ اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ ڈھاکہ کے مسلمان، جو گفتگو ہم کر رہے ہیں اُس میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں اور نواب کے خط میں جس ڈیپوٹیشن کا ذکر ہے، اس میں ضرور شامل ہوں گے۔ ابھی حال ہی میں ہماری اچھی خط و کتابت (اور بات چیت؟) ان سے ہوئی ہے۔ یہ اچھا ہوگا کہ ان کی موجودہ مشتعل مزاجی کی کیفیت میں ان کی قوتیں فطری اور جائز سمت کی طرف موڑ دی جائیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ڈیپوٹیشن کے سامنے اعتماد پیدا کرنے والا کوئی ایسا بیان دیا جائے جس سے ہندوؤں یا کسی اور کے ساتھ ناانصافی نہ ہو تو معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ جب میں نے ڈھاکہ کی میٹنگ اور بے چینی کا حال پڑھا اور متعلقہ لوگوں کے نام دیکھے تو مجھے وہاں کی اور ممکن ہے دوسرے جگہوں کی مشکلات کا حل ڈیپوٹیشن ہی میں نظر آیا اور اسی مشورے کے لیے میں مضطرب تھا۔'' (۳۱)

۱۰ ر اگست ۱۹۰۶ء کو آرچ بولڈ نے محسن الملک کو لکھا:

''کرنل ڈنلپ اسمتھ جو ہز اکسیلنسی دی وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں، لکھتے ہیں کہ ہز اکسی لنسی مسلم ڈیپوٹیشن سے ملنے کے لیے رضامند ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ ضابطے کا ایک خط کہ ہز اکسی لنسی سے ڈیپوٹیشن ملنا چاہتا ہے، انھیں بھیج دیا جائے۔ اس سلسلے میں میری چند تجاویز ہیں۔ ضابطے کا خط بعض نمائندہ مسلمانوں کے دستخط سے بھیجا

جائے۔ ڈیپوٹیشن میں مختلف صوبوں کے نمایندے شامل ہوں۔ تیسری بات ایڈریس کے متن پر غور وفکر کرنا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہم اسے وفاداری کے ابتدائیہ کلمات سے شروع کریں۔ سیلف گورنمنٹ کی طرف قدم اُٹھانے کا حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے لیکن اپنا یہ خدشہ بیان کر دینا چاہیے کہ الیکشن کا اصول اگر حکومت نے اسے نافذ کیا، مسلم اقلیت کے حق میں مضر اور مہلک ہوگا۔ نہایت ادب سے یہ تجویز کرنا ہے کہ نامزدگی یا مذہب کی نمایندگی کا نفاذ ہی مسلم رائے عامہ کا مطالبہ پورا کرے گا۔ ہمیں یہ بھی کہنا چاہیے کہ ہندستان جیسے ملک میں زمینداروں کے خیالات کو ضروری اہمیت دینی چاہیے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو نامزدگی ہی پر زور دینا چاہیے کیوں کہ الیکشن میں مسلمانوں کے لیے اپنا حصہ لینا مشکل ہوگا لیکن یہ تمام خیالات پیش کیے جائیں تو میرا نام چھپا ہی رہنا چاہیے۔ یہ آپ کے خیالات ہوں گے۔ میں ایڈریس کا مسودہ تیار کرسکتا یا اس پر نظر ثانی کرسکتا ہوں۔ اگر بمبئی میں یہ تیار ہو تو میں اسے دیکھ لوں گا، اسی لیے کہ (جیسا کہ آپ واقف ہیں) میں مناسب زبان میں اس طرح کی چیزوں کو بیان کرسکتا ہوں۔ براہِ کرم اس کا خیال رکھیے کہ اگر ہمیں کم وقت میں ایک طاقت ور تحریک کی تنظیم کرنی ہے تو ہمیں جلدی کرنی چاہیے۔"(۳۲)

مسلمان لیڈروں نے ڈیپوٹیشن کو منظم کرنے میں بڑی جلدی کی اور مقررہ تاریخ یعنی یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو آغا خاں (۱۸۷۵-۱۹۵۸ء) کی قیادت میں ممتاز مسلم نمایندوں نے ایڈریس پیش کیا جو بہت دلچسپ لیکن دور آفریں ہے۔ اس کے دلچسپ پہلو (۳۳) کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کے تاریخی اور اہمیت کے حامل نکتے نے جس پر، اس میں روشنی ڈالی گئی ہے، برصغیر ہند میں مسلمانوں کے مقدر کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس ایڈریس میں

وائسرائے بہادر سے کہا گیا تھا کہ تمام آئینی اصلاحات میں مسلمانوں کو راست یا بالواسطہ نمایندگی، نہ صرف ان کی عددی قوت بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور اُن کی ان خدمات کی قدر و قیمت کے پیش نظر ملنی چاہیے جو وہ امپائر کے دفاع میں انجام دیتے ہیں (۳۴)۔ یہ بھی کہا گیا کہ ''اس بات کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ ہم مسلمان اپنے ذاتی مفاد کے لحاظ سے الگ ایک کمیونٹی ہیں جس میں ہندو شریک نہیں ہیں اور اب تک اس اعتبار سے نقصان اُٹھایا ہے کہ انھیں مناسب طور پر نمایندگی نہیں دی گئی'' (۳۵)۔ اس کے بعد نمایندگی کا مسئلہ زیر بحث آیا اور ڈیپوٹیشن نے کہا کہ ''نمایندہ ادارے جو یورپ کے طرز کے ہیں، ہندستان کے لوگوں کے لیے نئے ہیں۔ اس لیے اگر ہندستان کے موجودہ سماجی اور مذہبی حالات میں انھیں اپنایا جائے تو بڑی احتیاط، غور و فکر اور سمجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا اور یہ کہ احتیاط اور سمجھ بوجھ کی عدم موجودگی میں ان کو اختیار کرنے میں، دوسری برائیوں کے علاوہ بڑی برائی یہ ہے کہ ایک غیر ہمدرد اکثریت پر ہمارا قومی مفاد منحصر ہو'' (۳۶)۔ اس نے نمایندہ جماعتوں میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے طریقے تجویز کیے اور یہ مشورہ دینے کی گزارش کی کہ ''ہر کمیونٹی کو الگ الگ اپنے نمایندے بھیجنے کی اجازت ہو'' (۳۶)۔ یعنی اس میں علاحدہ حق رائے دہندگی (Separate Electorates) کی وکالت کی گئی تھی۔

وائسرائے نے ڈیپوٹیشن والوں کی آرزوؤں سے کھل کر اظہار ہمدردی کیا اور کہا: جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، تمھارے ایڈریس کا مطلب یہ مطالبہ ہے کہ نمایندگی کے نظام میں مسلم فرقے کو ایک فرقے کی حیثیت سے نمائندگی ملنی چاہیے اور تمھارا یہ مطالبہ مبنی بر انصاف ہے (تاکید از مصنف) کہ تمھارا مرتبہ نہ صرف تمھاری قوت کے اعتبار سے متعین کیا جائے بلکہ اس کا لحاظ کیا جائے کہ تمھارے فرقے کی سیاسی اہمیت کیا ہے اور اس نے امپائر کی کیا خدمت کی ہے۔ مجھے تم سے کامل اتفاق ہے۔ جس طرح تمھیں متیقن پاتا ہوں اسی طرح مجھے یقین ہے کہ ہندستان میں انتخابی نمایندگی کا ہر وہ نظام ناکام ہو کر رہے گا جس نے مختلف فرقوں کی روایات اور عقاید کی پروا کیے بغیر پرسنل حق رائے دہندگی کا ارادہ کیا (۳۸)۔

یہ ڈیپوٹیشن وائسرائے سے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ملا تھا۔ اس کے لیڈر آغا خاں نے

۴؍اکتوبر ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک کو لکھا کہ وہ شملہ میں مسلمان لیڈروں کے فیصلے کے مطابق ڈیپوٹیشن کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک مرکزی تنظیم قائم کریں اور اسی طرح ''صوبوں میں بھی مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے صوبائی انجمنیں بنائی جائیں۔''(۳۹) اس خط میں کچھ اور ہدایات بھی تھیں۔ اس کے بعد ۲۹؍اکتوبر کو آغا خاں نے ڈنلپ اسمتھ کو مطلع کیا:

> ''ہزاکسی لنسی وائسرائے کے سامنے ڈیپوٹیشن نے اپنی درخواست میں واضح مقاصد کے حصول کے لیے جو تجاویز رکھی ہیں ان پر عمل کی خاطر میں نے ڈیپوٹیشن کے تمام ممبروں سے ایک مستقل کمیٹی کی تشکیل کے لیے کہا ہے۔ میں نے اپنے دیرینہ دوست نواب محسن الملک کو جو بہت زیادہ وفادار اور پرجوش مسلمان ہیں، میری عدم موجودگی میں آگے کام کرنے کے طریقہ کار سے متعلق کچھ ہدایتیں بھی دی ہیں۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک وہ نجی طور پر حکومت کی رضامندی حاصل نہ کرلیں کسی معاملے میں کوئی قدم ایسا نہ اُٹھائیں کہ نادانستہ طور پر وہ حکومت کو اُلجھن میں مبتلا کردیں۔ وہ اس بے ضابطہ کمیٹی کے اعزازی سیکرٹری ہوں گے اور اُن سے زیادہ اچھا اور قابل اعتماد آدمی ہمیں ملے گا بھی نہیں!''

کیا اس مکتوب کے نسخ والے حصے پراسرار اہمیت کے حامل نہیں ہیں؟ آغا خاں کو برٹش امپائر میں سب سے زیادہ وفادار مسلمان ہونے کی وجہ سے حکومت وقت کا پور اعتماد حاصل تھا۔ اپنے ہم مذہبوں کی سیاسی سرگرمیوں سے انگریز حکومت کو پوری طرح باخبر رکھنا انھوں نے اپنا فرض منصبی تصور کررکھا تھا۔

اور یہ وہی آغا خاں تھے جنھوں نے ۱۹۰۵ء میں کمانڈران چیف لارڈ کچنر کے ہمہ گیر چارج میں، جو مہدی سوڈانی کی ہڈیوں کو ان کی قبر سے نکلوانے کی ذلت میں متہم تھے، شمالی مغربی سرحد پر انگریزوں کے دفاع کو مضبوط کرنے کی خاطر امپریل سروس ٹروپ کی تشکیل کے

لیے تجویز پیش کی تھی (۴۰)۔ اپنے انڈین جرنل میں ۹رفروری ۱۹۱۰ءکو ان کے بارے میں لیڈی منٹو نے لکھا ''ہمارے ساتھ ٹھہرنے کے لیے آج آغا خاں پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے، درمیان سفر میں انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیسی لوگوں (Natives) کے جذبات سے اپیل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کے مذہبی توہمات کا واسطہ تلاش کیا جائے اور اسی لیے مسجد کے ہر امام کو یہ ہدایت دی ہے کہ یہ فتویٰ جاری کریں کہ وہ مسلمان جو بغاوت بھڑکائیں یا لوگوں میں باغیانہ خیالات پھیلائیں ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جائیں گے۔ اسی خیال سے انھوں نے ہندوؤں سے بھی اسی قسم کا ایک منشور جاری کرنے کی تجویز رکھی ہے کہ مستقبل کی زندگی میں اُن کی مسرت و سعادت کے امکانات مشتبہ ہیں۔'' (۴۱)

ذیل میں بھی ایک 'قیمتی' مشورہ درج ہے جسے ہندستانی مسلمانوں کے اس بزعم خود لیڈر نے جولائی ۱۹۱۳ء میں مسلمانانِ ہند کو دیا تھا جب کہ طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں میں ترک پہلے ہی اُن بعض یورپی طاقتوں کے ہاتھوں نا قابل بیان مصائب و آلام جھیل چکے تھے جن کی طرف برطانیہ نے جان بوجھ کر چشم پوشی اور بعض صورتوں میں ہمت افزائی کا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ مشورہ یہ تھا:

> ''اسلامی دنیا میں ہندستان کے مسلمان جو کچھ بھی وزن رکھتے ہیں اسے ترکی اور دوسرے مسلم ممالک کو برطانیہ پر سچا اعتماد کرنے کے کام میں استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح، وہ صرف برٹش امپائر کی ہی اچھی خدمت نہ کریں گے بلکہ دوسرے ملکوں میں رہنے والے اپنے ہم مذہبوں کی بھی۔ برطانیہ اور دنیاے اسلام کی فلاح و بہبود ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ ہندستان کے مسلمان، اس طرح، اُس مقدر کے تقاضے کو پورا کریں گے جسے قضا و قدر نے طے کیا ہے اور یہ کہ ان میں سے اگر ایک کمزور ہوتا ہے تو دوسرا بھی کمزور ہوگا۔'' (۴۲)

ڈیپوٹیشن نے وائسرائے کو یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اپنی عرض داشت پیش کی۔ ''آج شام کو''

لیڈی منٹو نے لکھا ہے" مجھے ایک افسر کا یہ خط ملا (۴۳): یور ایکسی لنسی کی خدمت میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج ایک بہت بڑا واقعہ ظہور میں آیا، سیاسی تدبر کا ایسا عمل جو ایک طویل مدت تک ہندستان اور تاریخ ہند کو متاثر کرے گا یعنی باغیانہ مخالفت سے چھ کروڑ بیس لاکھ کی آبادی کو پیچھے ہٹا لینے کا یہ کارنامہ" اور اسی دن "لندن ٹائمز" نے جسے پہلے ہی اس ایڈرس کی ایک نقل مل چکی تھی، اس کا ایک اہم دستاویز کی حیثیت سے خیر مقدم کیا اور کہا" جدید ہندستان کی طرف سے اوریجنل سیاسی فکر کا یہی ایک کارنامہ ظہور میں آیا ہے۔"(۴۴) "ٹائمز" نے مسلمانوں کی حالیہ تاریخ میں اسے مثالی اقدام بتایا اور ان کے پس پشت کارفرما سیاسی دانش مندی کی تعریف کی۔ اس کا خیال تھا کہ" یہ بیس سال کی سیاسی خاموشی کی پالیسی کو چھوڑ دینا ہے۔ اس بیس سال کے عرصے میں مسلمانوں نے ایمانداری سے سرسیّد کے مشورے پر عمل کیا اور اپنے آپ کو احتجاج کی سیاست سے الگ رکھا۔"(۴۵) اس نے یہ بھی لکھا کہ اگرچہ وہ سیاسی حوصلہ مندیاں رکھتے تھے، لیکن اس پر بھی وہ اس مشورے پر عامل رہے اور یہ کہ" جب بھی انھوں نے کسی سیاسی اقدام سے متعلق سوچا تو حکومت کے خلاف کسی قسم کا احتجاج اُن کی آخری بات تھی۔" "ٹائمز" کے مطابق "مسلمانوں نے انگریز حکومت کے ساتھ نہ تو کسی مذہبی تعصب سے کام لیا اور نہ سیاسی جذبات سے، (اور) ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو سیاسی ذمے داری کے لائق ہونے کا کوئی معمولی ثبوت نہیں ہے۔"(۴۶) "ڈیلی ایکسپریس" نے لکھا کہ برٹش نمونے کی کسی لوکل سیلف گورنمنٹ کے قایم کرنے کا خیال محض کٹر اصول پرستی ہوگی کیوں کہ "ہندستان کی تقسیم انتظامی نہیں، اور جغرافیائی بھی نہیں، یہ تقسیم مذہبی ہے اور نمایندگی کے کسی معقول ترین نظام کو اسے ضرور تسلیم کرنا چاہیے۔" دوسرے لفظوں میں یہ کہ "یہ (ڈیلی ایکسپریس) ڈیپوٹیشن والوں کے اس مطالبے کی تائید کرتا ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کی حیثیت سے نمایندگی ملنی چاہیے اور ہندوؤں کو ہندو کی حیثیت سے۔"(۴۷)

مسلم لیگ کا قیام:

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی شہر میں ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ دسمبر کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بیسواں اجلاس ہوا۔ نواب وقار الملک

نے اس بڑے اجتماع کی صدارت کی اور افتتاحی تقریر کی۔ انھوں نے سرسیّد احمد خاں کی وفادارانہ پالیسی کو دہرایا اور مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ہندستان میں انگریز حکومت کے قایم رہنے ہی میں اُن کا تحفظ ہے۔ انھوں نے سامعین سے کہا کہ ایک محکوم قوم کے سیاسی حقوق وفاداری کی زمین میں ہی پھلتے پھولتے ہیں۔ اس لیے قبل اس کے کہ وہ اپنے حقوق منوائیں انھیں اپنے آپ کو حکومت کا وفادار ثابت کرنا چاہیے۔ ہندستان میں مسلمان ایک چھوٹی اقلیت ہیں، نواب نے کہا ''اور یہ بات ظاہر ہے کہ اگر آگے چل کر کبھی ہندستان سے انگریز حکومت کا خاتمہ ہو جائے، تو حکومت اس کمیونٹی کے ہاتھ میں ہو جائے گی جو ہم سے تعداد میں چار گنا زیادہ ہے۔'' اس طرح کی صورت حال میں انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا جو اُن کے املاک، عزت اور عقیدے کو ہوگا۔ (۴۸)

نواب صاحب اور ان کے ہم مذہبوں نے شاید اُس وقت یہ سوچا کہ مسلمانوں کی تائید سے ہندستان میں انگریز حکومت کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا اور ان کے مقصد کے لیے وفاداری کی پالیسی ہی ہمیشہ مفید رہے گی۔ اُن کے شملہ کے ایڈرس کے حوصلہ افزا ردعمل میں وائسرائے نے جوش وخروش کا اظہار کیا تھا اور اس کی بے پناہ رو میں امپائر کی انتظامی مصلحتیں، جب بھی اور جہاں کہیں بھی ضرورت ہو ان کی نظر سے اوجھل تھیں کہ وفاداری کی اسی پالیسی پر جس پر انھیں اس قدر فخر اور اعتماد تھا ایک دن شدید ضرب لگے گی اور جلدی ہی انھیں اس کا تجربہ بھی ہو گیا جب بنگال میں سودیشی تحریک کے انقلابیوں کے مسلسل احتجاج کے دباؤ کی وجہ سے ۱۹۱۱ء میں برٹش راج نے تقسیم بنگال کو ختم کر دیا۔ (۴۹)

قیام مسلم لیگ کے مقاصد:

مسلم لیگ کے قیام کا جو ریزولیشن منظور ہوا وہ درج ذیل ہے:

''اس فیصلے کو منظور کیا گیا کہ ڈھاکہ میں جمع ہندستان کے تمام علاقوں کے مسلمانوں کی یہ میٹنگ، آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے، مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے ایک سیاسی جماعت قایم کرتی ہے:

(۱) ہندستان کے مسلمانوں میں انگریز حکومت سے جذبہ وفاداری کو تقویت

دی جائے اور ہر اس غلط فہمی کو دور کیا جائے جو حکومت کے کسی اقدام کے نتیجے میں پیدا ہو۔

(۲) مسلمانانِ ہند کے مفاد اور سیاسی حقوق اور ان کی ترقی کا تحفظ کیا جائے اور کمال ادب کے ساتھ حکومت کے سامنے ان کی ضرورتوں اور حوصلوں کی نمایندگی کی جائے۔

(۳) مسلمانانِ ہند میں، مسلم لیگ کے مقاصد کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر کسی دوسری کمیونٹی کی طرف مخالفت و دشمنی کے ہر جذبے کی روک تھام کی جائے۔''(۵۰)

یہ تھی مسلم لیگ کی سیاست کی اصلیت (۵۱) جس نے اپنے ''نظریہ مسلم سیاست'' پر مولانا آزاد کی نکتہ چینیوں کو مدعو کیا۔ الہلال کے صفحات شاہد ہیں کہ آزاد نے اسے کبھی معاف نہیں کیا۔ فیڈرل قیادت میں اپنے بدیسی آقاؤں سے اختلاف کی مسلم لیگ میں ہمت نہ تھی اور آزاد نے اسی بنا پر اس کے طریقہ کار پر سخت تنقید کی۔ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں زاہد سہروردی کے مکان پر سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے آزاد نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا تھا ''ہر چیز لائق تسلیم ہے سوائے مسلم لیگ کے''(۵۲)۔ مسلم لیگ سے آزاد کی یہ دوری لیگ کے خوشامدی لیڈروں کی وجہ سے تھی جنھوں نے ''بدنصیب مسلم کمیونٹی کو حریص حکمرانوں کے کھیلنے کی چیز بنا دیا تھا۔'' ڈھاکہ میں اپنے ہم مذہبوں کو 'ٹھوس' مشورہ دیتے ہوئے قیام مسلم لیگ کے موقع پر نواب وقار الملک نے جو کچھ کہا تھا، آزاد نے اس سب کی تردید کی (۵۳)۔

ترکی کو آغا خاں کا مشورہ اور مولانا آزاد:

آزاد نے آغا خاں کی قیادت پر پرزور حملہ کیا اور کہا کہ ان کا مسلم عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھیں پورا یقین تھا کہ آغا خاں کی قیادت میں مسلم لیگ نے مسلم کمیونٹی کو ایک افسوس ناک مستقبل کی طرف دھکیل دیا ہے۔ جنگ بلقان میں ترکوں کی ہزیمتوں کے سبب جب آغا خاں نے انھیں، یورپ کے مقبوضہ علاقے چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تو آزاد نے ان کی مذمت کی اور ۱۶ر فروری ۱۹۱۳ء کی اس میٹنگ کی تفصیلی روداد شائع کر دی جس میں میٹنگ کے صدر مظہر الحق

نے ترکی کو آغا خاں کے ذلت آمیز مشورے پر سخت تنقید کی تھی۔ (۵۴)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مولانا آزاد قیام مسلم لیگ کے پورے طریقہ کار اور کارروائی سے متفق نہیں تھے۔ انھوں نے لکھا کہ برٹش بیوروکریسی کی سیاسی عیاریوں کے سبب مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکا گیا ہے۔ ''...... پس ضروری ہوا کہ اب تبدیلِ ذائقہ کے لیے کوئی نیا کھلونا ہماری گود میں ڈال دیا جائے اور کچھ دنوں اس کے ساتھ کھیلنے میں کاٹ دیں۔ یہ کھلونا ہماری نئی ضلالت یا غفلت یا بیداری نما (مسلم لیگ) تھا جو زمانے کے نئے تغیرات کا لحاظ کر کے پالیٹکس کے نام سے شکل پذیر ہوا۔'' (۵۵)

اخبار کے بعد کے شمارے میں انھوں نے کہا:

''...... بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام 'لیگ' رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتش کدہ رکھ دو گے، تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی؟ نادانو! چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو۔ شاید ہی آج تک دنیا میں کسی قوم نے پالیٹکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہوگی، جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ (۵۶) تمھارا وجود یکسر سیاست کی تحقیر اور تمھارے اعمال اس کی معزز پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ تم نے غلامی کا ایک بت کدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے سجدے کا سر جھکایا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں۔'' (۵۷)

آزاد نے اسے لیگ کی ایک غلطی سے تعبیر کیا کہ اس نے اپنی سیاست کا پودا علی گڑھ کی زمین میں لگایا۔ پہلے ہی سے جس درخت کی جڑیں وہاں تھیں، ان میں گھن لگ چکا تھا۔ (۵۸)

آزاد عہد وسطیٰ کے علم کلام اور عہد جدید کی عقلیت کے عجیب و غریب امتزاج تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کی معاشرتی اور سیاسی قدامت پسندی کو چیلنج کیا اور فیڈرل نظام کے نمایندوں کو ہدف مت بنایا جو کالج کے ٹرسٹی بن کر علی گڑھ کی نئی نسل کی ہمت شکنی کرتے تھے۔ علی گڑھ کی یہ نئی نسل سماجی اور سیاسی فکر کے نئے رجحان سے وابستہ ہونے کے لیے بے تاب تھی۔ اپنے اس کھیل

میں جاگیرداری کے نمایندوں کو کالج کے انگریز پرنسپلوں سے بہت مدد ملی جنھوں نے حکومت کے بااختیار حلقوں سے مل کر علاحدگی پسند رجحانات کو پروان چڑھایا اور ان میں قومیت اور کانگریس کی مخالفت کا خیال پیدا کیا۔ آزاد نے لیگ سے اپنے سامنے کوئی بلند آدرش رکھنے کے لیے کہا، کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ کوئی قوم اپنے قلبی جوش کے ساتھ کسی جدوجہد میں شریک نہیں ہوسکتی جب تک اس کے سامنے سب کچھ تج دینے والا کوئی آدرش نہ ہو۔ انھوں نے لکھا کہ آزادی ہی یہ آدرش ہوسکتی تھی جس کا خیال ہی دل کی دھڑکنیں تیز کرتا اور لوگوں کو عمل پر آمادہ کرتا تھا۔ طنز و تعریض کے لہجے میں انھوں نے کہا کہ وہ مسلم لیگ کو گڑبڑ میں نہیں ڈالنا چاہتے یہ کہہ کر وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ چلے جو اس قسم کا ایک بلند تر مقصد رکھتے ہیں۔ وہ تو صرف اس کی طرف سے کم از کم یہ اعلان چاہتے ہیں "انگریزوں کے تحفظ (Protectorate) میں ہندستان کے لیے سیلف گورنمنٹ۔"(۵۹)

مولانا آزاد اور مسلم لیگ کی شہادت:

مسلم لیگ اور اس کی قیادت کا سخت تعاقب نتیجہ خیز ثابت ہوا کہ وہ ایسے وقت کیا گیا تھا جب طرابلس اور بلقان کی جنگوں، مراکش پر فرانسیسی انتداب (۱۹۱۱ء)، مشہد پر روس کی بمباری (۱۹۱۲ء) اور ہندستان میں تقسیم بنگال کی تنسیخ (۱۹۱۱ء)، مسلم یونیورسٹی اسکیم کے انکار (۱۹۱۲ء) اور کانپور کی مسجد کے حادثہ فاجعہ (۱۹۱۳ء) نے مسلمانوں پر کاری ضربیں لگائی تھیں۔ اس کے سبب ترقی پسندانہ رجحانات کے حامل نوجوان مسلم لیڈروں کو بہت بڑا دھکا لگا، انگریزی حکومت کے عدل و انصاف پر سے ان کا اعتقاد اُٹھ گیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ علی گڑھ کے سیاسی فکر کا فریم ورک موزوں اور مناسب نہیں ہے۔ ان کے ایک طبقے کا خیال تھا کہ ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہتر ہونے چاہییں اور اس سلسلے میں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتراک کار کی صورتیں نکلیں۔ الہ آباد میں بات چیت شروع ہوئی۔(۶۰)

مولانا آزاد اور لیگ کے دستور میں تبدیلی:

مسلم لیگ نے اپنے مارچ ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں اپنے دستور میں دوررس نتائج کی

حامل دو ترمیمیں منظور کیں۔ پہلے لیگ کا مقصد ''ہندستان میں انگریز حکومت سے جذبہ وفاداری کو تقویت دینا'' تھا۔ اب ''انگریز حکومت'' کے بجائے ''تاج'' (The Crown) کا لفظ شامل کیا گیا۔ مقاصد کی دفعہ ۳ میں اس فقرے کا اضافہ کیا گیا ''برٹش تاج کے تحت مناسب سیلف گورنمنٹ کا حاصل کرنا'' اگر چہ جو کچھ مولانا آزاد نے تجویز کیا تھا اس کے بالکل مطابق یہ ترمیمیں نہ تھیں (۶۱)، لیکن انھوں نے ان کو آگے کی طرف ایک قدم تصور کیا اور خیر مقدم کیا اور ''کانگریس نے مسلم لیگ کے مقاصد میں اس تبدیلی کو گرم جوشی سے نوٹ کیا اور قومی مفاد کے معاملات میں متحدہ اور مستقل لائحہ عمل کی مسلم لیگ کی تجویز پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔'' (۶۲)

اس طرح، اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندستانی سیاست میں فرقہ وارانہ (کمیونل) محاذ کی کوئی گنجایش نہ ہوگی اور سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ تمام ہندستانیوں کا مشترک مطالبہ ہوگا۔ فرقہ وارانہ دوستی کی اس فضا میں ۱۷ اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۶ء کو کانگریس اور لیگ کے نمایندوں نے آئینی اصلاحات کی ایک اسکیم تیار کی جسے دونوں جماعتوں کے دسمبر ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ اجلاس میں منظور کیا گیا۔ یہ وہی مشہور و معروف معاہدۂ لکھنو (Lucknow Pact) تھا جس کا نیشنلزم کی فتح کے طور پر بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا گیا۔ (۶۳) اس معاہدے کی خاص باتیں علاحدہ حق راے دہندگی (Separate Electorate) (۶۴) اور قانون ساز کونسل میں نشستوں کے متعینہ تناسب اور ویٹیج (Weitage) تھیں۔ اس معاہدے کو اگر قومی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ''یہ محض وقتی معاہدہ تھا جو قومی اتحاد اور یکجہتی کی جڑوں ہی کو کاٹ کر رکھ دینے والا تھا، مصلحت کی قربان گاہ پر اصول کو چڑھا دیا گیا تھا۔ کانگریس نے جس کا مسلک سیکولر قومیت تھا دیکھا جائے تو فرقہ واریت کو تقویت دی تھی۔ علاحدہ حق راے دہندگی کو وقتی ہوشیاری کی بنا پر مان لینے کا مطلب یہ تھا کہ آیندہ فرقہ وارانہ اور آئینی معاملات میں یہی معاہدہ بنیاد کا کام دے گا۔ (۶۵)

یہ نہیں معلوم کہ ''اس سطحی گٹھ جوڑ کے خلاف جو اتحاد کی کسی گہری بنیاد پر قائم نہ تھا (۶۶)'' مولانا آزاد کا ردعمل کیا ہوتا لیکن آزاد کے تمام عمر کے آدرش، غیر مشروط ہندو مسلم اتحاد سے

متعلق ان کی سوچی سمجھی رائے کے پیش نظر، اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی وقتی سیاسی مصلحت کے طور پر بھی کانگریس کی طرف سے علاحدہ حق رائے دہندگی کے اصول کا مان لینا شاید کسی طرح پسند نہ کرتے۔

ہندو مسلم اتحاد:

اپنی پبلک زندگی کے آغاز ہی سے مولانا آزاد نے جنگ آزادی کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک فریضہ تصور کیا۔ وہ ان دونوں قوموں کے مابین اشتراک وتعاون کو غیر مشروط سمجھتے تھے۔ الہلال کے صفحات اس کے شاہد ہیں۔ اس کا آدرش ہی یہ تھا کہ اس کا ایڈیٹر نہ صرف معاصر جدوجہد کے اصل دھارے سے اپنے فرقے کے الگ رہنے کے رجحان کے خلاف آواز اُٹھائے بلکہ اپنے فرقے کو بتائے کہ جب تک وہ ہندوؤں پر اعتماد نہیں کرتا اس وقت تک ان میں حقیقی اشتراک جو قومی مقاصد کے حصول کے لیے بہت ضروری ہے، نہیں ہو سکتا۔

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو بتایا کہ اسلام کا موقف سلامتی اور انسان دوستی ہے اور یہ ذہن کی تنگی اور علاحدگی پسندی کا انکاری ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے ذہن سے ایسے خیالات نکالیں کہ مسلمان علاحدگی پسندی کو ترجیح دیتے ہیں، قومیت کے مخالف اور بدیسی حکومت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہیں جنھیں ملک کے قومی مقاصد کے خلاف، جب بھی اس کے وجود کو خطرہ ہو، استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ[۶۷] کی نسلی پالیسی اور گاندھی جی اور لکھنؤ کے ہندستانی اخبار کے ایڈیٹر بابو گنگا پرساد ورما کی وفات سے متعلق الہلال میں ان کے مضامین کا مقصد مسلمانوں میں ہندو مسلم اتحاد کو بڑھاوا دینا ہی تھا۔ بابو گنگا پرساد کے سیاسی خیالات کے صحیح اور ٹھوس ہونے کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے فرقہ واریت کے موضوع پر ان کے خیالات کی وضاحت کی:

> ''ہندو مسلمان کے اتحاد سے متعلق ان کے خیالات نہایت قیمتی تھے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کبھی بھی حملہ آورانہ قومیت کا وہ افسوس ناک رویہ اختیار نہیں کیا جو بعض ہندو اور مسلمان لیڈر اختیار کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ پنجاب کے ان

ہندو اخبارات کو ناپسند کیا کرتے تھے جن کی پالیسی متحدہ ہند کے تصور کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ خود مجھ سے انھوں نے بارہا کہا کہ ایسے لوگوں اور اخبارات سے بڑھ کر ملک کا کوئی دشمن نہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں، خواہ ہندو۔'' (۶۸)

ڈگلس کے بیان کی پیچیدگی یا غلط بیانی:

بعض مسلمان اہل قلم (زیادہ تر پاکستانی) اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلامی موضوعات پر الہلال میں آزاد کے مضامین کا کوئی تعلق قومی سیاست سے نہ تھا۔ اپنے ذہنی تحفظات کے سبب ان کی ایسی تحریروں کا بنیادی مقصد پین اسلامی تھا۔ آزاد کا عیسائی سوانح نگار، ڈگلس، پورے طور پر اس نقطہ نظر سے متفق ہے، لیکن ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر آزاد کی تحریروں کے بارے میں اُلجھاوے پیدا کرتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے:

(۱) ''یہ کہنا غالباً قدرے مبالغہ آمیز ہے کہ الہلال کے واضح مقاصد میں سے ایک مقصد، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترک پلیٹ فارم پر لانا اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے برطانوی استعمار کی مخالف تھا'' یا

(۲) ''بعد میں آزاد کا یہ دعویٰ کہ الہلال میں شروع ہی سے انھوں نے ہندوؤں سے مسلمانوں کے اشتراک وتعاون کی ضرورت پر زور دیا غلط نہیں ہے، لیکن اس میں حقیقت کو اس طرح مسخ کیا گیا ہے کہ نکتہ چینوں کو یہ کہنے کا موقع مل سکے کہ الہلال کے ابتدائی شماروں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی'' (۶۹)

اور پھر، شاید اپنے استدلال کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے، انھیں یہ کہنے میں عافیت نظر آئی کہ ''ان (آزاد) کے سیاسی فکر کے پھلنے پھولنے کے اول روز سے لے کر وفات تک آزاد کو مسلسل یہ یقین رہا کہ ہندستانی مسلمانوں کو ہندوؤں اور ہندستان کے دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر سرگرم کار رہنا چاہیے۔'' (۷۰) مختلف خط والے لفظ ''ابتدا'' اور فقرے ''سیاسی فکر کے پھلنے پھولنے کے اوّل روز سے'' کا مطلب ہی معاملے کو 'مبہم' اور 'اُلجھا ہوا بنانا ہے' ڈگلس سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر اس فقرے سے کہ ''ان (آزاد) کے سیاسی فکر کے پھلنے پھولنے

کے اوّل روز سے" کیا مطلب ہے؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی ہند و مسلم اتحاد اور آزاد ہندستان کے لیے پارلیمانی طرز کی حکومت کے مطالبے میں مولانا آزاد پرانی نسل کے قومی لیڈروں سے بہت آگے تھے۔

مولانا آزاد کی حقیقت بیانی:

پختہ فکر کے حامل مولانا آزاد اپنے ہم مذہبوں کو ان الفاظ میں خطاب کر سکتے تھے:

"...... ہندوؤں کی میجارٹی، مختلف عناصر کی باہمی رقیبانہ کشمکش، ہندو مسلمان کی گزشتہ تاریخ کے اثرات، ملک کی عدم طیاری (تیاری)، مسلمانوں کے لیے باہر کی حکومت کی بہتری اور اسی طرح کے وہ تمام وساوس و نزغات نفسانیہ جو مسلمانوں کے دل میں جاگزیں کیے گئے تھے، ہمیں حسن ظن ہے کہ اب بھلائے جا چکے ہیں۔ سیلف گورنمنٹ اسی لیے نہیں مانگی جاتی کہ ملک کی استعداد اور عدم استعداد کا افسانہ دہرایا جائے۔ ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے، یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ یہ تمام وساوس اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ ملک کے سامنے کوئی مشترک اور بلند نصب العین نہیں۔ اگر روزِ اوّل ہی یہی ہو گیا ہوتا کہ سب مل کر ایک ہی نصب العین اعلیٰ کی طرف دیکھنے لگتے تو اور کسی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہ ملتی اور تمام قوتیں جو آج باہمی جدال و قتال میں صرف ہو رہی ہیں اسی کے پیچھے صرف ہوتیں۔" (۷۱)

آزاد نے اپنے اسلوب میں مسلمانوں سے کہا کہ وہ ہندو اکثریت سے نہ ڈریں اور اپنے اشتراک و تعاون کا ہاتھ ان کی طرف بڑھائیں۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام تمام غیر آئینی اور غیر پارلیمانی حکومتوں کو گناہ کبیرہ تصور کرتا ہے (۷۲) اور یہ بات انھوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہی تھی کہ پارلیمانی نظام حکومت میں حکومت اکثریتی پارٹی ہی کی ہوتی ہے لیکن انھوں نے ہندو

مسلم اتحاد پر اصرار کیا اس لیے کہ اس ۔کے بغیر آزادی اور ہندستان کے لیے ایک نمائندہ حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۱۲ء میں آزاد نے لکھا:

''مسلمانوں کی بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ تعداد کی قلت و کثرت کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ تعداد کو قوی کرنا چاہتے ہیں، مگر دلوں کو قوی نہیں کرتے، حال آں کہ اسلام کی نظر میں تعداد کوئی چیز نہیں۔ یہ تعداد کی قلت و کثرت کا وسوسہ بھی ہمارے دلوں میں اندر کے نفس کا نہیں بلکہ باہر کے وسوسۂ لذات کا ڈالا ہوا ہے (۷۳) اور اب تو ہمارے تمام دایرہ بدبختی کا محور بن گیا ہے۔ کانگریس میں اس لیے جا نہیں سکتے کہ تعداد کم ہے، ہندو مار ڈالیں گے۔ سیلف گورنمنٹ کی خواہش میں اس لیے شریک نہیں ہو سکتے کہ تعداد کم ہے، ہندو گورنمنٹ ہو جائے گی...... ہندوؤں سے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں، البتہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔ تم کو ہندستان میں رہنا ہے تو اپنے ہمسایوں سے معانقہ کرلو اور زندہ رہنا ہے تو ان سے الگ رہنے کا نتیجہ دیکھ چکے۔ اگر ان کی طرف سے رکاوٹ ہے، تو اس کی پروا مت کرو۔......قومیں اگر تمھارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتیں تو تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔'' (۷۴)

ابتدائی برسوں میں آزاد کے قارئین خاص طور پر مسلمان تھے۔ ان کی علاحدگی پسندی کے سیاسی رجحان نے ان کو سخت سے سخت الفاظ میں اور پوری مہارت کے ساتھ مذہبی اصطلاحات اور علایم استعمال کرتے ہوئے علی گڑھ پارٹی کی، جس کے کنٹرول میں مسلم لیگ تھی، برطانیہ دوست پالیسی کے خلاف لکھنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندو اکثریت کا خوف بے بنیاد اور غلط ہے اور یہ کہ ہندستان کی آزادی ایشیائی اور افریقی ملکوں کی آزادی ۔ہے جن میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں۔ بعد میں جب آزاد قومی رہنما کی حیثیت سے اُبھرے تو الہلال میں بار بار دہرایا گیا ہندو مسلم اتحاد کا خیال ہندستان کے تکثیری (Plural) معاشرے میں ایک اچھی مشترک زندگی سے متعلق آزاد کے

نظریے کا ایک خاص عنصر بن گیا۔اس مشترک زندگی کی بنیاد صدیوں لوگوں کے مل جل کر رہنے کی نا قابل انکار حقیقتوں پر پڑی تھی جنھوں نے ایک گنگا جمنی تہذیب اور متحدہ قومیت کو جنم دیا تھا۔اب ان کے مخاطب ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور انھوں نے دونوں سے اپیل کی وہ ہندو مسلم اتحاد کو انگریزوں کے خلاف محض ایک سیاسی چال نہ تصور کریں بلکہ پوری اہمیت کے ساتھ، اسے ایک پرامن اور ترقی پسند قومی زندگی کی بنیاد سمجھیں جو ''انسان دوستی کے مبادی اصولوں'' سے تقویت حاصل کرتی ہے۔

جہاد آزادی، حزب اللہ:

مولانا آزاد تیز سیاسی بصیرت کے حامل تھے۔ان کو یقین تھا کہ عالمی سیاست کے پیچھے جو سیاسی اور معاشی طاقتیں کام کر رہی ہیں، ان کا نتیجہ بالآخر آزادی ہوگا اور یہ کہ بیسویں صدی میں کوئی قوم غلام نہیں رہے گی۔اس سلسلے میں ان کے خیال اور پیش گوئی میں کس قدر سچائی تھی! ان کے یقین ہی نے ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں ان سے وہ طاقت ور دعوتی مضمون لکھوایا جس نے ان کے ہم مذہبوں کو بدیسی حکومت کی محکومی اور وفاداری کے خلاف بغاوت کا پیغام دیا۔ان کے احساس فخر و خودداری کو اپیل کرتے اور 'الجہاد! الجہاد۔ الجہاد فی سبیل الحریت' کے عنوان سے لکھتے ہوئے، انھوں نے کہا:

> ''......جو ہونے والا ہے اسے کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔
> یقیناً ایک دن آئے گا، جب کہ ہندستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی۔اور وہ سب کچھ ہو چکے گا، جس کا ہونا ضروری ہے۔فرض کیجیے کہ اس وقت ہندستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟
> اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بد بخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہ

آزادی میں سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست اجانب میں بازیچہ لعب، ہندستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی!......

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی جو آہ ثم آہ! کہ مسلم تھی، جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی جو دنیا میں اسی لیے بھیجی گئی تھی تاکہ انسانی استبداد کی زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے......

......بے شک (تاریخ ہند میں) ایک باب ہوگا، مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا۔ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا۔ ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دیے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا۔ ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی، بلکہ مجنونانہ چیخ اُٹھی کہ تمام یہ کام کرنے والے باغی ہیں۔

اس کے بعد وہ آنے والا مورخ، جو ہندستان کا وقائع نگار ہوگا، لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا، بیسویں صدی میں کوئی غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا...... لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا، اُس قوم کی سرفروشی سے ہوا، جو مسلم نہ تھی۔ پر جو ''مسلم'' تھے اُنھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ مذلت کی کوشش کی......

یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا، داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ!...... اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق و

صداقت اور انسانی بند استبداد و غلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے۔
......پس اُٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اُٹھانا چاہتا ہے اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں، بیدار ہوں اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔'' (۷۵)

الہلال میں اپنی تحریروں کے ذریعے آزاد نے مسلمانوں کو بتایا کہ ہندستان کے حالات میں جہاد کا اصل مطلب کیا تھا۔ انھوں نے جہاد کے مسئلے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا اور نتیجہ نکالا کہ حقیقت میں دونوں ایک ہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے جب علماء نے ہندستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا، آخر الذکر کے نزدیک جہاد کا ہی لفظ سخت ناپسندیدہ قرار پایا تھا۔ سر سیّد احمد خاں نے اس غرض سے کہ حکومت وقت مطمئن رہے یہ کہہ کر کہ اسلام نے بہت استثنائی صورت حال میں اسلحہ کے استعمال کی اجازت دی ہے، اپنے طریقے سے اس لفظ کی تعبیر کی تھی (۷۶)۔ آزاد نے سر سیّد کی تعبیر و تشریح پر طنز کیا اور اعلان کیا کہ جہاد قوموں کی زندگی کا سرچشمہ، عدل و انصاف کے قیام کا ذریعہ اور مظلوموں کے ہاتھ میں دفاع کی ڈھال ہے۔ (۷۷)

اس وقت آزاد کا خیال تھا کہ ہندستان کی جنگ آزادی جیتنے کی راہ میں تمام کوششیں، خواہ وہ پرامن ہوں یا تشدد آمیز، دراصل جہاد ہیں اور موجودہ صورت حال میں اس کے عدم جواز سے متعلق کوئی اجتہاد، جو اس کے حق میں نہ ہو، ان کے نزدیک قابل قبول نہیں تھا کہ اس سے جہاد کے اسلامی اصول کی نفی اور گمراہ کن ترجمانی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ آزاد نے اس موضوع پر محض ''مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے'' لکھا۔ دینیاتی نقطہ نظر سے، ان کا موقف مستحکم اور مضبوط تھا کہ خدا کی راہ میں اسلام کی خاطر جو عمل کیا جائے اور جو قدم بھی اُٹھایا جائے وہ درحقیقت جہاد ہے۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے، ان کے خیال میں یہ اسی طرح کا فرض ہے جیسے فرض نمازیں اور اس زمین پر اللہ کی صداقت و عدل کی شہادت۔ مسئلہ جہاد کی اس واضح تعبیر و تشریح کو جو معاصر زندگی سے متعلق اور اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن

(۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) نے بہت سراہا۔ انھوں نے آزاد کے اس جرأت آموز موقف کی تائید کی اور کہا کہ ''ہم نے جہاد کا سبق بھلا دیا تھا، ابوالکلام نے اسے ایک بار پھر یاد دلا دیا ہے۔''(۷۸)

کلکتہ میں مسلمانوں کے بعض مسائل حاضرہ کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے ۲۷/اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مولانا آزاد نے پر زور لہجے میں کہا:

''اے اخوان عزیز! میں جس چیز کے اعلان سے نہیں ڈرتا، تعجب ہے اگر آپ اس کی سماعت سے خوفزدہ ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ہر اس مومن پر، جو اللہ، اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے، فرض ہے کہ آج جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔ سب سے پہلا جہاد اس کے لیے جہاد مال ہے اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو جہاد نفس و جان۔ مال و متاع کو بھیج دو اور اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر طیار (تیار) رکھو! آج اگر ضرورت پیش نہ آئی تو کیا مضائقہ۔ کل کو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ یہ متاع ایسی نہیں جس کی تیاری بیکار جائے:

بطاعت کوش گر عشق بلا انگیز می خواہی
متاعے جمع کن شاید کہ غارت گر شود پیدا''(۷۹)

علماء اور مغربی تعلیم یافتہ دونوں کی، اپنی دعوت کی طرف سست رفتاری سے، آزاد کو خیال آیا کہ مسلمانوں میں اسلام کی سچی روح پیدا کرنے اور الہلال کا پیغام دور دور تک پھیلانے کی غرض سے تربیت یافتہ اور اپنی جان کھپا دینے والے لوگوں کی ایک تنظیم قائم کی جائے جس کا نام حزب اللہ (اللہ کی جماعت)(۸۰) ہو اور اس کا مقصد مکمل معاشرتی اصلاح اور سیاسی فعالیت، یعنی جہاد تھا۔ اس سلسلے میں ۲۳/اپریل ۱۹۱۳ء کو الہلال میں اس کا اعلان کیا گیا۔(۸۱)

جنگ بلقان میں ترکی کی شکست، اپنے ہم مذہبوں سے مولانا آزاد کی پرجوش اپیل و سمجھنے کی کلید ہے، اور اسی کلید سے انھوں نے یہ راز کھولا کہ یہ المناک واقعہ یومِ قیامت سے کسی طرح کم نہیں۔

الہلال کے اسی شمارے میں ان کا ایک نوٹ شائع ہوا جس میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا

من انصاری الی اللہ (اللہ کی راہ میں میرے مددگار کون ہیں؟)۔ اس نوٹ میں الہلال کے مقاصد کی تائید کرنے والوں کو حزب اللہ کے ممبر کے طور پر اپنے نام اور پتے بھیجنے کو بھی کہا گیا تھا۔ اُن کی آواز رائیگاں نہیں گئی اور اس کا اچھا جواب ملا۔ درخواست کا فارم، جس میں قرآن مجید کی ایک حوصلہ بخش آیت تھی، اس طرح تھا:(۸۲)

نحن انصار الله

''ہم اللہ کے مددگار ہیں''

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین۔ لا شریك له بذالك امرت و انا اول المسلمین۔

''میری عبادت، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، غرض کہ میری ہر چیز صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اسی قربانی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں میں پہلا مسلم ہوں۔''

نام............................ پیشہ............................ عمر............................

پتہ..

اُوپر قرآن کی جو آیت درج کی گئی ہے، وہ اللہ کی راہ میں ایک حقیقی اور ایماندار مجاہد کی تصویر پیش کرتی ہے اور ایسے ہی مجاہد آزاد 'حزب اللہ' کے لیے چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں اور جہاد کے موضوع پر الہلال میں ان کی تحریروں کو ڈگلس کی قسم کے اسکالروں نے غلط سمجھا ہے اور انھوں نے ان میں ہندستانی مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کی غرض ۔ یہ آزاد کی امامت (۸۳) کی آرزو کو دیکھا ہے۔ آزاد کوئی احمق نہ تھے۔ وہ ہندستان میں پارلیمانی طرز کی حکومت چاہتے تھے اور الہلال کے صفحات پر اس کا اصرار کے ساتھ مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اب ہندستان میں ''مغل حکومت کی طرز''(۸۴) کی مسلم حکومت کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انقلابی مقاصد کی حامل 'حزب اللہ' جیسی تنظیم کے لیے آزاد کو اس کی رکنیت کے سلسلے میں بڑی احتیاط سے کام لینا تھا۔ سیّد سلیمان ندوی کے نام ان کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'حزب اللہ' کے لیے سرفروش اراکین آسانی سے دستیاب نہیں تھے(۸۵)۔ سیّد

صاحب نے انھیں جو کچھ لکھا ہوگا، اس کے جواب میں اُن کا ردعمل یہ تھا کہ خدا کی لعنت ہو اگر 'حزب اللہ' کے، ذریعے وہ کسی عظمت کی تلاش میں ہوں۔

''بے شک حزب اللہ کو' انھوں نے کہا'' (میں نے) انجمن کی طرح نہیں بنایا اور لوگ اس میں شریک نہیں کیے گئے لیکن فرمایئے اس کے مقاصد کے لیے جو چاہتا ہوں کسے شریک کروں اور کون ہوتا ہے۔'' (۸۶)

'حزب اللہ' کو تربیت یافتہ لوگ ملیں، اس کے لیے آزاد نے 'دارالارشاد' قایم کیا۔ بظاہر تعلیم قرآن اس ادارے کا مقصد تھا، لیکن حقیقت میں گہرے مذہبی جوش و جذبے کے ساتھ ان کے انقلابی منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے اس ادارے کو سرفروش آدمی تیار کرنے کی غرض سے قایم کیا گیا تھا اور چوں کہ مشن ضروری اور جلدی کا تھا اس لیے تربیت کا پروگرام مکمل اور صرف چھ مہینے سے ایک سال کی مدت کا تھا۔ (۸۷)

رجت رے اپنے تحقیقی مقالے ''ریوولیوشنریز، پین اسلامسٹ اینڈ بالشوکس'' میں ان کٹر مسلمان اسکالروں کے نظریے کی نفی کرتا ہے کہ آزاد، ۱۹۱۲ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیانی وقفے میں، پکے پین اسلامسٹ تھے اور مسلم ممالک کی مدد سے ہندستان میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس نظریے کے برخلاف اس مقالے میں، حکومت بنگال کے ریکاڈوں اور حکومت ہند کے انٹیلی جنس بیورو رپورٹوں کی سند پر، یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آزاد ایک بڑے پائے کے انقلابی نیشنلسٹ تھے اور ملک سے بدیسی حکومت کے خاتمے کے لیے جوش اور ہمت سے کام کر رہے تھے۔ (۸۸) مندرجہ ذیل پیراگراف، خاص طور پر رے کے مقالے پر مبنی ہیں اور آزاد کی تاریخی بصیرت، حقیقت پسندی و بے داغ حب الوطنی پر ہمارے یقین کو اور مستحکم کرتے ہیں، جن میں آزاد کے شعور میں رچا بسا اسلامی کردار بھی بنیادی طور پر شامل تھا۔

''بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں یکے بعد دیگرے خفیہ پین اسلامی سوسائٹیوں کا قیام ہندستان میں انگریز ایڈمنسٹریشن کے لیے دردسر ثابت ہو رہا تھا۔ چوں کہ ایسی سوسائٹیوں کو اپنے کام کے لیے پردۂ خفا میں رہنا، ان کی بنیادی ضرورت ہے، اس لیے ہندستان کی قومی تحریک کے اس پہلو پر تاریخی مواد بہت کم ملتا ہے۔

''انگریزوں کی حکومت بہرحال چوکنا تھی اور آزاد کی سرگرمیوں اور ایسی سوسائٹیوں سے ان کے تعلق پر نظر رکھتی تھی۔ حکومت کے آرکائیوز کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ جماعت 'حزب اللہ' اس طرز کی پہلی سوسایٹی تھی۔ اس کے متحرک مبلغ تمام ہندستان میں اور باہر تک سفر کرتے تھے...... ان کا کام مسلمانوں میں جوش و خروش بھی پیدا کرنا تھا۔'' (۸۹)

عالمی جنگ کا جب آغاز ہوا تو انقلابی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہوگئی اور (مولانا) آزاد پر برکت اللہ (بھوپالی) اور عبید اللہ (سندھی) سے رابطے کا شبہ کیا گیا جو کابل میں ''ہندستانی رنگروٹوں پر مشتمل خدائی فوج (۹۰) کی مدد سے سرحدی علاقے میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کو منظم کر رہے تھے۔ حکومت کی انٹیلی جنس سروس نے دارالارشاد کے بارے میں بھی رپورٹ دی۔ ''ابھی (دارالارشاد) سے مقصود یہ تھا کہ (آزاد کے) انقلاب کے منصوبے کو اور آگے بڑھایا جائے۔ آزاد اس کالج (دارالارشاد) میں ہر صوبے سے کچھ منتخب طالب علموں کو داخل کر رہے تھے۔ ملک کے کسی خاص علاقے میں پروپیگنڈے کا کام وہ ایک طالب علم کے سپرد کر دیتے تھے۔ جو گنتر یا انوشیلن کی طرح وہ دہشت پھیلانے کے کام نہیں کرتے تھے۔ اس کے بجائے اس کالج (دارالارشاد) کی توجہ خاموش کام اور خفیہ تیاریوں پر مرکوز تھی۔ جہاد کا اعلان کر دیا گیا، مگر پوشیدہ۔ ایک خفیہ میٹنگ میں فروری میں انھوں نے کہا:

> ''جہاد کے لیے ہمیشہ یہ ضروری نہیں کہ میدانِ جنگ، تلوار یا فوجی تنظیم ہو، بلکہ ہر جگہ اور ہر علاقے میں دشمن پر وار کیا جائے جس سے اس کے جان و مال، علاقہ، قومیت، تجارت یا اخلاقی قوت کو نقصان ہو۔ نراج پسندوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ان دنوں حکومت کے غرور پر بم اور ریوالور کی گولیوں کا وار کرتے ہیں۔ اُن کا تعلق ایک غیر مسلم پارٹی سے ہے، لیکن کام اور طریقہ کار (اپنی نوعیت کے لحاظ سے) اسلامی ہیں، اگرچہ اس کام کو انجام دینے والے مسلمان نہیں ہیں۔ اس پوری تقریر سے آپ نے سمجھا ہوگا کہ نراج پسندوں کی دہشت گردیاں اور جرمنوں کے فاتحانہ حملے بھی ایک قسم کا جہاد ہی ہیں اور قرآن مجید پر اعتقاد رکھنے

والے ہر مومن پر فرض ہے کہ عیسائیت اور اس کے فرزندوں کے برباد
کرنے اور مارنے کے جتن سوچے اور ان کے ناپاک وجود سے سطح
زمین کو پاک صاف کردے۔'' (۹۱)

انٹیلی جنس رپورٹ کا صحیح ہونا ہمیشہ مشتبہ رہے گا۔ خاص طور سے اس رپورٹ کا زیادہ جس کا تعلق کسی خفیہ تنظیم اور حکومت مخالف افراد سے ہو۔ یقیناً مذکورہ بالا رپورٹ میں بہت مبالغہ ہے، اس لیے کہ اس رپورٹ کا پورا مزاج ہی ایسا ہے کہ آزاد یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ جرمن قوم بھی عیسائی تھی اور آزاد برطانوی سامراج کے خلاف جہاد کی اپنی اسکیم میں عیسائیت کی بربادی اپنا مقصد نہیں رکھ سکتے تھے۔ بہرحال، رپورٹ سے اتنا تو صاف ظاہر ہے کہ 'دارالارشاد' میں آزاد کی تقریروں کا موضوع جہاد ہوتا تھا اور یہ کہ 'دارالارشاد' مذہبی تعلیم کا کوئی امن پسند ادارہ نہ تھا۔ رجت رے نے آزاد کے 'حزب اللہ' کی ایک انقلابی سیاسی تنظیم کی حیثیت سے تصدیق کرنے کے لیے معاصر ہندو انقلابی مراجع کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اگرچہ پین اسلامی اور ہندو انقلابی تنظیموں نے جرمنوں کی فوجی امداد سے ہندستان میں کامیاب بغاوت کے لیے عالمی جنگ کو ایک غنیمت کا موقع تصور کیا، لیکن آخر الذکر کو ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ ''پین اسلامی سوسائٹیاں ہندستان میں مسلمانوں کا غلبہ حاصل کرنے کے لیے ترکی اور افغانستان سے حملہ کرا سکتی ہیں۔'' (۹۲) انٹیلی جنس بیورو کی فائلیں (۱۹۱۶ء) چندر نگر کی تلاشیوں (Chandernagar Searches) کے عنوان سے محفوظ ہیں۔ ان میں پولیس کی تلاشیوں کے دوران حاصل ہونے والا بتیس صفحات کا ایک بنگالی خط بھی شامل ہے۔ اس خط کی روشنی میں دیکھیے تو مندرجہ ذیل اقتباس میں خوف اور شبہ کی اس فضا کی خوب عکاسی ملتی ہے۔ خط میں جسے آروبندو گھوش کے ایک پرانے پیرو نے چندر نگر کے ایک سینئر انقلابی موتی لال رائے (پ ۱۸۸۲ء) کو لکھا ہے، کہا گیا ہے:

''اب مجھے ملک کے اندرونی حالات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔
مسلمانوں میں بھی بیداری پیدا ہو چکی ہے، لیکن ان کی تحریک میں
(نہیں معلوم کیوں؟) پین اسلامزم کا رجحان پایا جاتا ہے جو ہمارے

مقاصد کے لیے تباہ کن ہے۔ مسلمان ترکی اور افغانستان کو یہاں بلائیں گے۔ برندر نے سیّد حیدر رضا کی نگرانی کے لیے کہا ہے، کیوں کہ وہ (افغانستان کے) امیر سے مدد لینے کا سخت آرزومند ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں رضا کہاں ہے۔ موجودہ جنگ میں ترک جرمن اتحاد کی وجہ سے مسلمانوں کی ہمدردیاں جرمنوں کے ساتھ ہیں۔ الہلال کے ایڈیٹر کو کلکتہ سے نکال دیا گیا۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے مسلم نوجوانوں کی ایک جماعت بنائی ہے اور ان کا مقصد (ترکی کو) یہاں لانا ہے۔ میں اس جماعت کا اعتماد حاصل کرنے اور اس کے اندرونی معاملات معلوم کرنے میں ناکام رہا۔ اب اگر ہم اپنے داخلی معاملات سے غافل نہیں تو سب سے پہلے مسلم مسئلہ (محمڈن پرابلم) پر غور کرنا ہوگا۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ انڈین نیشنلزم کی مشترک بنیاد پر دونوں پارٹیاں کس طرح ساتھ ساتھ رہ سکتی ہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو مسلمانوں کو ہوشیاری سے دھوکے میں رکھنا چاہیے۔ مسلمانوں کی جماعت پر جو ہم سے مل کر کام کر رہی ہے زیادہ اعتماد کرنا ممکن نہ ہوگا۔ آگے چل کر وہ ہر بات کو خراب کر دیں گے۔ انھیں الگ رکھ کر ہمیں اپنے کام کا نقشہ بنانا چاہیے۔ اگر ہمیں اُن کی مدد حاصل رہے تو بہت اچھا ہے، لیکن ہمیں ان کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ ہمارے منصوبوں کے خلاف ہیں تو انھیں ترکیب سے فریب میں مبتلا رکھنا چاہیے۔" (۹۳)

ان افسوس ناک تحفظات ذہنی کے ساتھ مسلمان اور ہندو انقلابیوں کا ساتھ کام کرنا اور مشترک مقصد کے حصول کے لیے پرخلوص جدوجہد کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ۱۹۱۶ء میں سخت کارروائی کرکے ان کی سرگرمیوں کو روک دیا اور ان کی انقلابی تنظیموں کو منتشر کر دیا۔

طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں (۱۹۱۲ء-۱۹۱۳ء) میں مختلف محاذوں اور عالمی جنگ کے ابتدائی مراحل میں جرمنی کی فتوحات کی مصور رپورٹیں الہلال میں شائع ہوئی تھیں۔ یورپی محاذ پر اتحادیوں کی فوجی شکستوں کی خبریں طنز آمیز تبصروں کے ساتھ چھپی تھیں۔ پھر آزاد جہاد کی تبلیغ کررہے تھے اور مسجد کانپور کے سلسلے میں سخت موقف اپنائے ہوئے تھے (۱۹۱۳ء)۔ ان سب باتوں نے حکومت کو مولانا آزاد کی طرف سے مشتبہ اور خوفزدہ کررکھا تھا۔

عالمی جنگ یکم اگست ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی۔ اس کے بعد الہلال نے انگریزوں کا طنزیہ مذاق اُڑاتے ہوئے زیادہ طاقت ور ہونے کے بارے میں لکھا۔ اس کے بعد ۱۴/اور ۲۱/اکتوبر ۱۹۱۴ء کے مشترک شمارے میں اینٹورپ کے سقوط پر آزاد کا مضمون شائع ہوا جس پر الہ آباد کے 'پانیر' کے توجہ دلانے پر حکومت نے نوٹس لیا۔ یکم نومبر ۱۹۱۴ء کو اس اخبار نے اڈیٹوریل لکھا، عنوان تھا Pro-Germanism in Calcutta (کلکتہ میں جرمنی کی حمایت)۔ خیال ہے کہ یوپی کے لفٹنٹ گورنر نے 'پانیر' سے یہ اڈیٹوریل لکھوایا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا:

> ''الہلال ہفتہ وار مصور اخبار ہے، جو کلکتہ سے اُردو میں نکلتا ہے۔ اسے دہلی کا ایک مسلمان جس کا نام ابوالکلام ہے شائع کرتا ہے۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے اُس کا رویہ نمایاں طور پر اس قدر جرمنی کے ایک حمایتی کا رہا ہے کہ اس کے قاری اس بات پر متعجب ہیں کہ حکومت نے کیسے اس کی تحریروں کو برداشت کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ اخبار اُردو میں چھپتا ہے اور کلکتہ میں اس کا کوئی نوٹس نہیں لیتا اور اس میں کوئی شبہ نہیں، یہی اس کی خاص وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے اڈیٹر نے اس کا مقام کلکتہ منتخب کیا۔ دوسری وجہ اخبار کا شرارت سے بھرا طنزیہ اور اشارتی وتلمیحی اسلوب بیان ہوسکتا ہے جسے انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو ان تحریروں کا اثر اور زور ختم ہوجاتا ہے اور اس کا بہت زیادہ امکان بھی ہے کہ راجدھانی میں زیادہ تر انگریز افسر اس اخبار کو پڑھتے بھی نہیں۔'' (۹۴)

جرمنی اور ترکی کے حق اور برطانیہ کی مخالفت میں الہلال نے جو کچھ لکھا تھا حکومت ہند نے اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا، اینٹورپ کے سقوط پر اس کے مضمون کی طرف حکومت بنگال کی توجہ مبذول کرائی اور اسے ہدایت دی کہ اخبار کے خلاف قانونی کارروائی کرے۔ بنگال کی حکومت پہلے ہی مبلغ ۲۰۰۰ روپے کی ضمانت اور مذکورہ مشترک شمارہ ضبط کر چکی تھی۔ اس مرتبہ اس نے مبلغ ۱۰،۰۰۰ روپے کی رقم بطور ضمانت جمع کرانے کے لیے کہا۔ آزاد کو پریس بند کر دینا پڑا۔ ایک سال بعد انھوں نے ایک نیا اخبار البلاغ نکالنا شروع کیا، لیکن اس کی اشاعت بند ہو گئی، جب ۲۳ / مارچ ۱۹۱٦ء کو ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کے تحت ان کو بنگال سے چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ دہلی، پنجاب، یوپی اور مدراس کے صوبوں میں داخلہ پہلے ہی ممنوع تھا، اس لیے انھوں نے بہار کو منتخب کیا اور رانچی چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ چوں کہ یہ مقام کلکتہ سے بہت دور نہیں تھا، وہ وہاں سے البلاغ کو بآسانی جاری رکھ سکتے تھے، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ رانچی ۱۵/ اپریل ۹۱٦ء کو پہنچے اور ۱۳/ اپریل کو صوبہ بہار کی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا کی ہدایت پر انھیں چند پابندیوں کے ساتھ وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ (۹۵) بعد میں ۲۲/ اکتوبر کو حکومت ہند کی ہدایت پر ان کی نقل و حرکت پر مزید پابندیوں کے ساتھ حکومت بہار نے انھیں رانچی میں نظر بند کر دیا۔

مولانا آزاد کی انقلابی سرگرمیوں اور ان کی تحریروں اور تقریروں کو، جنھوں نے ان کے ہم وطنوں کے انگریز مخالف جذبات کو بہت زیادہ اُبھار دیا تھا، باغیانہ کہا گیا۔ آخر کب تک ظالم اور آمرانہ انگریز حکومت ایک انقلابی کی آزادی کو برداشت کر سکتی تھی؟ اسے فیصلہ کرنا تھا اور اُس نے انٹیلی جنس رپورٹ (مبالغہ آمیز اور عموماً بے خبر) کی بنیاد پر فیصلہ کیا۔ رپورٹ یہ تھی کہ وہ جرمنی کے جاسوس تھے، باہر کے ملکوں سے اپنے اخبار کے لیے فنڈ حاصل کرتے تھے، بادشاہ کے دشمنوں سے غدارانہ خط و کتابت کرتے تھے، ریشمی رومال کے خطوط کی سازش میں شریک تھے اور سرحد پار کے سرگرم ملاؤں اور سازش کی ہمت افزائی کرنے والوں کے ساتھ خدائی فوج میں بہ حیثیت لیفٹیننٹ کرنل شامل تھے۔ (۹٦)

رانچی میں آزاد کوئی ساڑھے تین سال نظر بند رہے۔ ۲۷/ دسمبر ۱۹۱۹ء کو وہ رہا ہوئے۔

حوالہ جات

۱- دیکھیے سیّد سلیمان ندوی کے نام مولانا آزاد کا خط۔ مکتوبات سلیمانی (بنام عبدالماجد دریابادی): حصہ اوّل، لکھنو، ۱۹۶۳ء، ص ۲۰ تا ۲۵۔

۲- الندوہ، جلد ۷، شمارہ نمبر ۴ (اپریل ۱۹۱۰ء) صفحہ ۱۱-۱۲، مولانا شبلی کی تقریر آزاد کے لفظوں میں۔

۳- الہلال، جلد ۱، شمارہ نمبر ۴ (۴راگست ۱۹۳۲ء)، صفحہ ۴۔

۴- جزیرۃ العرب اس علاقے کا نام تھا جو بحیرۂ روم، بحر احمر، بحر ہند، خلیج فارس اور دجلہ و فرات سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں عرب و حجاز، عراق، شام اور فلسطین شامل تھے۔ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور القدس (یروشلم) جزیرۃ العرب میں تھے۔ ان سے چھوٹے پانچ مقدس مقامات (نجف اشرف، کربلا، سمارہ، کاظمین اور بغداد) عراق میں تھے۔

۵- ابوالکلام آزاد، خلافت اور جزیرۃ العرب۔

۶- الہلال، جلد ۱، شمارہ نمبر ۹ (۸رستمبر ۱۹۱۲ء) صفحات ۴ تا ۸۔

۷- قرآن کریم: سورہ ۷، آیت ۵۶۔

۸- آزاد نے یہاں برٹش گورنمنٹ کے حق میں فیصلہ دیا ہے لیکن اپنے صحافتی اور سیاسی کیریئر کے آغاز میں یہ مناسب تھا کہ وہ یہ ظاہر کریں کہ ہندوانقلابیوں کی متشدد سیاست سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے اور یہ کہ ان کی تحریک بنیادی طور پر مذہبی تحریک ہے اور اگر ان کے کوئی سیاسی مقاصد ہیں تو یہ کہ وہ آئینی طور پر جمہوریت اور پارلیمانی طرز حکومت کے قیام کی کوشش کریں۔

۹- قرآن کریم: سورۃ ۵، آیت ۲۔

۱۰- یہ اشارہ انارکسٹوں اور انقلابیوں کی طرف ہے۔

۱۱- قرآن کریم: سورۃ ۲، آیت ۲۱۳۔

۱۲- قرآن کریم: سورۃ ۴۹، آیت ۱۳۔

۱۳- قرآن کریم: سورۃ ۲، آیت ۱۴۳۔

۱۴- نمبر ۱۲ اور ۱۳ کے تمام اردو اقتباسات ''قول فیصل''، اشاعت البلاغ پریس، کلکتہ ۵۱ تا ۵۳ کے ہیں۔

۱۵- ایضاً: صفحہ ۶۳، ۶۴

۱۶- یہ خاص طور پر ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۸ء کی طرف اشارہ ہے جب وہ امرتسر میں وکیل کی ادارت کر رہے تھے جہاں انھوں نے پنجاب کے انقلابیوں سے ربط قایم کیا۔

۱۷- قرآن: سورۃ ۶، آیت ۱۶۲، قول فیصل: بحولہ بالا، ص ۶۷

۱۸- ایضاً: ص ۶۷

۱۹- الہلال کا آخری شمارہ (پہلے دور میں) ۱۸ دسمبر ۱۹۱۴ء کو نکالا تھا۔ قریب ایک سال بعد انھوں نے البلاغ نکالا جو مارچ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ جب وہ کلکتہ سے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کے تحت رانچی میں نظر بند ہوئے۔

۲۰- آزاد کے پین اسلامی تصور کے لیے دیکھیے الہلال (۶ نومبر ۱۹۱۲ء، صفحات ۱۶ تا ۲۰) جس میں ان کا لکچر (منعقدہ ۲۷/ اکتوبر ۱۹۱۲ء بمقام کلکتہ) ''تقریر موجودہ اسلامی مسئلہ پر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

۲۱- دیکھیے، باب ۳۔

۲۲- دیکھیے، باب اوّل۔

۲۳- رجت رے، ''ریولوشنر یز، پین اسلامسٹس اینڈ بالشیوکس: مولانا ابوالکلام آزاد اینڈ دی پولیٹکل انڈر ورلڈ ان کلکتہ ۱۹۰۵ء-۱۹۲۵ء'' مشیر الحسن (مرتب) کمیونل اینڈ پین اسلامک ٹرینڈ ان کلونیل انڈیا، منوہر، ۱۹۸۱ء، صفحات ۸۹-۹۰۔

۲۴- گاندھی جی نے ۴/ جولائی ۱۹۱۹ء کو لکھا ''میرا جھکاؤ سیاست کی طرف نہیں بلکہ مذہب کی طرف ہے اور میں سیاست میں اس لیے حصہ لیتا ہوں کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ زندگی کے ہر شعبے پر مذہب حاوی ہے اور اس لیے بھی کہ تقریباً مذہب ہر نقطے پر ہندستان کی زندگی کو چھوتا ہے۔'' جوڈتھ ایم براؤن، گاندھیز رائز ٹو پاور: انڈین پولیٹکس ۱۹۱۰-۱۹۲۲ء، کیمبرج، ۱۹۷۲ء، صفحہ ۱۶۰، ۱۲/ اگست ۱۹۱۹ء کے بمبئی کرانکل کے حوالے سے۔

۲۵- قول فیصل: بحولہ بالا، ص ۶۷

۲۶- الہلال، جلد ۱، شمارہ نمبر ۴ (۴/ اگست ۱۹۱۲ء)، صفحات ۳ تا ۵۔

۲۷- طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، دہلی، ۱۹۴۵ء، صفحہ ۳۴۸۔

۲۸- ان دستاویز کے لیے دیکھیے شان محمد (مرتب)، دی انڈین مسلمز، اے ڈوکومینٹری ریکارڈ ۱۹۴۷ء-۱۹۰۰ء، جلد ۱، مینا کشی پرکاشن، میرٹھ، تاریخ درج نہیں، صفحات ۱۷۵ تا ۱۸۳۔

۲۹- ایضاً، صفحہ ۱۷۵۔

۳۰- ایضاً، صفحات ۱۷۵-۱۷۶۔

۳۱- ایضاً، صفحہ ۱۷۷۔

۳۲- شریف الدین پیرزادہ (مرتب)، فاؤنڈیشنز آف پاکستان، جلد اوّل، کراچی، ۱۹۶۹ء، صفحات ۶ تا ۳۵۔ آرچ بولڈ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک پرنسپل رہے۔ اپنے اس عہدے کی مدت میں انھوں نے مسلم سیاست میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ اپنے پیشروؤں کی مانند وہ حکومت ہند اور مسلم لیڈروں کے مابین ایک واسطے کا کام کرتے رہے۔

۳۳- اس لحاظ سے دلچسپ کہ اس کے افتتاحی فقرے اس طرح ہیں (ا) ''ہم امراء، جاگیردار، تعلقہ دار،

وکلاء، زمیندار، تاجر اور دوسرے لوگ جن کے دستخط نیچے ہیں...... (۲) ہم پورے طور پر ان بے شمار نعمتوں کا احساس رکھتے اور قدر کرتے ہیں جنھیں انگریزوں کی حکومت نے ہمیں دیا ہے......'' شان محمد، حوالہ سابق: صفحات ۱۹۲-۱۹۳۔

۳۴- شان محمد، حوالہ سابق: صفحات ۱۹۳-۱۹۴۔

۳۵- ایضاً: صفحہ ۱۹۵۔

۳۶- ایضاً: صفحہ ۱۹۴۔

۳۷- ایضاً: صفحہ ۱۹۷۔

۳۸- ایضاً: صفحہ ۲۰۱۔

۳۹- شریف الدین پیرزادہ، حوالہ سابق: صفحہ ۴۳، ۴۴۔

۴۰- طفیل احمد منگلوری، حوالہ سابق: صفحہ ۳۵۳۔

۴۱- میری، کاؤنٹس آف منٹو، انڈیا، منٹو اینڈ مورلے (۱۹۰۵ء-۱۹۱۰)، میکملن، ۱۹۳۵ء، صفحہ ۳۸۳۔

۴۲- شان محمد، حوالہ سابق، صفحہ ۳۰۱-۳۱۴ پر دیکھیے ۱۴ جولائی ۱۹۱۳ء کو لندن میں آغا خاں کی تقریر۔

۴۳- میری، کاؤنٹس آف منٹو، حوالہ سابق: صفحہ ۴۷۔

۴۴- شان محمد، حوالہ سابق: جلد اوّل صفحہ ۲۰۶۔

۴۵- ایضاً: صفحہ ۲۰۷۔

۴۶- ایضاً:

۴۷- ایضاً: صفحہ ۲۱۹۔

۴۸- ایضاً: صفحات ۲۴۵-۲۴۶۔

۴۹- آغا خاں ہی ایک ایسے مسلم لیڈر تھے جنھوں نے تقسیم بنگال کے خاتمے کو مسلمانوں کے لیے ایک نعمت تصور کیا تھا۔ انگریز حکومت سے ان کی غیر مشروط وفاداری اس کا خاص سبب تھی۔ اس پر ان کی اس قدر تنقید ہوئی کہ ہندستان میں ان کا موقف ان کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا اور انھوں نے مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔

۵۰- شان محمد، حوالہ سابق: صفحات ۲۴۵ تا ۲۴۷۔

۵۱- یہ بات اہم ہے کہ ۱۹۰۷ء میں ''ہندو سبھا'' کے نام سے ہندوؤں کی ایک جماعت پنجاب میں باضابطہ بنائی گئی۔ شاید، یہ تنظیم جزوی طور پر لیگ کے ردعمل کے طور پر تھی۔ پنجاب کی اسی صوبائی سبھا میں ہندو مہاسبھا کا وجود تلاش کیا جا سکتا ہے۔

۵۲- وی این دتا، حوالہ سابق: صفحہ ۶۳۔

۵۳- طفیل احمد منگلوری، حوالہ سابق، صفحات ۳۶۱-۳۶۲-۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کے طلبہ کے سامنے وقار الملک کی تقریر میں انگریز حکومت سے وفاداری پر زیادہ زور تھا۔

۵۴- الہلال، جلد۲، شمارہ ۷ (۱۹ فروری ۱۹۱۳ء)، صفحات ۴تا۶ اور ۱۹۔

۵۵- ایضاً، جلد۱، شمارہ ۸ (یکم ستمبر ۱۹۱۲ء) صفحات ۷-۸، یہ ایک طویل پیراگراف کا خلاصہ ہے۔

۵۶- الہلال، جلد۱، شمارہ ۲۳ (۱۹ دسمبر ۱۹۱۲ء) صفحہ ۷۔

۵۷- ایضاً: صفحہ ۱۰۔

۵۸- ایضاً:

۵۹- ایضاً:

۶۰- انٹیلی جنس بیورو کے اُس وقت کے (جولائی ۱۹۱۲ء) اسسٹنٹ ڈائریکٹر مسٹر پٹری نے بالکل صحیح سوچا کہ اب ''ہندو کانگریس پارٹی سے اتحاد کی طرف غالباً مسلم سیاست دانوں کا رُخ ہوگا۔ دیکھیے بی این پانڈے (مرتب) اے سینٹی نیری ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگریس، جلد دوم، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۹۱۔

۶۱- حوالہ سابق۔

۶۲- بی این پانڈے (مرتب) حوالہ سابق: جلد۱، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۳۱۱۔

۶۳- تفصیلات کے لیے دیکھیے شریف الدین پیرزادہ، حوالہ سابق: جلد۱، صفحات ۳۹۴ تا ۳۹۷۔

۶۴- کانگریس نے اپنے ۱۹۰۹ء کے جلسے میں علاحدہ حق راے دہندگی کو مسترد کر دیا تھا۔

۶۵- پیپا چکرورتی، ہندو ریسپونس ٹو نیشنلسٹ فرنٹ: کلکتہ، صفحات ۱۲۹-۱۳۰۔

۶۶- جوڈتھ ایم براؤن، گاندھیز رائز ٹو پاور: انڈین پولیٹکس: ۱۹۱۵-۱۹۲۲ء، کیمبرج، ۱۹۷۲ء، صفحہ ۳۰۔

۶۷- ۲۶/نومبر ۱۹۱۳ء کے الہلال میں آزاد نے لکھا کہ گاندھی جی کی بدولت ''جنوبی افریقہ کے تمام ہندستانیوں کے دلوں میں ایک آگ روشن ہے'' اور اس کے بعد کے شمارے میں پہلے صفحے پر گاندھی جی کی تصویر شائع کی۔

۶۸- الہلال، جلد۵، شمارہ نمبر۲، صفحہ ۲۷۔

۶۹- ڈگلس، حوالہ سابق: صفحات ۱۴۶ تا ۱۴۷۔

۷۰- ایضاً: صفحہ ۱۴۷۔

۷۱- الہلال، جلد۱، نمبر ۲۳ (۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء) صفحہ ۹۔

۷۲- الہلال، جلد۱، شمارہ نمبر ۳ (۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء) صفحہ ۶۔

۷۳- اس سے قرآن کریم کی آخری سورۃ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کا مطلب باہر کی حکومت ہے جو بقول آزاد، بدی اور معصیت کی قوت کی نمایندہ تھی۔

۷۴- الہلال، جلد۱، شمارہ نمبر ۸ (یکم ستمبر ۱۹۱۲ء) صفحات ۲-۳۔

۷۵- الہلال، جلد۱، شمارہ نمبر (۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء) صفحہ ۵-۱۱۔

۷۶- سیّد احمد خاں، مقالات سرسیّد، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، جلد ۱۶، ۱۹۶۳ء، لاہور، صفحات ۲۷۰-۲۷۷۔

۷۷- الہلال، جلد۱، شمارہ نمبر ۱۷ (۶ نومبر ۱۹۱۲ء) صفحہ ۲۰۔ ایک بار آزاد نے کہا تھا کہ انھوں نے قابل وثوق ذرائع سے سنا تھا کہ علی گڑھ کے پرنسپل بیک نے فقہ کی کتابوں سے مسئلہ جہاد کے باب کو کالج کے نصاب سے خارج کر دینا چاہا تھا۔

۷۸- سعید احمد، اکبرآبادی، برہان، جون ۱۹۸۰ء، دہلی، صفحات ۴-۵، سیّد سلیمان ندوی، یادِ رفتگاں: کراچی، ۱۹۸۳ء، صفحات ۳۸۸-۳۸۹۔ ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن، جلد ۳، مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۶۸ء، صفحات ۲۸۸-۲۸۹ کو بھی دیکھیے۔

۷۹- الہلال، جلد۱، شمارہ نمبر ۱۸ (۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء) صفحہ ۱۱۔

۸۰- آزاد نے اپنی تنظیم کا یہ نام قرآن مجید (۲۲:۴۷) سے لیا تھا۔ وہ 'حزب اللہ' کو الہلال کا دوسرا منطقی قدم تصور کرتے تھے۔

۸۱- یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حزب اللہ کے قیام کے باضابطہ اعلان سے قبل الہلال میں آزاد کے تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہونے کے لیے انجمن خدام کعبہ کے قیام کی ایک تجویز آئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تجویز کسی سنجیدہ فکر پر مبنی نہ تھی اور جو لوگ اس تخیل سے وابستہ تھے وہ تلون مزاجی کے حامل تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس اسکیم میں شامل ہونے سے معذرت کر لی اور پھر ان کی اپنی، اچھی طرح غور و فکر کے بعد تیار کی ہوئی، عملی اسکیم تھی جس کے بارے میں انھوں نے اعلان کیا کہ جلد ہی منصۂ شہود پر آئے گی۔ انجمن مذکورہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے شان محمد، حوالہ سابق، جلد ۳، صفحات ۳۰۴ تا ۳۰۷، (گورنمنٹ آف انڈیا، ہوم پولیٹیکل ڈیپارٹ، جولائی ۱۹۱۳ء نمبر ۷)، ایضاً جلد ۵، صفحہ ۴۲ (ہارڈنگ پیپرز ۱۹۱۰ء)، ابوسلمان شاہ جہاں پوری، انجمن خدام کعبہ، کراچی، کوئی تاریخ، خاص طور پر دوسرے، چوتھے اور نویں ابواب، گیل منالٹ دی خلافت موومنٹ، دہلی، ۱۹۸۲ء، صفحات ۳۵ تا ۳۸، ۵۰ تا ۵۱۔

۸۲- الہلال، جلد ۲، شمارہ نمبر ۱۸ (۷ مئی ۱۹۱۳ء) آخری صفحہ

۸۳- ڈگلس، حوالہ سابق، صفحہ ۱۳۴۔ ایسا لگتا ہے کہ ڈگلس فروری ۱۹۱۴ء کے خط میں آزاد کے خلاف سیّد سلیمان ندوی کے الزامات کو صحیح ماننے کے رجحان کے حامل ہیں۔ مکتوبات سلیمانی، جلد اوّل، صفحات ۲۰ تا ۲۷۔

۸۴- ایضاً، صفحہ ۱۴۰۔

۸۵- اُردو کی ایک حالیہ کتاب میں اس کا حوالہ ہے کہ بنگال کے انقلابیوں کی وجہ سے آزاد کو یہ حوصلہ ہوا تھا کہ وہ ہندستان اور نتیجے میں مسلم ملکوں کو آزاد کرانے کے لیے مسلمان انقلابیوں کی ایک جماعت قائم کریں۔ طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کے زمانے میں انھوں نے مسلم نوجوانوں سے رابطہ قائم کیا۔ انھی میں کلکتہ میڈیکل کالج کے طالب علم قمرالدین بھی تھے۔ قمرالدین نے گیا (بہار) کے ایک متمول خاندان کے نوجوان فرزند، قاضی احمد حسین، کا ان سے تعارف کرایا۔ قاضی صاحب مرحوم بنگالی انقلابیوں کی جوگنتر پارٹی کے سرگرم رُکن تھے، جو انوشیلن سمیتی کی طرح مسلم دشمن نہ تھی۔ انڈیا دنس

فریڈم میں آزاد نے لکھا ہے کہ وہ انقلابیوں کی ایک پارٹی میں شامل ہو گئے تھے (صفحات ۴ تا ۶)۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پارٹی کلکتہ کے جوگنتر سیل سے تعلق رکھتی تھی۔ آزاد اور قاضی احمد حسین کے مابین نظریاتی اتحاد تھا اور جلد ہی قاضی صاحب آزاد کے معتمد بن گئے جس کے ذمے آزادی کی انقلابی تنظیم کے لیے صاحب یقین اور معتبر آدمیوں کی تلاش تھی۔ رانچی کی نظر بندی کے دنوں میں قاضی احمد حسین کے ذریعے مولانا محمد سجاد (۱۸۸۲ تا ۱۹۴۰ء) جو بذات خود امارت شرعیہ کے بڑے نقیب تھے، ان سے ملے۔ دیکھیے شاہ محمد عثمانی ٹوٹے ہوئے تارے، عثمانی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء، صفحات ۵۷ اور ۲۶۹-۲۷۰۔ مزید دیکھیے مسعود عالم ندوی (مرتب) محاسن سجاد، پٹنہ، ۱۹۴۱ء، صفحات ۳۸-۳۹۔

۸۶- مکتوبات سلیمانی: جلد ۱، صفحہ ۲۴۔

۸۷- البلاغ، جلد ۱، شمارہ نمبر (۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)، صفحات ۱۶-۱۷۔

۸۸- رجت رے، حوالہ سابق: صفحات ۹۰-۹۱۔

۸۹- ایضاً: صفحہ ۹۲۔

۹۰- ایضاً: برکت اللہ (۱۸۷۰-۱۹۲۸ء) اور مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴ء) سے متعلق دیکھیے این کے جین مسلمز ان انڈیا: اے ببلیو گریفیکل ڈکشنری، جلد ۱، منوہر، دہلی، ۱۹۸۳ء، (علی الترتیب) صفحات ۱۲۱-۱۲۲ اور ۹۸-۱۹۹۔

۹۱- رجت رے، حوالہ سابق: صفحات ۹۳-۹۴۔

۹۲- ایضاً: صفحات ۹۴-۹۵۔

۹۳- ایضاً: صفحات ۹۵-۹۶۔

۹۴- وی این دتا، حوالہ سابق: صفحہ ۷۶۔ الہلال، جلد ۵، شمارہ نمبر ۱۹ (۱۱ نومبر ۱۹۱۴ء)، صفحات ۹-۱۰ بھی دیکھیے۔

۹۵- پابندیوں کی شرطیں یہ تھیں: (۱) رانچی کے ڈپٹی کمشنر کی اجازت کے بغیر وہ رانچی نہیں چھوڑیں گے (۲) اپنی تمام سرگرمیاں ختم کر دیں گے اور سیاسی احتجاجیوں سے نہیں ملیں گے۔ (۳) اپنے ملاقاتیوں کا اتا پتا اور ان کے ملنے کا مقصد بتائیں گے (۴) رانچی یا صوبے کی کسی جگہ پر جب تک وہ رہیں اپنے چال چلن اور اپنی مصروفیتوں کی ضمانت دیں۔ ان کو متنبہ کیا گیا کہ ان شرائط میں سے اگر کسی پر عمل نہیں کیا گیا تو ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کے تحت نظر بند کر دیے جائیں گے۔ ان شرائط اور دوسری شرطوں اور معلومات کے لیے دیکھیے جمشید قمر، مولانا آزاد کا قیام رانچی، احوال و آثار: رانچی، صفحات ۴۹، ۷۴۔ ۲۰۹، ۲۱۱-۲۱۳۔

۹۶- وی این دتا، حوالہ سابق: صفحات ۸۰-۸۱۔ دتا نے اس سلسلے میں کئی فائلوں کا حوالہ دیا ہے جن میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ریکارڈ اور ہوم منسٹری کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کے دستاویز ہیں (ڈیپازٹ: نیشنل آرکائیوز آف انڈیا)، شان محمد، حوالہ سابق، جلد ۵، صفحات ۸۰ اور ۱۱۳ بھی دیکھیے۔

مولانا آزاد کا سیاسی کارنامہ

ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات میں قدرت نے بیک وقت اتنی خصوصیات جمع کردی تھیں جن کا ظہور کسی ایک شخصیت میں نادرالوجود ہے۔ وہ خطیب بھی تھے اور ادیب بھی، عالم دین بھی تھے اور صحافی بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی، عملی سیاست داں بھی تھے اور مفسر قرآن بھی۔ پھر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان کی کون سی خصوصیت باقی سب خصوصیتوں پر حاوی تھی۔ اس بارے میں مختلف لوگوں کی رائیں مختلف ہیں۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ خطابت ہو یا انشاپردازی، صحافت ہو یا تفسیر نویسی ان کی اہمیت کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا دشوار ہے کہ ان میدانوں میں کسی شخص نے جو کارنامہ انجام دے دیا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور اب اس پر اضافے کا امکان نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے بعد کم سے کم اُردو میں آج تک اس پایے کا کوئی اور جریدہ شائع نہیں ہوا ہے، یہ بھی درست ہے کہ ''ترجمان القرآن'' کا قرآن مجید کے تفسیری لٹریچر میں بہت اُونچا مقام ہے اور اُردو میں تو میرے نزدیک اس سے عظیم تر تصنیف تاحال وجود ہی میں نہیں آئی ہے۔ اہل نظر ہمیشہ اس کا ماتم بھی کرتے رہیں گے کہ یہ تفسیر اپنی مکمل صورت میں ہماری نظروں کے سامنے نہیں آسکی۔ بایں ہمہ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ ادب وصحافت یا تفسیر نویسی کے میدانوں میں بہرحال اس کی گنجایش ہے کہ قدرت اپنی فیاضانہ بخششوں سے کام لے کر کل کوئی دوسرا ''ابوالکلام'' پیدا کردے جو اس کمی کو پورا کرسکے لیکن ایک میدان اور اس میدان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کارنامہ ایسا ہے جس کے دوبارہ ظہور میں آنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ

میدان ہے سیاسی فہم وتدبر کا اور وہ کارنامہ ہے ہندستانی قومیت کو مستحکم کرنے کا۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اب وہ حالات پیش ہی نہیں آئیں گے جن میں وہ کارنامہ انجام پذیر ہوا۔ تاریخ کا وہ موڑ گزر چکا ہے اور اب تاریخ اپنے کو اس طرح کبھی نہیں دہرائے گی جس میں ابوالکلام کی سیاسی فراست کا امتحان ہوگا۔

یہ ہندستان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنی تحریک آزادی کے دوران کئی ایسی قدآور شخصیتیں میسر آئیں جن کا مثیل کسی اور جگہ ملنا دشوار ہے لیکن اگر معیار کی بلندی کو پوری طرح پیش نظر رکھ کر ایسی شخصیتوں کی کھوج لگائی جائے جنھوں نے اس میدان میں ہمیشہ باقی رہنے والا کارنامہ انجام دیا تو میری ناچیز رائے میں تعداد چار پانچ سے آگے نہیں بڑھے گی (اور کسی ملک کے لیے یہ تعداد بھی کم نہیں ہے)۔ اس ضمن میں میرے ذہن میں سب سے پہلا نام لوکمانیہ تلک کا آتا ہے۔ لوکمانیہ تلک کے سیاسی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہماری قومی تحریک غیر ملکی حکومت کے سامنے عرض معروض کرنے کے اسٹیج سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ انھوں نے اسے پہلی دفعہ انقلابی رنگ وآہنگ عطا کیا۔ گاندھی جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہماری قومی تحریک کو عوامی تحریک بنایا اور اس کا رشتہ دیہات میں رہنے والے لنگوٹی بند کسانوں سے جوڑا، نیز اسے ایک مستقل فلسفہ اور ایک مستقل تکنیک عطا فرمائی۔ مولانا آزاد نے اس تحریک کو صحیح معنی میں قومی تحریک بنایا کیوں کہ ہندستان میں کوئی تحریک اس وقت تک قومی تحریک بن ہی نہیں سکتی تھی جب تک اس میں ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمان بھی شریک نہ ہوتے، مولانا آزاد نے یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا اس کی تفصیل آگے آئے گی لیکن یہاں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ اس جدوجہد میں مولانا محمد علی برابر کے شریک تھے۔ البتہ یہ بڑا افسوس ناک واقعہ ہے کہ آگے چل کر مولانا محمد علی قومی دھارے سے کٹ گئے اور مسلمانوں کی قومی تحریک سے وابستہ رکھنے کی ذمے داری تنہا مولانا آزاد کی رہ گئی۔ جب میں یہ عرض کرتا ہوں تو میرا مقصد دوسرے نیشنلسٹ رہنماؤں خصوصاً جمعیۃ العلماء کی خدمات کو نظرانداز کرنا نہیں ہوتا ہے لیکن میں یہ کیوں سمجھتا ہوں یہ بھی آگے چل کر عرض کیا جائے گا۔ اس فہرست میں آخری (لیکن مرتبے میں کسی سے کم نہیں) نام پنڈت جواہر لال نہرو

کا ہے جنھوں نے ہماری تحریک کو جدید ذہن عطا کیا، اس کا تعلق دوسرے ملکوں کی قومی تحریکوں سے استوار کیا اور حصولِ آزادی کے بعد ہندستان کا جو سیاسی اور اقتصادی نقشہ بننے والا تھا اس میں سب سے پہلے رنگ بھرنے کی کوشش کی۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۱۲ء میں کر دیا تھا جب انھوں نے کلکتہ سے ''الہلال'' جاری کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۴ سال تھی اور جب ۱۹۵۸ء میں ستر سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی اس وقت تک وہ اسی راستے پر گامزن رہے جو ۴۶ سال قبل انھوں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ راستہ ہندستان کی آزادی (جس کی تکمیل مولانا کی زندگی ہی میں ۱۹۴۸ء میں ہوگئی تھی) اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ تھا لیکن ان کے ذہن میں ہندستان کا جو نقشہ تھا اس میں ہندو مسلم اتحاد کو آزادی پر بھی فوقیت حاصل تھی کیونکہ انھوں نے خود فرمایا تھا کہ اگر بادلوں سے اُتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہو جائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندستان کو آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں آزادی سے دست بردار ہو جاؤں گا لیکن ہندو مسلم اتحاد کو نہیں چھوڑوں گا کیوں کہ اگر ہمیں آزادی نہ ملی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد قائم نہ ہوسکا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔ ''الہلال'' کا بنیادی پیغام یہی تھا اور اس کے بارے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی جیسے عالم دین نے فرمایا تھا کہ ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے جو ہمیں ''الہلال'' نے یاد دلا دیا۔ مولانا محمود حسن کے اس بیان پر غور فرمایئے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ میرے اس دعوے میں کہاں تک صداقت ہے کہ ہندستان میں متحدہ قومیت کو استحکام بخشنے میں سب سے بڑا کارنامہ مولانا آزاد نے انجام دیا ہے۔

''الہلال'' کے اجرا سے پہلے مولانا آزاد بنگال کے دہشت پسندوں سے متاثر رہے تھے لیکن یہ نوجوانی کا اُبال تھا جو جلدی ہی بیٹھ گیا۔ البتہ اس دوران بھی انھوں نے یہ عظیم خدمت انجام دی کہ ان دہشت پسندوں کو مسلمانوں کی طرف سے جو بے اعتمادی اور شکوک تھے اور جو نتیجہ تھے مسلمانوں کے سیاست سے دور رہنے کا انھیں اپنی ذاتی مثال سے بڑی حد تک رفع کر دیا۔ مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں سب سے بڑا موڑ اس وقت آیا جب وہ ۱۹۲۰ء

میں رانچی کی نظر بندی سے رہا ہونے کے بعد دہلی میں پہلی دفعہ گاندھی جی سے ملے۔ یہ صحیح معنی میں کعبہ و کاشی کا قران السعدین تھا اور اس نے ہندستان کی سیاسی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ اسی ملاقات کے بعد گاندھی جی نے تحریک خلافت کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا اعلان فرمایا اور عدم تعاون کی تحریک کا جنم ہوا جس نے ایک طرف ہندستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کے ایسے روح پرور مناظر دنیا کو دکھا دیے جنھیں دیکھنے کے لیے بعد میں نگاہیں ترستی ہی رہیں۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کانگریس نے آزادی ہند کے لیے جتنی تحریکیں چلائیں ان میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہ سب سے زیادہ مولانا آزاد کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ قدرت نے انھیں قلم اور زبان دونوں پر جو دسترس عطا فرمائی تھی اور ان کا کردار جتنا ارفع و اعلیٰ تھا اس نے عام مسلمانوں اور ان سے زیادہ مسلم علماء اور دانشوروں کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ یہ خود مولانا آزاد کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا بھی سب سے زیادہ شاندار اور تابناک دور تھا۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف صیاد بھی تاک میں لگا ہوا تھا۔ غیر ملکی حکومت اس صورت حال کو کیسے برداشت کرسکتی تھی کیوں کہ اسے برداشت کرنا اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھکوانے کے مترادف تھا۔ اس نے ایسا پانسہ پھینکا اور ایسی چال چلی کہ ہندو مسلم اتحاد کا یہ لہلہاتا ہوا چمن خاکستر میں تبدیل ہو کر رہا۔

ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی گئیں اور فساد کا بیج کس طرح بویا گیا یہ ایک لمبی داستان ہے جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہر حال شکوک کی فضا میں ۱۹۳۷ء کا قانون نافذ ہوا اور اس قانون کے مطابق جداگانہ اور محدود حق رائے دہندگی کی بنیاد پر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن لڑے گئے۔ یہی وقت تھا جب ۱۵ سال کی جلاوطنی کے بعد مسٹر محمد علی جناح انگلستان سے ہندستان واپس آئے۔ ۱۹۲۰ء تک مسٹر جناح کا تعلق کانگریس سے رہا تھا اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی سمجھے جاتے تھے لیکن جب ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو ان کی عافیت پسند طبیعت اس سے اپنے کو ہم آہنگ نہیں کرسکی اور وہ سیاست سے دست کش ہو کر انگلستان چلے گئے۔ کچھ عرصہ قبل علی گڑھ

معنی میں سچ گئی تھی۔

۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تو مولانا آزاد نے پریس کو ایک بیان دیا تھا۔ مشہور برطانوی صحافی اور مصنف لیونارڈ موسکے نے اپنی کتاب ''ہندوستان میں برطانوی حکومت کے آخری ایام'' میں لکھا ہے کہ اس بیان کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ مجھے اس بیان کا ایک جملہ آج تک یاد ہے اور اس جملے کے پیچھے فہم و فراست اور دوراندیشی کی جو دنیا آباد ہے اس کے رموز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ عیاں ہوتے جاتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ پاکستان کا قیام جتنے مسائل حل کرے گا ان سے بہت زیادہ مسائل پیدا کر دے گا۔ آج کوئی ہے جو اس جملے کی صداقت سے انکار کر سکے اسی طرح کا ایک اور جملہ مولانا آزاد نے ''انڈیا ونس فریڈم'' میں املا کرایا تھا اور وقت نے اس کی صداقت پر بھی ایسی مہر ثبت کر دی ہے جو کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی ہے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ قیام پاکستان کے وقت مسٹر جناح اور ان کے مقلد یہ بھول گئے تھے کہ جغرافیہ ان کے خلاف تھا۔ کیا بنگلہ دیش کے قیام نے یہ ثابت نہیں کر دیا ہے کہ جس شخص کی زبان سے یہ جملہ نکل رہا تھا وہ اپنے وقت سے کتنا آگے تک دیکھ سکتا تھا؟

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو واقعی بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور دراصل اس نے تقسیم وطن کی جنگ اسی وقت جیت لی لیکن اس سلسلے میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ جن رائے دہندگان نے اسے یہ جنگ جتائی ان کا حلقہ بہت محدود تھا۔ اگر یہی انتخابات عام بالغ حق رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوئے ہوتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا رہتا۔ دوسرے مسلم لیگ کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں جتنی نشستیں حاصل ہوئیں ووٹ ان کے مقابلے میں کافی کم ملے۔ یوپی جیسے صوبے میں جہاں فرقہ پرستی اپنے عروج پر تھی نیشنلسٹ مسلمان ۳۳ فیصدی ووٹ حاصل کر لے گئے۔ یہ اثر تھا ہمارے علمائے کرام کا اور ان علماء کو پشت پناہی حاصل تھی مولانا ابوالکلام آزاد کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جتنے مسلمان اس وقت کانگریس کے ساتھ تھے وہ سب علمائے کرام کے اثر ہی سے تھے۔ بلاشبہ ایسے لوگ بھی تھے جو بصورت دیگر بھی کانگریس سے وابستہ رہتے اور اس کا ساتھ دیتے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی

اور ان کی حیثیت محض انفرادی تھی، اجتماعی ہرگز نہیں تھی۔ یہی وہ بات ہے جو چودھری خلیق الزمان نے بعنوان دیگر ''شاہراہ پاکستان'' میں لکھی ہے اور جس کا حوالہ اُوپر دیا جا چکا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شہادت سب سے زیادہ معتبر وہی ہوتی ہے جو دشمن کی زبان یا قلم سے نکلتی ہے۔

تقسیم ملک کے باوجود ہمارے قومی رہنماؤں نے ہمارے ملک کا جو دستور بنایا اس کی بنیاد سیکولرزم پر رکھی اور اس میں اقلیتوں کو ہر میدان میں اکثریت کے مساوی حقوق عطا کیے۔ بے شک یہ بہت بڑا کارنامہ تھا اور ان کا سب سے زیادہ کریڈٹ پنڈت جواہر لال نہرو کو جاتا ہے جنھوں نے اس معاملے میں صحیح معنی میں مہاتما گاندھی کے جانشین ہونے کا ثبوت دیا۔ ساتھ ہی اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان تھے اور اگر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے طوفانی دور میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد قومی تحریک سے وابستہ نہ رہی ہوتی جس کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے اور اس نے بھی سوادِ اعظم کی اندھی تقلید کو اپنا شعار بنالیا ہوتا تو کیا گاندھی جی اور پنڈت جی اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود وہ کر سکے ہوتے جو انھوں نے کیا؟ اس طرح ہماری نئی قایم شدہ ریاست کا سیکولر کردار گاندھی جی اور پنڈت جی کے علاوہ جس شخص کا سب سے زیادہ رہین منت ہے وہ مولانا آزاد ہی کی ذات ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دستور سازی کے ہر مرحلے پر مولانا عملی طور پر اس سے وابستہ رہے اور جہاں تک ان سے ممکن ہوا بدلے ہوئے حالات کے باوصف انھوں نے دستور ساز اسمبلی کو صحیح راستے سے ہٹنے نہیں دیا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کام میں انھیں سب سے زیادہ مدد پنڈت جواہر لال نہرو سے ملی۔

یہ تو مستقبل کی نقشہ آرائی تھی لیکن تقسیم ملک نے جو فوری مسائل پیدا کر دیے تھے ان میں سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کا وجود اس ملک میں قائم رکھنے کا تھا، اس لیے کہ اگر وہی یہاں نہ رہ پاتے تو مستقبل کی نقشہ آرائی کس کے لیے ہوتی کیوں کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس ملک کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ جب تک اس کی تعمیر میں ہندو اور مسلمان دوش بدوش حصہ نہ لیں اس کا اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے گزشتہ سات سال میں جن لیڈروں کی پیروی میں اپنی نجات سمجھی تھی وہ یا تو نئی مملکت کے اعلیٰ عہدوں

کو زینت بخشنے کے لیے وہاں تشریف لے جا چکے تھے یا کہیں کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ گویا مولانا آزاد کے الفاظ میں پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست انھیں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کو ہمت بندھانے اور ان کی راہنمائی کرنے کے لیے کون میدان میں آیا، مولانا آزاد یا کوئی اور؟ دہلی کی شاہجہانی مسجد سے کس کی آواز فضا میں گونجی جس نے انھیں یاد دلایا کہ ''اس ملک میں جو اُجلے نقوش تمھیں نظر آرہے ہیں وہ تمھارا ہی قافلہ یہاں لایا تھا اس لیے انھیں چھوڑو نہیں، یہاں سے بھاگو نہیں کیوں کہ اگر تم بھاگنا نہیں چاہتے تو کوئی تمھیں بھگا نہیں سکتا۔'' ساتھ ہی انھیں عزت نفس کا یہ سبق بھی پڑھایا کہ ''میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو، خوشامد اور کاسہ لیسی کی وہی پالیسی اختیار کرو جو غیر ملکی حکومت کے دور میں تمھارا شعار تھا۔'' وقت کے جو حالات تھے ان میں یہ درس دینا کس دل گردے اور ساتھ ہی کس سیاسی تدبر اور دور بینی کا کام تھا اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے اور کیا آج بھی یہی درس اس قابل نہیں ہے کہ اسے ہم اپنا لائحہ عمل بنائیں؟ پھر لکھنؤ کے پلیٹ فارم سے مولانا آزاد نے مسلمانوں سے کہا کہ ''فرقہ وارانہ بنیادوں پر جماعت سازی کا تجربہ تم بہت کر چکے اور اس کے نتائج بھی دیکھ چکے اب ملک کی مشترک سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر کام کرنے کا تجربہ کر دیکھو۔'' آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں اور گزشتہ ۲۹ برسوں میں ہم نے جو سفر طے کیا ہے وہ انھی قیمتی مشوروں پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہم ان مشوروں پر پوری طرح عمل نہیں کر سکے ورنہ نہ معلوم اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے۔

یہ اس شخص کا سیاسی کارنامہ ہے جس کے بارے میں منجملہ اور باتوں کے پروپیگنڈا بھی کیا گیا تھا کہ وہ اصلاً علم وادب کے میدان کا شہسوار ہے۔ اس سے علم وادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور سیاسیات کو کوئی خاص فایدہ حاصل نہیں ہوا۔ یہ پروپیگنڈا کچھ اس شدومد سے کیا گیا کہ مولانا کے مخالفین ومعاندین ہی نہیں، بعض پیرو اور مقلدین بھی اس پر ایمان لے آئے حالانکہ جو امور اُوپر گوش گزار کیے گئے وہ اس امر کی شہادت دینے کے لیے کافی ہیں کہ اگر مولانا آزاد کسی شہ نشیں میں علم وادب کی مسند پر جلوہ افروز رہے ہوتے اور سیاسیات کے خارزار سے

انھوں نے اپنے تلوے چھلنی نہ کیے ہوئے تو ممکن ہے بیش قیمت کتابوں کا ایک ذخیرہ ہمارے ہاتھ آ جاتا لیکن ایسے ذخائر تو بہت سوں نے مہیا کیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زہر کا وہ پیالہ کون پیتا جسے پینے کے لیے قدرت صدیوں کے بعد کوئی سقراط اور کوئی ابوالکلام پیدا کرتی ہے اور اگر مولانا نے زہر کا وہ پیالہ نہ پیا ہوتا تو آج ہماری زندگیاں کتنی زیادہ مسموم ہوتیں بلکہ میری ناچیز رائے میں تو کہنا دشوار ہے کہ ہم اس ملک میں ٹک بھی پاتے یا نہیں! اور یہ تو یقینی امر ہے کہ ہندستان ایک سیکولر ریاست نہ ہو کر دھارمک راشٹر بن گیا ہوتا جس سے پورے ملک کو ایسا نقصان پہنچتا جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

مولانا آزاد کی سیاسی خدمات......ایک جائزہ

رشید الدین خاں

①

اس سوال کے جواب میں کہ مولانا آزاد کی سیاسی خدمات کیا ہیں، ایک دفتر کھل سکتا ہے۔نصف صدی کی تاریخ ہند کے اوراق میں کتنے واقعات، حادثات، معاملات اور مشکلات تھے اور کتنی رکاوٹیں، جستجوئیں اور دردمندیاں تھیں، جن کے ساتھ مولانا آزاد کا نام اور کام جڑا ہوا ہے۔قوم سازی، جدوجہد آزادی اور نئی سیکولر جمہوری ریاست کی نگہداشت کے تین مختلف اور یکے بعد دیگرے بنیادی ذمے داریوں کے کتنے مسائل ہیں جن پر مولانا کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی کی مہر ثبت ہے۔اس نصف صدی میں مسلمانوں کا کوئی اہم مسئلہ ایسا نہیں تھا جو ان کی دلچسپی اور ذمے داری کے دائرے سے باہر ہو۔مسلمانوں کی اجتماعی درماندگیاں، سماجی پسماندگیاں، اقتصادی دشواریاں، سیاسی بدگمانیاں، شکوک وشبہات، قومی صراط مستقیم سے انحراف اور وہ تعطل جو''آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا'' والی کٹھن حالت میں پیدا ہوتا ہے، یہ سبھی اجتماعی اُلجھنیں مولانا کے ذہن اور احساس پر بارگراں تھیں۔ان کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مسلم لیگ کا ساحرانہ مگر غلط انداز سیاست مسلمانوں کو ایک خیالی ارض ارم کا جھوٹا وعدہ کر کے نہ صرف دوسرے ہم وطنوں سے بدگمان اور الگ کر رہا ہے اور سامراجی سیاست کی شاطری سے بے نیاز ملک کی تقسیم کا باعث بن رہا ہے۔ بلکہ برصغیر کے مسلم اقلیتی علاقوں کے مستقبل کو اس بے حسی سے نظر انداز کر رہا ہے کہ جب جذباتی سیاست کا نشہ ٹوٹے گا تو مسلمان اپنی اس تاریخی نادانی پر شاید کف افسوس ملنے کے بھی قابل نہ رہیں گے۔اس لیے ان کو

مسلمانوں سے گلہ تھا کہ:

ساحر الموت نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور ناداں تو اسے سمجھا کہ ہے شاخِ نبات!

یاد کیجیے مولانا آزاد کی جامع مسجد کی وہ تاریخی تقریر جس کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو خشک یا تر اُبھرنے لگتے ہیں۔اس دردناک خطابت میں اُنھوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ایک مردِ حق، ہمدم وغم خوار کہہ سکتا تھا، جس کی صدائے وفا و معقولیت قافلہ قومی نے اجتماعی زندگی کے خطرناک موڑ پر، اپنی نافہمی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے نہ سنی اور اپنا نقصان اپنے ہاتھوں کیا۔

بڑے دردِ دل سے مولانا نے فرمایا:

”......تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اُٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ میں نے تمھیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم ہے کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔ سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں ٹھہرے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمھارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسا کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سنی اَن سنی برابر کر دی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسا تھا تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے......

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف اُلٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے......

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں، متحد ہندستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے......

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں...... البتہ ہندستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے......

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو! جامع مسجد کے بلند مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حال آں کہ دہلی تمھارے

خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمھارا جوش وخروش بیجا تھا اسی طرح آج یہ تمھارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمھیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ......

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے مگر سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔"

مولانا آزاد کی سب سے بڑی سیاسی خدمت تو ان کی زندگی کا نمونہ ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت میں اعلیٰ نصب العین، اولوالعزمی اور اعلیٰ قدروں کو یوں پیوست کر لیا تھا کہ وہ ان کے سیاسی کردار اور سماجی رہن سہن کا ذریعہ بن گئے تھے۔ ان کی شخصیت میں ٹھہراؤ بھی تھا اور جولانی بھی، استحکام کا سکون بھی اور انقلابی شرارے بھی، جلالی طرہ بازی بھی اور جمالی مروّت بھی۔ ان کی ایک مرکوز اور مبسوط (Integrated and comprehensive) شخصیت تھی، اپنی جگہ اٹل اور فیصلہ کن، مگر اہل کارواں کی ہمسری کا لحاظ رکھتے ہوئے کئی موقعوں پر انھوں نے اپنی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے اظہار سے بھی دریغ نہیں کیا۔

مولانا آزاد نہ صرف بے انتہا ذہین تھے بلکہ معاملہ فہم اور حاضر دماغ بھی۔ ان کو علوم متداولہ میں ید طولیٰ حاصل تھا اور علوم اسلامی میں وہ مجتہد کا مقام رکھتے تھے۔ تاریخ، فلسفہ، کلام اور منطق کا گہرا مطالعہ تھا اور سیاست حاضرہ سے گہرا لگاؤ۔ عربی، فارسی اور اُردو کے شہ پاروں کو یوں پڑھا اور ذہن نشین کر لیا تھا کہ جیسے وہ ان کی ذاتی میراث بن چکی ہوں، جس کا اظہار

ان کی انشا پردازی اور خطابت میں مناسب حال مقولے اور موزوں اشعار کے فی البدیہہ استعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ غبارِ خاطر ہی کو لے لیجیے، اس میں کیا کچھ نہیں ہے۔ ایک اعلیٰ ذہن کے نقش و نگار، زبان کی سلاست، متن کی بلاغت، تبحر علمی، لطیف مزاح، بڑے مزے کی حکایتیں، دلچسپ کہانیاں، پھڑک دار استعارے، منتخب اشعار، خاندانی پس منظر، اپنی زندگی کی بعض منزلوں کا ذکر، تخیل اور محاکات کی فراوانی، جذب دل کے انکشافات، ہم عصروں خصوصاً جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سیّد محمود اور بیرسٹر آصف علی کی زندانی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات اور چینی چائے کی تعریف و توصیف اور بنانے اور پینے کے اہتمام میں ایسی قصیدہ خوانی جو دنیا کی کسی اور زبان میں شاید موجود نہ ہو۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اقبال کے شاعرانہ مجموعوں کے کئی عنوانات اور ترکیبوں کا بڑا موزوں اور دلچسپ اطلاق مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف اوصاف پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی خطابت بمثل بانگ درا تھی۔ صحافت جیسے ضرب کلیم، پرواز ذہنی جیسے بال جبریل، سماجی ادب و اخلاق اور اندازِ نشست و برخاست جیسے رموز خودی، مسلمانوں کا درد اور ان کی بے اعتنائیوں پر صبر جیسے رموز بے خودی اور مطمحِ سیاسی جیسے پیام مشرق اور مولانا آزاد ان قدروں پر پورے اُترتے ہیں جن کی عکاسی اقبال کے اشعار میں بڑی حسن اور ندرت سے کی گئی ہے۔ یہ شعر تو لگتا ہے کہ مولانا ہی کو دیکھ کر لکھا گیا ہو:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

یوں تو مولانا آزاد میں قیادت کے وہ سارے اوصاف موجود تھے جو صحیح معنوں میں ایک رہنما میں ہونے چاہییں، مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کے باوجود ان کی سیاسی زندگی ایک نشیب و فراز کی داستان رہی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فراز اور نشیب کی داستان رہی۔ ایک عہد میں کامیابیوں کی جلوہ گری رہی اور دوسرے میں سانحہ کا منظر۔ ان کی داستانِ حیات میں دونوں پہلو تھے، کامیابیوں کے اُجالے اور ناکامیوں کے اندھیرے، انھوں نے تحریم اور توصیف کے قصیدے بھی سنے اور طعن و تشنیع کے طنزیہ نعرے بھی سنے۔ ان میں جہاں بعض

مقاصد حیات کی کامرانیوں کا احساس تھا وہیں بعض بنیادی مقاصد کی پامالی کا دلگیر حزن بھی تھا۔ عالم شباب میں وہ پر شباب سیاسی دور سے گزرے اور جب عمر نصف النہار کو پہنچی تو دھوپ چھاؤں کا عالم تھا اور پھر بڑھاپے میں مولانا کبھی تصویر درد نظر آتے تھے اور کبھی حکایتِ غم دوراں۔ یوں تو زندگی میں کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا مگر بعض شخصیتوں کی صورت پر عجب ایک شانِ استغناء چمکتی ہے، یہ شاید عمر بھر کے صبر و تحمل اور جہاں بینی کی ودیعت ہوتی ہے، مولانا آزاد کی جاذب اور منور صورت پر بھی یہی شان استغناء آخر میں خوب عیاں تھی۔ اس میں کچھ ایسی بے لوثی، کج کلاہی اور بانکپن جھلکتا تھا کہ زمانے کے نامساعد حالات کے باوجود ان کا نفس کہہ رہا ہو:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

سیاسی کامیابی اور ناکامی میں دخل شخصی اوصاف کے علاوہ حالات کے رُخ، تاریخ کے موڑ اور دیگر خارجی وجوہات اور بیرونی محرکات کے مجموعی اثرات کا بھی ہوتا ہے۔ اس کا احساس مولانا کو تھا۔ غبار خاطر کے ایک خط میں انھوں نے اپنے آپ کو ''ناوقت کا پھل'' لکھا ہے، کہتے ہیں:

''کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ ناوقت کے پھلوں کی طرح ناوقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں...... ایسی ناوقت کی طبیعتیں جب کبھی ظہور میں آئیں گی تو ناوقت کے پھلوں کی طرح موسم کے لیے اجنبی ہوں گی۔ نہ تو وہ وقت کا ساتھ دے سکیں گی نہ وقت ان کے ساتھ میل کھا سکے گا۔'' (غبارِ خاطر: دہلی، ۱۹۶۷ء، ص ۹۱)

ان کا یہ احساس غالب کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے جس میں غالبؔ نے غالباً خود اپنی زندگی کا جائزہ لے کر کہا تھا:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

بڑے لطیف انداز سے حکیم صدرائے شیرازی کے اس بلیغ شعر کو دہرا کر کہ:

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمارست
گوئی ثمر پیشتر از باغِ وجودم!

لکھتے ہیں:

"یہ شعر دہراتے ہوئے مجھے خیال ہوا میرا اور زمانے کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہو۔ طبیعت کی بے میل افتاد، فکر و عمل کے کسی گوشے میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے چل نہ سکی۔ اسے وجود کا نقص کہیے...... زمانہ جو قدرتی طور پر موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے اس ناوقت کے پھل میں کیا لذت پا سکتا تھا۔" (ایضاً)

پھر فرماتے ہیں:

"مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا، کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ جس راہ میں بھی قدم اُٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اُڑائی ہوئی تھی۔"

(ایضاً: ص۹۲، ۹۳)

مولانا آزاد شاید مسلمان سیاست دانوں میں وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے حالات حاضرہ کے تقاضوں سے اسلامی نظریۂ حکمرانی کو ایک نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے اپنے عہد کی سیاست کو قرآن حکیم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور حیاتِ نبوی کے سیاسی اور سماجی تجربوں کو پیش نظر رکھ کر جمہوریت اور متحدہ قومیت کے جدید میلانات کو اسلامی اصول سیاسی سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ ان ساری کاوشوں میں عقل، منطق، اجتہاد فکر اور جرأت عمل کو بڑا دخل رہا۔ وہ منقولات پر، معقولیت کو ترجیح دیتے تھے۔ اندھی تقلید پر روشن دماغی کو وہ تجربات ماضی سے فائدہ تو اُٹھاتے تھے مگر ان تجربات کو عین

ایمان نہیں سمجھتے تھے۔ ان میں تاریخ کے ترقی پذیری کے عمل کا ایک رومانی احساس تھا اور گو وہ تاریخی عوامل اور محرکات کے مسلسل عمل اور ردعمل کے جدلیاتی وجدان کا سائنٹفک علم تو نہیں رکھتے تھے مگر تاریخ عالم کے نشیب وفراز سے واقف تھے۔ ابن خلدون کا انھوں نے زیادہ حوالہ تو نہیں دیا لیکن ان کی سیاسی اور سماجی تحریروں میں ابن خلدون کے تفکرات اور اُس کے معرکتہ الآرا مقدمہ کے بنیادی مفروضوں کا پرتو ملتا ہے۔ وہ فارابی اور ماوردی کے قائل نہیں تھے اور اصول سیاست میں انھوں نے خود اپنا ایک نیا راستہ ڈھونڈ لیا تھا اور ایک نئے استدلال کا طریقہ مروج کیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں جو قول فیصل کے نام سے عدالت کے سامنے اپنا بیان دیا اس میں انھوں نے اپنے جذبۂ بغاوت کو نہ صرف حب الوطنی کی بنیاد پر جائز قرار دیا تھا بلکہ اس کو اسلامی اصول سیاست کی بنیاد پر اپنا فرض قرار دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ مسلمان کی حیثیت سے یہ ان کی ذمہ داری اور فرض ہے کہ وہ بدیشی استبداد کے خلاف، اپنے وطن کی آزادی اور اسلامی اداروں کی حفاظت کے لیے نعرۂ بغاوت بلند کریں۔ کیوں کہ قرآن حکیم نے سریع انداز سے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ''الامر بالمعروف ونہی عن المنکر'' پر پابند رہیں، یعنی ہمیشہ نیکی کا حکم دیں اور برائی کو روکیں، کیوں کہ یہی اُسوۂ حسنہ ہے اور رسول کریم ﷺ کے عہد سے یہ اسلامی معاشرت اور ضمیر سیاسی کا ایک بنیادی اصول رہا ہے۔ کئی احادیث اس اصول کی اہمیت میں پیش کی جاسکتی ہیں اور کئی تاریخی واقعات اس کی شہادت دیں گے۔ مثلاً امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت عظمیٰ ہی اس اصول کی دلگیر اور عبرتناک کہانی ہے۔ پھر جب منگول استبداد مشرق وسطیٰ میں بڑھنے لگا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے منگول حکمران کے روبرو نہ صرف اس کے ظلم وزیادتی پر تنقید کی بلکہ یہ جانتے ہوئے کہ اس بہیمانہ عہد میں مخالفت کی سزا موت ہے، انھوں نے سر دربار، منگول تشدد پر سخت نکتہ چینی کی۔ ان تاریخی واقعات کے پیش نظر مولانا آزاد نے کہا کہ انگریز حکومت کی مخالفت بنیادی اسلامی اصول سیاسی کے عین مطابق ہے۔

عہد نبوی میں مدینہ کے طرزِ حکومت کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اچھی اور اعلیٰ طرزِ حکومت جمہوری ہے جس میں مشورہ (Consultation) اور نیابت

(Representation) انسانی حقوق کی اہمیت، عدل گستری اور منصف مزاجی کی قدروں کو اہمیت حاصل تھی۔ مولانا آزاد نے صاف طور پر کہا ہے کہ بری طرز کی حکومت (Bad and corrupt form of governance) وہ ہے جو دمشق میں دارالخلافت منتقل ہونے کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد سے شروع ہوئی جس کی بنیاد خاندانی، جانشینی سلطنت آرائی، غیر نیابتی (non-representative) طرزِ حکومت پر مبنی تھی۔

اس میں سلطنت روم کے طریقہ کار کو اہمیت تھی اور بنیادی اسلامی قدریں اس میں مفقود تھیں۔ اسی لیے مولانا آزاد نے بنی اُمیہ کی حکومت کو استبدادیت قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ جب خلیفہ استبداد اور تشدد کی طرف مائل ہو تب اور بھی زیادہ لازم ہے کہ مسلمان اسلامی اصول کی پابجائی میں الامر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرائض زیادہ ہوش مندی اور تندہی سے ادا کریں۔

مولانا آزاد ہندستان میں متحدہ قومیت پر مبنی اور ملک کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے جمہوری، سیکولر، وفاقی طرز حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ نہ صرف جمہوریت کی روح اسلامی تعلیمات میں جھلکتی ہے بلکہ سیکولر ریاست کا نقشہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاقِ مدینہ میں واضح کر دیا تھا۔ جب انھوں نے یہ دو اصول ساتھ ساتھ منسلک کر دیے تھے کہ ہر مذہبی گروہ اپنے مذہب کا پابند رہے گا، مسلمان کے لیے اپنا مذہب اور یہودی کے لیے اپنا مذہب، اور اس کے باوجود مسلمان، یہودی، عیسائی، بت پرست وغیرہ مل کر ایک اُمۃ واحدہ میں منسلک ہو جائیں گے۔ اسی طرح وفاق (Federation) کا تجربہ خود ترکی کی مسلمان سلطنت عثمانیہ میں ملتوں کے اتحاد اور سیاسی اتفاق سے ظاہر ہو چکا ہے۔ ترکوں نے مختلف مذہبی گروہوں، نسلی گروہوں کو الگ الگ ملت تسلیم کیا تھا اور ان سب ملتوں کے جداگانہ قوانین اور طرز ہائے معاشرت بھی تھے۔ جیسے ملت روم، ملت یہود، ملت بلغاریہ وغیرہ۔

مولانا آزاد اپنے آپ کو اصولوں کا موجد (Innovator) نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنے آپ کو دریافت کرنے والا (Discoverer) تصور کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اصولِ اسلام اور ورثہ اسلام میں بہت سی چیزیں ہیں جن کو ہمیں نئے طریقے سے دریافت کرنا چاہیے اور ان

کی موزونیت کے لحاظ سے حالات حاضرہ میں ان کا استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً اسلام ایک طبقہ داری (Class) سماج کا قائل نہیں ہے۔ اس اصول کی روشنی میں مسلمان ایک نئے اور ترقی پسند سماج کی راہ تلاش کر سکتے ہیں۔

مولانا آزاد کا بڑا انوکھا اور بہت اہم کام یہی تھا کہ انھوں نے روح اسلام کو روح عصر کے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور اُن مثبت، ترقی پسند اور صحت مند قدروں کو جیسے جمہوریت، قومی اتحاد، سیکولر سماج، عالمگیر انسانیت، بنیادی انسانی حقوق اور آزادیِ ملک وقوم کو اسلامی نظریہ سیاسی کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی۔

مگر یہ تنقید اپنی جگہ درست ہے کہ مولانا آزاد کے سوچنے کے سانچے مذہبی تھے اور اسلامی تھے۔ وہ انسانی معاشرت کو مذہبی کسوٹی پر ہی پرکھتے تھے اور اپنے سیاسی مطمح نظر کی بنیاد اصولِ اسلامی پر رکھتے تھے۔ ان کی فکر اور عمل کو اگر مذہب اور اسلام کے دایرے سے جدا کر کے دیکھا جائے تو بہت سے مفروضے اور محرکات سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ ہندستانی سیاست میں گاندھی جی اور مولانا آزاد میں یہ امر مشترک تھا کہ دونوں کی بنیادی قدریں مذہبی تھیں اور باوجود یکہ دونوں میں دو مختلف مذہبی روایتوں کا اختلاف موجود تھا، مگر چونکہ دونوں اپنے اپنے مذہب کے اعتقادی پہلو سے زیادہ بنیادی اخلاقی اور انسانی قدروں کو اہمیت دیتے تھے اس لیے ان میں ایک عجیب، ان کہی یگانگت اور ہم آہنگی تھی اور شاید مذہب کے وسیع اور غیر متعصب اخلاقی اور انسانی پہلو کو اہمیت دینے کی وجہ سے گاندھی جی اور مولانا آزاد کے سیاسی تعلقات ان لوگوں سے بھی قریب تھے جو سیاست میں، مذہب کی مداخلت کو زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جیسے جواہر لال نہرو، بیرسٹر آصف علی۔

مولانا آزاد کے عقیدت مند رفیق کار اور مخلص دوست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب ''ذکر آزاد'' میں ایک بڑی دلچسپ اور صحیح تنقید کی ہے، جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی اور ایک بے باک پٹھان دوست کی راست گفتاری کو ظاہر کرتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''......لیکن مولانا خاندان، تربیت، ماحول کی پابندیوں سے آزاد ہو جانے پر بھی بالکل آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ سیاست میں نیشنلزم اور

مغرب زدہ جمہوریت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ کمیونزم کے برابر مخالف رہے۔ میں نے بارہا اصرار کیا کہ کمیونزم کا مطالعہ کریں مگر راضی نہ ہوئے۔ الہلال (دور دوم) میں ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' کا خلاصہ تو شائع کرنے کی اجازت دے دی تھی مگر خود کبھی مطالعہ نہ کیا اس لیے کہ کمیونزم ان کے مزاج، خاندانی روایات اور ماحول کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ بے شک عمر کے آخری دور میں سوشلزم تک آ گئے تھے مگر یہ سوشلزم کانگریسی تھا یا برٹش لیبر پارٹی کا جو حقیقت میں سرمایہ داری ہی کا دوسرا نام ہے۔''

مولانا آزاد میں گاندھی جی کی طرح مذہبی پیرائے کی حب الوطنی تھی۔ ان میں جواہر لال نہرو کی طرح کی عقلیت (Rationalism) پر مبنی اشتراکی طرزِ فکر (Socialist thought) اور مارکسی (Marxists) انداز کا تاریخی فہم نہیں تھا اور یہی ان کے سیاسی مطمح نظر کی حد بندی کا موجب ہوئی۔ وہ عام ترقی پسند تحریک (Progressive movement) اور کمیونسٹ پارٹی سے بھی دور رہے۔ انھوں نے انقلاب کا نعرہ تو ہر دم لگایا مگر اس میں رومانیت اور جذباتیت کا پہلو غالب تھا۔ انقلاب کے بنیادی سماجی اور معاشی محرکات اور تاریخی عوامل کا فہم اگر تھا بھی تو اس کا انھوں نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ تاریخی جدلیات کی منطق (Logic of historical dialectics) سے وہ گویا بے اعتناء سے رہے۔ اسی لیے وہ یوں تو ملک اور قوم کے ہر دلعزیز رہنما رہے لیکن ان کے فکر و فہم کی وہ افادیت اور سیکولر مقبولیت ثابت نہ ہو سکی جس نے جواہر لال نہرو کو ممتاز اور دیدہ ور قائد بنا دیا تھا۔

ہندستان کی جدوجہد آزادی کی ایک بین تاریخی کمزوری یہی رہی کہ اس میں سیکولر اسلوب بھرپور انداز سے نہیں اُبھر سکا اور نہ ہی ترقی پسند (Progressive) دھارے، رجعت پسند (Reactionary) دھاروں سے زیادہ قوی ہو سکے۔ زمان و مکان کی تحدیدات (Limitations) کو بھی اس میں دخل رہا اور قومی قیادت کی اُلجھنیں اور نظریاتی کمزوریوں نے بھی دشواریاں پیدا کیں۔ شاہد صدیقی کے الفاظ میں قوم یہ کہہ سکتی ہے کہ:

مجھے رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انھیں شعور سفر نہ تھا
کبھی راستوں میں اُلجھ گئے، کبھی منزلوں سے گزر گئے

یہ تو ایک بنیادی تاریخی تجربہ ہے کہ ہر عہد اپنے حالات کو، اپنے تقاضوں کو ماضی کے ورثے سے اس لیے مربوط کرتا ہے کہ عہد حاضر کا عمل ایک تسلسل کی شکل اختیار کرلے، مگر ساتھ ہی ہر عہد میں نئے مسائل کے حل کے لیے ندرت فکر، اجتہاد عمل اور اختراع طرز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی گروہ کا ہر معاشرہ ایک امتزاج کی تصویر پیش کرتا ہے۔ تسلسل اور تبدیلی کا، تقلید اور اختراع کا Continuity and change, immitation and innovation) ماضی سے ربط اور مستقبل کی طرف چھلانگ کا۔ اسی لیے ہر عہد کے قائدین کو تاریخ کے اس عمل کا فہم اور ادراک ہونا ضروری ہوتا ہے، ورنہ ماضی کی عبرتناک تاریخ یہ بھی سکھلاتی ہے کہ حیات اجتماعی میں کبھی کبھی ایسے موڑ بھی آئے ہیں جہاں سے کارواں بھٹک کر نافہمی کے کوہستان میں برسوں، بلکہ قرنوں بے نیل ومرام مارا مارا گھومتا رہا:

وہ وقت بھی دیکھا ہے تاریخ کی گھڑیوں نے
لمحوں نے خطا کی ہے، صدیوں نے سزا پائی

ہندستان کی جدوجہد آزادی کی ایک بڑی اُلجھن یہ رہی کہ عوامی سیاسی شعور کی بیداری میں مذہبی نظریوں اور مذہبی اصطلاحوں کے استعمال سے، تحریک آزادی ایک عالمگیر تحریک تو بن گئی مگر اس میں صحت مند سیکولر انداز فکر اور جدید جمہوری قومیت کی قدریں بھرپور انداز سے اُبھر نہ سکیں۔ سیاست میں مذہب کا جائز استعمال بھی ہوسکتا ہے جیسے گاندھی جی اور مولانا آزاد نے کیا مگر خطرہ یہ لاحق ہوجاتا ہے کہ مذہب کا ناجائز اور غیر مناسب استعمال بھی ہوسکتا ہے اور اکثر ہوا ہے جیسے مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا اور بعد میں جماعت اسلامی اور آر ایس ایس نے کیا اور اسی کی وجہ سے گاندھی جی اور مولانا آزاد کا زندگی بھر کا کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ نہ ہندو مسلم اور دیگر مذہبی گروہوں کا اتحاد مستحکم ہوسکا اور نہ ملک میں متحدہ قومیت تقویت پاسکی کہ وہ ملک کی سالمیت کی ضامن ہوسکے۔ اس میں گاندھی اور مولانا آزاد کی نیت اور عزم کی کمزوری ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ تاریخی حالت اور سیاسی ماحول کی پستی ظاہر ہوتی ہے اور یہ پستی مختلف معاشی، سماجی

اور سیاسی عوامل کے مجموعی منفی اثر کا نتیجہ تھی جس کے بعض اہم عناصر تھے، سامراج کی لگاتار ریشہ دوانیاں، جاگیردارانہ سماجی ماحول، کامگار طبقہ کی پستی، کسانوں اور دہقانوں کا بھیانک افلاس، متوسط طبقہ (Middle class) کے پھیلاؤ اور مثبت سیاسی اثر کی کمی، ترقی پسند طاقتوں کا فقدان اور اس کے برعکس فرقہ وارانہ ذہنیت کا فروغ، فرقہ وارانہ سیاست کا پھیلاؤ، بین مذہبی تعصب کی فضا کی فراوانی اور تنگ نظری سیاست کا جاہل عوام پر اثر وغیرہ۔

بہرحال ان سب حالات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد عہد حاضر کے ہندستان میں ان انوکھے اور دور بین قائدین میں سے ایک تھے، جنھوں نے تاریخ کے اس فہم اور حکمت کو اپنی فکر اور عمل کی بنیاد بتایا تھا کہ انسان اور انسانیت کے اعلیٰ قدروں کی جیت، دیر سے سہی، مشکل سے سہی، ابتدائی پسپائیوں کے بعد سہی، بڑی سخت مخالفت کے باوجود مگر اپنی جگہ اٹل، لازم اور ناگزیر ہے۔ تاریخ کے اس روش اور طریق کا بین ثبوت ہمیں عوامی تحریکوں جیسے تحریک جمہوریت، تحریک انسانی حقوق، تحریک آزادی کے نشیب وفراز سے مل جاتا ہے۔ مولانا آزاد جن اعلیٰ سیاسی قدروں پر ایقان رکھتے تھے وہ تھیں انسانی ہم آہنگی، مذہبی گروہوں میں صلح و آشتی، جمہوری طرز حکومت، انسانی حقوق، مساوات اور ہندوستان جیسے مختلف مذاہب، مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں پر منقسم ملک کی آزادی سالمیت اور ترقی کے لیے، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب (Unified nationalism and composite culture) کا ایک وفاقی معاشرہ اور وفاقی طرزِ حکومت پر مبنی نظام حیات (Federal polity and federal form of government) یہ صحیح ہے کہ حالات نے ان کا ساتھ نہ دیا اور اپنی زندگی میں وہ اپنے خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے۔ مگر ان کا بنایا ہوا نصب العین آج بھی ملک اور قوم کے لیے مشعل راہ ہے۔ یہی حقیقت ان کی شخصیت کی عظمت اور ان کی سیاسی فکر کی بلاغت کی غمازی کرتی ہے۔ زندگی بھر ان کا مشرب اقبال کے الفاظ میں یہی رہا ہے کہ:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

بڑے اختصار اور معنی خیز الفاظ میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف

انڈیا'' میں مولانا آزاد کی شخصیت کے بارے میں لکھا ہے، وہ ان کی شخصیت کا بہت صحیح اور واجب تجزیہ ہے اور اسی پر یہ مقالہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ جواہر لال نہرو نے لکھا:

''اسلام کی صحیح روایات میں رچے ہوئے مولانا آزاد اپنی علمی بصیرت اور فضیلت سے اسلامی ممالک میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے ترکی اور دوسرے ممالک میں حریت کی آواز بلند ہوتے دیکھی تھی۔ اس لیے ان کا نظریہ سیاست پرانے مسلمان لیڈروں سے جداگانہ تھا۔ انھوں نے مذہبی تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ وہ ہر بات میں عقلیت (Rationalism) کے علمبردار تھے......

مولانا آزاد نے الہلال میں مسلمانوں سے ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ صرف ان کے خیالات اور نقطۂ نظر ہی میں جدت نہیں تھی بلکہ ان کی تحریک کا رنگ بھی نیا تھا۔ ان کا اسلوب بیان جاندار اور پرزور تھا۔ ان کا ذہن عہدِ وسطیٰ کے خیالات، اٹھارویں صدی کی عقلیت اور جدید رجحانات کا ایک دل آویز مرکب تھا۔''

(۲)

مولانا آزاد کے دو بڑے سیاسی کارنامے

مولانا آزاد کے دو سیاسی کارنامے، ہندستانی قومیت کی بڑی میراث ہیں۔ ایک نظریاتی اور ایک عملی۔ ایک اجتہادی اور ایک مجاہدانہ! ان کا نظریاتی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تعلیمات قرآنی اور رسول کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور تاریخ اسلام کی روشنی میں، متحدہ قومیت کے شرعی اور مذہبی جواز کا ایک عالمانہ استدلال پیش کیا جو اپنے اجتہادِ فکر، جرأت ایمانی اور خلوصِ سیاسی کا ایک لاجواب نمونہ ہے۔

ان کا عملی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے متحدہ قومیت کی سیاست اور مشترکہ گنگا جمنی تہذیب (Composite culture) کی روایات کو تحریک آزادی کے زمانے میں اجتماعی قومی زندگی کی اساس بنانے اور آزادی کے بعد اس کو ہندستان کے نئے سیکولر جمہوری نظام سے وابستہ اور منسلک کرنے میں اپنی کاوشوں اور تمناؤں کا بنیادی مرکز بنالیا تھا۔ ان کی زندگی کا بہترین حصہ اسی جستجو کو عملی روپ پہنانے میں صرف ہوا۔

ان دو کارناموں کو ہندستان کی قدیم اور مسلسل تاریخ اور پیچیدہ سماجی پس منظر میں دیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمیں ایک طرف مسائل کی پے در پے مشکلات کا اندازہ ہو اور دوسری طرف ہم خلوص سے مولانا کے عزم اور یقین کی داد دے سکیں اور میرؔ کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے و لے اے میرؔ
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

ہندستان اور چین دنیا کے دو ہی ممالک بلکہ ان کو برصغیر کہنا چاہیے، ایسے ہیں جن کا تمدن

بے رخنہ اور بغیر قطع ہوئے ہزاروں سال سے قائم و دائم ہے (Uninterrupted civilzation) عہد عتیق میں کئی تمدن اُبھرے اور مرور زمانہ سے تہہ و بالا ہو گئے، بعض کے کچھ آثار ابھی بھی باقی ہیں۔ بہت سے تمدن بالتسلسل باقی نہیں رہے، گو ملکوں کے نام وہی باقی رہ گئے، جیسے مصر، یونان، روم یا بعض ختم ہی ہو گئے جیسے اسیریا، سومیریا، ازٹک میکسیکو وغیرہ۔ اقبال نے اسی تاریخی حقیقت کی طرف بڑا حکیمانہ اشارہ کیا ہے، جس کو اپنی مختلف تقریروں میں جواہر لال نہرو دہرایا کرتے تھے کہ:

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا
یونان و مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

مگر چین اور ہندستان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ چین میں یک رنگی زیادہ ہے کیوں کہ اس کی آبادی کی اکثریت ہان قبیلہ (Han race) کی شاخوں پر منقسم ہے، گو کچھ اور قبیلوں اور نسلوں کے لوگ بھی ہیں۔ جیسے مان، چن، ہوئی، اوئیگر، تبتی وغیرہ۔ ہوئی اور اوئیگر مسلمان ہیں اور تبتی لاماوادی بدھ متی ہیں۔ برعکس اس کے ہندستان کی تاریخی خصوصیت ہی یہ رہی ہے کہ صدیوں سے دریا کی موجوں کی طرح، جوق در جوق قبائلی قافلے نسلوں کے کارواں آتے رہے، بستے رہے اور اس مردم خیز دھرتی کو مالا مال کرتے رہے۔ یہ انسانی غول، تاریخ کے ہر عہد میں آتے رہے، خصوصاً شمال مغرب سے، گو کچھ شمال مشرق سے بھی آئے اور دلکش و خوشگوار وادیوں میں، دریاؤں کے کنارے، اپنی آرزوؤں اور اُمنگوں کی کھیتیاں لہراتے رہے۔ گنگا، جمنا، راوی، بیاس، جہلم، ستلج، نربدا، گوداوری، مہاندی، کرشنا اور برہم پتر، ان سب کے کنارے ہماری تاریخ کی رنگارنگی کی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے اقبال کی زبان میں فخریہ ہم یہ گاتے رہے کہ:

اے آبرود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا

مگر اس تصور کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر جو انسانی قافلے یہاں آئے، وہ اپنے ساتھ بعض ورثے بھی لائے۔ پے در پے، زبان کے، بیان کے، عقیدے کے، فکر کے، رسم و رواج کے، طریقہ حیات کے، رہنے سہنے کے، گانے اور موسیقی کے، کھانے اور ضیافت کے، غرض زندگی کی سب ہی کاوشوں اور اُمنگوں کے ورثے بھی آئے۔ اسی کے ساتھ یہاں پہنچ کر اور دیگر انسانی گروہوں سے میل جول اور ردوقدح کے بعد مختلف قسم کے اچھے اور برے روابط اور مراسم قائم ہوئے جن کے نتیجے میں کچھ اور نئے ورثے تیار ہوئے جو گوناگوں تعلقات پر حاوی تھے۔ جیسے محبت اور عداوت، دوستی و دشمنی، رشک و حسد، صلح و جنگ، بھروسا و بدگمانی، منافقت اور ملنساری، رفاقت اور رقابت، وفاداری اور جفاکشی، غرض بزم کی دلگیریوں اور پشیمانیوں اور رزم کی دل آزاریوں اور دل بستیوں، سب ہی قسم کے انسانی تجربوں اور حالتوں کا ایک پس منظر اُبھرا اور کچھ نئے ورثے بنے۔

ہندستان کی تاریخ میں دو مختلف عہدوں میں دو بڑے انسانی قافلے یہاں آئے جن کے کارنامے حیات سماجی اور تہذیب میں گہری طرح پیوست ہو گئے۔ عہد عتیق میں انڈو آرین قافلہ اور عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کے قافلے جو افغانستان، ایران، توران اور ماوراء النہر کے مختلف علاقوں سے مختلف قبیلوں پر منقسم آئے۔ جیسے پٹھان، ازبک، تاجک، ترکمان، بلوچ، بختیاری وغیرہ۔ عہد عتیق میں سب سے بڑا اور بااثر قافلہ جو تاریخ کی پہلی کرنوں کے ساتھ یہاں پہنچا وہ تھا آریہ نسل کا، جس کے پیدائشی مسکن کے بارے میں مختلف تاریخی شواہد اور قیاس آرائیاں اور مختلف سماجیاتی نظریے ہیں۔ یورپ کے یخ بستہ بالٹک علاقہ سے لے کر، قفقاز کی حسین وادیوں تک ان کے گہوارے کی نشان دہی ہوتی ہے، بعض محققین ان کی اصلی جائے پیدائش درمیانی یورپ، خصوصاً ہنگری کے قرب و نواح میں متعین کرتے ہیں۔ آریہ نسل کی کئی شاخیں دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل گئیں۔ ایک ایران میں جا بسی، ایک نے جرمنی کا احاطہ کیا اور دوسرے دریائے سندھ کو پار کر کے بھارت ورش میں پھیل گئی۔ یہی انڈو آرین (-Indo

(Aryan) ہیں جنھوں نے ہم کو رگ وید اور دیگر تین وید دیے اور ان میں اوپنیشد کا عالمگیر فلسفہ حیات و ممات دیا جس کی وجہ سے ہم مولانا آزاد کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ:

"دنیا میں وحدت الوجود (Pantheism) کے عقیدے کا سب سے
قدیم سرچشمہ ہندستان ہے۔"

یاد رہے کہ وید مقدس نے ہی ہندستان کو ہندستان بنایا، اس معنی میں کہ دنیائے علم و تقدس، فلسفہ اور رموز حیات میں قدیم انسانی حکمت کا سرچشمہ اسی خزانہ فکر و محاکات سے پھوٹا اور ہماری تہذیب کے فکر و اخلاقیات کے ادب عالیہ (Classics) کا بھی وہی مخزن رہا۔ اس ملک کا بنیادی اور اکثریتی عقیدہ جس کو عرف عام میں آج ہندوازم کہا جاتا ہے، اس کا اہم اثاثہ ویدانت کا ہی نظریۂ عالم، حیات اور انسان ہے۔ ہندو مذہب کے بنیادی صحیفوں میں رامائن اور مہابھارت اور اس میں گیتا کی تعلیمات کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہی وہ خزانہ ہائے عرفان و وجدان ہیں جن پر ہماری مسلسل چار ہزار سالہ پرانی تہذیب اور اس کی قدروں اور مفروضوں کا دار و مدار ہے۔

مسلمانوں کے قافلے جنھوں نے عہد وسطیٰ میں مختلف اوقات اور مختلف حالات میں سرزمین ہند کا رُخ کیا۔ ان کے محرکات سفر و ہجرت محض مذہبی نہیں تھے۔ یہ سمجھنا تاریخ کے واقعات کے مغائر ہوگا کہ یہ قافلے مجاہدین دین کے یا غازیانِ اسلام کے تھے۔ کچھ ایسی موجیں بھی ساحل ہند سے ٹکرائیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ حکمرانی اور سلطنت آرائی کے خواب لے کر بھی کچھ قبائل یہاں فتوحات کی مہم میں سرگرداں رہے اور اپنے جبر و استبداد اور تلوار کے زور سے پسماندہ طبقوں کو اپنے عقاید کے زمرے میں شامل کر لیا۔ مگر زیادہ اور مسلسل لہریں ان مسلمانوں کی تھیں جو زرخیز زمین کی تلاش میں یا اپنے فن اور ہنر کی قدردانی کی جستجو میں گوناگوں نوکریوں میں قسمت آزمائی کرنے، مختلف ذرائع معاش اور زندگی کے نئے گہواروں کی آرزو میں یہاں آئے اور ہندستان کو اپنا وطن بنایا۔ غرض مختلف اور متنوع محرکات نے انھیں ہندستان کی طرف کھینچا اور ایسا کھینچا کہ پھر پشتہا پشت وہ اسی مادر وطن میں پروان چڑھے اور مر کر اسی خاک میں پیوست ہو گئے۔

ہندستان میں اسلام، پانچ مسلم اقتدار کے مراکز سے آیا۔عرب، افغانستان اور ایران، توران اور ماوراء النہر۔ سندھ، کچ، مالا بار اور کورومنڈل میں عرب سے مسلمان آئے، پنجاب اور گنگا جمنا کے دواب میں، وندھیا چل، دکن اور بنگال میں، مختلف قافلہ افغانستان، ایران توران اور ماوراء النہر (یعنی سمرقند، بخارا، خیوا، فرغنہ، بلخ و بدخشاں وغیرہ) سے آئے۔فقہ کے لحاظ سے ہندستان میں زیادہ تر حنفی المذہب ہیں، جنوب میں شافعی مذہب کے گروہ ہیں اور فقہ امامیہ کے پابند اہل تشیع ملک کے مختلف علاقوں میں کہیں کم اور کہیں زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ مغربی ساحل پر خلیج عرب کے آس پاس تاجر پیشہ مسلم فرقے جیسے خوجہ جو اسماعیلی ہیں، بوہرے، میمن وغیرہ آباد ہیں۔

مذاہب کے لحاظ سے ہندستان میں آٹھ مذہب کے پیرو رہتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، بدھ متی، جین، زرتشتی، پارسی اور یہودی۔ان کے علاوہ مختلف قسم کے بت پرست اور قبائلی عقیدوں کے گروہ بھی ہیں۔شاید دنیا کے کسی ملک میں، انسانی عقیدوں کی اتنی فراوانی نہیں ہے جتنی ہندستان میں۔ظاہر ہے کہ مذاہب کی اس رنگارنگی میں متحدہ قومیت کے استحکام اور تقویت کا مسئلہ قدرے پیچیدہ اور مشکل الحل ہو جاتا ہے۔مولانا آزاد اس سے واقف تھے اور اسی وجہ سے ۱۹۲۰ء کے بعد انھوں نے اپنی پوری توجہ، مہاتما گاندھی کی قیادت میں، اس بنیادی تعمیری کام میں لگادی اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں انھوں نے تقریباً نصف صدی کا زمانہ صرف کیا۔

متحدہ قومیت کی اہمیت اور اس میں مسلمانوں کی ضروری شرکت، وہ عنوانات تھے، جن پر مولانا آزاد نے بہت کچھ لکھا اور اپنی کئی تقریروں میں ان پر روشنی ڈالی۔اسی طرح جمہوری وفاق نظام کے مضمرات کے بارے میں مولانا آزاد نے مختلف مواقع پر ان کے مختلف پہلوؤں کے سمجھانے کی کوشش کی۔

الہلال کے ۱۸/دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں مسلمانوں کو عبرت دلاتے ہوئے بڑے جلالی انداز سے لکھتے ہیں کہ:

"......یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندستان کا سیاسی انقلاب ہو چکا

ہوگا۔ غلامی کی بیڑیاں جو اُس نے خود اپنے پاؤں میں ڈالی ہیں، بیسویں صدی کے ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو چکے گا جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کرو کہ اس وقت ہندستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اُس میں سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا ہوگا؟ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بد بخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہ آزادی میں ایک سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست اجانب میں بازیچہ لعب، ہندستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی۔"

اس قسم کے دلوں کو ہلا دینے اور دماغوں کو جھنجھوڑنے والے آتش فشاں مضامین انگریز حکومت کے لیے وبال جان بنے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے مولانا کو ۱۹۱۶ء میں کلکتہ اور بنگال سے نکال دیا گیا تھا اور وہ رانچی میں چار سال محصور زندگی گزارتے رہے۔ اسی زمانے میں گاندھی جی نے ان سے ملنے کی کوشش کی مگر انگریز حکومت نے انھیں اجازت نہیں دی اور ان دو قائدین کی ملاقات ۱۹۲۰ء تک ملتوی رہی۔

مولانا آزاد نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کی عالمگیر انقلابی تبدیلیوں میں ترک اور عرب قومی تحریکوں سے یہ بنیادی سبق سیکھا کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں ہوتی بلکہ قوم کے مختلف عناصر کے امتزاج سے یہ اُبھرتی ہے اور ایک نیا سیاسی شعور پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے اس بنیادی حقیقت کو سمجھ کر یہ مان لیا کہ قومیت کی اساس مذہب سے ماورا سماجی تشخص، علاقائی وحدت (Territoril Unity) اور سیکولر سیاسی محرکات پر مبنی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ اعتراف خود ان کے لیے بھی نیا تھا کیونکہ ۱۹۲۰ء تک وہ علاحدہ مسلم حب الوطنی اور عالمگیر اسلامی اخوت کے قایل تھے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں سیکولر، علاقہ واری قومیت کا کوئی ذکر اس وقت تک نہیں تھا۔

مولانا نے کل ہند خلافت کانفرنس کو کانپور میں ۲۹ ردسمبر ۱۹۲۵ء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''ہندستان کے موجودہ منظر کا سب سے زیادہ دردانگیز پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب مشرقی ممالک کے موجودہ تغیرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے۔ جب کہ مشرق کی تبدیلیاں آزادی اور ترقی کی طرف جارہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک قدم اُٹھا کر صرف تھک ہی نہیں گیا ہے بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے۔ ہندستان کی طرح شام میں بھی مختلف مذاہب اور اور نسل کی مشترک آبادی ہے، وہاں کے دروزی قبائل (Druze) عام مسلمان اور مسیحی جماعتیں صدیوں سے باہم دگر قتل و غارت میں سرگرم رہی ہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے مذہبی اختلافات کے لیے صرف صلیبی لڑائیوں (Crusades) ہی کا افسانہ کافی ہے، جس کے آٹھ خونی سیلاب اسی سرزمین میں بہہ بہہ کر خشک ہو چکے ہیں۔ تاہم آج اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان سب کا متحدہ نعرہ ہے اَلدِّینُ لِلْوَاحِدِ وَالْوَطَنُ لِلْجَمِیْعِ وطن سب کے لیے ہے اور ہر شخص کا دین اس کے لیے ہے لیکن ہندستان کا کیا حال ہے؟ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیمی اور سیاسی پیداوار بھی آج اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔ مذہبی منافرت، جماعتی تعصب، فرقہ وارانہ تنگ دلی اور محکومانہ ذہنیت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑے ہیں۔''

مولانا آزاد کی رام گڑھ کانگریس کے سالانہ جلسے کی مارچ ۱۹۴۰ء کی صدارتی تقریر شاید ان کی آخری جامع تقریر ہے، جس میں انھوں نے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے فوائد اور علاحدگی کی سیاست کے مضمرات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بڑی صفائی سے انھوں نے یہ کہا تھا کہ مسلمان نہ تو معمولی اصطلاح میں اقلیت ہیں اور نہ ان کو سیاسی اقلیت ہونے کا بے جا احساس

ہونا چاہیے۔ کیوں کہ برٹش انڈیا کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں تو ان کو اکثریت حاصل ہے (اور اگر بلوچستان کو شمار کیا جائے تو پانچ ہیں) انھوں نے انگریز سامراج کی تفرقہ پرور حکمت عملی کا رول واضح کیا اور کہا کہ مستقبل میں جب ہندستان وفاقی اور جمہوری دستور بنے گا اس میں مختلف اکائیوں (Units) کو خود اختیاری (Autonomy) حاصل ہوگی تا کہ وہ اپنے اندرونی معاملوں کو اپنے اپنے انداز سے حل کر سکیں۔ بہر حال مولانا آزاد ملک شام کے کامیاب متحدہ قومیت کے تجربے کو پیش نظر رکھ کر، یقین رکھتے تھے ہم بھی ہندستان میں یہی کر سکتے ہیں، اگر بالغ النظری اور سیاسی فہم سے کام لیں۔

مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی تعمیر میں مشغول کرنے میں مولانا آزاد نے تاریخ اسلام کے زریں عہد کے، یعنی عہد نبوی سے اسوۂ حسنہ پر مبنی ایک انوکھا جواز پیش کیا۔ ہجرت کے پہلے ہی سال میں (یعنی ۶۲۳ء) رسول اکرم ﷺ نے، مدینہ اور اس کے قرب و نواح کی حفاظت، دفاع اور بہبودی کے لیے، مہاجر اور انصار مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذہبی گروہوں، جن میں یہودی، نصرانی، صابی (Sabaeans) ماگی (Magians) اور بت پرست قبائل بھی شامل تھے۔ سب کو ملا کر ایک سیاسی گروہ کی شکل دی تا کہ مخالف قریش مکہ اور دیگر سرکش قبائلیوں کی یلغار سے باشندگان محفوظ رہ سکیں۔ اس انتظام کو باقاعدہ شکل دینے کے لیے رسول کریم ﷺ نے ایک قانونی دستاویز خود تیار فرمائی جس کو تاریخ میں ''میثاقِ مدینہ'' یا ''عہد نامۂ مدینہ'' یا ''دستورِ مدینہ'' کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس عہد نامے کی رو سے سماجی اصلاح کے بعض اہم مسائل پر مختلف مذاہب اور عقیدوں کے پیروؤں نے اتفاق کیا اور اس طرح اپنے اشتراک کو ایک قانونی اور سیاسی شکل دی مثلاً سب نے اقرار کیا کہ بعض قدیم غیر انسانی روایات کا خاتمہ ہونا چاہیے، جیسے اس رواج کا کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے۔ عرب کا ایک دوسرا عجیب رواج تھا جس کی رو سے نہ صرف دولت بلکہ فوت ہونے والے مرد کی بیویاں بھی ورثہ میں آتی تھیں، اس رواج کو ختم کر کے یہ ترمیم منظور ہوئی کہ صرف دولت ہی ورثہ میں مل سکتی ہے، بیویاں نہیں پھر یہ بھی مان لیا گیا کہ اصل پر زیادہ سود نا جائز ہے، غلاموں کی رہائی نیک عمل ہے۔ ایک متفقہ عدالت کا قیام بھی عمل میں آیا تا کہ قانون میں یگانگت اور مساوات قایم ہو

سکے۔اس عہدنامے کے دیباچے میں ہی رسول کریم ﷺ نے اس مختلف مذاہب اور عقیدوں پر منقسم سیاسی گروہ (Multi religious political group) کو ''اُمۃ الواحدہ'' کہا ہے۔اس کا ترجمہ بعض مفسرین نے ''ایک لوگ'' (One people) بعض نے ''ایک فرقہ'' (One community) اور بعض نے ''ایک قوم'' (One nation) کیا ہے۔مولانا آزاد نے ''اُمۃ الواحدہ'' کو ایک قوم ہی قرار دیا ہے۔

یادرہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ میثاق کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔مسلمانوں اور یہودیوں میں تعلقات خوشگوار قائم نہ رہ سکے۔بلکہ اس میثاق کے باوجود اور خلاف ورزی میں مدینہ کے یہودیوں نے مخالف قریش مکہ کے ساتھ ساز باز کیا جس کی وجہ سے رسول کریم ﷺ کا رویہ ان کی طرف سے بالکل تبدیل ہو گیا اور بالآخر یہودی عرب سے نکال دیے گئے۔مولانا آزاد ظاہر ہے کہ اس تاریخی واقعہ سے خوبی واقف تھے لیکن ان کا مقصد صرف یہ بتلانا تھا کہ رسول اکرم ﷺ نے مختلف مذاہب کے متحدہ سیاسی گروہ کو ''اُمۃ الواحدہ'' قرار دیا تھا اور یہ کہ ایسا سیاسی اتحاد اسلامی تاریخ میں ممکن تھا اور اسلامی اصول کے لحاظ سے جائز ہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے عین مطابق ہے۔ان کی سیاسی فہم یہ تھی کہ متحدہ قومیت کے استحکام کے لیے ''اُمۃ الواحدہ'' کے نظریہ کا اطلاق مناسب اور موزوں ہے۔مولانا آزاد سے پہلے کسی نے اس نظریے کی طرف نہ اشارہ کیا نہ اس کی توجیہ کی۔یہ انھی کے اجتہادِ فکر کا نتیجہ تھا کہ متحدہ اور مشترکہ قومیت کے نظریے کے لیے ہمیں تاریخ اسلام سے بھی ایک جواز مل سکا اور یہ ان کا ایک اہم نظریاتی کارنامہ ہے۔

(رشید الدین خاں)

قومی وسیاسی جدوجہد میں مولانا آزاد کا حصہ

مولانا ضیاءالدین اصلاحی

قدرت نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات میں گوناگوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات جمع کردی تھیں، اس سے پہلے ان کے مذہبی افکار اور صحافتی خدمات پر مفصل بحث و گفتگو کی جاچکی ہے۔ آگے کے مضامین میں مولانا کی قومی وسیاسی خدمات، ملک کی آزادی، ہندستانی قومیت کے استحکام اور فرقہ وارانہ اتحاد وہم آہنگی کے لیے ان کی کوششوں کا مختصر جایزہ لے کر دکھایا جائے گا کہ انھوں نے ملک وقوم بالخصوص مسلمانوں کی ذہنی وسیاسی تربیت میں کیا نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سے ان کی دوراندیشی اور سیاسی فہم وتدبر کا اندازہ بھی ہوگا۔

یہ تحریریں مختلف وقتوں میں مختلف موقعوں کے لیے لکھی گئی تھیں، اس کے علاوہ موضوع کی یکسانیت بھی ہے۔ اس لیے ان میں تکرار سے بچنا ناممکن تھا۔ اُمید ہے اس مجبوری کے پیش نظر قارئین بھی انھیں گوارا کریں گے۔

مولانا آزاد اور قومی تحریک:

مولانا ابوالکلام آزاد آزادی واتحاد کی تحریک کے پرجوش اور سرگرم داعی تھے۔ اس راہ میں انھوں نے اپنے، یگانے اور بے گانے سب کے طعنے سنے، سب وشتم کا نشانہ بنے، قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں اور مال ومتاع کی قربانی دی لیکن کبھی آزادی وحریت کی آواز بلند کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دینے سے باز نہ آئے، وہ دار پر چڑھ کر بھی یہی نعرہ بلند کرتے اور صدائے حق دنیا کو سناتے رہے، انگریزوں کا جبر وتشدد اور ان کی چیرہ دستیاں بھی ان کے عزم و

ارادے کو تبدیل نہ کرسکیں۔

مولانا شروع ہی سے ہندستان کی آزادی کے علمبردار رہے۔ ان کے سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا، جب انھوں نے کلکتہ سے الہلال جاری کیا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو آزادی وحریت کا درس دیا۔ وہ عزم واستقلال کا پہاڑ تھے، اس لیے ابتدا میں انھوں نے جو راہ اختیار کی اس سے تمام عمر سرمو انحراف نہیں کیا۔ حالانکہ اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے اور ان کی وجہ سے اچھے اچھے لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے اور خود مولانا کے رفقاے کار نے فکر وعمل کی نئی راہیں تلاش کرلیں مگر انھوں نے اپنے اختیار کیے ہوئے راستے سے منہ نہ موڑا۔ بالآخر ۱۹۴۷ء کے بعد کے واقعات نے مولانا کی سیاسی بصیرت، ہوش مندی، فہم وفراست اور اصابت رائے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

مولانا نے آزادی کا صور پھونک کر ہندستان کے مسلمانوں کو غلبۂ حق کا یقین اور آزادی کے متوالوں کو فتح وکامرانی کی نوید سنائی۔ یہ ان کے الفاظ کا جادو اور تحریروں کا سحر ہی تھا جس نے طرابلس کے مسلمانوں کے لیے ہندستان کے مسلمانوں کے دلوں میں تڑپ پیدا کردی، ترک شہیدوں کے لیے ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں کردیے۔ کان پور کی مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کے ہر ہر گھر کو ماتم کدہ بنادیا۔

الہلال کے ذریعے مولانا نے انقلاب وآزادی کا جو پرشور نعرہ بلند کیا تھا اس کی گونج ہندستان کے باہر بھی سنائی دینے لگی۔ اس کے نتیجے میں پوری اسلامی دنیا کی قیادت سنبھالنے کی انھیں دعوت ملی۔ ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ سے شاکر آفندی نے ان کو لکھا:

> ''بلقان کی سرزمین پر، طرابلس کے ریگستان پر، شہدا کا خون سوکھنے سے پہلے معصوم بچوں کی ہڈیاں گلنے سے پہلے، بیوہ عورتوں کے ہلاک گریہ ہو جانے سے پہلے، میری آنکھیں تیرے لیے فرشِ راہ ہوں گی، میرے لب قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔''

(الہلال: ۲۸ رجنوری ۱۹۱۴ء)

مولانا نے الہلال کے ذریعے ملکی سیاست اور وطنی آزادی کا جو صور پھونکا اس سے

انگریزوں کے تعمیر کردہ غلامی کے طلائی قصر کی بنیادیں ہل گئیں اور مسلمان بھی خواب غفلت سے بیدار ہو گئے۔ ان کے لہو میں گرمی و حرارت آئی اور ان کا جمود و تعطل حرکت و انقلاب میں بدل گیا۔

وہ الہلال کے صفحات میں الجہاد، الجہاد فی سبیل الحریت کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو یہ بتاتے رہے کہ:

> ''وہ دنیا میں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا انسانوں کی گردنوں میں نہیں ڈالی جاسکتی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، وہ اس لیے نہیں پیدا کیے گئے ہیں کہ غلامی کی سب سے بھاری زنجیر کو خود اپنی گردن کا زیور بنائیں۔'' (الہلال: ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

۱۹۱۳ء میں مولانا مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ:

> ''ایک چراغ جو روشن ہو کر پھر نہیں بجھتا وہ حریت صحیحہ کا چراغ ہے، مسلمان ہندستان میں رہتے ہیں، ہندستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے جس کی بجا آوری لازم ہے۔ انھوں نے جس جوش و ایثار سے جنگ طرابلس و بلقان اور مسجد کان پور کے معاملے میں حصہ لیا تھا اس معاملے میں بھی اسی طرح حصہ لیں، انسانیت اور حق و عدل کے پرستاروں کے لیے امتیازِ این و آں نہیں ہے۔ مسلمانوں کا نصب العین خدمت عالم ہے، وہ انسانیت کے خادم ہیں، ان کے لیے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔''

مولانا آزادی کی جدوجہد کو حق و انصاف اور عدل و مساوات کی جدوجہد سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ بالآخر اس کو کامیابی نصیب ہوگی۔ وہ ہوا کی رفتار دیکھ کر اور نوشتہ تقدیر پڑھ کر اس کا بھی اعلان کرتے تھے کہ آزادی و حریت کے سیلاب کو جبر و استبداد سے روکا نہیں جاسکتا۔ آزادی کی ہوائیں ہر طرف چل رہی ہیں، غلاموں نے غلامی کا قلاوہ اپنی گردنوں سے اُتار پھینکنے کا فیصلہ کرلیا ہے، جذبۂ حریت کو نہ زور و قوت سے مٹایا جاسکتا ہے اور نہ داد و دہش سے!

ان کی فراست نے الہلال کی ادارت ہی کے زمانے میں تاڑ لیا تھا کہ آزادی کے شیدائیوں کو نہ سیم وزر کے انبار متاثر کر سکتے ہیں اور نہ جاہ و منصب کے وعدے انھیں راہِ حق سے ہٹا سکتے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کے مظالم کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ قید و بند، دار و رسن، کسی تشدد سے کبھی حریت پسند مرعوب نہیں ہوتے اور بالآخر وہ وقت آجاتا ہے جب ظالموں کے تخت ہائے عظمت وجلال سرنگوں ہو جاتے ہیں اور مظلوم آگے بڑھ کر حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ ممکن ہے ظالموں کی رسّی کچھ عرصے کے لیے دراز ہو جائے لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب ظلم وستم کا خاتمہ ہو جائے گا، ظالم فنا ہو جائیں گے اور عدل و مساوات اور حق و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔

مولانا آزادی واتحاد کی جس راہ پر گامزن تھے اسے حق وصداقت کی راہ سمجھتے تھے، اس لیے ان کا خیال تھا کہ حق ضرور کامیاب ہوگا اور باطل خواہ وہ کتنا ہی طاقتور اور ساز وسامان سے لیس کیوں نہ ہو اسے فنا اور معدوم ہو جانا ہے۔ اس کی چمک دمک عارضی ہے، حق کے نمودار ہوتے ہی باطل کو راہِ فرار اختیار کرنی ہوگی، قرآن مجید اور دوسرے صحف سماوی اور تاریخ عالم کے مطالعے نے ان پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی تھی کہ انگریزوں کا جاہ وجلال خاک میں مل کر رہے گا اور ہندستان کے مظلوم ومقہور عوام اپنی بے سروسامانی کے باوجود ان کے پنجہ استبداد سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے کیوں کہ وہ حق پر ہیں۔

مولانا کا یقین واذعان درست نکلا اور انھوں نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی۔ چنانچہ انگریزی حکومت اپنی شان وشوکت اور جلال و جبروت کے باوجود سرنگوں اور غلام ہندستان آزاد ہو گیا۔

قومی تحریک اور جدوجہد آزادی میں مولانا کی اوّلیت:

مولانا نے جس زمانے میں آزادی کا یہ صور پھونکا اور ایسی تیز وتند تقریریں اور اشتعال انگیز تحریریں لکھیں اس زمانے میں کانگریس کا کوئی رہنما اور لیڈر ایسی جوش وخروش سے بھری ہوئی باتیں کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ تحریک آزادی میں مولانا کی اس سبقت اور پیش قدمی

کا اعتراف اس زمانے کے لیڈروں نے بھی کیا ہے۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ ''انہوں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔'' مولانا محمود حسن دیوبندی نے فرمایا ''ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے جو ہمیں الہلال نے یاد دلایا'' پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا ہے۔ یہ ایک ایسا اندازِ تخاطب تھا جس سے ہندستان کے مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجے سے واقف تھے۔ سرسیّد، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبِ خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔''

آزادی و حریت کی سرفروشانہ دعوت دینے اور ملک و قوم خصوصاً مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے جرم میں الہلال سے بار بار ضمانت اور جرمانہ طلب کیا گیا اور بالآخر اسے بند ہی کرنا پڑا۔ اس کی روداد بیان کرتے ہوئے مولانا نے انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے:

''الہلال کی اشاعت سے اُردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ پبلک کے لیے باعث کشش صرف اس کی اعلیٰ طباعت ہی نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ جذبہ تھا جس کی وہ دعوت دیتا تھا۔ الہلال نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی۔ دو سال کے اندر اس کی اشاعت ۲۶ ہزار فی ہفتہ ہوگئی۔ اُردو صحافت کی تاریخ میں ایسی کثیر اشاعت کا امکان وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کی کامیابی دیکھ کر حکومت کو بھی تشویش ہوئی اس لیے دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح الہلال کے انداز بیان میں کچھ فرق ہو جائے، میری ہمت پر اس

دھمکی کا اثر نہ پڑا، جلد ہی حکومت نے ضمانت ضبط کر لی۔ دس ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا......۱۹۱۴ء میں الہلال پریس ضبط کرلیا گیا۔ ایک سال بعد البلاغ کے نام سے ایک نیا پریس قائم کیا اور اسی نام کا اخبار جاری کیا۔ حکومت کو احساس ہوا کہ پریس ایکٹ کے ماتحت کارروائی کر کے میری سرگرمیوں کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اُس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز سے کام لے کر مجھے کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ اسی کے ماتحت پنجاب، دہلی، یو پی اور بمبئی کی حکومتوں نے مجھے اپنے حدود میں اندر داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی۔ اب میں صرف بہار جاسکتا تھا اس لیے رانچی چلا گیا۔ چھ مہینے بعد رانچی میں نظر بند کر دیا گیا اور میں ۳۱/ دسمبر ۱۹۱۹ء تک یہاں حراست میں رہا۔'' (ابوالکلام آزاد احوال و آثار: ص ۹۱ و ۹۲)

حکومت سمجھتی رہی ہوگی کہ اس طویل نظر بندی کے نتیجے میں مولانا کی سیاسی سرگرمیاں کم ہو جائیں گی لیکن اس کے بعد وہ اور زیادہ جوش وخروش سے قوم وملت میں آزادی کی روح پھونکنے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ پہلی دفعہ گاندھی جی سے ملے۔ اس کے بعد ہندستان کی تاریخ نے نیا موڑ لیا، گاندھی جی نے تحریک خلافت کی تائید وحمایت شروع کر دی۔ نان کوآپریشن اور ترکِ موالات کی تحریک کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا جس نے انگریزی حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں، ہندو مسلم اتحاد کا روح پرور منظر اس زمانے میں دیکھنے میں آیا اس کو دیکھنے کے لیے آج تک نگاہیں ترس رہی ہیں۔

غرض اس زمانے میں کانگریس نے آزادی کی جو تحریکیں چلائیں اور ہندو مسلم اتحاد کے جو منصوبے اور نقشے تیار کیے ان میں مولانا خود بھی شریک رہے اور ان کوششوں سے مسلمان بھی من حیث القوم ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، اس طرح ۱۹۳۰ء تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ دراصل ملک کی سیاست اور آزادی کی جدوجہد میں مولانا ابوالکلام کا امتیازی کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے آزادی کی تحریک کو قومی بنا دیا۔

مسلمانوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ:

۱۹۳۰ء کے بعد حالات نے ایک نیا موڑ لیا اور ساحرانِ افرنگ نے ایسا افسوں پھونکا کہ مسلمان مولانا کی بتائی راہ سے منحرف ہونے لگے۔ موہوم خدشات اور شبہات نے انھیں گھیر لیا، وہ وقتی جذبات کے سیلاب میں بہنے لگے، ہنگامی نعروں اور من پسند وعدوں پر ایسا فریفتہ ہوئے کہ ان کی اکثریت قوم پروری اور قومی تحریک سے دور ہوتی گئی مگر مولانا اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے اور مزاحمت کرنے والوں کے تمام شکوک وشبہات بھی دور فرماتے رہے، انگریزوں کے اشارے پر مذہبی حلقوں اور دینی رہنماؤں کی طرف سے جب آزادی و اتحاد کی تحریک کو دین و مذہب کے خلاف ثابت کرنے کی مہم شروع ہوئی تو مولانا نے اس غلط بیانی کا پردہ فاش کیا اور بتایا کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے، کوئی مذہب اپنے پیرووں کو اس حق سے محروم نہیں کرسکتا۔ وہ مسلمانوں کو خاص طور پر اس کی تلقین فرماتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد تمھارا دینی فرض ہے۔ تم نے ظلم واستبداد کو مٹا کر دنیا میں عدل و مساوات کو فروغ دینے کے لیے کیسی عظیم الشان جدوجہد کی ہے، تم ہی نے دنیا کو اصلی جمہوریت کا چہرہ دکھایا تھا، پھر آج لیت ولعل کیوں ہے؟ وہ فرماتے تھے کہ:

> ”ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ ایک فرضِ دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق وصداقت اور انسانی بندو استبداد و غلامی کو توڑنے کے لیے کی جائے۔“ (الہلال: ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء)

ان کے نزدیک اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں، مسلمانوں کے لیے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اسلام کا حکم ہے۔ وہ کاروانِ آزادی وحریت میں اس لیے شامل ہوئے تھے کہ وہ اسے اپنا مذہبی فریضہ اور اسلامی تعلیم کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے۔ وہ مذہب و سیاست اور دین ودنیا کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے رام گڑھ کے اجلاسِ

کانگریس کا خطبہ صدارت دیتے ہوئے نہایت وثوق واعتماد سے فرمایا:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دایرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں، میں ہندستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک عامل (Factor) ہوں، لیکن میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔'' (خطبات آزاد: مرتبہ مالک رام، ص ۲۹۷)

مولانا کی سیاسی بصیرت اور دُور اندیشی:

مولانا کا خیال تھا کہ تقسیم سے ملک کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ اس کے باشندوں کے سر پر ایسی قیامت آئے گی جس کا اُس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے گھر اور جائداد تباہ ہو جائے گی، تجارت اور کاروبار تہس نہس ہو جائے گا۔ وہ فرماتے تھے کہ:

''تم کو یہ سبز باغ دکھایا جارہا ہے، آیندہ جب اس کے ہولناک نتائج

سامنے آئیں گے اور تم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے تب تم کو ہوش آئے گا اور اپنی غلطی کا احساس کرو گے اور تمھاری حمایت کا دم بھرنے والے بالکل ہی غائب ہو جائیں گے۔“

مگر اس وقت جذبات کے طوفان میں بہنے والوں کو اس کا ہوش ہی کہاں تھا کہ مولانا کی حقیقت پسندانہ اور خیر خواہی پر مبنی باتوں پر توجہ دیتے۔

تقسیم کے بعد وہ ساری باتیں روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آ گئیں جن سے مولانا نے بہت پہلے اپنی قوم اور اپنے ملک کو آگاہ کیا تھا۔ کروڑوں اشخاص بے گھر ہوئے، جان و مال اور عزت و آبرو برباد ہوئی، ہر طرف خوں ریزی، سفاکی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اور وحشت و درندگی کے نہایت شرمناک واقعات ظہور میں آئے۔ علاقائیت، رنگ و نسل اور زبان کے جو جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے وہ تقسیم در تقسیم کا باعث بنے۔ مشرقی بنگال سے لوگوں کو جان بچا کر بھاگنا دُشوار ہو گیا اور اب بھی ان کی نگاہوں کے سامنے ادھیرا چھایا ہوا ہے۔

اب جب کہ تمام واقعات و حقائق سامنے آ گئے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اپنے وقت سے کتنا آگے دیکھ رہے تھے۔ مولانا کے نزدیک تقسیم ایک جانکاہ حادثہ تھا جس کے لیے وہ نہ کبھی راضی ہوئے اور نہ اس معاملے میں کوئی سمجھوتا اور مفاہمت گوارا کی لیکن جب خود کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بھی یہ تجویز منظور کر لی تو مولانا کو جو شدید اذیت پہنچی اس کا اظہارِ انھوں نے نہایت درد و کرب کے ساتھ انڈیا ونس فریڈم میں کیا ہے، جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ تاہم جب ان کی منشا کے علی الرغم پاکستان بن گیا تو وہ اس کے خواہش مند تھے کہ دونوں ملک پھلیں پھولیں، ان کے خیال میں دونوں ملکوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات کو مستحکم اور استوار رکھیں، مل جل کر رہیں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں مگر افسوس مولانا کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور پر امن بقائے باہمی کے اصول پر عمل پیرا ہونے کے بجائے دونوں ملک ایک دوسرے سے مسلسل اُلجھتے رہتے ہیں جس سے اس برصغیر کے امن و امان کو برابر خطرہ لاحق رہتا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد:

آزادی سے زیادہ مولانا کو ہندو مسلم اتحاد عزیز تھا۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ فکرمند اور بے چین رہتے۔ انھوں نے دوقومی نظریے کی شدید مذمت کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اخوت و محبت اور اتحاد و اتفاق کے رشتہ میں منسلک رہنے کی ہمیشہ تاکید فرمائی۔ ان کے دل و دماغ پر متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں ملک کی آزادی کو بے سود اور بے حقیقت سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کی انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ دہلی کے اجلاسِ خصوصی میں فرمایا:

> ''ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''
>
> (خطباتِ آزاد: مالک رام، ص ۲۰۵)

جدید ہندستان کے پس منظر میں مسلمانوں کی رہنمائی:

گو تقسیم نے مولانا کو نڈھال اور درد و حسرت کی مجسم تصویر بنا دیا تھا مگر انھوں نے جدید ہندستان کی تعمیر و تشکیل اور اسے سیکولر، جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے میں بھی پورا حصہ لیا؛ اور آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کے اُکھڑتے قدم کو جمانے، انھیں سہارا دینے اور ان کی ہمت بڑھانے میں بھی پیش پیش رہے۔ مولانا نے اس موقع پر ماضی مرحوم کے جو اوراق اُلٹے ہیں، اس سے ان کے درد و اضطراب کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے:

''ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو، یہ ستون جن پر تم نے بھروسا کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے، وقت کی رفتار تھمی نہیں، تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسا تھا وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔'' (خطباتِ آزاد: ص ۳۳۸)

اور جب مولانا کی یہ آواز فضا میں گونجی کہ:

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳:۱۳۹)

تو مسلمانوں کے عاجلانہ فیصلوں میں ٹھہراؤ پیدا ہوا اور ان کو نیا عزم اور نیا حوصلہ ملا۔

مولانا نے دہلی کی شاہجہانی مسجد سے یہ اعلان کیا:

''یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حال آں کہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بے جا تھا، اسی طرح آج یہ تمھارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمھیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ

دیکھو کہ تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رُخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو انھیں خدا کی جلوہ گاہ بناؤ، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمی کی معرفت فرمایا تھا ''جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم'' ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں، یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے، یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔''

آگے فرماتے ہیں:

''عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ، ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔''

مولانا کانگریس سے مدۃ العمر وابستہ رہنے کے باوجود مسلمانوں کو غیرت وعزتِ نفس کا یہ پیام بھی دیتے ہیں:

''میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ تھا، انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔'' (خطباتِ آزاد: ص ۳۴۲)

اس تقریر میں مولانا نے مسلمانوں کو بعض اہم پیام بھی دیے ہیں:

''ہراس کا موسم عارضی ہے، میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کرسکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اُٹھا لو اور بدعملی کو ترک کردو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دودھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔''

مولانا کی ہوش مندی، بصیرت اور تدبر نے مسلمانوں کو فرقہ وارانہ سیاست اور جداگانہ تنظیموں سے دور رہ کر انھیں ملک وقوم کی خدمت انجام دینے کا مشورہ بھی دیا۔ لکھنؤ کی مسلم کانفرنس میں انھوں نے مسلمانوں کی رہنمائی اس طرح فرمائی کہ:

''فرقہ وارانہ بنیادوں پر جماعت کا تجربہ تم بہت کرچکے اور اس کے نتائج بھی دیکھ چکے، اب ملک کی مشترک سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر کام کرنے کا تجربہ کردیکھو۔''

غرض مولانا ۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۸ء تک ملک وقوم کی رہنمائی وسربراہی کرتے رہے۔ آزاد ہندستان کا انھوں نے جو نقشہ بنایا اور اس میں مسلمانوں کے لیے جو جگہ تجویز فرمائی وہ آج بھی معنویت کی حامل اور غور کے قابل ہے:

تقسیم ملک کا ذمے دار کون ہے؟......ایک تاریخی خط

حبیب منزل۔علی گڑھ

۲۱-۱۲-۱۹۶۴ء

مکرمی تسلیم!

شری بسواناتھ داس گورنر یوپی نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہندستان کی تقسیم کے اصلی ذمے دار نیشنلسٹ مسلمان ہیں، جن کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وزارتوں میں کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو لیا جائے۔ اس طرح انھوں نے غیر کانگریسی مسلمانوں کو تقسیم ہند کا حامی بنا دیا۔ شری بسواناتھ داس نے یہ بات ''انڈیا ونس فریڈم'' میں مولانا آزادؒ کے اس بیان کے جواب میں کہی ہے کہ ''ان کی مخالفت کے باوجود سردار پٹیل اور پنڈت جواہر لال نہرو تقسیم ملک پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر مہاتما گاندھی کو بھی اس پر راضی ہونا پڑا۔''

میری ناچیز رائے میں شری بسواناتھ داس کا یہ بیان تاریخی حقایق کے خلاف ہے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد جب صوبوں میں وزارت سازی کا مرحلہ پیش آیا تو یوپی میں مسلم لیگی نمایندے وزارت میں شمولیت اور کانگریس کے پروگرام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ بشرطیکہ نواب محمد اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں دونوں کو وزارت میں لے لیا جاتا۔ مولانا آزاد (جو کانگریس پارلیمنٹری بورڈ میں یوپی کے انچارج تھے) اس پر راضی تھے لیکن پنڈت نہرو (جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے) یوپی کے کانگریسی لیڈروں، بالخصوص پنڈت پنت اور شری رفیع احمد قدوائی سے مشورہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا اور اس لیے یہ مسئلہ یہیں ختم ہو گیا۔ اس سے بلاشبہ یوپی میں مسلم لیگ کو تقویت حاصل ہوئی اور تقسیم ہند کے لیے فضا ہموار ہونے میں مدد ملی۔

یہ مسئلے کا ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ عارضی حکومت کے دوران مسلم لیگی نمایندوں کا جو رویہ رہا اس نے سردار پٹیل کو اتنا پریشان اور ناراض کر دیا کہ ان کی نظر میں تقسیم ناگزیر ہوگئی اور جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کے لیے اپنا پلان پیش کیا تو سردار نے اسے "عطیہ خداوندی" سمجھ کر بلا پس و پیش منظور کر لیا۔ پنڈت نہرو ایک وقت تک اس کے حق میں نہیں تھے لیکن مولانا آزادؒ کے بیان کے مطابق لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور شری کرشنا مینن کے زیر اثر بالآخر وہ بھی زیادہ دیر تک قدم نہیں جما سکے۔ مہاتما گاندھی تقسیم ہند کے ان دونوں سے زیادہ مخالف تھے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سردار پٹیل نے انھیں صورت حال کی خطرناکی کچھ اس طرح سمجھائی کہ انھیں بھی اپنی رائے بدلنی پڑی اور کانگریس ہائی کمانڈ میں مولانا آزاد تقسیم کے تنہا مخالف رہ گئے۔ مولانا آزاد جمہوری اقدار کے اتنے قایل اور جماعتی ڈسپلن کے اتنے پابند تھے کہ جب ایک دفعہ کانگریس کی مجلس عاملہ نے ان کی مخالفت کے باوجود تقسیم کی تجویز منظور کر لی تو ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ پریس یا پلیٹ فارم سے اس کی مخالفت فرماتے۔ بہر حال جب تقسیم کی تجویز آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پیش ہوئی تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک دوسرے نمایندے مولانا محمد حفظ الرحمٰنؒ نے کھل کر اس کی مخالفت کی۔

ان حالات میں نیشنلسٹ مسلمانوں کو تقسیم ہند کا ذمے دار قرار دینا سیاسی شعبدہ بازی تو ہو سکتی ہے، تاریخی شعور کا مظاہرہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ تقسیم کی اصلی ذمے داری کس پر ہے۔ اس سوال کا جواب ہمیں سیاسی مصالح کے پیش نظر نہیں دینا چاہیے، بلکہ حق و انصاف کے تقاضوں کے مطابق اعتراف حقیقت کرنا چاہیے۔ مسلم لیگ نے تقسیم کی تحریک چلائی اور اتنی شدت سے چلائی کہ جو کوئی اس کا مخالف تھا، لیگی مسلمانوں کی نظر میں عام مسلمانوں اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس میں ہندو مسلمان کی تمیز بالکل نہیں تھی بلکہ نیشنلسٹ مسلمان اور بالخصوص ان کے کاروان سالار مولانا ابوالکلام آزادؒ دشمن نمبر ایک تھے۔ کیوں کہ انھیں وہ اپنی راہ کا سب سے بڑا روڑا سمجھتے تھے۔ فرقہ پرست ہندوؤں کے طرز عمل سے انھیں اس کا موقع ملا کہ وہ عام مسلمانوں کو اپنا ہم نوا اور حامی بنا لیں۔ حکومت برطانیہ نے ان کی ہمت افزائی کی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، شروع میں تو اس نے مسلم لیگ کے مطالبات کو تحریک آزادی کے خلاف استعمال کیا اور جب آزادی ناگزیر ہوگئی تو ملک کا بٹوارا کرا کے اس کی طاقت بانٹ دی اور ملک کے دونوں حصوں کو اپنا دست نگر بننے پر مجبور کر دیا۔ کانگریس نے

تقسیم بلاشبہ قبول کی لیکن مجبور ہو کر! اگرچہ مولانا آزاد کی رائے میں (اور میں اس معاملے میں مولانا آزادؒ سے پوری طرح متفق ہوں) یہ ''مجبوری خیالی زیادہ تھی، حقیقی کم تھی۔ دراصل (جیسا کہ خود پنڈت نہرو نے بعد میں اعتراف کیا) کانگریس کے لیڈر طویل جدوجہد سے اتنے تھک چکے تھے کہ بیک وقت حکومت اور مسلم لیگ سے ایک اور ٹکر لینے پر تیار نہیں تھے۔ ان حالات میں مسلم لیگ اور کانگریس کو تقسیم ہند کا یکساں ذمے دار قرار دینا کسی طرح درست اور مناسب نہیں ہے، بلکہ اتنا بڑا جھوٹ ہے جتنا بڑا جھوٹ آج تک روئے زمین پر نہیں بولا گیا ہے۔ لیگی ذہنیت کے مسلمان کبھی فخر کرتے تھے (اور آج بھی پاکستان جا کر فخر کرتے ہیں) کہ انھوں نے پاکستان بنوایا ہے لیکن جب اس کا خمیازہ بھگتنے کا وقت آتا ہے تو اس کی ذمے داری کانگریس کے سر ڈال دیتے ہیں۔ یہ حق پسندی کے سراسر خلاف ہے۔ جب تک کانگریس ملک کی تقسیم نہیں مان رہی تھی، ان کی نظر میں مجرم تھی اور جب اس نے تقسیم مان لی تب بھی مجرم رہی۔ یہ کیسی انوکھی منطق ہے! تقسیم ملک کے قضیے میں کانگریس کی ذمے داری اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی ایک ایسے شخص کی ہوتی ہے جو اپنے گھر کی حفاظت نہ کر سکے اور ڈاکو اسے لوٹ کر چلے جائیں۔ ایسے شخص کو آپ اور جو کچھ کہیں وہ خود ڈاکو بہر حال نہیں ہے اور اس کا جرم ڈاکوؤں سے یقیناً کم ہے۔ ڈاکوؤں کو یہ حق کون دے سکتا ہے کہ وہ اپنے جرم سے اس بنا پر انکار کر دیں کہ چوں کہ اس شخص نے اپنے گھر کی حفاظت نہیں کی تھی اس لیے ہم اور وہ برابر کے مجرم ہیں۔ حکومت برطانیہ کا رول اس قضیے میں پولیس کے ان سپاہیوں جیسا ہے جو بقائے امن کی جگہ ڈاکوؤں کے ساتھ سازش میں شریک ہوں اور ڈاکے کے مال میں سے اپنا حصہ بنائیں۔

مولانا آزاد نے ''انڈیا ونس فریڈم'' میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے خلاف نہیں ہے، چاہے اپنے اغراض کے پیش نظر اسے معنی کچھ بھی پہنائے جائیں۔ انھوں نے بے شک سردار پٹیل، پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی پر اس معاملے میں تنقید کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ مسلم لیگ کو تقسیم کا اصلی مجرم نہیں سمجھتے یا ان کی نظر میں مسلم لیگ اور کانگریس کا جرم یکساں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا وہ تقسیم کے باوجود کانگریس کے حامی اور اس میں شریک رہتے؟

نیاز مند

ریاض الرحمٰن شروانی

باب ۳

خدمات الہلال والبلاغ

فہرست مضامین

جنگ آزادی میں الہلال کا حصہ

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بہت بڑے انشاپرداز، بہت بڑے خطیب، بہت بڑے مفسر قرآن، بہت بڑے مجاہد آزادی اور بہت بڑے سیاستدان تھے۔ اُن کی شخصیت کی یہ رنگارنگی اُن کے ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' سے ظاہر ہوتی ہے اور جس کی پرانی جلدوں میں اب بھی اُن کے تمام جلوے نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ الہلال میں ان کی طرزِ نگارش میں جو سحر طرازی اور جادو بیانی ہے اُس کا مقابلہ اُردو کا کوئی اور انشاپرداز نہ کرسکا۔ اس کی تحریروں میں شوکتِ بیان اور جوش وخروش کا سیلاب بہتا نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے اُردو ادب میں الہلال کے ذریعے سے بادل کی جو کڑک اور رعد کی جو گرج دی، وہ اس زبان کے لیے بالکل ایک نئی چیز تھی۔ وہ جب چوبیس پچیس سال ہی کے تھے تو اُن کے اسلوب جدید اور اندازِ نو پر لوگ متحیر تھے۔ اُن کی تحریروں میں جو ایک مضطرب اور بے چین آواز فضا میں گونجی، وہ واقعی صدائے ربانی معلوم ہوتی تھی۔

وہ الہلال میں اپنے الفاظ کے شکوہ، فقروں کی چمک دمک، تحریر کی حرارت، اور تاثیر سے بجلی بھی گراتے اور موتی بھی لٹاتے رہے، پھول بھی برسائے اور انگارے بھی۔ اُنھوں نے الہلال کی ادارت کے زمانے میں محض اپنے قلم کے سحر سے ہندستان کے مسلمانوں کو غلبہ حق کا یقین دلایا۔ اُن کے دلوں میں توحید اور ایمان کو راسخ کیا، طرابلس کے مظلوم مسلمانوں کے لیے ہندستان کے مسلمانوں کے دلوں میں تڑپ پیدا کردی۔ ترک شہیدوں کے لیے اُن کی آنکھوں سے خون کے آنسو رُلائے، کانپور کی مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کے گھر گھر میں ماتم

بپا کر دیا اور اُن کے سیاسی ذہن پر ایک ضرب کلیمی لگا کر اُن میں خود اعتمادی اور خود شناسی کے جذبات بیدا۔ کیے۔

الہلال جب نکلا تو اُس وقت اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا تھا۔ بظاہر ایک چھوٹے سے حصہ پر حملہ تھا لیکن اس سے ایک ایسی آگ بھڑک اُٹھی جس سے عالم اسلام کی ملی زندگی میں غیر معمولی حرارت پیدا ہوئی۔ طرابلس میں مسیحیت کی درندگی، خونریزی اور غارت گری سے تمام مسلمان کچھ ایسے متاثر تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ صلیبی جنگ کا اعادہ پھر ہو جائے گا۔ ہندستان کے مسلمانوں میں جوش کا سمندر اُبل پڑا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کے ذریعے اور بھی تلاطم پیدا ہو گیا۔ ابھی طرابلس کا قضیہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یورپ کی بڑی سلطنتوں کے اشارے پر بلقانی ریاستوں یعنی بلغاریہ، سرویا اور مانٹی نگرو نے مل کر ٹرکی پر حملہ کر دیا۔ ٹرکی کو اپنی موت و زیست کی جنگ لڑنی پڑی۔ ترکوں کی حمایت میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے بھی شعلے برسنے لگے اور جب اڈریانوپل میں ترکوں کی پسپائی کی خبر ہندستان پہنچی تو مولانا الہلال میں اور پر جوش اور فکر انگیز مضامین لکھ کر ہندستان کے مسلمانوں کو جہاد مالی، جہادِ زبانی اور جہادِ نفس و جان کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ ترکوں کی حمایت میں مسلمان جہادِ نفس و جان تو نہ کر سکے لیکن جہاد لسانی اور جہادِ مالی کی جتنی ممکن صورتیں تھیں وہ سب عمل میں آتی رہیں فرنگی فتنہ و فساد اور مکر و فریب پر مولانا آزاد نے اتنی تقریریں کیں کہ مسلمانوں کو تمام اہل یورپ اور خصوصاً انگریزوں کی سامراجیت سے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نفرت سے مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے خلاف جو اشتعال اور غصہ بیدا ہوا اُس کے نتائج بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔ اُس زمانے میں مسلمانوں میں جو جوش و خروش مولانا کی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے پیدا ہوا اُس کو دیکھ کر خود مولانا نے لکھا کہ مسلمانوں میں عجیب نا قابل تغیر۔ بے خودانہ کیفیت کے ساتھ اپنے اندر قوت و عظمت کا جو احساس پیدا ہوا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان اتنے ضعیف اور کمزور نہیں ہیں جتنا کہ بدقسمتی سے اُن کو سمجھا گیا ہے۔

اس زمانے میں مولانا الہلال کی وجہ سے مسلمانوں میں کچھ ایسے مقبول ہوتے گئے کہ وہ امام الاحرار اور امام الہند کے لقب سے یاد کیے جانے لگے۔ مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر کوئی

اُن کے دبے ہوئے جذبات کا صحیح ترجمان ہے اور کوئی آتش غیرت کی سوزش سے اُن کو لذت آشنا کرا سکتا ہے اور کوئی اُن کے شعلہ حیات کو فروزاں کر سکتا ہے تو وہ مولانا ہی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے یورپ کی سیاست کے مکروفریب کے خلاف جو نعرہ بلند کیا تھا اُس کی گونج باہر کے ملکوں میں بھی پہنچی۔ اُن کے پاس پورے اسلامی ملک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینے کی دعوت آنے لگی۔ الہلال ۲۸ رجنوری ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ سے شاکر آفندی نے اُن کو لکھا:

> ''اسلام کے عاشق، حریت کے پرستار، میں تسلیم کرتا ہوں کہ تو اپنی ملت مظلوم کی خدمت کر رہا ہے۔ جسم سے ہی نہیں بلکہ رُوح و دل سے کر رہا ہے۔ اپنے آرام کی فکر نہیں، مگر اپنے اہل وطن کی راحت کا تو خواہاں ہے۔ پیروانِ اسلام کو اُن کی ابتدائی حریت و مساوات میں دیکھنے کے لیے تیری آنکھوں میں اضطرار کی چمک ہے۔''

پھر اپنے وطن میں آنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھا:

> ''بلقان کی سرزمین پر طرابلس کے ریگستان پر، شہدا کا خون سوکھنے سے پہلے، معصوم بچوں کی ہڈیاں گلنے سے پہلے، بیوہ عورتوں کے ہلاک گریہ ہو جانے سے پہلے آ، اے اپنی دولت سعی کو ضائع کرنے والے آ، میری آنکھیں تیرے لیے فرشِ راہ ہوں گی۔ میرے لب قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔''

اگر مولانا نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہوتا تو وہ اپنے دور کے شیخ محمد عبدہ یا جمال الدین افغانی ہوتے لیکن اُن کے لیے مقدر تھا کہ وہ ہندستان کی جنگ آزادی کے محاذ پر آگے چل کر ایک آزمودہ کار قائد بنیں، طرابلس اور بلقان کے واقعات کی وجہ سے مسلمانوں کی دینی حمیت اور قومی غیرت کا جو پرشور گنبد مینا تیار ہوا اُس کی چوٹی پر چڑھ کر مولانا نے ملکی سیاست اور وطنی آزادی کے لیے بھی ایک صور پھونکا جس سے انگریزوں کے تعمیر کردہ غلامی کے طلائی قصر کی بنیاد ہل گئی۔ مسلمانوں کا خون گرم ہوا اور اُن کی جامد زندگی متحرک ہوئی، وہ انگریزوں کی سیاسی

اصلاحوں کی افیون کھا کر کچھ مخمور اور نڈھال بنے ہوئے تھے۔ الہلال نے جس طرح اُن کو جھنجھوڑا وہ اُن کی سیاسی زندگی کی ایک بڑی تابناک مثال ہے۔

مولانا نے انگریزوں کے کنگرۂ فرعونیت کو متزلزل اور اُن کے وقارِ نمرودیت کو پامال کرنے کے لیے قرآنی آیتوں اور مذہبی احکام ہی کا سہارا لیا۔ 'الجہاد فی سبیل الحریت' کا نعرہ بلند کیا اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ اس وقت خود شل ہو رہے ہیں جو نہ سیاسی طور پر اپنے دماغ سے سوچ سکتے ہیں، نہ اپنی زبان سے بول سکتے ہیں اور نہ اپنے پاؤں سے چل سکتے ہیں۔ پھر اُن کی حمیت کو اُبھارنے کے لیے اُن کو بتاتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتے ہیں، دنیا میں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ اُن زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا انسانوں کی گردنوں میں نہیں ڈالی جا سکتی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ وہ اس لیے نہیں پیدا کیے گئے ہیں کہ غلامی کی سب سے بھاری زنجیر کو خود اپنی گردن کا زیور بنائیں۔ اس تلقین کے بعد وہ مسلمانوں کو آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے یہ کہہ کر اُبھارتے ہیں:

> ''ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حبِ الوطنی ہے، مسلمانوں کے لیے یہ ایک فرضِ دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ نے اُن کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند و استبداد و غلامی توڑنے کے لیے کی جائے۔'' (الہلال: ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۱)

انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کے سلسلے میں مولانا نے یہ نعرہ اُس وقت بلند کیا جب کہ خود گاندھی جی اُس وقت تک اتنی تیز اور اشتعال انگیز تقریریں کرنا اور تحریریں لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو تو اُس وقت غالباً انگلستان میں طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔ اس لحاظ سے مولانا ان دونوں فدایانِ وطن سے پہلے پیش قدمی کر کے جنگِ آزادی کے محاذ پر پہنچ چکے تھے، اُس زمانے میں تمام مسلمان رہنما اُن ہی سے متاثر رہے۔ مولانا محمد علی نے اعتراف کیا کہ اُنھوں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔

مولانا مسلمانوں کے اندر بے ہمتی، افسردگی، خوف اور مرعوبیت کے بجائے بلندی، خودداری، طاقت اور استحکام پیدا کر کے اُن کو جنگِ آزادی کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے، اس لیے اُنھوں نے حزب اللہ کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس جماعت کی تشکیل سے پہلے ہی الہلال برطانوی حکومت کی زد میں آ گیا۔ پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی تھی۔ برطانوی حکومت نے الہلال پر یہ الزام لگایا کہ یہ انگریزوں کے خلاف جرمنوں کی حمایت کرتا ہے۔ اس کے مضامین برطانوی حکومت کے خلاف طنز، تعریض، طعن آمیز اشاروں اور استعاروں سے پر ہوتے ہیں۔ مگر الہلال کی دعوت اپنے مقصد میں اُس وقت تک کامیاب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں سے غفلت دور ہو چکی تھی۔ ان میں احساسِ بیداری پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا اعتراف پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں یہ لکھ کر کیا ہے:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ تخاطب تھا جس سے ہندستان کے مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجے سے واقف تھے۔ سرسیّد، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا اُن تک پہنچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔''

الہلال کے بعد مولانا نے ۱۹۱۵ء میں البلاغ نکالا جس میں الہلال ہی کی جھلک ہے لیکن یہ پانچ مہینے سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ پھر گیارہ برس کے بعد ۱۹۲۷ء میں الہلال کا اجرا ازسرنو کیا، تو اس میں پہلے الہلال کے طرزِ انشاء کی جادونگاری چھوڑ دی، پھر ترجمان القرآن، غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کے مصنف کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے لیکن اُن میں الہلال کا رنگ نہیں آیا، جس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ ''اگر مولانا نے اپنا قلمی جہاد جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور صحیح راہِ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی، مگر یہ قلمی جہاد جنگ آزادی کی سرگرمیوں اور مشغولیتوں اور

بار بار جیل جانے کی صعوبتوں کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔ الہلال کو یاد کر کے مولانا اپنی مشہور کتاب انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:

''الہلال کی اشاعت سے اُردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ پبلک کے لیے باعثِ کشش صرف اس کی اعلیٰ طباعت ہی نہیں تھی، بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ جذبہ تھا جس کی وہ دعوت دیتا تھا۔ الہلال نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی۔ الہلال ہر دلعزیز ہوتا گیا۔ دو سال کے اندر اس کی اشاعت ۲۶ ہزار فی ہفتہ ہوگئی۔ اُردو صحافت کی تاریخ میں ایسی اشاعت کا امکان وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اُس کی کامیابی دیکھ کر حکومت کو بھی تشویش ہوئی اس لیے دو ہزار کی ضمانت طلب کی۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح الہلال کے اندازِ بیان میں کچھ فرق پیدا ہو جائے۔ میری ہمت پر اس دھمکی کا کچھ اثر نہ پڑا۔ جلد ہی حکومت نے ضمانت ضبط کر لی، دس ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ کیا...... اس دوران ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس ضبط کر لیا گیا۔ پانچ مہینے بعد البلاغ کے نام سے ایک نیا پریس قائم کیا اور اسی نام کا اخبار جاری کیا۔ حکومت کو احساس ہوا کہ پریس ایکٹ کے ماتحت کارروائی کر کے میری سرگرمیوں کو بند نہیں کیا جا سکتا اس لیے اُس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز سے کام لے کر مجھے کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ اسی کے ساتھ پنجاب، دہلی، یو پی اور بمبئی کی حکومتوں نے مجھے اپنے حدود میں اندر داخل ہونے کی ممانعت کر دی تھی۔ اب میں صرف بہار جا سکتا تھا۔ اس لیے رانچی چلا گیا۔ چھ مہینے بعد مجھے رانچی میں نظر بند کر دیا گیا اور میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء تک یہاں حراست میں رہا۔''

(یہ ترجمہ ''ہماری آزادی'' سے لیا گیا)

اس کے بعد وہ خلافت، ترک موالات، نمک سازی، سول نافرمانی، ہندستان چھوڑ دو کی تحریکوں میں آزادی کے مجاہد بنے ہوئے تمام کانگریسی رہنماؤں کے شانہ بشانہ رہے اور ہر موقع پر جیل جا کر اسیری کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔

پوری جنگِ آزادی میں اُن کے دل کی صرف یہ لگن رہی کہ اس ملک میں ہندو مسلمان مل کر رہیں۔ اُن کے یہ گہرے قلبی احساسات کا اندازہ اُن کی اُس تقریر سے ہوگا جو ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے اجلاسِ خصوصی میں کی۔ اُس میں یہ فرمایا:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطے کہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

اُن کی زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ ملک کی تقسیم ہوگئی۔ وہ اس تقسیم کے شدید مخالف رہے۔ جب تقسیم کی تجویز منظور کر لی گئی تو اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:

''کانگریس نے اپنے کو اس طرح گرا کر ہتھیار ڈال دیے۔ یہ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہا کہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ واقعات کے ایک بہت ہی افسوس ناک سلسلے کا نتیجہ ہے۔ ہندستان کا تقسیم ہو جانا ایک جانکاہ حادثہ ہے۔ ہم اپنی معذرت کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس سے بچنے کی امکانی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ پھر بھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ قوم ایک متحد قوم ہے، اس کی تہذیب مشترک تہذیب کا نمونہ ہے اور رہے گی، چونکہ سیاسی اعتبار سے ہم ناکام رہے ہیں اس لیے ملک کی تقسیم کر رہے ہے

ہیں۔اس میں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم نے شکست کھائی ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری معاشرت اور تہذیب تقسیم نہ ہونے پائے۔ پانی پر چھڑی رکھ دینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے، چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم بھی غائب ہو جاتی ہے۔" (یہ اقتباس انڈیا وِنس فریڈم کے اُردو ترجمہ "ہماری آزادی" سے لیا گیا ہے)

مولانا پاکستان کو مسلمانوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے۔لکھتے ہیں کہ "پاکستان کے قیام کا بس ایک نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر ہندستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہوگئی۔ ہندستان کے باقی ماندہ مسلمان تو کمزور ہو ہی گئے دوسری طرف خود پاکستان میں اب تک کسی مستحکم اور مستعد حکومت کے قیام کے آثار نظر نہیں آتے۔کیا کوئی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان نے فرقے وارانہ مسئلے کو حل نہیں کیا، بلکہ اُسے اور زیادہ شدید اور ضرر رساں بنادیا ہے۔"

مگر اپنی اس کتاب انڈیا وِنس فریڈم کے آخر میں لکھتے ہیں کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ پاکستان کی نئی ریاست ایک حقیقت ہے۔اب دونوں ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراکِ عمل سے کام لیں اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی تو وہ نئے اور بڑے مصائب وآلام کا باعث بن سکتی ہے۔

اس سے بھی ظاہر ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۳ء میں اپنے قلبی احساسات کا اظہار جو یہ کہہ کر کیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد جاتا رہا تو عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔ یہ جذبہ اُن کی زندگی کے آخری لمحے تک قایم رہا۔

تحریکِ آزادی میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا حصہ

محمود انصاری

یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع شدہ جرائد ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے وجود کے بغیر تحریک آزادی کی کامیابی ناممکن تھی لیکن یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ ان دونوں رسائل کے تذکرہ کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔ تحریک آزادی کی تائید کرنے والے بعض اخبارات برسہا برس شائع ہوتے رہے لیکن وہ جدوجہد آزادی پر اس حد تک اثرانداز نہیں ہو سکے جس قدر کہ یہ دونوں رسائل جو مشکل سے چار، پانچ سال تک شائع ہوتے رہے۔ تحریک آزادی کے آخری دور میں یہ جرائد شائع ہوتے تو شاید یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کی مقبولیت تحریک آزادی کے کامیابی کی قربت کے دوران عوام میں پیدا شدہ جوش وخروش سے وابستہ تھی لیکن یہ رسائل تو اس وقت تک تحریک آزادی کی تاریخ کا جزو بن چکے تھے۔ ممتاز نقاد مالک رام نے لکھا ہے ''اور جب یہ خیال میں رہے کہ الہلال جولائی ۱۹۱۲ء جاری ہوا۔ اس وقت ہماری قومی تحریک اس مرحلے پر تھی کہ دوسرے کا تو کیا ذکر، کانگریس کے سالانہ اجلاس میں سب سے پہلی قرارداد قیصر ہند ملک معظم سے ملک وقوم کی وفاداری کی منظور کی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی ہنوز جنوبی افریقہ سے ہندستان نہیں پہنچے تھے اور پوری سیاسی تحریک بہت ہی نرم اور نرم گفتار تھی، حکومت پر اس کے اعمال واقوال میں کڑی نکتہ چینی کی ابتدا ''الہلال'' ہی سے ہوئی۔ کسی بھی رسالے کو مقبول بنانے کے لیے اس کی پالیسی کو عوامی رجحانات کے بہاؤ میں چھوڑ دینا بڑا آسان ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ رسالہ عوامی احساسات کا آئینہ دار ہے لیکن اپنے نظریات کو منوانا، قارئین کے خیالات کو تبدیل کرنا، عوامی

رجحانات کے رُخ کو موڑ دینا، کسی بھی صحیفہ نگار کی قابلیت اور اہلیت کا امتحان ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ ایک طرف انھوں نے تحریک آزادی میں شدت پیدا کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف مسلمانوں کو تحریک آزادی کی طرف راغب کیا۔ الہلال کی اشاعت کے آغاز سے قبل صورت حال یہ تھی کہ بقول مولانا آزاد تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں اور دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلہ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر چلتے ہیں۔ مولانا آزاد جانتے تھے کہ اس صورتِ حال سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ تحریک آزادی کی کامیابی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے لیکن مسلمانوں کے رول کے تعین کا وقت آ گیا تھا۔ اپنی تحریرات اور تقاریر کے ذریعہ مولانا آزاد نے اس رول کا تعین کیا۔ ''الہلال'' کا اوّلین شمارہ ۱۳رجولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا اور وہ ۱۸رنومبر ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ ایک سال بعد ۱۲رنومبر ۱۹۱۵ء کو وہ ''البلاغ'' کے نام سے دوبارہ نکالا گیا اور صرف ۳۱رمارچ ۱۹۱۶ء تک یعنی صرف ۵ مہینے زندہ رہا۔ اس کے بعد گیارہ سال تک مولانا آزاد کوئی رسالہ شائع نہ کر سکے۔ ۱۰رجون ۱۹۲۷ء کو ''الہلال'' پھر سے شائع ہونے لگا لیکن ۹ردسمبر ۱۹۲۷ء کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ''البلاغ'' میں مولانا بار بار یہ لکھتے رہے کہ وہ تاجر نہیں بلکہ داعی ہیں۔ اُن کے الفاظ میں:

> ''بلاشبہ میں نے پریس کھولا اور یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا لیکن یہ صرف اس لیے کیا کہ اظہارِ خیال اور تبلیغ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ میں مفت چھاپ کر تقسیم کیا کرتا۔ پس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت، میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو کیوں کہ میں نے اسے ضمناً اختیار کیا ہے اور وہ میرا اصلی کام نہیں ہے۔ میں نے اگر اسے اختیار کیا تو ہندستان کی اخبار نویسی اور مطبوعہ اشاعت کے لیے بہتر ہوا۔ اس کے لیے ترقی کی ایک بالکل نئی راہ کھلی۔''

مولانا نے خود ''الہلال'' کے پہلے شمارے میں یہ بھی تحریر کیا تھا کہ ۱۹۰۶ء کی موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا۔ انسان کے ارادوں کو جب تک ذہن وتخیل میں ہیں، عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے، کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے، اُمیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس وقنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ وعزم پر غالب آ گیا لیکن الحمد للہ کہ ارادے کے استحکام اور توفیق الٰہی کا جذبہ ہر حال میں طمانیت بخش تھا۔ یہاں تک کہ آج اس خوابِ عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا نے مصر، عراق، شام، ترکی اور فرانس کا سفر کیا تو اخبار اور پریس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے بموجب یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ محمد عبدہ، جمال الدین افغانی کے ساتھ پیرس سے ''العروۃ الوثقیٰ'' نکال کر یورپ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچا چکے تھے اور مصر کے سرکاری اخبار ''الوقائع المصریہ'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے اخبار کو اصلاحِ معاشرہ کا موثر ترین حربہ بنا چکے تھے۔ مولانا نے خود تحریر کیا ہے:

> ''واپسی کے بعد، میں کچھ دنوں تک غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار اور کیا پروگرام بنانا چاہیے، میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمیں اپنے خیالات کو پبلک تک پہنچا کر اپنی موافقت کے لیے رائے عامہ پیدا کرنا چاہیے۔ اس لیے ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا۔ اس ارادے سے میں نے الہلال پریس قایم کیا ہے۔''

مولانا نے ''الہلال'' شائع کرنے کے جو مقاصد ظاہر کیے ہیں ان میں کہیں راست تذکرہ نہیں ملتا کہ وہ الہلال کے ذریعہ تحریکِ آزادی کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے حق میں تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت مولانا کی سیاسی زندگی بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ (۱) یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ تحریک آزادی کے بارے میں آیا وہ کسی واضح نقطہ نظر پر پہنچ چکے تھے۔ اگر اس وقت تک وہ تحریک آزادی سے سرگرم طور سے وابستہ ہو جاتے تو شاید قارئین پر اُن کا اثر ورسوخ گھٹ جاتا کیوں کہ ویسی صورت میں یہ سمجھا جاتا کہ وہ اپنے شخصی مفادات کے

تکمیل کی خاطر عوام کو تحریک آزادی سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مولانا کی تحریرات اس لیے بھی زیادہ پر اثر ہو گئیں کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات کی مدد سے ہی قومی تحریکات کی وضاحت کی اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ مذہب اور قوم پرستی میں کہیں کوئی تصادم نہیں۔ ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو پریس ایکٹ کے تحت ''الہلال'' سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ اس اطلاع کی اشاعت پر ہمدردانِ الہلال نے انھیں عطیات روانہ کیے جسے انھوں نے انڈین پریس ایسوسی ایشن کے قیام کے لیے مختص کر دیا۔ اس موقع پر انھوں نے لکھا تھا۔

''الہلال اور پریس ایکٹ کا سوال بالکل اسلام اور پریس ایکٹ کا سوال ہے۔ ''الہلال'' اپنے ہر خیال کو خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتا ہو محض اسلامی اصولوں کے ماتحت ظاہر کرتا ہے اور کوئی آواز ایسی بلند نہیں کرتا جو اسلام کے قانون اور دستور العمل یعنی قرآنِ کریم سے ماخوذ نہ ہو۔ پھر اگر ''الہلال'' پریس ایکٹ کی دفعات کے تحت میں آ سکتا ہے تو ہم کو اس دن کا منتظر رہنا چاہیے۔ جب پریس ایکٹ کی دفعہ ۱۲ کے بموجب ''قرآنِ کریم'' نامی ایک کتاب کا بھی سوال پیدا ہو جائے گا اور برطانوی قوانین کا یہ عجیب الخلقت فرزند اپنے سامنے صرف ''الہلال'' کے دارالاشاعت ہی کو نہیں بلکہ چالیس کروڑ پیروانِ قرآن کو پائے گا جو اس کی ہر دفعہ کے بموجب مجرم ہوں گے اور ہر شخص کے ہاتھ میں ایک حکم نامہ ہوگا جس میں لکھا ہوگا'' سات دن کے اندر دو ہزار روپے داخل کر دو۔''

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے بھی لکھا ہے:

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ''الہلال'' کی ابتدا سے لے کر رانچی کی نظر بندی تک مولانا نے بنیادی طور پر ہمیشہ خدا کا نام لیا اور قرآن کی دعوت دی اور جب بھی کوئی بات کہی تو اس کو وحی الٰہی کے دائمی اور غیر متغیر تعینات اور حقائق کی بنا پر پیش کیا انھوں نے ہمیشہ اپنے

سامنے ایک یقین رکھا ہے اور اپنے دعوت کی بنیاد انسانی افکار کی بجائے دینی اعتقادات پر رکھی انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کا بھی ذکر کیا، سیاسی اصولوں اور تقلیدوں کی بھی دعوت دی، انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں اور حکمت عملیوں کی طرف بھی اشارے کیے مگر ان سب کی طرف ان کا زاویہ نظر ہمیشہ قرآن اور اس کی تعلیمات سے مربوط رہا۔''

مولانا کے اسی جذبے کی وجہ سے مسلمانوں میں وہ معتبر سمجھے جانے لگے۔ ان کی صحافت کی ابتدا ایک ایسے دور میں ہوئی تھی جب سر سیّد احمد خاں یہ کوشش کر رہے تھے کہ مسلمان حصولِ علم پر زور دینے کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت سے تعاون کریں۔ غازی پور کی سائنٹفک سوسایٹی کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر میں نہ صرف جدید علوم کے فایدے گنوائے تھے بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ ''تاریخ ہم کو اس لیے پڑھنی چاہیے کہ بغاوت کی غلطی کا ہم دوبارہ اعادہ نہ کر سکیں'' عام مسلمان تو سر سیّد کی تحریک کے مخالف تھے لیکن تحریک آزادی میں اپنے موقف کے بارے میں تذبذب کا شکار تھے۔ ایسے وقت مولانا کی آواز انھیں ایک معتبر آواز نظر آئی۔ مولانا نے اپنی تحریرات کے ذریعے مسلمانوں کی فکر کو ایک سمت دی۔ مولانا کو یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی مہم میں شرکت اور معاونت کرنا چاہیے۔ بقول صباح الدین عبدالرحمٰن ''الہلال'' کا یہ بڑا احسان ہے کہ جب مسلمان انگریزوں اور ان کے تمدن کی برتری اور فوقیت سے مرعوب ہو کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے تو اس وقت مولانا نے اُن کو ان کے ''امتیاز ملی اور شرفِ خصوصی'' کی طرف توجہ دلا کر ان میں احساسِ برتری پیدا کیا بلکہ انھوں نے برطانوی حکومت کو بھی آگاہ کیا کہ اگر ہم سچے مسلمان ہو جائیں تو گورنمنٹ کے حق میں بہتر ہے۔ پس گورنمنٹ کی مصلحت بھی یہی ہے کہ ہم کو مسلمان بننے کے لیے چھوڑ دے کیوں کہ مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے نفس کے لیے اور نیز تمام عالم کے لیے یکساں طور پر مفید ہو سکتے ہیں۔

تحریک آزادی میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے حصے کا جایزہ لیتے ہوئے اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ''الہلال'' کی اشاعت کے آغاز کے وقت تحریک آزادی کافی

ابتدائی مرحلہ میں تھی اور ''الہلال'' کا آخری شمارہ ملک کے آزاد ہونے سے تقریباً ۲۰ سال پہلے اس وقت شائع ہوا تھا جب کہ جدوجہد آزادی کی کامیابی کے آثار تک موجود نہیں تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ۱۹۱۲ء میں یہ لکھا:

> ''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر مسلمانوں کے لیے ایک فرضِ دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ'' (الہلال: ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۱)

انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک رضا کارِ تنظیم ''حزب اللہ'' بھی بنانے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی ''الہلال'' بند کر دینا پڑا۔ ''الہلال'' کے ابتدائی دور کی خدمات کے بارے میں خود مولانا نے لکھا تھا۔ اس نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالات میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ وہ پہلے اپنے ہندو بھائیوں کی پولٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ پر ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی کی وجہ سے اس فریب میں مبتلا رہتے تھے کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ ہندستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قایم ہو جائے گی مگر ''الہلال'' نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتقاد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک وخلافت وسوراج ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے پہلے ''الہلال'' کی ضمانت ضبط کی گئی اور پھر ''البلاغ'' کے نام سے جب دوبارہ جاری کیا تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظر بند کر دیا۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ ''الہلال'' تمام تر آزادی یا موت کی دعوت تھی۔ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی میں جو روح پیدا کر رہے ہیں ''الہلال'' اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے آج سے بارہ سال پہلے ''الہلال'' کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی وجاں فروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔ ان کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بیکار نہ گئیں، مسلمانوں نے

اب آخری فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنے ہندو سکھ عیسائی اور پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں۔ ''الہلال'' کی یہی خدمات تھیں کہ انگلستان کی پارلیمان میں اس کے بارے میں سوالات کیے گئے اور آخرکار جریدۂ مذکور کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا۔ مولانا نے پہلی مرتبہ رقم ضمانت دو ہزار روپے ادا کردی لیکن پھر کچھ عرصہ بعد دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی تو اخبار بند کردینا پڑا۔ ۱۹۲۷ء میں ''الہلال'' پھر شائع ہوا تو مولانا کو احساس تھا کہ تحریک آزادی ۱۲ برس آگے بڑھ چکی ہے۔ یوں تو ''الہلال'' ۶ ماہ بعد ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا لیکن مولانا کی صحافت کا یہ مختصر دور تحریک آزادی میں اپنا رول ادا کرچکا تھا۔ مولانا مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کو تحریک آزادی سے نہ صرف متاثر کرنے بلکہ تحریک آزادی میں شامل کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوچکے تھے۔ مولانا کی اس دور ہی کی تحریرات کا نتیجہ تھا کہ علماء کی بڑی تعداد ہمیشہ ہی قوم پرست تحریکات سے وابستہ رہی۔ جمعیۃ العلماء ہند کے قیام سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ مسلمان بالعموم اور علماء بالخصوص تحریک آزادی میں دوسرے ہندوستانیوں کے دوش بدوش ہیں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی خدمات کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدوجہد آزادی کی کسی بھی غیر جانبدار تاریخ میں ان دو جرائد کا نام یقیناً سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

۱۔ معلوم نہیں فاضل مقالہ نگار کے قلم سے یہ تحریر اور ان کے ذہن میں یہ خیال کیوں کر پیدا ہوا کہ الہلال کے ابتدائی دور میں ملک کی آزادی کے مقصد کا انھیں سراغ نہیں ملا اور اس وقت تک مولانا کی سیاسی زندگی بھی شروع نہیں ہوئی تھی! حال آں کہ یہ مقصد الہلال کے اجرا کے اوّل روز (۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء) سے اور اسی وقت سے سیاست کی راہ پر چل کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا خواب انھوں نے ۱۹۰۶ء میں دیکھا تھا اور ۱۹۰۸ء میں جب وکیل امرتسر سے قطع تعلق کیا تھا تو صرف اس لیے وکیل کے مالک شیخ غلام محمد سیاست سے محض ناآشنا تھے اور حکومت کے خلاف اشارہ وکنایے میں بھی انھیں کوئی بات گوارا نہ تھی اور الہلال کے ابتدائی دور میں اس کے شمارہ ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو جو مقالہ ''الجہاد سبیل الحریت'' کے عنوان سے صفحہ ۵ تا ۱۱ پورے سات صفحات پر شائع ہوا تھا، اگر اس کا رُخ مولانا مسلم لیگ اور اس کی سیاست کی طرف نہ پھیر دیتے تو الہلال کی بندش اور پریس کی ضبطی کے لیے تو یہی کافی تھا۔ محمود انصاری صاحب نے اسی مقالے کا دوسطری اقتباس بھی دیا ہے،

لیکن تعجب ہے کہ اس مقالے کے سات طویل مضمون میں انھیں اور کچھ نظر نہ آیا! حال آں کہ پچھلے ۲۲ نمبروں کی مختلف تحریر میں اسی مضمون کی تمہید تھیں۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ انصاری صاحب نے اس پیراگراف میں جو بات لکھی ہے۔ اُس سے ان کی اس بات کی توثیق نہیں ہوتی۔ وہی بات ثابت ہوتی ہے جس کی طرف خاکسار نے اشارہ کیا ہے۔

اس خیال کا اظہار بطور ایک موضوع کے جان ہینڈرسن ڈگلس نے مولانا آزاد پر اپنی کتاب میں چھیڑا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بہ اہتمام استاد مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ زیر نظر مجموعہ مقالات میں شامل ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام اس کے مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔

مولانا آزاد کا مذکورہ بالا مقالہ جو ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کو الہلال میں شایع ہوا تھا اور جس کے اقتباسات سے کئی دوسرے مقالہ نگاروں نے اپنی تحریرات کو آراستہ کیا ہے۔ پھر خاکسار نے اس مجموعے کے باب "آثار و افاداتِ سیاسیہ و تاریخیہ" میں اسے شامل کرلیا ہے۔ تا کہ کسی محترم قاری یا اسکالر کے غلط فہمی میں پڑنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

باب ۴

سیاسی افکار و مسائل

فہرست مضامین

ہندستانی قومیت اور مسلمان

پروفیسر آل احمد سرور

مولانا آزاد کے انتقال کو پانچ سال ہو گئے۔ ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی اسے کوئی پر نہ کر سکا۔ ایک حد تک مولانا حفظ الرحمٰن نے ہندستانی مسلمانوں کو قومیت کی شاہراہ پر آگے بڑھایا مگر وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب یہ عالم ہے:

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

آزادی کے پندرہ سال بعد بھی قومی زندگی میں ہندستانی مسلمانوں کی نہ وہ اہمیت ہے جس کے وہ مستحق ہیں، نہ ان کے یہاں وہ جذبہ ہے جو مشکلات پر قابو پاتا ہے اور مردانہ وار منزل کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ اپنے آپ کو مظلوم کہتے ہیں۔ جمہوریت کا تصور، غیر مذہبی ریاست کا وجود، سوشلزم کی منزل، اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے وعدے، نہ ان کے دل کو گرماتے ہیں نہ ان کے دماغ کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سن لیتے ہیں جو انھیں ہندستانی قومیت کے شاندار نصب العین اور ہماری قومی حکومت کے نیک ارادوں کی داستان سناتے ہیں مگر ان پر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں ایک ایسی تاریک رات آئی ہے جس کی کوئی سحر نہیں۔ وہ اپنے مذہب کے سچے پیرو تو نہیں کہے جا سکتے، ہاں! اس سے محبت ضرور کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر کوئی انھیں پکارتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے دوڑتے ہیں۔ مذہب پر ان کے خیال میں کوئی آنچ آتی ہے تو احتجاج کرتے ہیں، مذہب کا کوئی نام لے تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی تہہ میں کوئی سیاسی مصلحت پوشیدہ ہے یا نہیں۔ وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کے جذبات سے کھیل رہا ہے۔ اگر

کوئی جماعت انھیں اپنا آلہ کار بنانا چاہتی ہے، تو اس کے لیے بڑی آسانی ہے۔ وہ صرف یہ کہہ دے کہ اسلام خطرے میں ہے، اس کے بعد جو چاہے سو کرا لے!

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے نزدیک مذہب تو ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جس کے ساتھ مل کر ہی انھیں دین اور دنیا مل سکتے ہیں، مگر قومیت کو وہ ایک ایسا سودا سمجھتے ہیں جس میں ان کے لیے نقصان ہی نقصان ہے اور اکثریت کے لیے نفع ہی نفع۔ پھر انھیں یہ بھی خیال ہو چکا ہے کہ اسلام اور قومیت ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ قومیت سے مسلمان جتنا ہی ہم آہنگ ہوگا اتنا ہی وہ اسلام سے دور ہوتا جائے گا۔ پہلے اُسے ہر معاملے میں اکثریت کی غلامی قبول کرنا پڑے گی پھر اُسے رفتہ رفتہ ایک خاموش زہر کے اثر سے اپنی تہذیبی خصوصیات سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس کے بعد نوبت یہ آئے گی کہ عقاید بھی کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ خطرہ کیوں مول لے۔

اقبال نے پہلی جنگ عظیم سے پہلے قومیت کے متعلق کہا تھا:

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس کے بعد سے گنگا میں کتنا پانی بہہ گیا۔ دو عالم گیر لڑائیاں ہوئیں۔ اسلامی ممالک میں قومیت کی تحریک نے زور پکڑا۔ ہندستان اور پاکستان آزاد ہوئے۔ ایشیا اور افریقہ کا نقشہ بدل گیا۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر کچھ لوگوں کو چھوڑ کر جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے مجموعی طور پر ہندستان کے مسلمان قومیت اسلام کے نظریے سے ہی چمٹے رہے۔ انھوں نے ہندستانی قومیت کو آتش نمرود تو سمجھا مگر اس میں کودے نہیں ورنہ یہی آگ اسی طرح ان کے لیے گلزار ہو جاتی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ہو گئی تھی۔ مولانا آزاد نے ''ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے'' کے آخری صفحے پر صاف صاف کہا تھا:

''تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلی چند دہائیوں کے بعد یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام صرف اسلام کی بنیاد پر تمام مسلم ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔''

مگر آج بھی بیشتر ہندستانی مسلمان جب کسی اسلامی بلاک کی تجویز سنتے ہیں تو انھیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آج بھی ان کے دل میں ہندستان کے لیے وہ جذبہ نہیں ہے جو اسلامی ممالک کے لیے ہے، آج بھی وہ اپنے ہم وطنوں سے جو کسی دوسرے مذہب کے پیرو ہیں ذہنی طور پر اتنے قریب نہیں جتنے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ہیں۔ آج بھی وہ قومیت کے فروغ کو مذہب کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ وہ آج بھی پہلے مراعات اور سہولتیں ڈھونڈتے ہیں اور بعد میں خدمت کی بات کرتے ہیں۔ آج بھی حقوق تو یاد ہیں، فرایض سے غفلت ہے۔
اس لیے مولانا آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر یہ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ہندستانی مسلمانوں کو ان کا قومی فریضہ یاد دلائیں اور انھیں بتائیں کہ قومیت اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے اور ایک سے وفا دوسرے سے بے وفائی کے مترادف نہیں کہی جا سکتی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے خود مولانا کے رام گڑھ کے خطبے کا ایک اقتباس پیش کر دینا ضروری ہے جس سے نہ صرف مولانا کا بلکہ قوم پرست مسلمانوں کا بھی نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ اقتباس طویل ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ اس میں سے کوئی جز حذف نہیں کیا جا سکتا:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دایرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان

کی ایک نا قابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (فیکٹر) ہوں۔ میں اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔"

مولانا کے نزدیک قومیت اور اسلام میں کسی کو چھوڑنا ضروری نہیں۔ نہ ان میں سے ایک کے بڑے اور ایک کے چھوٹے ہونے کا سوال ہے۔ یہ دونوں علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں اور ان کے آپس میں ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبال کا یہ خیال نہ تھا۔ آخر عمر میں ان سے اور مولانا حسین احمد سے اس پر بحث بھی ہوئی تھی۔ اقبال کی طرح بہت سے ہندستانی مسلمان یہ پہلے بھی سمجھتے تھے اور آج بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتا ہے اور کسی دوسری شے سے وفاداری گوارا نہیں کرتا۔ خواہ وہ قومیت ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں اسلام اور قومیت دونوں کا ایک خاص تصور ذہن میں آتا ہے۔ اگر اسلام کے آئیڈیل تصور اور قومیت کے آئیڈیل تصور کا موازنہ ہو تب ہی بات نتیجہ خیز ہوسکتی ہے مگر عام طور پر اسلام کا آئیڈیل تصور اور قومیت کا عملی روپ دیکھا جاتا ہے۔ اگر دونوں کے عملی رُوپ کی بات ہو تو بھی گفتگو دلچسپ ہوسکتی ہے اور شاید نتیجہ خیز بھی ہو۔

قومیت ہندستان کے لیے نئی چیز ہے۔ مغربی ملکوں کا تجربہ ہمارے لیے مفید ہو یا نہ ہو، مگر خود اسلامی ممالک کا کوئی بھی معروضی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان میں قومیت آج سب سے بڑی طاقت ہے۔ عرب ممالک میں صدر ناصر کی مقبولیت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یمن میں انقلاب اور عراق میں نئی کروٹ ناصرازم کی بڑھتی ہوئی طاقت کا پتا دیتے ہیں۔ اگر چہ ایک دنیا کا تخیل دانش وروں اور ادیبوں کے دلوں کو گرمانے لگا ہے، مگر عملی طور پر "قومیت" آج دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مذہب سے بڑی ہے۔ مذہب کے مقابلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیوں کہ مذہب میں عقاید، عبادات اور معاملات سبھی پہلو آتے ہیں۔ ان تینوں میں اسلام کی تعلیم کے مطابق عمل ہونا چاہیے مگر معاملات صرف اپنے گروہ کے لوگوں سے نہیں دوسروں سے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے

معاملات کے سلسلے میں دوسروں سے رشتے کا سوال بھی آتا ہے اور اس لیے روزمرہ کے کاروبار میں اور ایسے معاملات میں جن سے آج کی پیچیدہ زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، قومیت کی طاقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر دور کے ذہن کی ایک کنجی ہوتی ہے اور یہ کنجی بدلتی رہتی ہے۔ یہ کنجی اس کنجی کے علاوہ ہوتی ہے جو مذہب کی ہے اور جس کے ذریعے سے انسان اور اس کے خدا کے درمیان راستے کھلتے ہیں۔ اس دور کے ذہن کی کنجی قومیت ہے اور جب ہم قومیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے کسی طرح اسلام کی اہمیت کو گھٹانا مقصود نہیں ہوتا۔ اسلام بہر حال ہمیں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے ممتاز کرتا ہے اور علاحدہ کرتا ہے۔ قومیت ہمیں ان سے ملاتی ہے۔ مذہبی مسائل کے علاوہ روزمرہ زندگی میں ہمارا سابقہ دوسروں سے زیادہ پڑتا ہے۔ اس لیے یہ رشتہ جو ہمیں اس ملک کے دوسرے رہنے والوں سے ملاتا ہے اتنا اہم، جاندار اور معنی خیز ہے کہ ہم اس کی اہمیت سے انکار کر کے اپنا نقصان کریں گے۔ دنیا یہ دیکھتی ہے کہ اس کا کاروبار کیسا چل رہا ہے، وہ اپنے کاروبار میں ہر مذہب کے پیرو کو شریک کر لیتی ہے بشرطے کہ کاروبار پر برا اثر نہ پڑے۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں نے عام طور پر اس کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ وہ جب قومیت کی طرف بڑھتے بھی ہیں تو ان کا اسلام کا تصور ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ حقیقی اسلام قومیت کے فروغ میں کوئی خطرہ نہیں سمجھتا، بلکہ قومیت کا فروغ علاوہ دوسرے مذاہب کے ہندستان میں اسلام کے فروغ کے لیے بھی راہیں کھول سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا ہے کہ ابھی قومیت کا تجربہ ہمارے ملک میں نیا ہے۔ ابھی اس میں وہ پختگی نہیں آئی کہ ہم اس کے سارے محاسن کو دیکھ سکیں۔ ابھی اس کے فروغ کے راستے میں تاریخی وجوہات کی بنا پر کچھ سنگ گراں حائل رہے ہیں اور ان میں سے کچھ دوسروں نے پیدا کیے ہیں تو کچھ کے پیدا کرنے میں ہمارا ہاتھ بھی ہے۔ یہ پتھر وقت کے تقاضے کے مطابق رفتہ رفتہ راہ سے ہٹنے والے ہیں۔ ہم ان دونوں پہلوؤں کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیں گے۔

ہندستان کا مسلمان مجموعی طور سے اسلام سے محبت کرتا ہے، مگر اس کا اسلام حقیقی اسلام

سے خاصا دور ہے۔ وہ قبر پرستی کی لعنت میں بڑی حد تک گرفتار ہے۔ اس کے یہاں فرقہ بندی بھی ہے اور ذاتیں بھی۔ وہ جاگیردارانہ نظام سے بری طرح چمٹا ہوا ہے۔ اس کا قدیم نظام تعلیم تقلیدی ہے، یہ کولھو کے بیل بناتا ہے، عرصۂ کارزار میں چلنا نہیں سکھاتا۔ اس میں آدھی آبادی یعنی عورت کچھ عرصے پہلے تک سماج کا فعال حصہ نہیں بلکہ سماج پر بوجھ رہی ہے۔ اس کے یہاں دولت کی مساوی تقسیم نہیں ہے۔ اس نے جدید علوم کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں، ان میں پرانی حکومت کا نشہ ہے، یہ محنت سے جی چراتا ہے۔ یہ ہر اندرونی یا بیرونی طاقت کا آلہ کار بن سکتا ہے۔ بشرطے کہ ان کا کچھ فایدہ ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس عمومی جائزے میں سرسیّد کے وقت سے جو تبدیلی ہوئی ہے، اس کا احساس بہ ظاہر نظر نہیں آتا، مگر یہاں بات مجموعی طور پر کہی گئی ہے۔ سرسیّد ہوں یا ابوالکلام، ان کا احترام تو برابر کیا گیا ہے، مگر ان کے خیالات پر عمل کم ہی ہوا ہے۔

کیا ہندستان کے مسلمان نے حقیقی اسلام کی کوئی بڑی خدمت کی ہے! کیا پاکستان بنوانا اسلام کی واقعی خدمت تھی؟ اور کیا یہ بات غلط ہے کہ پاکستان کا وجود ہندستانی مسلمانوں کی کاوش سے زیادہ مغربی استعمار پرستوں کی ایک سیاسی مصلحت کا مرہونِ منت ہے؟

ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی سیاست میں بالائی طبقے کے مسلمانوں کے طبقاتی مفاد کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، غریب اسلام کا صرف نام لیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ مفاد اس نام کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ نظام حیدرآباد سے ہندستانی مسلمانوں کو کتنی ہمدردی تھی اور اس ہمدردی کی کیا قیمت دینی پڑی، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

اسلام ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ توحید و رسالت پر یقین محکم رکھے۔ وہ قرآن کی روشنی میں اپنی زندگی کو منظم کرے اور اس زندگی کو انسانیت کے لیے باعث خیر و برکت بنائے۔ اسلام میں فرقوں کی گنجایش نہیں، مگر ہمارے یہاں بہتر فرقے موجود ہیں جو اپنے علاوہ دوسرے کو کافر سمجھتے ہیں۔ اسلام نے وراثت، نکاح، طلاق کے لیے کچھ قوانین بنائے ہیں۔ ہمارے یہاں ان قوانین سے زیادہ رسم کی پیروی ہوتی ہے۔ اسلام کی روح جمہوری ہے۔ ہم نے دولت اور خاندان کا لحاظ زیادہ رکھنا ہے۔ اسلام نے علم کے لیے کوئی

دروازہ بند نہیں کیا، ابھی کتنے دن ہوئے کہ ہمارے علماء انگریزی تعلیم کو بے دینی کے مترادف سمجھتے تھے۔ اب بھی کچھ لوگ ہندی اور سنسکرت سے اس لیے جھجکتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے مذہب سے دور ہو جائیں گے۔ ہم نے صدیوں تک نئے علوم کی طرف سے اپنے ذہن کا دریچہ بند رکھا ہے۔

اس لیے اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ایک مدت سے ہندستانی مسلمان اسلام کی خدمت کم کرتا رہا ہے، اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کی جدوجہد میں زیادہ مصروف رہا ہے۔ تاریخ کا نقشہ بدلنے پر جمہوری عناصر کے تقویت پانے پر، غلام ملکوں کے آزاد ہونے پر آبادی کے بڑے حصے کا ملک پر اثر انداز ہونا قدرتی تھا۔ اس ماضی کی یاد جس کے شاندار کارنامے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں اکثریت کو کیوں نہ آتی، وہ فلسفہ، وہ ادب، وہ تہذیب، کیوں نہ اُبھرتے جن کو مغربی سامراج نے اپنے مصالح کی بنا پر دبا رکھا تھا۔ اس سے یہ شکایت تو بجا ہوتی کہ وہ صرف قدیم ہندستان کو کیوں یاد کرتا ہے، درمیانی دور کے ہندستان کو بھی کیوں اپنی یاد میں شامل نہیں کرتا، لیکن اس کے سارے جذبات کو محض اکثریت کا نشہ قرار دینا کہاں کی دانش مندی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا پروفیسر ہمایوں کبیر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک کانووکیشن میں خطبہ پڑھتے ہوئے یونی ورسٹی کے مسلمان طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ ہندستان کے مشاہیر کو اپنائیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ ہندو مذہب کے بزرگوں پر ایمان لے آئیں بلکہ سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ اشوک، کالی داس، وکرماجیت، کرشن جی، رام چندر جی کا بھی اقرار کریں۔ مگر عام طور پر پروفیسر کبیر کے ارشادات کو ایک ہندو پرست وزیر کے بھاشن سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی، جو جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے۔

ہندستان کے مسلمانوں کی تنگ نظری اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے ہر جدید تحریک کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھا یا یاروں نے اپنے مفاد کی خاطر ان کو یہ سمجھا دیا۔ جمہوریت سے وہ بیزار، قومیت ان کے نزدیک ایک فریب، سوشلزم یا کمیونزم لامذہبیت کا دوسرا نام، ہر اہنسا کا فلسفہ گوسفندی کا نیا رُوپ، جن اللہ کے بندوں نے نئی تحریکوں کی کچھ تعریف کی وہ فوراً ٹاٹ باہر کر دیے گئے۔ برسوں مولانا آزاد کے متعلق یہ پروپیگنڈا ہوتا رہا کہ کانگریس نے

انھیں چند سکوں کے عوض خرید لیا ہے۔ مولانا کا جرم یہ تھا کہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے، جو قومی تحریک کی سربراہ تھی۔ گاندھی جی کے متعلق اقبال کے شعر پر سر دھننے والے اب بھی موجود ہیں:

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

حال آں کہ جن لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ذہنوں پر جالا نہیں ہے وہ جانتے ہیں کہ رشی کے فاقوں نے نہ صرف برہمن کا طلسم توڑ دیا بلکہ ہندو حکومت کے خواب کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

ہندستان کا مسلمان اب تک معلق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا اسلام سے رشتہ مضبوط ہے۔ حال آں کہ صدیوں کے رسم و رواج کی وجہ سے مذہب کے ایک ظاہری رُوپ کی پرستش تو اس کے پاس رہ گئی ہے، مذہب کی روح نہیں رہی۔ اس نے قومیت سے من حیث القوم ابھی تک اپنا رشتہ مضبوط نہیں کیا۔ یعنی قومیت اس کے ذہن، اس کے عقیدے، اس کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک نہیں ہے۔ قومیت کا جذبہ اسے گرماتا نہیں!

قومیت صرف جغرافیے کی مرہونِ منت نہیں۔ اس میں تاریخ، تہذیب، اقتصادی مفاد کی وحدت بھی ضروری ہے اور سب سے زیادہ یگانگت کے احساس کی۔ قومیں مذہب سے نہیں بنتیں، وطن اور اس کی مشترک تاریخ و تہذیب سے بنتی ہیں۔ عرب عیسائی اور عرب یہودی، باوجود اس کے کہ عرب مسلمانوں سے مختلف مذہب رکھتے ہیں، مگر ان کے ساتھ ایک عرب قوم کے جز ہیں۔ ہندستان کے ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، سکھ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہوئے ہندستانی قوم کے افراد ہیں۔ مذہب قوم کے راستے میں حائل نہیں ہوتا، نہ قوم افراد کے مذہب سے کوئی علاقہ رکھتی ہے۔ ہندستان کی تاریخ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشمکش کے بہت سے مظاہر ملتے ہیں۔ مگر اس سے کم مظاہر ان کے تعاون کے بھی نہیں ہیں۔ یہ کشمکش اسلام اور دوسرے مذاہب کی نہیں ہے بلکہ ان افراد کی سیاسی اقتدار کے لیے لڑائی ہے جو مختلف مذاہب رکھتے تھے۔ پھر ان میں تعاون اور اشتراک کے بھی اَن گنت نمونے ملتے ہیں۔ یہاں

پھر مولانا کے مشہور خطبے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کی جگہ نکالی۔ انھیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔''

''تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔''

''ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم

و رواج ایک دوسرے ۔ سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں چل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔

''ہماری اس ہزاروں برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا ہے اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔''

کہا جا سکتا ہے کہ اس ''ناقابل تقسیم'' ہندستانی قوم کے ۱۹۴۷ء میں دو ٹکڑے ہو گئے اور اس لیے یہ سارا استدلال غلط ثابت ہو گیا۔ حال آں کہ اس عمل جراحی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی اقلیت اور پاکستان میں ہندوؤں کی اقلیت اب ہندستانی اور پاکستانی قوم ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے مفاد ہندستان کے ساتھ اور پاکستان کے ہندوؤں کا ۔۔ پاکستان کے ساتھ ہے۔ تقسیم یقیناً غلط تھی مگر اب تو وہ ہو گئی، اب اُسے برا کہنے سے کوئی فایدہ نہیں۔ اب دونوں ملکوں کو پرانے جھگڑوں کو بھلا کر آزاد اور خودمختار دوستوں کی طرح رہنا چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندستان کے ہندوؤں کو اب پاکستان کے ہندوؤں سے کوئی سروکار نہیں اور اس طرح پاکستان کے مسلمانوں کو اب ہندستان کے مسلمانوں سے کوئی سروکار نہیں۔ دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ اگر اب بھی کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تو یہ ان کی

بھول ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا۔ یہ حقیقت بھی اور زیادہ واضح ہوتی جائے گی۔

ہندستان میں قومیت کا تصور نیا ہے۔ مذہب، ذات پات، علاقے سے وفاداریاں پرانی ہیں۔ قومیت کا تصور ابھی دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا ہے۔ صرف اُوپر سے مان لیا گیا ہے یہاں اقرار باللسان ہے تصدیق بالقلب کی منزل تک ابھی بات نہیں پہنچی۔ اس لیے پرانے رشتے اب بھی اپنا زور دکھاتے ہیں اور ذرا سی سختی یا دباؤ پر اُبھر آتے ہیں۔ پھر انگریز کے زمانے میں لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول پر جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو برسوں سبق دیے گئے تھے وہ جلد بھلائے نہیں جا سکتے۔ سیاست دانوں کی بہت بڑی تعداد اس ماحول میں پلی ہے۔ حکومت کے کارکن خلا میں پیدا نہیں ہوئے۔ اس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور ان میں سے بڑی تعداد کو اس بنا پر ملازمتیں ملی تھیں۔ اقلیت کے ذہن سے مراعات اور محفوظ نشستوں کی یاد محو نہیں ہوئی ہے، پرانی تاریخ کو جس طرح پیش کیا گیا تھا اس کے اثرات بھی باقی ہیں۔ تقسیم کے بعد ہولناک فسادات نے دونوں طرف اتنا زہر پھیلایا تھا کہ وہ جاتے جاتے جائے گا۔ ان باتوں کی وجہ سے آزادی کے بعد قومیت کے تصور کو وہ فضا نہ ملی جو ملنی چاہیے تھی۔ اگرچہ ان حالات میں اکثریت کی ذمے داری زیادہ ہوتی ہے، مگر صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلتا کہ جب تک، اقلیت کو انصاف نہ ملے گا اس وقت تک وہ قومیت کے تجربے میں حصہ نہ لے گی۔ ہندستان کے مسلمانوں کا قومیت کے تجربے کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں جو فرض ہے وہ صرف اس وجہ سے دھل نہیں جاتا کہ ہندستان کی اکثریت یا حکومت بہت سی باتیں جمہوریت کے خلاف کرتی ہے۔ خواب اور حقیقت نصب العین اور عمل میں خلیج ہمیشہ ہوتی ہے مگر جتنی ہی کوئی قوم پختہ ہوتی ہے اتنی ہی یہ خلیج کم ہوتی ہے۔ ابھی قومیت ہمارے یہاں راسخ نہیں ہوئی ہے۔ ہاں یہ بات اہم ہے کہ چین کے ہماری سرحد پر در آنے سے ملک میں یکجہتی کی فضا خود بخود قائم ہوئی ہے۔ شر سے کبھی کبھی خیر بھی برآمد ہوتا ہے۔

اس لیے یہ کہنا کہ ہندستانی مسلمانوں کا مستقبل قومیت، کے فروغ کی وجہ سے روشن نہیں ہو سکتا، ایک فریب ہے اس وقت ہندستانی مسلمانوں میں ایک عجیب بددلی اور مایوسی ہے۔ ہماری سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ ہے کہ یہ بددلی اور مایوسی ایک نفسیاتی مرض کی وجہ سے ہے۔

اکثریت کے قصور کم نہیں، مگر اکثریت کو الزام دے کر ہم کچھ کرنے کی ذمے داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ کچھ کرنے میں محنت کرنی پڑتی ہے، ذہن و دماغ کو اس کام میں لگانا پڑتا ہے۔ بددلی اور مایوسی میں بظاہر ہمارا کچھ نہیں جاتا۔ سب قصور دوسروں کا ٹھہرتا ہے۔ لوگ ہمیں موقع ہی نہیں دیتے۔ ہر جگہ ہمارے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے اور ہر دروازہ ہمارے لیے بند ہے۔ یہ غیر مذہبی ریاست محض ڈھونگ ہے یہاں ابوالکلام آزاد کی حیثیت محض جمہورے (شو بوائے) کی تھی۔ یہ الفاظ ۱۹۴۵ء میں دہلی میں ایک مسلم لیگی مسلمان نے کہے تھے۔ اب ذاکر حسین نائب صدر ہوئے تو اس خیال کے ایک بزرگ نے کہا کہ ہندوان سے نہ معلوم کیا کام لینے والے ہیں۔ اس مریض ذہنیت کا کیا علاج ہے۔ نفسیات میں مظلومیت کے تخیل کی اصطلاح عام ہے۔ اس مرض کے شکار اب بھی بہت سے لوگ ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ آزادی کے بعد جو ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں ان سے ہم آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں مسلمانوں کی طرف سے پہلے سمجھ میں آنے والی چیز نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی غیر ذمے دار آدمی نے کوئی نازیبا حرکت کی ہو اور یہ غیر ذمے دار آدمی اتفاق سے مسلمان ہو۔ غیر ذمے دار آدمی ہر مذہبی گروہ میں مل جائیں گے اور ایک سیدھے سادے حساب کے مطابق اکثریت میں برے لوگوں اور اچھے لوگوں کی تعداد ہمیشہ اقلیت کے برے اور اچھے لوگوں سے زیادہ ہوگی، اس لیے ان فسادات کی ذمے داری سے اکثریت سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ مگر اقلیت اگر ان سے یہ اثر لیتی ہے کہ اور بھی اپنے خول میں سکڑ جاتی ہے، اور بھی قومی زندگی سے ہٹ جاتی ہے، اور بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی تعمیر میں لگ جاتی ہے اور بھی اپنے زخموں کو کریدتی رہتی ہے اور ایک احساسِ مظلومیت اور جذبہ شکست کے ماتحت، نئے حالات، نئے میلانات، آئے دن کی تبدیلیوں اور امکانات کو نظر انداز کر دیتی ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اگر اکثریت کے کچھ ناسمجھ افراد، اقلیت سے بار بار وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ غلط ہے۔ ہمیں وفاداری کا سرٹیفکیٹ کسی سیاسی پارٹی یا کسی افسر سے حاصل نہیں کرنا ہے، ہاں اپنے ذہن کو ٹٹولنا ہے اور دیکھنا ہے کہ ہمارے دل کے کسی گوشے میں ہندستانی قوم کی کوئی تصویر ہے یا نہیں، ہندستان کی یہ تصویر دھرتی کی محبت اور گھر کی محبت اور پڑوسیوں کی محبت سے بڑی چیز ہے۔ یہ ایک سیاسی

مفاد، ایک مشترک نظام زندگی، ایک مشترک تہذیب اور ایک مشترک نصب العین سے محبت ہے۔ یہ زندگی، تہذیب اور نصب العین دنیاوی زندگی کے لیے ہے، روحانی غذا ہمیں اسلام سے ہی مل سکتی ہے اور ملے گی۔ اسلام اتنا وسیع، جامع اور ہمہ گیر دایرہ رکھتا ہے کہ اس میں عرب کے مسلمانوں، انڈونیشیا کے مسلمانوں، ہندستان کے مسلمانوں، سب کے لیے اپنی اپنی قومیت کا جزو لاینفک ہوتے ہوئے ذہنی آسودگی اور مادی خوش حالی کا امکان ہے۔ عرب، انڈونیشیا اور پاکستان میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

ان کے لیے سوال یہ ہے کہ وہ اسلام کے راستے پر چلتے ہوئے کس طرح موجودہ دور کی بھول بھلیوں سے نکل سکتے ہیں، کس طرح حال کے پیچ وخم کو ہموار کر سکتے ہیں، کس طرح اپنی اور انسانیت کی خدمت کر سکتے ہیں۔

ہندستان کے مسلمانوں کے سامنے دوسرا سوال ہے اور یہ سوال پہلے سے کم اہم نہیں۔ یہاں اکثریت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی جس کے پیچھے ایسی شاندار تاریخ ہے جس کا ہماری مشترک تہذیب اور قومی زندگی میں ایسا نمایاں حصہ رہا ہے جو کشمیر سے کیرالا تک اور کلکتے سے کچھ تک پھیلی ہوئی ہے، یہاں بھی ایک رول رکھتی ہے۔ ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ جس نے اسلام کا نہایت ہمدردی سے مطالعہ کیا ہے اور جو اسلام کے غیر فانی کارنامے کا قائل ہے۔ اپنی کتاب ''جدید تاریخ میں اسلام'' میں ہندستان کے باب میں لکھتا ہے:

> ''ہندستان میں اسلام دوسروں سے رشتے قایم کرنے کی ضرورت کو ایک نقطے پر مرکوز کرتا ہے اور اس ضرورت کی ایک علامت ہے۔
> دوسروں کی طرح اسلام کو اس منزل پر اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیے اور غالباً یہ سبق وہ ہندستان میں سیکھے گا۔'' (صفحہ ۲۹۱)

اسمتھ کے نزدیک ہندستان کی غیر مذہبی ریاست میں اسلام کا جو مقام ہوگا اس کے مطابق اسلام اور ہندستان دونوں کی تاریخ لکھی جائے گی۔ اسی مضمون میں وہ دوسری جگہ لکھتا ہے:

ہاں ہندستان اور اسلام دونوں کی تاریخیں ایک حد تک اس جماعت
کے (ہندستانی مسلمانوں کے) اپنے موجودہ مسائل کے حل میں
کامیاب ہونے یا ناکام رہنے پر اور آج کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں
اس کی صلاحیت اور سوجھ بوجھ پر تشکیل پائیں گے۔

گویا ہندستان کے مسلمانوں کے رویے پر ایک حد تک ہندستان اور اسلام دونوں کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ ہندستانی مسلمان اگر ہندستان کی قومی جمہوریت کو کامیاب بنانے میں تن من دھن کی بازی لگاتے ہیں، تو ایک طرف وہ اپنے لیے ایک مرکز، ایک محور پاتے ہیں۔ ہندستانی قوم سے گہری ذہنی اور جذباتی وابستگی انھیں اپنے آپ کو پانے کا موقع دے گی اور قوم ان کی وجہ سے قدیم ہند کے تخیل سے آزاد ہوکر ہندستان کی پوری تاریخ اور اس کی مشترک تہذیب سے لو لگانے میں فخر سمجھے گی۔ یہ کام ایک حد تک تو زمانہ کرائے گا اور ہمارا بیدار طبقہ اس کے لیے کوشش بھی کر رہا ہے، مگر پھر پوری قوم کے یہاں قدیم و جدید کی ایسی شدید کشمکش نہ رہے گی جو اس کی ترقی کی رفتار پر برا اثر ڈال سکے۔ پھر اسلام کے عالمگیر مشن کے لیے بھی یہ ایک تجربہ ہوگا۔ دنیا کا نقشہ اب کچھ اس طرح کا بن رہا ہے کہ ایک ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے قابل لحاظ تعداد میں ملتے ہیں۔ ایسے بہت سے ملک ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوتے ہوئے اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کے رول سے پوری قوم کی رفتار پر اثر پڑتا ہے۔ ایسے ملکوں میں ہندستان کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس لیے ہندستانی قوم اگر اپنے جمہوری نظام، قومی بنیاد، غیر مذہبی ریاست کے تصور کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری وساری دیکھنا چاہتی ہے تو اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کو خوش اور مطمئن رکھے اور ان کے روحانی سرمایے کو جو اسلام کے نام سے دنیا کے سامنے ہے، اپنائے اور اس سے حسب توفیق مدد لے۔ یہ مدد شراب بندی کے قوانین اور ہندو کوڈ بل کے سلسلے میں اب بھی لی جارہی ہے اور ابھی اس سلسلے میں بہت سے امکانات ہیں۔

سیاسی اعتبار سے ہندستان دو بڑے گروہوں کے درمیان ناطرف داری کی پالیسی پر چل رہا ہے۔ امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود ہندستان میں ہمیشہ نہیں

نافذ کیا جا سکتا۔ اسی طرح کمیونزم کی فطری اپیل کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کمیونزم اختیار نہیں کرے گا۔ ہاں ہماری قومی جمہوریت نے سوشلزم کو اپنی منزل قرار دیا ہے اور اقبال تک یہ کہہ چکے ہیں کہ ''اسلام بھی ایک قسم کا سوشلزم ہے'' ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی قومیت کے جمہوری تصورات، غیر مذہبی حکومت اور سوشلزم کی منزل میں ایک مسلمان کے لیے نہ صرف ذہنی تسکین کا بلکہ حوصلے اور ولولے کا سامان بھی موجود ہے۔ مسلمان اگر ایسی جماعتوں کا ساتھ دیتے ہیں جن کی پالیسی ان مقاصد کے سلسلے میں واضح ہے تو وہ اس طرح ملک کی بھی خدمت کرتے ہیں اور اپنی بھی!

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

۱- اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہندستانی مسلمان اسلام کے سچے پیرو ہوتے ہوئے ہندستانی قومیت کے علم بردار رہ سکتے ہیں۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ حسن تدبیر سے دور کی جا سکتی ہیں۔ رکاوٹوں کی ذمے داری میں سب شریک ہیں۔

۲- قومیت کا تصور جیسے جیسے فروغ پاتا جائے گا اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا جائے گا۔ اسی نسبت سے اکثریت میں مذہب کی بنیاد پر سیاست کو متعین کرنے کا جذبہ کمزور ہوگا اور اگر اقلیت مذہبی بنیاد پر سیاست نہیں چلائے گی تو یہ عمل اور جلد ہوگا۔

۳- ہر گروہ کو علاوہ ایک روحانی مرکز کے ایک دنیوی مرکز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایسا مرکز قومیت فراہم کر سکتی ہے۔ اس کا مذہب اس دنیوی مرکز کے راستے میں حائل نہیں ہوتا۔

۴- ہندستانی مسلمانوں کے دنیوی، سیاسی اور کاروباری مفادات دوسرے مذہب کے ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہیں۔ ایک مسلمان کلرک کا مفاد ایک ہندو کلرک کے ساتھ، ایک مسلمان اُستاد کا ہندو اُستاد کے ساتھ، ایک مسلمان سرمایہ دار کا ہندو سرمایہ دار کے ساتھ ہے۔ نظام حیدرآباد نواب رام پور یا بمبئی کے مسلمان سیٹھوں کے ساتھ نہیں۔

۵- جس طرح ہندو مہاسبھا، رام راجیہ پرشد اور جن سنگھ کی مذہبی بنیاد پر سیاست غلط ہے، اسی طرح مسلم لیگ یا جماعت اسلامی کی سیاست بھی غلط ہے، بلکہ اقلیت میں مذہب کی

بنیاد پر سیاسی جدوجہد، اکثریت میں غلط جذبات کو اوراشتعال دے سکتی ہے۔

۶- ہندستان میں اسلام کی خدمت کے لیے غیر مذہبی سیاست نے راستہ کھول دیا ہے۔ اسے ایسی حقیقت بنانا چاہیے کہ ہر منزل پر اس پر عمل ہو۔ مسلمان ایسا کر سکتے ہیں اور اس طرح اسلام کے لیے دوسروں میں میلان پیدا کر سکتے ہیں۔

۷- اقلیت کو اپنا جمہوری حق ضرور مانگنا چاہیے مگر قومی زندگی میں بھرپور شرکت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ پہلے حق ملے، تب مدد ہو۔ فرایض کے ادا کرنے میں سودے بازی نہیں چلتی۔

۸- مولانا آزاد نے سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اپنی تفسیر قرآن کے ذریعہ اسلام کی حقیقی تعلیم پر روشنی ڈالی اور اپنی زندگی کے ذریعے سے یہ ثابت کیا کہ قومی زندگی میں دل و جان سے شرکت ہی اقلیتوں کے لیے صحیح راہِ عمل ہے۔ ان کی یاد کافی نہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔

۹- وفاداری ریاست (اسٹیٹ) سے ہوتی ہے۔ حکومت سے نہیں، قوم سے ہوتی ہے کسی سیاسی پارٹی سے نہیں۔

۱۰- ہندستانی مسلمانوں کا تعلق خواہ کسی سیاسی پارٹی سے ہو انھیں ہر حال میں ریاست سے اپنا رشتہ مضبوط رکھنا چاہیے۔ رشتے کا تعلق ذہن اور دل سے ہے، اسے کسی دکھاوے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ رشتہ موجود ہے تو اچھی بات ہے اور اگر نہیں ہے تو اسے پیدا کرنا چاہیے۔ مصلحت یا خوف سے نہیں اصولی طور پر۔ اقبال نے درست کہا ہے:

''پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ''

۱۱- اس وقت ہندستانی مسلمانوں کو قومی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بہت بڑی تحریک کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے کام میں دیر کی گئی تو نقصان ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں سرسیّد نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے ایک ذہنی انقلاب برپا کیا اور ہندستان کے مسلمانوں کو جذباتیت اور مشرقیت کے محدود تصور سے نکال کر عقلیت اور آفاقیت کی طرف لائے، اس طرح آج ایک اور تہذیب الاخلاق کی ضرورت ہے جو ہندستانی

مسلمانوں کو ایک طرف قومیت سے ہم آہنگ کرے، دوسری طرف عالمی افکار کو جذب کر کے ان کو اس قابل بنائے کہ وہ موجودہ دور میں اپنے لیے ایک باعزت جگہ بنانے میں کامیاب ہوسکیں۔

۱۲- اس کام کے لیے ایسے مسلمان ہی آگے آسکتے ہیں، جن کا حکومت سے تعلق نہ ہو۔ ان کے لیے قدیم وجدید دونوں علوم سے واقف ہونا ضروری ہے۔ آج وہی لوگ ہندستانی مسلمانوں کی قیادت کر سکتے ہیں جو ایک طرف اسلام کی تعلیم سے اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں، دوسرے جو ہندستان کی تاریخ کا اور اس کے ادبی سرمایے کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوں اور تیسرے جن کا ذہن جدید علوم کی روح تک پہنچنے اور ان سے اپنے طور پر کسبِ فیض کرنے کے قابل ہو۔

۱۳- ہمارے یہاں ہر تحریک سے بہت جلد نتائج کی توقع ہوتی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کو ہر جماعت سبز باغ دکھاتی ہے اور اس کے سامنے نتائج کی تصویر اس طرح آتی ہے، جس طرح مشین میں اکنی ڈالی اور ٹکٹ نکل آیا۔ قومی زندگی میں صالح رجحانات کی تعمیر بڑا خلوص، پیہم ریاض اور ناقابل شکست حوصلہ چاہتی ہے۔ اس لیے اس لائحہ عمل کو فوری سیاست کے خطوط پر نہیں ذہنی اور تہذیبی سطح پر چلانا چاہیے۔ اس کے نتائج خواہ دیر میں نکلیں، مگر وہ دیرپا ہوں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تصورِ قومیت

پروفیسر عبدالمغنی

انگریزی کے جن لفظوں نے عصرِ حاضر کی اُردو آبادی میں افکار و اعمال کی ایک نزاع برپا کی ہے ان میں سرفہرست لفظ ''نیشن'' (Nation) اور اس سے مشتق نیشنلزم (Nationalism) ہے۔ ان الفاظ کے مفہوم اور ان سے وابستہ تصور پر بہت ہی گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں، جن میں بعض اوقات بڑے بڑے مشاہیر نے حصہ لیا ہے، لیکن کوئی قطعی فیصلہ علمی سطح پر آج تک نہیں ہو سکا ہے۔ گرچہ ایک سیاسی نتیجہ ضرور یہ نکلا ہے کہ مغلوں اور انگریزوں کے ادوار کا غیر منقسم ہندستان پہلے دو، پھر تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے بعد بھی نیشنلزم کی بحث ختم نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ آزاد ہندستان میں اکتالیس سال سے قومی یک جہتی کا مسئلہ اور اس کے حل کے لیے مباحثہ جاری ہے۔ ملک میں قائم ہونے اور پروان چڑھنے والی جمہوریت (Democracy) نے اس مباحثے کو اکثریت (Majority) اور اقلیت (Minority) کے نام پر کچھ اور تیز کر دیا ہے۔ حال آں کہ دستورِ ہند کے تمام شہریوں کے یکساں حقوق اور مساوی مرتبے کی ضمانت دی ہے، مگر فرقہ وارانہ (Communalism) انداز سے مذہب اور زبان وغیرہ کا حوالہ دے کر سیاسی گفتگو میں تعداد کی بنا پر کم اور بیش کی تفریق کر دی گئی ہے۔ لہٰذا سیکولرزم (Secularism) کو اسٹیٹ کی پالیسی قرار دینے کے باوجود نیشنل انٹی گریشن (National Integration) یعنی قومی یک جہتی کا مقصد ہنوز حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

اس تناظر میں جنگ آزادی کے عظیم ترین مجاہد اور جدید ہندستان کے ایک اہم ترین معمار، مولانا ابوالکلام آزاد کے تصورِ قومیت کا مطالعہ اہلِ نظر کے لیے بصیرت کا باعث ہوگا اور

ممکن ہے کہ اس سے آزاد ہندستان میں قومی یک جہتی کے مسئلے کا حل دریافت کرنے میں بھی مدد ملے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ''قومیت'' اور ''قوم پرستی'' کے الفاظ ایک دوسرے سے جدا معانی رکھتے ہیں۔ اگرچہ دونوں ہی الفاظ عام طور پر انگریزی لفظ ''نیشنلزم'' کے ترجمے ہیں، جو مختلف مواقع پر مختلف اصحاب نے کیے۔ آج کے محاورۂ زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''قومیت'' دراصل ایک دوسرے انگریزی لفظ ''نیشنیلٹی'' (Nationality) کا مترادف ہے، جو ایک خالص انتظامی اصطلاح ہے اور اس کے بارے میں کوئی نظریاتی نزاع نہیں ہے، اس لیے کہ ہر ملک کے رہنے والے کی قومیت کا تعلق اس کے ملک سے ہی ہوتا ہے لیکن آج سے پچاس سال قبل کے سیاسی مباحث میں لفظ ''قومیت'' کا استعمال، مثال کے طور پر، خود مولانا آزاد نے قومی احساس کے معنی میں کیا، جس کا مقصود تھا وطن دوستی، یعنی اہل وطن کے اجتماعی مفاد اور ان کی مجموعی و عمومی صلاح و فلاح کا احساس و شعور۔ سوال یہ ہے کہ کیا لفظ ''قومیت'' استعمال کرتے ہوئے مولانا کے سامنے لفظ ''نیشنلزم'' تھا جس کا ترجمہ وہ کرنا چاہتے تھے؟ اس سوال کا کوئی واضح اور معین جواب دینا بہت مشکل ہے، لیکن یہ حقیقت تو ثابت ہے کہ مولانا نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے قوم پرستی کے بجائے قومیت کا لفظ استعمال کیا۔ یہ نکتہ وطن دوستی اور وطن پرستی کے فرق کا تجزیہ کرنے سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ حال آں کہ دونوں الفاظ ایک انگریزی لفظ ''پیٹریوٹزم'' (Patriotism) کے ترجمے ہیں، جب کہ اس انگریزی لفظ کا ایک تیسرا اُردو ترجمہ ''وطنیت'' بھی ممکن ہے اور مروّج رہا ہے۔ یہاں ایک سوال اُٹھتا ہے، کیا وطن پرستی اور قوم پرستی کا مفہوم ایک ہی ہے؟ اس موقعے پر ایک لسانی سوال یہ بھی اُٹھ سکتا ہے کہ کیا وطنیت و وطن پرستی ایک طرف اور قومیت و قوم پرستی دوسری طرف ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہیں۔

پہلے سوال کا جواب نسبتاً آسان ہے، وہ اس طرح کہ ایک سرزمین کے ساتھ وابستگی کا خیال وطن اور قوم میں بالعموم مشترک ہوگا۔ اِلا یہ کہ کوئی قوم اپنی سرزمین سے اُکھڑ چکی ہو، لیکن قوم میں حاکمانہ اختیار (Sovereignty) کا پہلو بھی مضمر ہے، جب کہ وطن جائے پیدائش اور جائے رہائش کے سوا کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے غلام ہندستان میں اہل ملک کے لیے بلاامتیازِ

فرقہ وطبقہ وطن تو ایک حقیقت تھی، لیکن قوم کا تخیل ایک آرزو پر مبنی تھا جس کی تکمیل آزادی کے بعد ہوتی تھی۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ جنگ آزادی کے زمانے میں وطنیت وقومیت کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال کیے گئے۔ چناں چہ وطن پرستی اور قوم پرستی کے درمیان کم ہی فرق کیا گیا۔ دوسرے سوال کا جواب دینے میں مشکل یہ ہے کہ ہر وطن دوست اور قوم پرور کوئی ضروری نہیں ہے کہ وطن پرست اور قوم پرست بھی ہو، اس لیے کہ سرزمین کی محبت ایک بات ہے اور اس کی پرستش دوسری بات۔ ممکن ہے کہ اسی وجہ سے وطن دوستوں اور قوم پروروں نے اپنے نقطہ نظر کے لیے وطنیت وقومیت کے الفاظ بالعموم استعمال کیے ہوں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے وطنیت و وطن پروری میں معنی کا فرق نہیں، لسانی اصلیت کا فرق ہے، پہلا لفظ عربی قاعدے پر ہے اور دوسرا فارسی قاعدے پر۔ ٹھیک یہی فرق قومیت وقوم پرستی کا بھی ہے۔

بہر حال، نصف صدی قبل نیشن کے تصور پر جو بحث ونزاع ہوئی اس میں توجہ اس انگریزی لفظ کے اُردو ترجمے پر نہیں، اس کے سیاسی مفہوم پر مرکوز رہی۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے درمیان جو مباحثہ ہوا اس کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مولانا کے پیش نظر عربی زبان میں لفظ ''قوم'' کا قدیمی استعمال تھا، جب کہ اقبال کے مدنظر انگریزی لفظ ''نیشن'' کے سیاسی مضمرات تھے۔ اس موضوع پر ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تصنیف ''مسئلہ قومیت'' میں مفصل بحث کی ہے۔ یہ تینوں حضرات معروف و مسلم علما و فضلا ہیں اور ان میں کسی کا بھی مطمح نظر خدا پرستی کے مقابلے میں زمین پرستی نہیں ہے۔ نیشن کے ساتھ ''اِزم'' جوڑ کر اُردو میں اس کا ترجمہ ''یت'' کے ساتھ کیا جائے یا ''پرستی'' کے ساتھ، مقصد کسی کا بھی پرستش نہیں، صرف اُلفت اور وابستگی ہے۔ لہٰذا لفظوں کے چکر سے نکل کر دیکھنا یہ چاہیے کہ نیشن کے تصور کا وہ کون سا پہلو ہے جس پر بحث ونزاع کا سارا زور پڑتا ہے اور اس معاملے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطہ نظر کیا ہے؟

نیشن یا وطن بحیثیت سیاسی تصور کے زمین کے علاوہ حسب ذیل عناصر پر مشتمل ہے:

(۱) نسل (۲) زبان (۳) عقیدہ (۴) تہذیب

غیر منقسم ہندستان کے باشندے فی الواقع ایک مخلوط نسل سے تعلق رکھتے تھے جو عمومی طور پر سب کے لیے یکساں تھی اور اس کی بنا پر اختلاف کی گنجایش گویا نہیں تھی، سوا اس کے کہ ہندوؤں نے اُونچی اور نیچی ذات کا ایک بالکل مصنوعی اور غیر انسانی تفرقہ کھڑا کر رکھا تھا۔ زبان کا جھگڑا غیر ملکی سامراج نے زبردستی انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا کیا، ورنہ اُردو پورے ملک کا مشترک عوامی ذریعہ اظہار بن چکی تھی اور اسی کو ہندوی، ہندی اور ریختہ یا ہندستانی کہا جاتا تھا، جس کا اصل رسم خط تو عربی وفارسی تھا مگر سنسکرت کی ملاوٹ کے ساتھ اس کا ایک نیا رسم خط دیوناگری بھی بنا لیا گیا تھا، اس کے باوجود ہندوستانی بہ خط فارسی وناگری پر ایک طرح کا قومی اجماع ہو گیا تھا، عقیدے کا اختلاف البتہ اہل ملک کے درمیان کل بھی پایا جاتا تھا اور آج بھی پایا جاتا ہے اور یہ محض ہندو مسلم ناموں کے دو فرقوں تک محدود نہیں بلکہ نہ صرف عیسائی، یہودی، پارسی اور سکھ فرقوں کے عقیدے مختلف ہیں، خود ہندو کہلانے والوں کے جتنے طبقات ہیں سب کے عقاید ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ تہذیب کا معاملہ یہ ہے کہ معاشرت کا فرق تو فرقوں اور طبقوں کے درمیان کل بھی تھا اور آج بھی ہے، مگر تمدن پورے ملک کا مغلوں کے وقت سے یکساں رہا ہے۔ تہذیب کا تعلق بلاشبہ اصلاً معاشرت سے ہے جسے انگریزی میں کلچر (Culture) کہتے ہیں، لیکن تمدن (Civilization) کے اثرات ونقوش بھی تہذیب پر مترتب ہوتے ہیں۔

اب نیشن یا قوم کا لفظ دو معنوں میں لیا جا سکتا ہے، ایک نظریاتی، دوسرے انتظامی! انتظامی معنے میں ایک ملک کے تمام باشندگان ایک حکومت کے تحت ایک قوم کے افراد بن جاتے ہیں۔ یہ گویا ایک جغرافیائی صورت ہے جس کے بارے میں کسی اختلاف کی ضرورت کبھی کسی کو محسوس نہیں ہوئی۔ حال آں کہ برطانوی سامراج کے عہد میں حکومت غیر ملکی تھی لیکن نظریاتی معنے میں جن حضرات نے ہندستان میں ایک سے زیادہ قوموں کی بات کی ان کے پیش نظر عقیدے اور تہذیب کا اختلاف خصوصی طور پر تھا۔ جب کہ مسلمانوں کے درمیان ایک قوم کا تصور رکھنے والے بھی عقیدے کا فرق تسلیم کرتے تھے۔ صرف تہذیب کے معاملے میں وہ معاشرت کے بجائے تمدن کو مدنظر رکھ کر یکسانی پر زور دیتے تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے

اپنے بعض غیر سنجیدہ لمحات میں معاشرتی فرق کا مذاق اُڑانے کے باوجود، ہندستانیوں کے اندر بہت سے اختلاف کو ''کثرت میں وحدت (Unity in diversity) کا نعرہ لگا کر تسلیم کر لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اختلاف کو صرف تنوع سمجھتے تھے جو کسی بھی اکائی کے مختلف پہلوؤں میں پایا جا سکتا ہے اور اس کی بنا پر ایک مجموعے کے عناصر ترکیبی میں فرق کے باوصف تفریق و تقسیم کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اس امر کا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ ہر عنصر اپنی ہستی کے تشخص اور اپنے مستقل کردار کے تحفظ پر اصرار کرے، خاص کر جب اس کو دیگر عنصر یا عناصر کی طرف سے جارحیت کا اندیشہ ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اوّل اوّل ''قوم'' کا لفظ بالکل غیر سیاسی معنوں میں استعمال کیا، جیسا کہ ان کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ماہنامے ''لسان الصدق'' کی اشاعت مئی ۱۹۰۴ء میں ''انجمن حمایت الاسلام - لاہور'' پر ایک تبصرے سے واضح ہے۔ مولانا انجمن کے کارکنوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے دلوں کو ''قومی ہمدردی اور حب الوطنی کے گراں بہا خزانے سے مالا مال'' بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''قوم کو ایسے ہی گمنام، غریب، معمولی مگر قومی محبت کے نشہ سے چور، حب الوطنی کے جذبات میں سرشار لوگوں کی ضرورت ہے''۔ انجمن حمایت اسلام مسلمانوں کا ایک ملی ادارہ تھا مگر مولانا کے خیال میں اس کے رکن حب الوطنی اور قومی محبت کے جذبات سے سرشار تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ایک اجتماعی خدمت انجام دے رہے تھے اور ان کے کاموں سے عوامی فلاح کے نتائج پیدا ہو رہے تھے۔ لہٰذا مولانا نے انھیں محبِ وطن اور ہم دردِ قوم قرار دیا لیکن ''لسان الصدق'' ہی کی اشاعت جنوری ۱۹۰۴ء میں مولانا ''نیشنل کانگریس'' کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انڈین نیشنل کانگریس میں اس وقت تک عمومی طور سے مسلمانوں کی عدم شمولیت کے مدنظر سوال اُٹھاتے ہیں:

''پھر اس کانگریس کو قومی کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟''

اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا لفظ ''نیشنل'' کے ترجمے لفظ ''قومی'' کے سیاسی مفہوم سے واقف تھے۔ اس کے باوجود وہ اس لفظ کا استعمال جب غیر سیاسی مفہوم میں بھی کرتے

تھے، جیسا انجمن حمایت اسلام پر تبصرے سے عیاں ہے تو اس صورتِ واقعہ سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۴ء تک مولانا آزاد کا تصورِ قومیت بالکل واضح اور معین نہیں ہوا تھا، گرچہ ان کے ذہن میں یہ خیال اس وقت بھی پرورش پا رہا تھا کہ قومی کہلانے کی مستحق وہی چیز ہوگی جس میں تمام فرقوں کی شمولیت ہو یا زیادہ صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ جس چیز میں تمام فرقوں کی شمولیت ہوگی وہ قومی کہلائے گی۔ (اقتباسات کے حوالے کے لیے دیکھیے:
(لسان الصدق کلکتہ (عکسی اشاعت): ۱۹۹۶ء (بین الدفتین)، کراچی، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اشاعت جنوری ۱۹۰۴ء، ص ۳،۴)

قومیت کا خیال کسی انداز سے ذہن کے کسی گوشے میں رکھنے کے باوجود ''الہلال'' کے دور تک مولانا ابوالکلام آزاد نظریاتی طور پر زبردست ملی و اسلامی تحریک کے علمبردار رہے۔ ایک سوال کے جواب میں وہ ''الہلال کے مقاصد اور پولیٹکل تعلیم'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیاوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا......''
>
> (الہلال: الہلال کی پولیٹکل تعلیم......۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۵)
>
> ''الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی،

سیاسی ہوں، خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے......" (ایضاً: ص ٦)

"پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالیٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقہ درس میں شریک ہو جایئے۔ صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط مستقیم ہے......" (ایضاً: ص ۷)

"قرآن نظامِ عالم کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استیلا واقتدار کی مخالفت کرے......پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انھیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصولِ مذہبی کی خاطر چین نہ لیں......"

"اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی کے حاصل کرنے، دونوں کی تعلیم دی ہے۔۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں......"

"ہمارا جوش اور ایجی ٹیشن قانون اور امن کے حدود کے اندر رہو گا، کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ فساد مت کرو......" (ایضاً: ص ۸)

یہ گویا ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مولانا ابوالکلام آزاد کا نہ صرف نظریاتی موقف بلکہ سیاسی منشور ہے، جس کے بنیادی نکات حسب ذیل ہیں؛

۱- دین اسلام ایک جامع اور مکمل نظامِ حیات ہے۔

۲- اس نظام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں۔

۳- اسلامی نظریہ سیاست مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے لیے کافی ہے۔

۴- اس نظریے کے تقاضے ہیں۔ (الف) آزادی (ب) جمہوریت (ج) پرامن جدوجہد۔

۵- اسلامی نظام آفاقی ہے۔

الہلال کے شمارہ مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۱۲ءمیں ''عید الفطر'' کے عنوان سے مضمون میں مولانا فرماتے ہیں:

''اسلام کی اخوتِ عمومی تمیز قوم و مرز بوم سے پاک ہے اور اس کا ایک ہی خدا اپنے ایک ہی آسمان کے نیچے تمام پیروانِ توحید کو ایک جسد واحد کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔'' (ص ۸)

لیکن مولانا آزاد کا اسلامی سیاسی شعور انھیں اسی دور میں ''مسلم لیگ'' کے طریق کار پر تنقید کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ ''مسلم یونیورسٹی'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل سطریں مولانا کے ذہنی رویے کا پتا دیتی ہیں:

''جو قوم چالیس برس تک محض حکومت کی بھیک اور دریوزہ گری پر زندگی بسر کرتی رہی ہو، جس نے ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے انکار کردیا، جس نے خود کبھی کچھ نہیں کیا مگر ہمیشہ کام کرنے والوں کی تضحیک وتحقیر کی اور طرح طرح کے باغیانہ خطابات سے اُنھیں یاد کیا، آج اسے کیا حق ہے کہ گورنمنٹ اس کی پروا کرے، کیوں نہ اس کو ذلیل و خوار بنایا جائے اور کیوں نہ اس کی اُمیدوں کو ذلت کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے؟ (مضامین ابوالکلام آزاد: حصہ دوم، مرتبہ منشی مشتاق، ص ۵۷)

آگے چل کر ''قوم کی اشخاص پر فتح'' کے عنوان سے مسلم لیگ کی بعض کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ارشاد کرتے ہیں:

''سیلف گورنمنٹ کی خواہش تو مسلمانوں کا قدرتی حق ہے جس کے سیکھنے کے لیے ان کو قرآن کے سوا اور کسی معلم کی ضرورت نہیں۔''

(ایضاً: ص ۸۴)

پہلے اقتباس میں ''قوم'' سے مراد ''ملت اسلامیہ'' ہے جسے دوسرے اقتباس میں اس کی سیاسی منزل بھی اسلام کے حوالے سے ہی ''سیلف گورنمنٹ'' بتائی جا رہی ہے اس کے بعد ''یالیت قومی یعلمون'' کے زیرِ عنوان مولانا ہندستانی مسلمانوں کو تعداد اور غیرتِ ملی کے

لحاظ سے ''خاندانِ اسلام کا سب سے بڑا گھرانا'' قرار دیتے ہوئے اعلان کرتے ہیں:

''جو مسلمان یورپ کی تجارت اور مصنوعات کو خریدتا اور استعمال کرتا ہے، وہ گویا دشمنانِ اسلام وتوحید کی کھلی اعانت کرتا ہے۔'' (ایضاً: ص ۹۳)

ساتھ ہی اپنے اعلان کی توصیف اس طرح کرتے ہیں:

''یہ کوئی ملکی اور سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک خالص دینی معاملہ ہے اور ہر مسلمان بشرطیکہ مسلمان ہو، اس کی تعمیل پر مجبور ہے۔'' (ص ۹۳)

مذکور بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا دینی وملی شعور ہی انھیں بتدریج سیاسی وقومی تحریک کی طرف لا رہا تھا۔ چناں چہ اسلام کے آفاقی تصورِ انسانیت کے تحت وہ ''خدمت عالم وخدمت وطن'' کو ایک دوسرے کے ساتھ فطری طور پر ہم آہنگ سمجھنے لگے:

''اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لیے محترم ہے تو وہ خاک تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترام محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں تو وہ انسان تو بہ درجہ اولیٰ ہمارے احترام اخوت کے مستحق ہیں جو اسی خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بہنے والے پانی کے پینے والے اور اسی کی فضاء محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔''

(مضامین مولانا ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، مرتبہ منشی مشتاق احمد، ص ۵۷)

یہ وہی تخیل ہے جو اقبالؔ کے ترانہ ہندی اور ترانہ ملی کے درمیان کسی تضاد کے بجائے تطبیق کی کلید فراہم کرتا ہے۔ مولانا آزاد نے ''اتحادِ اسلامی'' کا بین الملی نسخہ گویا اسی تخیل کے تحت تجویز کیا:

''درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن ومقام اور رنگ وزبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے۔ اس کو وہ کسی انسانی تفریق وتقسیم کی حد نہیں قرار دیتا اور انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی

رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس ونسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔''

(خطباتِ آزاد: مرتبہ مالک رام، دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۶)

مذکورِ بالا خطبے میں آگے چل کر مولانا نے پان اسلامزم کی تشریح وتائید کرتے ہوئے اسے ''نصف صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں'' کی وضع کی ہوئی اس متفقہ حکمت عملی کا سب سے موثر توڑ بتایا ہے جو ''مشرقی مسئلہ'' کے نام سے عالم اسلام میں انتشار برپا کر کے اسے تباہ کرنے کے لیے روبہ عمل لائی گئی تھی۔

پان اسلامزم کا تصور ہی فی الواقع ہندستان کی اس عظیم الشان تحریک خلافت کا محرک تھا جس نے بین المللی وحدت کے ساتھ ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد اور جنگ آزادی کی متحدہ قومی وعوامی جدوجہد کا صور پھونک دیا، ترکِ موالات یا عدم تعاون کا نعرہ بلند کیا اور بالآخر جنوبی ایشیا بالخصوص برصغیر سے برطانوی سامراج کا خاتمہ کر کے اہل ملک کے ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کا سامان کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس تحریک کے اہم ترین قائد، نظریہ ساز اور مجاہد تھے۔ یہ تحریک الہلال کے دور سے اب تک مولانا کی دس سالہ ملی وقومی سرگرمیوں کا نقطہ عروج تھا۔ مولانا کے سیاسی نقطہ نظر اور تصورِ قومیت کی بہترین عملی شکل اسی تحریک کی صورت میں رونما ہوئی۔ مجلس خلافت، آگرہ ۲۵/اگست ۱۹۲۱ء کا جو خطبہ صدارت مولانا نے ارشاد کیا اس کے حسب ذیل الفاظ فرقہ وارانہ سوال اور مذہب وسیاست کے مسئلے پر مولانا کے موقف کی موثر ترین ترجمانی کرتے ہیں:

''تحریک خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرایض انجام دینا چاہتے ہیں تو بحیثیت ہندستانی ہونے کے انھیں انجام دینا

چاہیے۔ یہ بھی ایک سچی حقیقت ہے مگر سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں......

میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان میں ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین فرایض انجام نہیں دے سکتے، جب تک وہ احکامِ اسلامیہ کے ماتحت ہندستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔ یہ اعتقاد قرآن مجید کی نص قطعی پر مبنی تھا۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے جو اگر ایک طرف ترکِ موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے۔"

(خطباتِ آزاد: ص ۴۷)

اس تاریخی بیان کے خاص نکات یہ ہیں:

۱- دیگر ممالک کی طرح ہندستان میں بھی مسلمانوں کو مسلمان ہی کی حیثیت سے ہر کام کرنا ہے۔

۲- مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے کہ اپنے وطن کے غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد و اتفاق رکھیں۔

۳- اہل ملک کا یہ فرقہ وارانہ اتحاد ہی انھیں ایک غیر ملکی سامراج کے خلاف ترکِ موالات کے قابل بناتا ہے۔

۴- سیاسی سطح پر اہلِ ہند کی قومی یکجہتی اور اس کے بل پر بیرونی اقتدار کے ساتھ مقابلے کی دعوت مولانا آزاد اپنے طور پر پچھلے دس سال سے دے رہے تھے۔

انھی نکات کی بنا پر مولانا آزاد زیر نظر خطبے کے شروع ہی میں "تحریک خلافت اور آزادی ہند کی تحریک" کا تذکرہ مشترکہ طور پر کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ خلافت ایک اسلامی اصول کا نام ہے، جو دراصل جمہوریت کی بہترین شکل ہے اور ہر قسم کی ملوکیت کے خلاف۔ اپنے وقت میں برطانوی سامراج ایک بدترین ملوکیت تھی جس سے ٹکر لینے کے لیے مسلم قایدین اور علمائے دین نے ایک سیاسی واقعے سے

متاثر ہو کر خلافت کی تحریک چلائی۔ غیر مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کی ہمدردی اور برطانوی حکومت کی مخالفت کے لیے تحریک خلافت میں شرکت کی اور اسے تحریک آزادی کا ایک معرکہ بنا دیا۔ اس طرح ملک میں نہ صرف مذہب و سیاست کی وہ یک جائی ہوئی جو مسلمانوں کو نظریاتی طور پر مطلوب تھی بلکہ وہ قومی یک جہتی بھی پیدا ہو گئی جو تحریک آزادی کی کامیابی کے لیے درکار تھی۔ چناں چہ قومی سیاست کا قوام ملک میں مشترک قومیت کے تصور سے تیار ہوا۔ اس قوام سے مولانا آزاد اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا وہ کام لینا چاہتے تھے جس کا تہیہ وہ میدانِ عمل میں قدم رکھتے ہوئے بیس سال قبل اپنی فکری زندگی کی بالکل ابتدا میں کر چکے تھے۔ لہٰذا لاہور میں ۱۸، ۲۱ر نومبر ۱۹۲۱ء کو اجلاس جمعیۃ العلماء ہند کا خطبہ صدارت ارشاد کرتے ہوئے وہ علماے دین کو یاد دلاتے ہیں:

> ''ہمارے کاندھوں پر اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی نیابت کا مقدس بوجھ ہے اور ہمارے سامنے حق کی شہادت اور اُمت مرحومہ کی احیا و تجدید کا عظیم الشان کام ہے۔'' (ایضاً: ص ۸۹)

آگے چل کر اس خطبے میں مولانا ''مسئلہ احیا و تجدید ملت'' کو جمعیۃ العلما کے قیام کی اصل وجہ بتاتے ہوئے ''اصلاحِ دینی کے مبادیات'' کی تشریح کرتے اور ان کی دعوت و تبلیغ کو ۱۹۱۲ء میں الہلال کی اشاعت کا مقصد قرار دیتے ہیں:

۱- اسلام کے نظم شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔

۲- مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔

۳- اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعت اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے۔

۴- مسلمانوں سے اہتداء و اتباعِ شریعت مہجور نہیں ہوا مگر علماے اسلام کی غفلت و اعراض سے۔ (خطباتِ آزاد: ص ۱۱۰-۱۱)

اب مولانا آزاد چاہتے ہیں کہ عصر حاضر میں علماے اسلام اپنا منصبی فریضہ ادا کریں اور ''افرادِ قوم کی شیرازہ بندی''، ''یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی'' کے بجاے، حیاتِ اجتماعی

کے لیے اسلام کے تجویز کیے ہوئے نظم کی بنیاد کریں (خطباتِ آزاد: ص ۱۲۷)۔ یہاں ایک بار پھر مولانا نے ''قوم'' کا لفظ ملت اسلامیہ کے لیے استعمال کیا ہے، جب کہ اس سے قبل وہ اصلاحِ دینی کے مبادیات بتاتے ہوئے ''مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم وعمل'' قرار دے چکے ہیں۔ اس کے بعد دلی میں ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس خصوصی سے خطاب کرتے ہوئے مولانا ترکوں کی فتح پر مبارک باد اِن لفظوں میں دیتے ہیں:

> ''انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے، نہ کوئی قومیت، اس کی قومیت اگر ہوسکتی ہے تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے۔''
>
> (خطباتِ آزاد: ص ۱۶۴)

لیکن آگے چل کر اس خطبے میں مولانا تحریک خلافت میں اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار پھر واضح کرتے ہیں کہ یہ خدمات ''نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے، بلکہ بحیثیت ہندستانی ہونے کے میرا قومی فرض ہے۔'' (ص ۱۷۱) اس تاریخی خطبے کے تقریباً آخر میں مولانا نے ''ہندو مسلم اتحاد'' پر وہ مشہور زمانہ بیان دیا کہ اس اتحاد کے بغیر اگر آزادی ملی، تو پورے ''عالم انسانیت کا نقصان'' (ص ۲۰۵) ہوگا جسے گوارا کرنے کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے ''ہندستان کی متحدہ قومیت'' (ص ۲۰۹) پر تاکیدی نشان لگاتے ہوئے، ہندستان کے تمام فرقوں اور جماعتوں کو مطمئن کر کے تحریک آزادی میں متحدہ طور پر شامل ہونے کا موقع دینے کے لیے ایک ''میثاقِ ملی'' کا ذکر کیا۔

متحدہ قومیت کا تذکرہ مولانا آزاد آل انڈیا خلافت کانفرنس، منعقدہ کانپور، ۱۹۲۵ء میں بھی کرتے ہیں، جب کہ اس کے بعد جمعیۃ تبلیغ اہل حدیث کو کلکتہ ستمبر ۱۹۳۴ء میں خطاب کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

> ''اسلام اور مسلمانوں کا حریف اگر کوئی بھی ہوسکتا ہے تو عیسائی مذہب اور عیسائی قوم ہے، دوسرا کوئی نہیں۔'' (خطبات آزاد: ص ۲۴۹)

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک مولانا آزاد نے قومیت کے تصور کی جو کچھ وضاحت کی وہ ایسے

وقت میں تھی جب ہندستان کی تحریک آزادی میں مسئلہ قومیت نے وہ رنگ پورے طور پر اختیار نہیں کیا تھا جس کے نتیجے میں بالآخر ملک تقسیم ہوگیا، گرچہ اس کے ابتدائی آثار تو تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے زمانے سے نمایاں ہونے لگے تھے اور اس سے بھی پہلے برطانوی سیاست اس کی تخم کاری انیسویں صدی کے اواخر میں کر چکی تھی۔ ۱۹۳۴ء تک مولانا نے اس مسئلے پر جو کچھ اظہارِ خیال کیا اس کا ماحصل یہ تھا:

۱- ملت اسلامیہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور اس کی تنظیم و ترقی ہمیشہ اس کے اپنے اصولوں کی بنیاد پر ہوگی۔

۲- لیکن اس تنظیم و ترقی کو فروغ اسی وقت ہوگا جب ملک آزاد ہو جائے۔

۳- ملک کی آزادی کے لیے فرقہ وارانہ اتحاد اور متحدہ تحریک ضروری ہے۔

۴- یہ تحریک سیاسی میدان میں ایک متحدہ قومیت کی بنیاد پر ہی چلائی جا سکتی اور کامیاب ہو سکتی ہے۔

۵- ایک آفاقی ملت ہونے کے اعتبار سے ملت اسلامیہ کے عالمی مفاد کا تقاضا ہے کہ وہ ہر حال میں ہندستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کرانے کی مؤثر جدوجہد کرے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد ہندستان میں مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا پیغام لے کر اُٹھے۔ اس کے بعد انھیں تحریک آزادی میں شرکت کرتے ہی قومیت کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا جو آہستہ آہستہ اُبھر کر پورے ملک کی فضا میں ایک ایسا انتشار پیدا کرنے لگا تھا جسے دور کیے بغیر نہ ملت کی صلاح و فلاح کا سامان نظر آتا تھا نہ ملک کو آزادی و ترقی نصیب ہونے کی توقع تھی۔ مغربی تصورِ جمہوریت نے عقیدے کے لحاظ سے آبادی کو اکثریت و اقلیت میں تقسیم کر کے قومیت کے مسئلے کی پیچیدگی بہت بڑھا دی تھی، خاص کر اقلیت کے دل میں اکثریت کی جانب سے شبہات پیدا کر دیے تھے اور اکثریت میں بھی ایسے عناصر نمایاں ہونے لگے تھے جو ان شبہات کو اپنی بعض سرگرمیوں سے تقویت دے رہے تھے، یہاں تک کہ تعداد کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے سبب مسلمانوں پر اکثریت کے بعض حلقوں کے خیالات و اقدامات کا ردِ عمل ہونے لگا، نتیجتاً فرقوں

کے درمیان اعتماد کا ایک بحران پیدا ہوا اور مسلمان اپنے ملی وجود کے تشخص و استقلال کے طلب گار ہوئے۔ چناں چہ آزادی کی راہ میں ایک مشکل فرقہ وارانہ مسئلہ چٹان بن کر کھڑا ہو گیا۔

یہی وہ صورتِ حال تھی جس میں مولانا آزاد کو انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ، مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنے سیاسی مؤقف اور تصورِ قومیت کی وضاحت ان ولولہ انگیز الفاظ میں کرنی پڑی:

> ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔''

(خطاباتِ آزاد: ص ۹۸-۲۹۷)

اس اصولی وضاحت کے بعد مولانا نے ہندستان کو اسلام کی دین ''جمہوریت اور انسانی

مساوات'' وغیرہ کا سراغ لگاتے ہوئے ملکی سیاست میں اُبھرے ہوئے فرقہ وارانہ سوال کا یہ قطعی جواب دیا:

''ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔'' (خطبات آزاد: ص ۳۰۰)

ان بیانات میں قومیت کو ایک قدرتی چیز، ایک ثابت شدہ واقعہ قرار دیا گیا ہے جو اپنے وقوع کے لیے کسی جماعت کی سیاست اور کسی ادارے کی قانون سازی کا محتاج نہیں۔ اس میں نظریاتی قوم پرستی Nationalism کا کوئی شائبہ نہیں، ایک فطری قومیت Nationality کا اعلان ہے جو ایک جغرافیائی و تاریخی حقیقت ہے اور انتظامی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی قومیت ملک کے تمام باشندگان کے درمیان مشترک ہے، خواہ ان کے عقاید و اطوار کتنے ہی مختلف ہوں اور اسی متحدہ قومیت کی ضرورت تقسیم ہند سے قبل تحریک آزادی کی قومی سیاست کو تھی جس کی علمبردار اس وقت مولانا آزاد کے زیر صدارت آل انڈیا کانگریس کمیٹی تھی۔

اس متحدہ قومیت کے عناصر و عوامل یکساں اور مساوی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں تھے، خواہ مذہب اور کلچرل کے لحاظ سے ان کے درمیان جو فرق و اختلاف ہو اور وہ اپنے اپنے روایتی ورثے پر الگ الگ جتنا فخر بھی کریں وہ جس طرح چاہیں پوری آزادی، بے خوفی، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اس ورثے کے تحفظ و ترقی کی زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کوشش کریں۔ اس سلسلے میں اسلام پر قایم رہتے ہوئے جہاں تک مسلمانوں کی وطن دوستی اور قوم پروری کا تعلق ہے، مولانا آزاد کے بہ قول ''اسلام کی روح'' خود اس راہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہے اور

ملک کی فلاح وترقی کی جدوجہد میں ''اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب'' سدراہ نہیں ہوتی، بلکہ ممد ومعاون ہوتی ہے، اس لیے کہ ایک خاص ملک میں اس تعلیم، اس تاریخ، ان علوم وفنون اور اس تہذیب کا فروغ بھی اسی وقت ممکن ہے جب ملت اسلامیہ کے افراد اہل ملک کے ساتھ مل کر اپنے قدرتی وطن کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں ہوں۔

ہندستان کی آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد کے اندر مسلمانانِ دلی کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے یاد دلایا:

''ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دوقوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔''

(خطباتِ آزاد: ص ۳۳۸)

دوقومی نظریے کو حیاتِ معنوی کے لیے مہلک بتانے کے بعد مولانا آزاد کی پوری توجہ دنیا میں قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی ہلاکت کی طرف مبذول ہوگئی۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے ارشاد کیا:

''اقوام کی ترقی کے راستے میں تنگ نظری ایک سنگ گراں کا حکم رکھتی ہے...... سیاست میں یہ روگ قومیت کا چولا پہن کر آتا ہے۔ علم وفضل اور تہذیب وثقافت کی اقلیم میں یہ خرابی قومیت اور وطنیت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔'' (آزاد کی تقریریں: مرتبہ انور عارف، نیو تاج آفس دہلی، ص ۱۸)

یہ نہ صرف تقسیم ہند کی لکیر کے دونوں طرف نوزائیدہ سیاسی قوموں کی جارحانہ قوم پرستی کی تباہ کاریوں پر مولانا آزاد کا ردِ عمل اور تبصرہ ہے، بلکہ اسی سیاق وسباق میں آگے چل کر وہ عصر حاضر کی نظریاتی قوم پرستی کا ایک تاریخی تجزیہ کر کے اہل ملک کو آفاقیت کا پیغام دیتے ہیں:

''یہ بھی واضح ہے کہ انیسویں صدی کے یورپ میں جس قومیت کے چرچے تھے اس کے تارو پود بکھر چکے ہیں اور آج دنیا میں قومیت کی قبا کسی کے جسم پر بھی چست وراست نہیں آتی۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ قیود جلد از جلد اُٹھا دی جائیں۔ آج دنیا قومیت کی نہیں بلکہ فوق

القومیت کی طالب ہے۔ عصر حاضر میں تنگ نظری کے لیے مطلق گنجایش نہیں ہے۔ اقوامِ عالم کی صف میں اگر ہم کوئی ممتاز مقام چاہتے ہیں تو اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے جب ہم نظریاتی اعتبار سے بین الاقوامی نقطہ نظر کے حامل ہو جائیں۔''

(آزاد کی تقریریں: مرتبہ انور عارف، نیو تاج آفس دہلی، ص ۱۸۱)

اس کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی یادگار کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا نے نئی دلی میں اہل ملک کو خبردار کیا:

''یہی حال قومی حد بندی کا ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی لتعارفوا ہے، یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حد بندی جو ایک ذریعہ پہچان تھی، جب اپنی حدوں سے گزر جاتی ہے تو دنیا میں بڑی خوں ریزیاں اسی قومی حرص وطمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔'' (خطبات آزاد: ص ۳۴۶)

یہاں اشارہ بیسویں صدی کی قوم پرستانہ عالمی جنگوں کی طرف بھی ہے۔ چناں چہ یونسکو اور بین الاقوامیت پر ۲۴/ مارچ ۱۹۵۱ء کو نئی دہلی میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''اگر ہمارے پیش نظر عالمی اتحاد کا حصول ہے اور اس چیز پر سب متفق ہیں کہ ایسے اتحاد کے بغیر انسان کا مستقبل تاریک رہتا ہے تو ہماری تمام تر کوششیں آفاقی شہریت کی خاطر نئی پود کی تعلیم و تربیت پر مرکوز ہونی چاہئیں۔'' (آزاد کی تقریریں: ص ۲۱۸)

اس سلسلے میں تمام بنی آدم کو بہ اعتبار تخلیق ایک جوہر سے متعلق اور کائنات کے تمام افراد کو ایک دوسرے کا گوشت پوست قرار دیتے ہوئے مولانا نتیجہ نکالتے ہیں:

''انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور حریت۔ پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ اس کے

اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین واعتماد کے باوجود جب تک قومیت کی قیود سے آزاد اور اس کی سطح سے بلند و بالا نہیں ہوں گے انسان کا مستقبل تاریک رہے گا۔'' (آزاد کی تقریریں: ص۲۲۲)

مولانا آزاد یونیسکو کا سب سے بڑا کارنامہ ''انسان کے بنیادی حقوق کا ایک نیا اور عالمگیر اعلان'' بتاتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے جون ۱۹۵۱ء میں یونسکو کے اجلاس پیرس میں یونسکو کے نصب العین پر بولتے ہوئے کہی۔ اس کے بعد ۵ نومبر ۱۹۵۶ء کو یونسکو کی جنرل کانفرنس کے نویں اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے بین الاقوامی کشیدگی کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ امن عالم کے لیے بقائے باہمی کا یہ نسخہ تجویز کیا:

''ہر شخص اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ تمام اقوام کو حق خود اختیاری حاصل ہے۔ اب نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر ملک کو اپنے ہی طرز کی سوسایٹی اور حکومت پسند کرنے کا حق بھی حاصل ہے اور اس معاملے میں کسی دوسرے ملک کو اپنا حکم جتانے کا حق نہیں ہے۔''

(آزاد کی تقریریں: ص۲۷۲)

یہ آفاقی تصورِ انسانیت کی وہ وسیع النظری اور رواداری ہے جس پر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لعل نہرو بھی مولانا آزاد سے اتفاق کرتے تھے۔ یہ آفاقیت مولانا آزاد کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اوّل روز سے ایک نصب العین کے طور پر اسے اپنی تمام سرگرمیوں کا نشانہ بنایا تھا، اس لیے کہ جس اسلامی نظریے کا پیغام وہ دنیا کو دینا چاہتے تھے۔ اس کا کلمہ اسی آفاقیت پر مبنی تھا۔ وہ ایک خدا، ایک انسان کے قایل تھے۔ اس معاملے میں اصولاً ان کے اور اقبالؔ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ تحریک آزادی کے دوران مسئلہ قومیت پر بعض جہتوں سے دونوں کی رایوں میں اختلاف ہوا، جو دراصل سیاست وقت کے متعلق دونوں کے اندازوں میں فرق پر مبنی تھا۔ نظریاتی قوم پرستی نہ اقبال کا مقصود تھا نہ آزاد کا، لیکن آزاد سیاسی قومیت پر زور دیتے تھے، جب کہ اقبالؔ بہ یک وقت بین الملیت اور بین الاقوامیت دونوں پر تاکیدی نشان لگاتے تھے۔ اسی جہت سے اقبال نے ملک کے شمال مغربی خطے میں خصوصیت

کے ساتھ مسلمانوں کے ملی استقلال کی تجویز پیش کی، جب کہ آزاد نے مسلم آبادی کے علاقوں کی صوبائی خودمختاری کو کافی سمجھا۔ درحقیقت یہ ملک کی آزادی میں حائل ہونے والے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تھا جو اقبال اور آزاد نے اپنی اپنی صواب دید کے مطابق پیش کیا۔ تقسیم ہند اور آزادی کے بعد یہ مسئلہ اصولی طور پر اپنے آپ تحلیل ہو گیا اور دونوں ملکوں میں انتظامی قومیت کا قانون نافذ ہو گیا۔ جہاں تک فرقہ وارانہ اتحاد کا تعلق ہے، اقبال اور آزاد دونوں ہی اس کے مبلغ تھے لیکن آزادی ہند کے بعد ظاہر ہے کہ تبلیغ کا رُخ بدل گیا۔

اس صورتِ واقعہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں عالمی سیاست کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل ملک اور پوری دنیا کو بین الاقوامیت کی تلقین کریں تاکہ جارحانہ قوم پرستی ماضی قریب کی طرح آئندہ بھی انسانیت کے لیے ایک لعنت نہ بن جائے اور بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے بعد تیسری کسی جنگ کا سدباب ہو، بنی آدم کو باہمی کشمکش اور غارت گری سے نجات ملے، بقائے باہم کے اصول پر پایدار امن قایم ہو اور تعمیر و ترقی کے منصوبے روبہ عمل آسکیں۔

اس طرح واضح ہے کہ مولانا آزاد کا تصورِ قومیت بہ یک وقت وطن دوستی اور انسان دوستی سے مرکب ہے۔ چناں چہ وہ ہندستانی قوم کی آزادی، اصلاح اور ترقی پر سارا زور اسی لیے دیتے تھے کہ اپنی بود و باش کے مخصوص خطے میں اپنے خاص انداز سے وہ پوری انسانیت کی خدمت کرنی چاہتے تھے اور بہت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ موجودہ بین الاقوامی دور میں ایک آفاقی نقطہ نظر کے بغیر نہ تو دنیا کے کسی گوشے میں امن قائم ہو سکتا ہے نہ وہاں کے باشندوں کی صلاح و فلاح کے لیے کوئی مفید کام ہو سکتا ہے۔ اصلی طور پر مولانا آزاد اپنے اسلامی نظریہ حیات کے تحت تمام مخلوقات کو اللہ کا کنبہ تصور کرتے تھے اور عملی طور پر ہندستان میں یہاں کے تمام فرقوں اور طبقوں کو متحد کر کے حریت، مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ان کی سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی بہبود کے لیے کوشاں تھے۔ مولانا آزاد کا یہ موقف جدید ہندستان کے بہترین مفادات کا تحفظ اسی طرح کرتا ہے جس طرح عصر حاضر کے عالم انسانیت کے بلند ترین مقاصد کا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور متحدہ قومیت

پروفیسر شان محمد

مولانا آزاد کی پیدائش ایک مذہبی گرانے میں ہوئی تھی۔ والد محترم کو پیری مریدی کے سوا کسی دوسری چیز سے سروکار نہ تھا۔ آزاد نے پوری تعلیم اسی ماحول میں حاصل کی۔ ان کی رسم بسم اللہ حرم شریف میں ہوئی اور جلد ہی وہ دینی تعلیم سے فارغ ہو گئے لیکن سر سیّد احمد خاں کے زیر اثر انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریزی تعلیم سے نابلد رہنا ان کے لیے بہتر نہ ہوگا اس لیے پرائیویٹ طور سے انگریزی پڑھی تا کہ اخبارات پڑھنے اور بین الاقوامی معاملات سمجھنے میں آسانی ہو اور یہی وجہ تھی کہ ان کے کتب خانے میں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کی بہت عمدہ کتابیں تھیں۔ مولانا نے یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا دورہ بھی کیا تھا اور ان ممالک کے سیاسی نشیب و فراز ان کی نگاہ میں تھے اور وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ دنیا کے سیاسی نشیب و فراز میں انگریزی سیاست بری طرح ملوث تھی۔ ایک مذہبی خاندان میں پرورش پانے کے بعد بھی مولانا نے ہندو مسلمان کو ایک قوم سمجھا جس کے اتحاد کے لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ [1] ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی پیداوار برٹش ڈپلومیسی کا ایک کرشمہ ہے اس لیے وہ برطانوی سامراج کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس میں کامیابی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک کہ ہندو اور مسلمان ایک نہ ہو جائیں اور اس خلیج کو پاٹ نہ دیا جائے جس کو برطانوی گورنمنٹ نے زیادہ وسیع کر دیا تھا اور جس کی بنیادیں دن بدن مضبوط کی جا رہی تھیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد۔ شخصیت اور کارنامے: مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۹

لفظ قوم (Nation) کے معنی انگریزی زبان میں اس جماعت یا گروہ کے ہیں جو ایک مذہب رکھتے ہوں۔ ایک زبان بولتے ہوں ہوں، ایک خطہ زمین پر بستے ہوں، جن کے رسم و رواج ایک ہوں۔ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہوں اور جن کا ایک کلچر اور تہذیب ہو۔ مولانا نے قوم کی یہ تعریف تسلیم نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان دو فرقے ہیں اور ان ہی کو ملا کر ہندستانی قوم کی تشکیل ہوئی ہے۔ ہندو یا مسلمان ہونا انسان کا ذاتی فعل ہے اور اس کا یہ فعل متحدہ قومیت کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرسکتا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب انسان کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے الگ نہیں کرتا اور مذہب ذات باری تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ مذہب کی بنا پر قومیت کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ مذہب ان تمام چیزوں سے بلند ہے۔

اپنے صدارتی خطبہ ۱۹۴۰ء میں مولانا نے بہت صاف صاف اپنے موقف کو دہرایا اور کہا:

> ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دایرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری راہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا

ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا"۔(۱)

ہندستان کی سرزمین نے درجنوں قوموں کو اپنی آغوش میں جگہ دی جو وسط ایشیا سے آ کر یہاں بس گئیں۔ مسلمان سب سے اخیر میں اس سرزمین میں داخل ہوئے اور انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا لیکن ان کی زبانیں مختلف، شاعری اور ادب مختلف، لباس اور رسم و رواج مختلف تھے لیکن وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور ہر شعبہ زندگی میں ان اثرات کی بنا پر ایک مشترک زندگی عمل میں آنے لگی۔ مولانا نے تاریخ کے اس اہم پہلو پر بھی اپنے صدارتی خطبہ میں روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو اور مسلمان گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے، لیکن قدرت کی یہ منشا تھی کہ یہ دونوں ایک ہوں اس لیے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے قدیم ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ اب نہ ہندو کو مسلمان پر اور نہ مسلمان کو ہندو پر برتری حاصل تھی۔ جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ ہندستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے اسی طرح مسلمان بھی اس فخر کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ ہندستانی ہے اور اسلام کا پیرو ہے۔ (۲)

ایسے مسلمان اور ہندوؤں کو جو متحدہ قومیت کے خلاف تھے خبر دار کرتے ہوئے آزاد نے کہا کہ اگر وہ اپنی ایک ہزار برس پرانی تہذیب کو پھر لانا چاہتے ہیں تو یہ ایک خواب سے زیادہ اور کچھ نہیں جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا کیوں کہ ہندستانی ایک قوم بن چکے ہیں جن کے علاحدہ ہونے کا اب کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مولانا نے کہا کہ اسلام اور نیشنلزم اور وطنیت ایک ہی چیز ہیں۔ اسلام اپنے وطن کی آزادی کے لیے قربانی دینے کو منع نہیں کرتا اور نہ یہ کہتا ہے کہ اپنے وطن سے محبت نہ رکھی جائے۔ انھوں نے بار بار دہرایا کہ "مسلمان ہندستان میں رہتے ہیں۔

۱- خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس تریپنواں اجلاس، رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء ص ۳۶

۲- خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس ۱۹۴۰ء، ص ۳۸

ہندستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے۔'' انھوں نے ہمیشہ نصیحت کی کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دیں۔ (۱) یہ وہ احساس تھا جس کی تشکیل کے لیے آزاد اوائل عمر سے ہی کوشش کرتے رہے۔ وہ ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جب کہ برطانیہ نے ہندوستان کو غلام بنالیا تھا لیکن محکوم کسی طرح بھی حاکم کے سامنے سرنگوں کرنے کو تیار نہ تھا اور آزاد جیسے غیرت مند اور آزاد فکر منش کے لیے اس ماحول میں سانس لینا کسی طرح ممکن نہ تھا اس لیے وہ سیاسی میدان میں کود پڑے ور آزادی کی جدوجہد میں صف اوّل میں جا کھڑے ہوئے۔ اس میدان کارزار میں ان کا آلہ صحافت تھی۔ برطانوی سیاست کا عکس سب سے پہلے تقسیم بنگال میں نمودار ہوا۔ ''لڑاؤ اور راج کرو'' کی پالیسی کا مظاہرہ اس سے بڑھ کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے تو برطانیہ سرکار نے ایک فرقے کو دوسرے کے خلاف استعمال کر کے اپنی حکومت کو مستحکم کیا اور اس کے بعد یورپ کی دوسری قوموں کو ٹرکی کے خلاف طرابلس اور بلقان کی خونریز جنگوں میں ٹرکی کی وسیع حکومت کو یورپ ہی سے ختم کروا دیا جہاں جو داؤ لگا وہ لگایا اور ہر قیمت پر برٹش سامراجیت کو بلند رکھا۔ (۲) یہ سب چیزیں مولانا کے سامنے تھیں۔ مشرق وسطیٰ کے دورے اور انقلابیوں کی صحبت نے مولانا کو ایک مضبوط سپاہی بنا دیا تھا۔ چنانچہ اپنے دورے کی واپسی پر آپ نے ہفتہ وار اخبار ۱۹۱۲ء میں الہلال کے نام سے جاری کیا جس نے ہندستانی قوم کو خواب غفلت سے جھنجھوڑ دیا۔

سیاسی مقصد کے ساتھ ساتھ الہلال کی اشاعت کا ایک مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا تھا۔ مولانا نے اس پر خود کافی روشنی ڈالی اور ۱۹۲۱ء میں آگرے کی مجلس خلافت میں خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

''الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا۔

۱- ڈاکٹر کامل قریشی۔ ہمارے زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت ص ۴-۲۰۳، مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ خلیق انجم۔

Parliamentary Debates: House of Commons, CC124-November 10,1913. See also Hardinge papers, November 1910 - March 1913, Viscount Errington to Hardinge, dated October, 11,1912.

کیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا...... ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔"(۱)

الہلال ہی کی کوششوں سے مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو علی گڑھ اسکول کی پالیٹکس سے بیزار رہنے لگا اور لیگ کے اندر خود دو اسکول پیدا ہو گئے۔ لیگ کے دستور میں تبدیلی کی گئی اور سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارتی تقریر جو انھوں نے آل انڈیا لیگ کے سالانہ جلسے ۱۹۱۳ء آگرے میں کی سن کر آزاد کو بہت تعجب ہوا اور انھوں نے کہا کہ مسلم لیگ کے وجود سے اب تک انھوں نے اتنی زبردست تقریر نہیں سنی جو ہندستانی نیشنلزم سے اس قدر بھرپور ہو۔ (۲)

جنگ طرابلس اور جنگ بلقان سے مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ خفیہ جماعتیں بننے لگیں اور عبیداللہ سندھی، حکیم اجمل خاں، حسرت موہانی اور علی برادران کے ساتھ مولانا آزاد کا نام بھی باغیوں میں شمار ہونے لگا۔ ترکی کی شکست کے بعد برطانیہ پھر "لڑاؤ اور راج کرو" کی پالیسی پر گامزن ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء کے بلوے وفساد گورنمنٹ کے ہی دماغ کی تخلیق تھی اور یہ پالیسی نئی نہ تھی۔ مئی ۱۸۲۱ء کے ایشیاٹک جرنل Asiatic Journal میں ایک ملٹری آفیسر نے کارنے ٹیکس Carnaticus کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں صاف طور سے کہا گیا تھا کہ ہندستان کے انتظامیہ میں چاہے وہ سیاسی ہو یا سول ہو یا ملٹری ہمیں دونوں قوموں کے درمیان تفرقہ پیدا کر کے حکومت کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلنبرا Lord Ellenborough نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا اور کارنے ٹیکس Carnaticus کے خیاں کی تائید کی۔ ۱۸۵۸ء میں لارڈ الفنسٹن Lord Elphinstone نے بھی جو بمبئی کا گورنر تھا لکھا کہ قوموں میں تفریق پیدا کر کے حکومت کرو اور یہی ہماری کامیابی

۱- خطبات آزاد، ص ۵۰-۵۱

۲- دی ٹریبون The Tribune جنوری ۱۹۱۲ء۔

کا راستہ ہے۔[1] بیسویں صدی میں کرزن نے بھی یہی پالیسی اختیار کی اور بنگال کا بٹوارا کیا۔ لارڈ مارلے اور منٹو کے ریفارم میں بھی جس میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات Separate Electorate منظور کیے گئے تھے اسی پالیسی کا ایک کرشمہ تھا لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بھی ہندو اور مسلمان متحد رہے۔ برطانیہ حکومت کو سب سے زیادہ فکر ہندو مسلم اتحاد کی تھی اور جب کبھی یہ دونوں قومیں شیر وشکر کی طرح مل جاتی تھیں تو لندن کے سیاسی حلقوں میں بڑی تشویش ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جنگ طرابلس اور بلقان کے موقعے پر جب یہ دونوں قومیں ایک ہو گئیں تو برطانیہ گورنمنٹ کو بہت فکر ہوئی۔ وزارتِ داخلہ کے خفیہ ریکارڈ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ گورنمنٹ کو اس سے زیادہ پریشان کن مسئلہ اور کوئی بھی نہ تھا۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ افسران سی آئی ڈی محکمے کو یہی لکھتے رہے کہ "گائے پر نظر رکھو" کہ یہ کدھر جاتی ہے تاکہ بلوہ فساد میں مدد ملے۔[۲]

برطانیہ کی پالیسی کامیاب ہوئی اور ۱۹۲۲ء میں بڑے پیمانے پر ہندستان میں بلوہ وفساد ہوئے۔ شدھی سنگھٹن اور تبلیغ وتنظیم کی تحریکیں دونوں طرف سے شروع ہوئیں اور ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ مولانا آزاد کی مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا مخصوص اجلاس بلایا گیا جس کی صدارت مولانا نے کی اور جنھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں سنگھٹن اور تنظیم تحریکوں پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ ملک کو صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ انڈین نیشنل کانگریس ہے۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ذرا ذرا سے مقامی مسئلوں کو ہوا نہ دیں۔ انگریزوں سے لڑنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد ضروری تھا اور مولانا اس کی خاطر سب کچھ نثار کرنے کو تیار تھے۔ ۱۹۲۳ء کے صدارتی خطبے میں مولانا نے یہ بھی کہا کہ:

1- A History of Hindu-Muslim problem in India- Being the Report of the Committe appointed by Indian National Congresses, Karachi session 1931, to inguire Kanpur riots of March 1931, pp.119-120.

۲- ہارڈنگ پیپر، سر بٹلر کا خط بنام ڈوبولے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۱۰ء

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیو۔ کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔"(۱)

وقتی طور سے فرقہ وارانہ فساد میں کمی تو آ گئی مگر دل صاف نہ ہوئے اس لیے شملہ میں پھر ایک کانفرنس ہوئی جس میں مولانا آزاد نے بھی شرکت کی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں میں تنازعہ دور ہو لیکن مولانا کی زبردست کوششوں کے باوجود بھی دونوں فرقے الگ الگ دھاروں میں بہنے لگے اور متحدہ قومیت کے بجائے دو قومی نظریہ وجود میں آنے لگا۔ کانگریس قومی یکجہتی اور ایک قومی نظریے کو مانتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان وطنی اور تہذیبی اعتبار سے ایک قوم ہیں اور دونوں کو مل کر ہندستان کو آزاد کرانے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن لیگ کا دعویٰ اس کے برعکس تھا۔ وہ کلچر زبان اور مذہب کی بنا پر ہندو اور مسلمانوں کو دو قوم تصور کرتی تھی اور اس کی نگاہ میں ملک کی تقسیم ضروری تھی(۲) لیکن مولانا آزاد متحدہ قومیت پر ڈٹے رہے۔ وہ اس نظریے کے حامی تھے کہ ہندو اور مسلم دونوں مل کر پہلے انگریزوں کو نکالیں اور جب ملک کو آزادی مل جائے تو ایک کنبے کے فرد کی حیثیت سے بیٹھ کر دونوں اپنے اپنے معاملات طے کر لیں۔ وہ یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ لیگ اور کانگریس دو الگ الگ سیاسی جماعتیں ہوں بلکہ اگر یہ دونوں ایک ہو جائیں تو یہ ملک اور مسلمانوں دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد کانگریس نے یوپی میں وزارت بنانے پر آمادگی ظاہر کی تو مولانا آزاد پنڈت گوبند ولبھ پنتھ کے ہمراہ چودھری خلیق الزماں کے پاس گئے اور ہر طرح لیگ اور کانگریس میں مفاہمت کرانے کی کوشش کی مگر ناکامیاب

۱- خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء

۲- انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے تمام اجلاس اپنی اپنی جگہ پر اپنے موقف کی وضاحت کرتے رہے۔

رہے [1] اور جناح نے تو اپنے ایک خط میں مولانا کو یہاں تک تحریر کیا کہ آپ دکھاوٹی مسلمان ہیں جس کو کانگریس نے صرف اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ کانگریس مسلمانوں کی بھی رہنمائی کرتی ہے اور اگر آپ میں ذرا بھی غیرت ہے تو کانگریس کو چھوڑ دیجیے جو صرف ہندوؤں کی ایک جماعت ہے [2] لیکن اتنا سخت خط بھی مولانا کے سیاسی نظریات کو تبدیل نہ کر سکا اور وہ متحدہ قومیت کے نظریے پر جمے رہے۔ اسی کے فوراً بعد لیگ نے اپنے اجلاس لاہور ۱۹۴۰ء میں دو قومی نظریہ پیش کیا اور پاکستان کی مانگ اُٹھائی۔ [3] ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان کرپس مشن آیا۔ پھر شملہ میں کانفرنسیں ہوئیں اور ویول پلان تیار ہوا اور اخیر میں کیبنٹ مشن آیا لیکن مولانا جناح کی زبردست مخالفت کے باوجود بھی متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کرتے رہے۔

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ملک کی تقسیم کسی طرح بھی مسلمانوں کے لیے فایدہ مند ثابت نہ ہوگی۔ اگر ملک کا بٹوارا ہو گیا تو ایک حصہ مسلم اکثریت کا ہوگا اور دوسرا ہندو اکثریت کا۔ ہندو اکثریت کے بیچ مسلمان ایک کمزور طاقت بن کر رہ جائیں گے جو صرف ان کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ان کے تعلیمی اور ثقافتی مراکز کمزور ہو جائیں گے جن کو انھوں نے ہزاروں سال کی محنت کے بعد سینچا ہے۔ قیام پاکستان پاکستانی مسلمانوں کے مسائل کو تو حل کر دے گا لیکن وہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کو اور بڑھا دے گا جو یہاں صرف اقلیت بن کر خاموش ہو جائیں گے لیکن لیگ اس کے برعکس سوچتی تھی، اس کا خیال تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں کانگریس مسلم اکثریتی صوبوں میں برابر مداخلت کرتی رہے گی اور متحدہ ہندستان میں مسلمانوں کو پنپنے کا موقع نہ ملے گا۔ مولانا چوں کہ کانگریس کے صدر تھے اس لیے وہ لیگ کے لیے ہر وہ آسانی پیدا کرتے رہے جہاں اس کو خطرہ نظر آتا تھا۔ کانگریس نے لیگ کا مندرجہ بالا اعتراض دور کرنے کے لیے صوبوں کو پوری خودمختاری دینے کا منصوبہ تیار کیا اور دیگر اختیارات

۱- چودھری خلیق الزماں، پاتھ وے ٹو پاکستان، ص ۱۶۱۔

۲- جناح کا خط بنام آزاد، بمبئی جولائی ۱۲، ۱۹۴۰ء۔

۳- شریف الدین پیرزادہ، فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوئم، ص ۴۰-۳۲۷۔

(Residuary Powers) بھی صوبوں کو دینے کا فیصلہ کیا تا کہ مسلم اکثریتی صوبے کانگریس کی مداخلت کے بعد بھی پھل پھول سکیں لیکن لیگ کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ کیبنٹ مشن تقسیم ہند کی تجویز جو لیگ پیش کر رہی تھی ماننے کو تیار نہ تھا لیکن جو تجویز مولانا نے پیش کی تھی مشن اس پر رضامند تھا لیکن لیگ اپنی ہٹ دھرمی پر تلی ہوئی تھی۔ [۱]

سمجھوتا نہ ہونے پر شری راج گوپال آچاریہ نے ایک تجویز پیش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس بٹوارے کو مان لے لیکن اس کا اثر اچھا نہ ہوا۔ کانگریس کے باخبر حلقوں نے راج گوپال آچاریہ پر کڑی نکتہ چینی کی اور ان کو کانگریس ورکنگ کمیٹی سے الگ ہونا پڑا سخت بحث و مباحثے کے بعد کیبنٹ مشن نے ایک پلان تیار کیا جس کی رو سے صرف تین شعبے یعنی رسل و رسائل۔ امور خارجہ اور دفاع مرکز کو دیے گئے اور بقیہ شعبے صوبوں کے ساتھ رکھے گئے۔ اس کے علاوہ مشن نے ملک کو اے بی اور سی تین حصوں میں بانٹ دیا تا کہ مسلم اقلیتیں اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں اور لیگ کا ڈر دور ہو جائے۔ ان تمام معاملات میں مولانا آگے آگے تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح لیگ کی غلط فہمی دور ہو جائے گی اور وہ اقلیتوں کو محفوظ سمجھے گی۔ مشن نے لیگ کی مانگ ''تقسیم ہند'' کو نامنظور کر دیا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ پاکستان ایک مضبوط ریاست نہ بن سکے گا۔ مجبوراً مسٹر جناح نے مشن کے پلان کو مان لیا اور مشن کی کامیابی کے ساتھ ساتھ یہ مولانا کی بھی فتح تھی۔ اپنی کتاب ''ہماری آزادی'' (India wins Freedom) میں مولانا لکھتے ہیں کہ لیگ اور کانگریس کا کیبنٹ مشن پلان کو مان لینا ہندستان کی تحریک آزادی میں ایک سنہرا دن تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ہندستانی آزادی کے مشکل مسئلے کو سمجھوتے اور گفتگو کے ذریعے حل کر لیا گیا نہ کہ لڑائی جھگڑے اور نفرت سے۔ [۲]

مولانا نے پہلی بار کانگریس کی صدارت ۱۹۲۳ء میں کی تھی۔ دوسری بار ۱۹۴۰ء میں ان کو پھر کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ اس عہدے پر ۱۹۴۶ء تک رہے۔ گو کہ ہندستان کے زیادہ صوبے چاہتے کہ مولانا اور چند سال تک کانگریس کے صدر رہیں لیکن وہ اس کے خلاف

۱- انڈیا وِنس فریڈم (India Wins Freedom)، صفحات ۳۰-۱۲۸۔

۲- انڈیا وِنس فریڈم: ص ۱۳۵۔

تھے۔ سات سال کا عرصہ ایک لمبی مدت ہے اور مولانا چاہتے تھے کہ اب کوئی دوسرا شخص ان فرائض کو انجام دے اور اس لیے پنڈت نہرو کا انتخاب کانگریس کی صدارت کے لیے عمل میں آیا۔ ۶؍جولائی ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان پر اپنی مہر ثبت کر دی اور تمام ملک اور ممبرانِ مشن نے مولانا کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ اس کے چند ہی دن بعد ۱۰؍جولائی کو جواہر لعل نہرو نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس طلب کی اور ایک اخباری نمائندے کے سوال کے جواب میں جس نے جواہر لعل نہرو سے پوچھا کہ کیا کسی اسٹیج پر کانگریس پلان میں ترمیم بھی کر سکتی ہے۔ جواب دیا کہ کانگریس نے قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے، لیکن وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کر سکتی ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ صدر کانگریس کا یہ بیان صداقت سے دور تھا۔ کیبنٹ مشن پلان مان لینے کے بعد وہ اس میں ترمیم کرنے کی مجاز نہ تھی۔ جواہر لعل نہرو کے اس بیان سے لیگ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی اور مسٹر جناح نے کانگریس کی نیت پر شک کرنا شروع کیا۔ انھوں نے لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا اور تین دن کے بحث و مباحثے کے بعد کیبنٹ پلان کو مسترد کر دیا۔[1] اب لیگ کھل کے میدان میں آ گئی اور اس نے شدت سے تقسیم ہند کا مطالبہ شروع کیا مولانا اس سے بہت پریشان ہوئے۔ ان کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ وہ اب بھی اسی خیال پر اڑے ہوئے تھے کہ تقسیم نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پورے دیش کے لیے مہلک ہوگی اور ان کا یقین تھا کہ کیبنٹ مشن پلان ہی ان حالات میں ملک کے لیے ایک بہتر راہ عمل پیش کرتا تھا جس کے ذریعہ ملک میں امن و امان برقرار رہ سکتا تھا۔

لیکن کانگریس کے دیگر اکابرین جن میں سردار پٹیل آگے آگے تھے اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ہندستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں جن کے درمیان میل ملاپ اور یکجہتی ممکن نہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کا خیال تھا کہ قدرتاً تقسیم ہند غلط ہے لیکن اس کے علاوہ اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ مولانا سے ملے اور درخواست کی کہ تقسیم ہند کی مخالفت نہ کریں اور لارڈ

۱- انڈیا وِنس فریڈم: ص ۱۳۰-۱۲۸، اس کے بعد کے صفحات بھی اسی بحث پر مبنی ہیں۔

ماؤنٹ بیٹن کی اسکیم کو تسلیم کر لیں لیکن مولانا نے اس سے انکار کر دیا۔ انھوں نے جواہر لعل کو بتایا کہ لیگ کے ذریعے کیبنٹ مشن پلان کو مان لینا ہماری سب سے بڑی فتح تھی، جس کو کانگریس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے لیگ نے مسترد کر دیا اور یہ کانگریس کی تیسری غلطی تھی۔ پہلی غلطی کانگریس نے اس وقت کی تھی جب کہ لارڈ ویول کے کہنے کے باوجود بھی وزارت داخلہ کانگریس نے لیگ کو نہیں دی اور دوسری غلطی یہ کی تھی کہ وزارت خزانہ کانگریس نے خود ہی لیگ کے سپرد کی اور پھر خود ہی تمام مالی مشکلات کا شکار ہوئی۔ تنبیہ کرتے ہوئے مولانا نے جواہر لعل سے کہا کہ اگر ہم بٹوارے کو تسلیم کر لیں گے تو تاریخ ہم کو کبھی معاف نہ کرے گی کیوں کہ جس طرح لیگ کو تقسیم ہند کا ذمے دار ٹھہرایا جائے گا اسی طرح کانگریس بھی ذمے دار ہوگی۔

گو کہ سردار پٹیل اور پنڈت نہرو نے کسی حد تک بٹوارے کو مان لیا تھا لیکن مہاتما گاندھی اب بھی متحدہ ہندستان کے علمبردار تھے اور وہی مولانا آزاد کے لیے اُمید کی آخری کرن تھے۔ گاندھی جی کے سوال کرنے پر کہ پاکستان کے لیے تمھارا کیا خیال ہے مولانا نے جواب دیا:

> ''میں پاکستان کے خلاف رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ کبھی بھی مسئلہ پاکستان سے میری مخالفت اتنی زیادہ نہیں رہی، جتنی آج ہے۔ مجھے یہ جان کر تکلیف ہوئی کہ جواہر لعل اور سردار پٹیل نے بھی اپنی شکست تسلیم کر لی اور اپنے ہتھیار ڈال دیے۔ اب آپ ہی میری آخری اُمید ہیں۔ اگر آپ بھی بدل گئے تو مجھے ڈر ہے کہ ہندستان کہیں کا نہ رہے گا۔''

مولانا کو تسلی دیتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ اگر کانگریس بٹوارے کو تسلیم کرتی ہے تو اس کو میرے جسد خاکی پر سے گزرنا پڑے گا۔ جب تک میری زندگی ہے میں بٹوارے پر تیار نہ ہوں گا اور نہ میں کانگریس کو بٹوارا تسلیم کرنے کی اجازت دوں گا۔

لیکن بٹوارا ہندستان کا مقدر بن چکا تھا۔ چند دن بعد جب مولانا باپو کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے صدمے کی انتہا نہ رہی۔ انھیں یہ جان کر زبردست صدمہ ہوا کہ گاندھی جی

خود بھی جواہر لعل اور سردار پٹیل کے طرز پر تقسیم ہند کے لیے سوچ رہے ہیں اور آخر کار ان ہی کی ایما پر کانگریس کمیٹی نے بٹوارے کا ریزولیوشن پاس کیا۔ یہ مولانا کی زندگی کا سب سے تاریک دن تھا۔

مولانا اخیر وقت تک یہ کہتے رہے کہ ہندو اور مسلمان کو بانٹا جانا قدرتاً خلاف ہے اور اس بٹوارے سے جتنے مسائل حل ہوں گے اس سے کہیں زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مولانا کی پیشین گوئی غلط نہیں تھی۔ پہلے پاکستان بنا پھر پاکستان کے بھی بٹوارے ہوئے اور آج بھی پاکستان جس قدر اندرونی خلفشار، مہاجر اور غیر مہاجر، مقامی اور غیر مقامی کی تفریق میں اور دیگر مسایل میں مبتلا ہے وہ اہل نظر کے سامنے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد سیکولرازم اور متحدہ قومیت

مخمور سعیدی

ہندستان کی قومی سیاست میں سیکولرازم کی اصطلاح نو وارد سہی، لیکن جہاں تک اس کے معنی ومفہوم کا تعلق ہے ہمارا اُن کے ساتھ صدیوں پرانا تعارف ہے۔ایک دوسرے کے مذہبی عقاید کا احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے تہذیبی رویوں کو عزت دیتے ہوئے انسانی اخوت کے رشتے سے بندھے رہنا ہمارا قومی شعار رہا ہے۔اس روایت کی پرورش و پرداخت میں جہاں ایک طرف مسلمان صوفیوں نے موثر کردار ادا کیا، وہیں دوسری طرف ہندو سادھو، سنت بھی اس کی تعمیر وترقی کا سروسامان بہم پہنچاتے رہے۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے حکومتی سطح پر بھی جو پالیسیاں وضع ہوئیں اور جو نظام نافذ کیے گئے وہ مذہبی رواداری اور تہذیبی وسیع المشربی کے آئینہ دار تھے۔ مسلم اور غیر مسلم حکمرانوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، ان کے پیچھے مذہبی اختلافات نہیں، ان حکمرانوں کی سیاسی اُمنگیں کارفرما تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں طرف کی فوجوں میں دونوں فرقوں کے جانباز سپاہی دادِ شجاعت دیتے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے اور جب کوئی فریق غالب آجاتا تھا تو مغلوب ومفتوح علاقے کی آبادی کے ساتھ مذہب و مسلک کی بنیاد پر وہ کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا تھا۔ سیکولرازم کی جو تشریح آج کی جاتی ہے وہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو ”صدیوں سے زہد وورع اور

رشد و ہدایت کا مرکز رہا تھا۔ ان کے والد مولانا خیر الدین مشائخ کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے۔ نیز وہ کلکتے کی جامع مسجد (مسجد ناخدا) میں اکثر جمعے کی نماز سے پہلے حاضرین کے سامنے وعظ بھی کہا کرتے تھے۔(۱) گویا مولانا آزاد کے والد محترم کی ذات میں مذہب و تصوف یک جا ہو گئے تھے۔ اگرچہ تصوف مذہب سے الگ نہیں لیکن صوفیہ مذہب کی تنگ نظرانہ توجیہات سے ضرور گریز کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کی ذہنی اور جذباتی تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ شریعت و طریقت کا ملا جلا ماحول تھا۔ اپنے دینی عقاید پر کامل ایمان لیکن دوسروں کے مذہبی تصورات کا بھی پورا احترام اور عملی زندگی میں اس کا صدق دلانہ مظاہرہ۔ مولانا نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ''میرے والد مرحوم نے ایک خوش نویس، حافظ مبارک بخاری کو گھر پر ہی رکھا لیا تاکہ ان کی تصنیفات کو تبییض کریں۔ وہ اپنے کپڑوں کی صفائی کا ذرا خیال نہیں کرتے تھے۔ ایک دن میں نے کہہ دیا کہ وہ بڑے گندے آدمی ہیں۔ میری والدہ نے نہایت دھیمی آواز میں مجھے تادیب تو نہیں تلقین کی اور کہا ''میری جان! ایسا نہ کہو، ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی نظر میں تم سے اور ہم سے عزیز تر ہو۔''(۲)

جس بچے کی پرورش ایسی خدا ترس ماں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ہو، اس کا وسیع النظر، کشادہ دل اور روادار ہونا ہر طرح قرین قیاس ہے کہ یہ اخلاقی صفات اپنے آخری تجزیے میں خدا ترسی ہی کی پروردہ قرار پائیں گی۔ شفیق ماں کی اس نصیحت کا جو بلند بانگ لہجے میں نہیں دھیمی آواز میں کی گئی تھی، مولانا آزاد کے کم سن دل و دماغ نے کتنا گہرا اور پائیدار اثر قبول کیا، وہ اس سے ظاہر ہے کہ جب برسوں بعد انھوں نے اپنے گزشتہ روز و شب پر نظر ڈالی تو یہ واقعہ کتابِ زندگی کے ایک ایسے روشن ورق کی طرح سامنے آموجود ہوا جسے ماہ و سال کی گرد دھندلا دینے میں ناکام رہی تھی۔

مولانا آزاد نے ۱۹۰۳ء میں ''لسان الصدق'' کے نام سے جو رسالہ جاری کیا اُسے ملک

۱- مقدمہ ''خطباتِ آزاد'' ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۱ء

۲- بحوالہ ''ابوالکلام آزاد'': عرش ملسیانی، پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی، اگست ۱۹۷۴ء، ص ۱۵

و ملت سے براہِ راست تخاطب کی راہ پر ان کا پہلا قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا کا سالِ پیدائش ۱۸۸۸ء ہے۔ گویا اس وقت اُن کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ ''نیرنگ عالم'' اور ''المصباح'' کے ناموں سے دو جریدے یکے بعد دیگرے نکال چکے تھے، لیکن اوّل الذکر کی نوعیت گلدستے کی تھی جس میں مولانا آزاد اور ان کے بڑے بھائی ابونصر آہ سمیت مختلف شاعروں کی طرحی غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ اس کے آٹھ شمارے شائع ہوئے۔ ثانی الذکر صرف تین چار مہینے ہی جاری رہ سکا۔ ''لسان الصدق'' مئی ۱۹۰۵ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اس کے مقاصد بھی علمی اور ادبی تھے لیکن ملکی رسم و رواج، بالخصوص مسلمانوں کی معاشرتی اور دینی اصلاح بھی اس کا ایک مقصد تھا۔ اس رسالے کے صفحات مولانا کی جن تحریروں کو سمیٹے ہوئے ہیں ان میں مولانا کے ان افکار و خیالات کی ابتدائی جھلکیاں صاف دیکھی جا سکتی ہیں جو آگے چل کر سرسیّد تحریک کے بعض منفی مضمرات کی مدلل مخالفت، ہندستان کی متحدہ قومیت کی پرزور وکالت اور غیر ملکی حکمرانوں کو ملک سے بے دخل کرنے کی منظم تحریک پر منتج ہوئے۔

''لسان الصدق'' ۱۹۰۵ء کے وسط میں بند ہوا اور اسی سال کے آخر میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، جو قومی زندگی میں مسلمانوں کی جداگانہ شناخت کی علم بردار بن کر سامنے آئی۔ قومی زندگی میں مسلمانوں کی سرگرم شرکت کے مولانا آزاد زبردست موید و مبلغ تھے اور وہ یہ احساس بھی رکھتے تھے کہ اس فرقے کے کچھ مخصوص مسائل بھی ہیں لیکن ان کا اندازِ نظر مسلم لیگ سے یکسر مختلف تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان دیگر برادرانِ وطن کے دوش بدوش چل کر ان مراحل سے عہدہ برآ ہوں، جن سے صرف وہی نہیں پورا ملک دوچار تھا۔ اگر مسلمانوں کے کچھ مخصوص مسائل تھے تو ان کا حل بھی انھیں علاحدگی اختیار کرنے میں نہیں، اشتراکِ عمل میں نظر آتا تھا۔ ہندستان سے باہر کی اسلامی دنیا اُن دنوں جن مسائل و مشکلات میں گھری ہوئی تھی مولانا ان کا بھی پورا درک رکھتے تھے اور ان حالات سے ہندستانی مسلمانوں کی دلچسپی کو نہ صرف قدرتی بلکہ ناگزیر خیال کرتے تھے لیکن یہاں بھی ان کے نقطۂ نظر کی اساس خالی خولی جذباتیت پر نہیں، عقلی استدلال پر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہندستانی مسلمان بیرونی اسلامی

دنیا کے ساتھ کسی موثر معاونت کے خواہاں ہیں تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اوّلاً وہ اپنی داخلی صفوں کو درست کریں اور اس کے ساتھ ہی اپنی کوششوں میں اپنے ہم وطنوں کو بھی اعتبار و اعتماد کے ساتھ شرکت کی دعوت دیں اور ایسا اس لیے تھا کہ مولانا محض مذہبی عقیدے کے اختلاف کی بنا پر ہم وطنوں میں سیاسی تفریق کے قایل نہیں تھے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ اسی سال مولانا کی ملاقات شیام شنکر چکرورتی سے ہوئی جو آزادیِ وطن کے حصول کے لیے انقلابی اقدامات پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو انگریز دوست خیال کرتے تھے اور اس لیے انھیں شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد مولانا آزاد نے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ پوری سچائی نہیں ہے اور غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ، مراعات یافتہ کچھ خواص یا سرکاری ملازموں کو چھوڑ کر عام مسلمانوں میں بھی اتنا ہی قوی ہے جتنا دوسرے ابنائے وطن میں۔ ضرورت ان سے رابطہ قایم کرنے اور انھیں اپنے قریب لانے کی ہے۔ مولانا نے ان لوگوں سے اپنے رابطے کا ذکر کرتے ہوئے ''اِنڈیا وِنس فریڈم'' میں لکھا ہے:

> ''اُن دنوں انقلابی جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے چنا کرتی تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں۔ وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلہ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ یہ بات انقلابی محسوس کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے ان کا اعتماد حاصل ہوگیا۔ میں نے انھیں بحث کر کے یہ یقین دلانا چاہا کہ یہ ان کا خیالِ خام ہے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک جماعت کے اُن سے دُشمنی رکھتے ہیں اور یہ مناسب نہیں ہے کہ بنگال کے چند سرکاری ملازموں کے رویے سے انھیں جو تجربہ ہوا ہے، اسے وہ ایک عام حقیقت سمجھ بیٹھیں۔ مصر ایران اور ترکی میں مسلمان جمہوریت اور

آزادی حاصل کرنے کے لیے انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلمان بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہو جائیں گے، اگر ہم ان میں کام کریں اور انھیں اپنا دوست اور ساتھی بنائیں۔ میں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر مسلمان مخالفت میں سرگرم اور سیاسی تحریک سے بے تعلق رہے تو آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت دُشوار ہو جائے گی اس لیے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اس جماعت کی تائید اور دوستی حاصل کریں۔''(۱)

مولانا آزاد کی یہ کوششیں بیکار نہ گئیں۔ جیسا کہ مولانا کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے، اُن کی ان کوششوں کی بدولت ہندو انقلابیوں کے ساتھ مسلمان انقلابی آ ملے اور یہ سلسلہ شمالی ہندستان تک جا پہنچا، ان کی خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں، خفیہ پروگرام ترتیب پانے لگے اور وہ بدگمانیاں دور ہونے لگیں جو ملک کے ان دو بڑے فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے سے روکتی تھیں اور بڑی حد تک غیر ملکی حکمرانوں کی حکمت عملی کا نتیجہ تھیں۔

۱۹۰۸ء کے اوائل میں مولانا آزاد نے عراق، شام، ترکی اور مصر کا دورہ کیا اور وہاں کے جمہوریت پسند اور آزادی خواہ حلقوں سے تعارف اور تعلق پیدا کیا۔ اس تعارف و تعلق نے ان کے فکری اور عملی موقف کو مزید تقویت بہم پہنچائی۔ ''انڈیا وِنس فریڈم'' میں لکھتے ہیں:

''کلکتہ چھوڑنے سے پہلے میں سیاسی خیالات کے اعتبار سے انقلابی سرگرمیوں کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ جب میں عراق گیا تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں مصطفیٰ کامل پاشا کے کچھ پیروؤں سے تعلقات پیدا ہو گئے۔ میں ینگ ٹرکش گروپ سے بھی ملا جس نے قاہرہ میں اپنا مرکز قایم کیا تھا اور وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار شائع کرتا تھا۔ جب ترکی گیا تو ینگ ٹرکش تحریک کے چند لیڈروں سے

---

(۱) ''انڈیا وِنس فریڈم'' اُردو ترجمہ ''ہماری آزادی'' مترجم: پروفیسر محمد مجیب۔ ناشر: اورینٹ لونگ مینس، فروری ۱۹۶۱ء

دوستی ہوگئی۔ ہندستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک میری ان کی خط وکتابت جاری رہی۔'' (ہماری آزادی)

مہاتما گاندھی سے بھی ان کا پہلا تعارف اسی سال ہوا۔ گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں ایک جلسہ اس سوال پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ جلسے کی صدارت مولانا آزاد نے کی تھی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا تھا:

> ''مجھے ان (گاندھی جی) کا تعارف سب سے پہلے ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ جب کہ والد مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی ٹرانسوال وغیرہ میں والد مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور ان اطراف میں ان کے بہت سے مریدین اور معتقدین تھے۔ ان دنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دل چسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرمِ عمل تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام ملا جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ انھوں نے اس ٹیلی گرام میں والد مرحوم کی تعزیت کی تھی۔'' (خطبات آزاد)

یہ پہلا رابطہ شخصی نوعیت کا تھا لیکن چند برس بعد اسی نے ہندستان کی تحریک آزادی کے دو عظیم رہنماؤں کے درمیان جو اس ملک کے دو سب سے بڑے فرقوں کی نمایندگی کرتے تھے ذہنی رفاقت اور اتحاد عمل کی صورت اختیار کی۔ گاندھی جی ایک راسخ العقیدہ ہندو تھے اور مولانا آزاد کو اپنے صحیح العقیدہ مسلمان اور اسلامی تعلیم وتہذیب کا وارث ہونے پر ہمیشہ فخر رہا لیکن دونوں ہی ملک وقوم کی اجتماعی زندگی میں حد بندیوں کے قایل نہ تھے۔ خود اس حقیقت کو سمجھتے تھے اور دوسروں کو سمجھانا چاہتے تھے کہ جس سرزمین کی آب وہوا پر وہ جی رہے ہیں وہاں رونما ہونے والے حالات و واقعات دونوں طرف یکساں طور پر اثر انداز ہوں گے اور اپنے اپنے تشخص کو قایم رکھتے ہوئے بھی ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے باہمی اتحاد و اعتماد ایک امر ناگزیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہی احساس تھا جسے عام کرنے کے لیے مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' جاری کیا۔ اس اخبار کو اُردو داں طبقے بالخصوص پڑھے لکھے مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت مختصر مدت میں اس نے ہزاروں سینوں میں جذبہ حریت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو اس طرح ہوا دی کہ وہ شعلہ بن کر بھڑک اُٹھیں۔ ''الہلال'' کی دعوت عام تھی لیکن اس کے مخاطب اوّل مسلمان ہی تھے۔ اس کی آواز پر علماء اور مشائخ کا وہ گروہ بھی جو مدرسوں اور خانقاہوں کی مقدس چار دیواریوں سے باہر قدم رکھنا کسر شان سمجھتا تھا، ملک وملت پر غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد میں شرکت کی خاطر میدانِ عمل میں نکل آیا۔ مسلمانوں کی قومی غیرت اور ساتھ ہی ملی حمیت کو غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے مولانا آزاد نے اُن پر لفظوں کے جو تازیانے برسائے اس کا کچھ اندازہ درجِ ذیل اقتباسات سے ہوسکتا ہے، جو ''الہلال'' کے ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے سے ماخوذ ہیں:

> ''جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندستان کا سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی بیڑیاں جو اس نے از خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی۔ فرض کرو کہ اس وقت ہندستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو تمھیں معلوم ہے کہ اس میں سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا ہوگا......؟ (ص ۵)
>
> ......اُس میں لکھا ہوگا کہ ہندستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا۔ ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے...... ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا۔ ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا، پر اس قومِ مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اُٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔'' (ص ٦)
>
> ......آنے والا مورخ لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا۔

بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا...... لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا اس قوم کی سرفروشی سے ہوا جو مسلم نہ تھی''۔ (ص ۷)

یہ الفاظ جہاں مولانا آزاد مرحوم کی غیر معمولی سیاسی بصیرت کی گواہی دے رہے ہیں، وہاں اُن سے وہ غم وغصہ بھی چھلکا پڑ رہا ہے جو اپنے ہم مذہبوں میں اس بصیرت کے فقدان کے ردعمل کے طور پر انھیں بے چین کیے ہوئے تھا۔ یہ بے چینی وہ ایک ہندستانی کی حیثیت سے بھی محسوس کرتے تھے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی ان کے نزدیک اسلام صرف خداشناسی کا پیغام نہیں خودشناسی کا درس بھی دیتا تھا۔

مولانا آزاد جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کے جس مجہول رویے اور برطانوی حکومت کی طرف ان کے جس جھکاؤ کے اس شدت سے شاکی تھے، اس کے لیے وہ بڑی حد تک سرسیّد کے اثرات کو ذمہ دار گردانتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ''الہلال'' کی ضبطی کے بعد انھوں نے ۱۹۱۵ء میں ''البلاغ'' نکالا۔ اس میں ایک بار لکھا:

> ''لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے سرسیّد کی پالیسی، یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لیے ایک مخصوص بت ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم وعمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔''

(ابوالکلام آزاد: عرش ملسیانی)

یہ بات توجہ طلب ہے کہ خود مولانا آزاد کے بیان کے مطابق ۱۹۰۸ء کے سرسری تعارف کے بعد ۱۹۱۸ء تک انھیں گاندھی جی سے خط وکتابت کا موقع ملا، نہ ملاقات کا اتفاق ہوا! کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی کے جس اجتماع (فروری ۱۹۴۸ء) کا اُوپر ذکر آیا اس کی صدارتی تقریر میں یہ اعتراف موجود ہے۔ ان کے ۱۹۰۸ء کے ٹیلی گرام کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اس کے بعد ۱۹۱۸ء تک مجھے ان سے خط وکتابت یا زیارت وملاقات

کا موقع نہ ملا۔ ۱۹۱۸ء میں جب میں رانچی جیل میں نظر بند تھا......
گاندھی جی بہار کے دورے کے لیے آئے اور انھوں نے ایک شخص
کے ذریعے مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں اور تم سے
ملنا چاہتا ہوں مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔"

(خطبات آزاد)

اسی تقریر کے مطابق گاندھی جی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات مولانا کے رانچی جیل سے رہا ہو جانے کے بعد ۲۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہوئی جہاں وہ ایک جلسے میں شرکت کرنے کے لیے آئے تھے، مولانا آزادی، جمہوریت اور غیر فرقہ وارانہ سیاست کا علم بہت پہلے بلند کر چکے تھے اور اپنے ان آدرشوں کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر رہے تھے۔ سیکولرزم کا مفہوم غیر فرقہ وارانہ سیاست کے سوا اور کیا ہے؟

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے سیاسی فکر و عمل میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوئے، ان میں جمال الدین افغانی اور مولانا کے مصری دوست محمد عبدہ کے نام آتے ہیں۔ اُن دونوں حریت پسند مفکرین کی روشن خیالی، راست گفتاری اور دُور بینی کی صفات مولانا آزاد کی شخصیت میں بھی بدیہی طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ وہ افغانی اور عبدہ سے کتنے متاثر تھے۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ "الہلال" کے پہلے ہی شمارے میں جو ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا، مولانا نے ان دونوں کی تصویریں شائع کی تھیں۔

مولانا آزاد غالباً پہلے جلیل القدر مسلم رہنما تھے جس نے زور و قوت کے ساتھ ہندستان کی متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا اور اسے ملک کے عوام و خواص میں رائج و راسخ کرنے کے لیے اپنی تمام تر ذہنی، علمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عالمگیر انسانی اخوت و مساوات پر بھی زور دیا اور اس سلسلے میں نہ صرف علمی اور عقلی دلایل سے کام لیا بلکہ اپنی جماعت کے مذہبی معتقدات سے بھی رجوع کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ خدا کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان پر یا ایک انسانی گروہ کو دوسرے انسانی گروہ پر کوئی برتری، کوئی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے تو صرف اس کے صالح کردار و عمل کی بنیاد پر،

دوسری کوئی بنیاد اس برتری اور فضیلت کی قایم نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بھی یاد دہانی کرائی کہ جس خدا پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس کی صفت رب العالمین ہے اور جس جلیل القدر پیغمبر نے اس خدا کا پیغام تم تک پہنچایا اُسے اُس نے رحمۃ للعالمین کہہ کر مخاطب کیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

''اے پیغمبر ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر''

(خطبہ اتحاد اسلامی، مشمولہ خطبات آزاد)

اقوامِ عالم کو پوری انسانی برادری کا حصہ قرار دینا آج کے بڑے بڑے سیاستدانوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ اس وقت کہا جب رنگ و نسل کی تفریق اور ادنیٰ مفادات کے پیدا کیے ہوئے باہم متصادم نظری اور عملی اختلافات نے اس طرف متوجہ ہونے کی کوئی گنجایش باقی نہیں چھوڑی تھی۔ پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرنا بے انصافی ہوگی کہ موجودہ سیاست دان جب اس قسم کی مفاہمانہ باتیں کرتے ہیں تو ان کے لہجے کی سطحیت اور منافقت آلودگی صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے جب کہ مولانا آزاد کی زبان پر یہ الفاظ ان کے دل و دماغ کے عمیق ترین اور شفاف ترین گوشوں سے نکل کر آئے تھے۔

مضمون ختم کرتے ہوئے میں آپ کے سامنے مولانا آزاد کے اس خطبے کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جو انھوں نے مارچ ۱۹۴۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے رام گڑھ اجلاس کی مسند صدارت سے پڑھا تھا۔ متحدہ قومیت کے تصور کو ان سے زیادہ معقول و مدلل الفاظ کا پیرایہ شاید ہی کبھی مل سکے۔ مولانا نے فرمایا تھا:

> ''ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک زبان بولنے لگے، ہمارے رسم

و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں اُن سے کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے......

ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"

بد قسمتی سے ان الفاظ کی معنویت مولانا کی زندگی میں پوری طرح نہیں سمجھی جا سکی لیکن ان لفظوں میں پوشیدہ پیغام آج کے بدلے ہوئے حالات میں بھی ہم ہندستانیوں کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا اُس وقت تھا جب یہ لفظ مولانا آزاد مرحوم کی زبان سے ادا ہوئے ہوں گے۔

مولانا ابوالکلام کی اقتصادی وسماجی بصیرت
اور
سیاسی وانتظامی قابلیت

سیّد اکبر علی ترمذی

۱-سماجی بہبود:

انسان دوستی اور سماجی بہبود میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مولانا آزاد کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہندستان میں لوگ طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض طبقوں کو سماجی مساوات اور جمہوری برابری حاصل نہیں۔ چناں چہ انھوں نے ہریجنوں، قبائلی اور پسماندہ طبقوں کے لیے وظائف کی ایک اسکیم جاری کی جو ان کے دورِ وزارت میں تین لاکھ روپیہ سالانہ سے بڑھ کر دو کروڑ روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔

سماجی بہبود کا کام وزارتِ تعلیم سے وابستہ تھا۔ اپریل ۱۹۵۳ء سوشل ویلفیئر بورڈ کی تشکیل ہوئی تو پلاننگ کمیشن کے سامنے یہ تجویز آئی کہ اس بورڈ کا تعلق وزیر مالیات سے ہو۔ مولانا آزاد نے اس کی سخت مخالفت کی اور پلاننگ کمیشن سے یہ بات منوائی کہ بورڈ کا تعلق وزارتِ تعلیم سے ہونا چاہیے جو پانچ سال سے یہ کام انجام دے رہی ہے۔ سوشل ویلفیئر بورڈ کی صدارت کے لیے ٹی ٹی کرشنما چاری نے جب مسز درگا بائی دیش مکھ کا نام پیش کیا تو مولانا آزاد نے ۲۸ر جولائی ۱۹۵۳ء کو لکھا ''مسز درگا بائی دیش مکھ کئی بار مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ وہ کسی حال

میں بھی پسند نہیں کریں گی کہ خود بورڈ کی چیئر مین ہوں مسٹر دیش مکھ نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا ہے۔جس خیال سے انھوں نے یہ فیصلہ کیا اسے میں نے پوری طرح اپری شیٹ کیا تھا۔'' سوشل ویلفیئر بورڈ کے علاوہ سماجیات پر تحقیقات کی غرض سے مولانا آزاد نے انڈین کونسل فار سوشل سائنسز قایم کی اس کونسل کا دایرہ سماجیات اور معاشیات تک پھیلا ہوا ہے۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سوشل آرڈر پونا میں ۱۹۵۱ء میں قایم ہوا۔دوسال بعد ڈی سوزا نے جب اس انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں کچھ کاغذات مولانا آزاد کو بھیجے تو انھوں نے انھیں بڑی دلچسپی سے پڑھا اور ۴راپریل ۱۹۵۳ء کو ڈی سوزا کو لکھا '' مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ایسے کام کے لیے جس کی انڈیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے یہ انسٹی ٹیوٹ بنایا گیا ہے اور جنوری ۱۹۵۱ء سے وہ کام کر رہا ہے۔اس کے ڈپلوما کورس سے مجھے خاص طور پر دلچسپی ہوئی کیوں کہ اس سے ایسے آدمی تیار ہو کر نکلیں گے جو میں اُمید کرتا ہوں کہ پنج سالہ پلاننگ اور کمیونٹی پروجیکٹس کے اہم کاموں میں مفید ہو سکتے ہیں۔''

مولانا آزاد کو سماجی بہبود کے خاموش کاموں سے گہری دلچسپی تھی لیکن اس سلسلے میں کی جانے والی نمود و نمایش سے وہ ہر وقت گریز کرتے تھے۔جب مشہور سماج سیوک شریمتی رامیشوری نہرو نے مولانا آزاد سے درخواست کی کہ ان کی کمیٹی کی جانب سے لگائے جانے والے کیمپ کا افتتاح کریں تو مولانا آزاد نے ۲۲رمئی ۱۹۵۳ء کو جواب میں لکھا '' آپ کی کمیٹی جو کام کر رہی ہے اس میں مجھے پوری دلچسپی ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ وہ کامیاب ہو لیکن میں نہیں خیال کرتا کہ کیمپ کھولنے کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے کھولنے کی رسم ادا کرے۔آپ کمیٹی کی چیئر مین ہیں، آپ ہی کو کیمپ کھولنے کی رسم ادا کرنی چاہیے۔میرا حال آپ کو معلوم ہے کہ میں ان کاموں کے سوا جن کا بوجھ میرے سر پڑ گیا ہے اور باتوں کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔''

رسم افتتاح کے لیے مولانا آزاد کے پاس وقت نہیں تھا لیکن وہ سماجی بہبود کے کاموں کے لیے مفید مشورے ضرور دیتے تھے۔۱۹۵۳ء میں راجستھان کے قحط زدہ لوگوں کی مدد کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس نے ریلیف فنڈ کے لیے اپیل کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔جب

مولانا آزاد کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے راجستھان کے راج پرمکھ مہاراجہ جے پور کو لکھا ''برٹش پیریڈ میں ہم نے دیکھا تھا کہ وائسرائے اور گورنروں کے ایک اشارے پر لوگ بخوشی لاکھوں روپیہ جمع کر دیتے تھے۔ اب جب خود ان کی گورنمنٹ ہے تو چاہیے تھا کہ ان کی فیاضیاں گورنمنٹ کا ساتھ دیتیں لیکن برخلاف اس کے ہر طرف ہاتھ رُکے ہوئے ہیں۔ عام طور پر یہ غلط خیال لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ اب جب کہ ہماری گورنمنٹ ہے تو جو کچھ کرنا ہے گورنمنٹ کو کرنا ہے۔ اپنی جیب کیوں خالی کریں۔ یہ کام ایسا ہے جس میں خاص انٹریسٹ آپ کو لینا چاہیے۔ اگر ضرورت ہو تو آپ اس کام کے لیے دورہ کریں۔ یہ بات کہ خود راج پرمکھ ریلیف کے لیے اپیل کر رہا ہے اور وہ خود دورے پر نکلا ہے، لوگوں پر ایک خاص اثر ڈالے گی اور دوسرے راج پرمکھ کے لیے ایک عمدہ مثال پیش کرے گی۔'' راجستھان کے وزیر اعلیٰ جے نرائن ویاس کے نام ایک مکتوب میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''راج پرمکھ کو پورا انٹریسٹ لینا چاہیے۔ مناسب ہوگا کہ وہی اپیل نکالیں اور فنڈ جمع کرنے کے لیے دورہ کریں۔ کلکتہ، بمبئی، کانپور، پٹنہ وغیرہ میں بڑے بڑے راجستھانی بزنس مین ہیں اور وہ اگر چاہیں تو راجستھان کے قحط زدہ حصوں کی ریلیف کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

سماجی مساوات کے علم بردار کی حیثیت سے مولانا آزاد مردوں اور عورتوں کے حقوق میں کوئی تفریق گوارا نہیں کرتے تھے۔ مصر کے مفتی اعظم شیخ حسین محمد مخلوف نے ایک فتویٰ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ عورتوں کو حق رائے دہندگی دینا اور ان کو پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہونے کی اجازت دینا اسلام کی رو سے جائز نہیں۔ جب مولانا آزاد کی توجہ اس فتویٰ کی جانب مبذول کی گئی تو انھوں نے اظہارِ حیرت کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اسلامی شرع میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ عورتوں کو ان کے سیاسی اور شہری حقوق سے محروم رکھا جائے بلکہ اسلام میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں پائی جاتی۔ میرے لیے یہ

بیان حیرت کا باعث ہے کیوں کہ جب ہم اسلامی قانون کے فلسفے یا اسلامی سوسائٹیوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے بالکل برعکس تصویر دکھائی دیتی ہے۔ اسلام سیاسی یا پبلک زندگی میں عورتوں اور مردوں کے امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا اس کا مظاہرہ اس جدوجہد سے ہوتا ہے، کہ جو خلیفہ سوم کی شہادت کے بعد شروع ہوئی ہے۔ حضرت پیغمبر ﷺ کے رفیقوں میں جو زندہ تھے اس سوال پر شدید اختلاف رکھتے تھے اور اس کا ثبوت جمل کی جنگ کی صورت میں برآمد ہوا۔ اسلامی گروپ میں یہ پہلا تنازعہ تھا۔ اس جنگ میں ایک گروپ کے لیڈر خلیفہ چہارم حضرت علیؓ تھے اور دوسرے گروپ کی رہنمائی حضرت پیغمبر ﷺ کی حرم حضرت عائشہؓ کر رہی تھیں۔ حضرت علیؓ کے حمایتی مخالف گروپ کی اگرچہ شدید نکتہ چینی کرتے تھے اور اس میں صحت کا عنصر غالب ہوتا تھا لیکن انھوں نے حضرت عائشہؓ کی قیادت پر اس لیے کبھی اعتراض نہیں کیا کہ وہ ایک خاتون تھیں۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کی وفات کے تیس سال بعد پیش آیا اور ان کے جو رفقاء حیات تھے، چاہے وہ کسی گروپ سے تعلق رکھتے ہوں انھوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا کہ ایک عورت سیاسی اور فوجی قیادت کی اہل ہے۔''

(مولانا آزاد......ایک سیاسی ڈائری: مرتبہ اثر بن یحییٰ انصاری، ص ۸۳-۴۸۲)

مولانا آزاد کے اس بیان سے مصر کی بنت النیل تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔ ۳ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو اس بنت النیل تحریک کی لیڈر مادام دریہ شفیق نے لکھنؤ میں بیان دیتے ہوئے کہا:

''مولانا آزاد نے گزشتہ جو بیان دیا تھا اُس سے ہماری تحریک کو بڑی مدد ملی ہے اور اس سے تمام قدامت پسند خاموش ہو گئے ہیں جو بنت النیل کے مطالبات کی مخالفت کر رہے تھے انھوں نے کہا کہ آج مصری

عورتوں میں کافی تعلیم ہے ان کی بڑی تعداد وکلاء، ڈاکٹر، انجینئر، اخبار نویس اور کلرک کی ہے۔''

(مولانا آزاد......ایک سیاسی ڈائری: ص ۱۶-۵۱۵)

۲- اقتصادی امور:

ہندستانی جمہوریہ کے قیام کے فوراً بعد جواہر لعل نہرو نے پنج سالہ پلاننگ کا آغاز کیا۔ جواہر لال نہرو کی طرح مولانا آزاد بھی پنج سالہ منصوبہ بندی کو ملک کی تعمیر اور ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ منصوبہ بندی کا مرکزی مقصد مادی وسائل اور ذرائع کی توسیع نہیں بلکہ ایک نیا ذہن اور نئی سیرت پیدا کرنا ہے۔

(مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ: ماحول- کراچی کا مولانا آزاد نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۹)

پنج سالہ منصوبہ بندی کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ بعض بڑی بڑی صنعتوں کو قومیایا جائے۔ چنانچہ یکم اگست ۱۹۵۲ء کو جب جواہر لال نہرو نے ایئر سروس کے نیشنلائزیشن کا افتتاح کیا تو مولانا آزاد نے کمیونی کیشن کے وزیر جگ جیون رام اور ان کی وزارت کے ساتھیوں کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا ''ہم نے پانچ برس کی پلاننگ میں بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ جن انڈسٹریوں کا نیشنلائزیشن ضروری ہے ان میں ٹرانسپورٹ، کمیونی کیشن اور بینکنگ کا میدان سب سے پہلے نمودار ہوتا ہے۔ ہم کئی سال سے اس بات پر غور کر رہے تھے کہ ایئر سروس کا نیشنلائز ہونا ضروری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بالآخر وہ وقت آ گیا کہ ہم اس اہم پروگریس کا اعلان کریں۔ یہ دراصل ہماری نیشنل انڈسٹری کی تاریخ میں ایک نئے چیپٹر کا آغاز ہے۔''

اقتصادی معاملات میں بھی مولانا آزاد میانہ روی کے قایل تھے جب ہندستان آزاد ہوا تو ہمارا ملک اقتصادی صورتِ حال کے لحاظ سے ایک خاص طرح کے دور سے گزر رہا تھا۔ مولانا آزاد کے سامنے ملک کی اقتصادی حالت تھی۔ چناں چہ انھوں نے اسی حالت کے مطابق آگے بڑھنے کا نقشہ بنایا۔ ان کا خیال تھا ''جہاں تک سوسایٹی اور اسٹیٹ سسٹم کا تعلق ہے دنیا اس وقت کیپٹل ازم اور سوشلزم میں بٹی ہوئی ہے اور دونوں نے ریجڈ عقیدہ کا نیچر پیدا کر لیا ہے۔

کیپٹل ازم کے حامی اس کے لیے تیار نہیں کہ پرائیویٹ انٹر پرائز کے سسٹم سے رائی برابر ادھرا اُدھر ہوں۔ اسی طرح سوشلزم کے حامی اس کے لیے تیار نہیں کہ کسی حال میں بھی پرائیویٹ انٹر پرائز کو ٹالریٹ کریں۔ گویا یہ دونوں سسٹم ایک طرح کے مذہبی ڈاگما ہیں جنھیں ایک فیتھ فل کو بے چوں چرا مان لینا چاہیے اور ذرا بھی ان سے ادھر ادھر نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا آزاد ان دونوں نظریوں کے بیچ کا راستہ پسند کرتے تھے۔ جہاں پرائیویٹ انٹر پرائز کی ضرورت تھی وہاں پرائیویٹ انٹر پرائز کی ہمت افزائی کرنا چاہتے تھے اور جہاں اسٹیٹ انٹر پرائز کی ضرورت ہے وہاں اسٹیٹ انٹر پرائز کو نیشنلائزیشن کے اصول پر قایم کرنا چاہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''ہم نے فیصلہ کیا کہ ملک کی انڈسٹری کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک سیکٹر پرانی انڈسٹری کا ہے دوسرا نئی انڈسٹری کا۔ پرانی انڈسٹری میں پرائیویٹ انٹر پرائز کو بدستور جاری رکھنا چاہیے۔ نئی انڈسٹریوں میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ موجودہ حالت میں اسٹیٹ کن چیزوں میں ہاتھ ڈال سکتا ہے اور کہاں تک نیشنلائزیشن پریکٹیکل ہے۔''

جیون بیمہ کے قومیانے کے معاملے میں بھی مولانا آزاد میانہ روی کے حامی تھے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز کے ذریعہ حکومت کو توجہ دلائی کہ جیون بیمہ اسکیم کا فایدہ دیہاتی آبادی کو بھی پہنچایا جائے۔ مولانا آزاد کو یہ اسکیم بہت پسند آئی۔ چناں چہ جواہر لال نہرو کو لکھتے ہیں: ''بعد کو میں نے اس پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نہایت اہم بات ہے اور اسے فوراً عمل میں لانا چاہیے۔'' اس مکتوب کے ساتھ مولانا آزاد نے ایک تجویز کانگریس ورکنگ کمیٹی میں پیش کرنے کے لیے بھیجی۔ اس تجویز میں یہ سوجھاؤ دیا گیا تھا کہ ''اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہونی چاہیے کہ پانچ ہزار اور اس سے کم کی پالیسیوں کے لائف انشورنس کا کاروبار نیشنلائز کر دیا جائے اور پانچ ہزار روپیہ سے اُوپر کا میدان پرائیویٹ کمپنیوں کے لیے چھوڑ دیا جائے پھر اس کے بعد تمام اسٹیٹ گورنمنٹوں کو اس طرح کا انتظام کرنا چاہیے کہ لینڈ ریونیو کے ساتھ ایک رقم لائف انشورنس پالیسی کی بھی سرکاری طور پر وصول کی جائے اور کمپل سری سیونگ کی طرح ہر خوشحال کاشتکار کو کمپل سری لائف انشورنس کرانے کا موقع دیا جائے۔'' مولانا آزاد کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو صدر جمہوریۂ ہند نے بذریعہ آرڈی ننس

جیون بیمہ کا نیشنلائزیشن کر دیا۔

مولانا آزاد کے ان ترقی پسند اقتصادی خیالات کی انتہا ہمیں کانگریس کے ساٹھویں آودی اجلاس میں نظر آتی ہے۔ کانگریس کا یہ اجلاس ۱۹ر سے ۲۱ر جنوری ۱۹۵۵ء کو ستیہ مورتی نگر۔ مدراس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا پہلا ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا کہ پہلے میں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندستان میں سوشلسٹ سماج کا مطالبہ کر کے کانگریس کوئی نیا نعرہ یا نئی آواز بلند نہیں کر رہی ہے بلکہ اپنے پرانے راستے پر ہی چل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ''سوشلزم'' کے بجائے ''سوشلسٹ سماج'' کی اصطلاح اپنائی ہے۔ اگر کسی ممبر کے ذہن میں اس کے نئے نعرہ ہونے کا خیال آیا ہو تو اسے فوراً نکال دینا چاہیے! یہ کوئی نہ سمجھے کہ کانگریس کے دستور میں نئی تبدیلی کی جارہی ہے (مولانا آزاد......ایک سیاسی ڈائری ص ص ۱۷-۶) یہ ریزولیوشن اس لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ ہندستان میں کانگریس نے اس کے بعد ایک اشتراکی سماج کی تعمیر کا کام ہاتھ میں لیا۔

۳- سیاسی وانتظامی قابلیت:

سیاسی گتھیاں سلجھانے اور مشکل مسائل سمجھنے کی مولانا آزاد میں خداداد قابلیت پائی جاتی تھی۔ متضاد نظریوں میں صلاح اور صفائی پیدا کرنے کی ان میں ایک خاص صلاحیت تھی۔ ان ہی صفات نے اُنھیں ایک عظیم الشان سیاسی رہنما بنا دیا تھا۔ جدوجہد آزادی میں جس سیاسی بصیرت کا ثبوت انھوں نے دیا اس کی تاریخ شاہد ہے۔

سردار پٹیل کی وفات ۱۵ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو ہوئی اور ۱۱ر فروری ۱۹۵۰ء کو کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا اجلاس ہوا تو مولانا آزاد نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ غیر مذہبی جمہوریۂ ہند میں یہ رسم نہ بننے پائے کہ اعلیٰ عہدے صرف ہندوؤں تک مخصوص رہیں بلکہ عملی طور پر وہ دوسروں تک منتقل ہو سکتے ہیں اور جب ہندستان ایک غیر مذہبی اسٹیٹ ہے تو ایک مسلمان بھی اس اسٹیٹ کا صدر، نائب صدر یا وزیر اعظم ہو سکتا ہے۔ اس کی عملی مثالیں بھی قائم کر دی جائیں۔ چناں چہ ۱۴ر فروری ۱۹۵۱ء کو کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے اجلاس میں خود جواہر لال نہرو نے ڈپٹی لیڈر

کی جگہ کے لیے مولانا آزاد کا نام پیش کیا جو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور وزیر تعلیم کی حیثیت سے کام کرتے وقت مولانا آزاد چند بنیادی اصولوں اور ڈسپلن کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ وہ کسی ایسی ایسوسی ایشن کی ممبری قبول نہیں کرتے تھے جس کے کام کے لیے وہ وقت نہ دے سکیں اور جس کام کے انجام دینے میں ان کا ہاتھ نہ ہو۔

وزارتِ خارجہ میں پارلیمنٹری سیکرٹری شریمتی لکشمی مینن نے نیشنل ہیرالڈ میں چھپے اپنے ایک مضمون میں وزارتِ تعلیم کے طریقہ کار پر سخت اعتراضات کیے۔ جب مولانا آزاد کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے ۱۸؍اپریل ۱۹۵۳ء کو جواہر لال نہرو کو لکھا ''کیا سنٹرل گورنمنٹ کے ایک پارلیمنٹری سیکرٹری کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنی گورنمنٹ کی ایک منسٹری کے خلاف اخبار میں آرٹیکل شائع کرائے۔ اگر مسز مینن کو تعلیم میں انٹریسٹ ہے اور وہ چاہتی تھیں کہ ایجوکیشن منسٹری کے متعلق کوئی رائے دیں تو وہ سیکرٹری کو لکھ کر دریافت کر سکتی تھیں یا مجھ سے کہہ سکتی تھیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انھیں کوئی حق نہیں تھا کہ ایک اخبار میں منسٹری کے خلاف آرٹیکل شائع کرائیں۔ اگر ان پارلیمنٹری سیکرٹریوں کو ان کے درجے کے اندر نہیں رکھا گیا تو آگے چل کر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔''

یونیورسٹی ایجوکیشن بل پر غور کرنے کی غرض سے مولانا آزاد نے دلی میں وائس چانسلروں کی ایک کانفرنس بلائی اور ڈاکٹر رادھا کرشنا کو شریک ہونے کو کہا تو انھوں نے نائب صدر ہونے کے سبب مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اس کانفرنس میں حصہ لیں اور مولانا آزاد نے اس بات سے اتفاق کیا لیکن چند دن بعد ڈاکٹر رادھا کرشنا نے وزیر قانون اور اقلیتی امور سی بسواس سے کہا مجھے مولانا نے کانفرنس میں بلایا تھا میں اس لیے نہیں گیا کہ اگر میں جاتا تو ان کے خلاف تقریر کرتا۔ جب بسواس نے یہ بات مولانا آزاد کو بتائی تو انھوں نے فوراً ڈاکٹر رادھا کرشنا کو لکھا ''پانچ برس سے جو تعلق دوستی کا آپ میں اور مجھ میں قایم ہے اس کے لحاظ سے مجھے یہ توقع تھی کہ اگر آپ کو کسی معاملے میں میری رائے سے اختلاف ہوگا تو سب سے پہلے آپ خود مجھ سے کہیں گے اس کے بعد دوسروں سے ذکر کریں گے۔ مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ

نے یہ بات مجھے نہیں بتلائی اور شریک نہ ہونے کی بالکل دوسری وجہ لکھی اور مسٹر بسواس سے کہنا ضروری سمجھا۔"

پنجاب پراونشل کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری شری رام دیال وید نے پنجاب کے ایک کیبنٹ منسٹر کے خلاف بیان دے دیا جو جالندھر کے ہند سماچار میں چھپ گیا۔ اس بیان کی ایک کٹنگ شری رام شرما نے مولانا آزاد کو بھیج دی۔ انھوں نے فوراً شری رام دیال وید کو لکھا "اگر ایک منسٹر کے خلاف کوئی الزام ہے تو وہ چیف منسٹر کے سامنے آنا چاہیے یا سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ کو اس پر توجہ دلانی چاہیے لیکن آپ کو بحیثیت سیکرٹری پراونشل کانگریس کمیٹی کے یہ حق (نہیں) پہنچتا ہے کہ آپ ایک پبلک انٹرویو میں اس کا ذکر کریں۔ اگر اس طرح کا طریقہ اختیار کیا گیا تو نہ تو پارٹی کا ڈسپلن قائم رہے گا اور نہ کوئی کیبنٹ کا رکن ذمے داری کے ساتھ کام کر سکے گا۔"

وزیر دفاع گوپال سوامی آینگر کا انتقال ۱۰ر فروری ۱۹۵۳ء کو ہوا اور ۱۳ مارچ ۱۹۵۳ء کو یہ خبر شائع ہوگئی کہ پنڈت گوبند ولبھ پنت کو وزیر دفاع اور کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا دوسرا ڈپٹی لیڈر مقرر کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد بدستور اوّل ڈپٹی لیڈر اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے۔ (مولانا آزاد......ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۹۰) ۱۶ر مارچ ۱۹۵۳ء کو مولانا آزاد نے جواہر لال نہرو کو لکھا "میں چاہتا ہوں کہ ڈیفنس منسٹری کے معاملات میں دلچسپی لوں۔ کیا مہربانی کر کے آپ کیبنٹ سیکرٹریٹ کو ہدایت کر دیں گے کہ آیندہ جب ڈیفنس سب کمیٹی کی میٹنگ ہو تو اس کا نوٹس اور ایجنڈا مجھے بھی بھیج دیا جائے جو ایجنڈا ایسا ہوگا جس کے غور و فکر کرنے میں میں بھی شریک ہونا چاہوں گا اس میں شریک ہو جاؤں گا۔ ۱۲ر اپریل ۱۹۵۳ء کو کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے اجلاس میں یہ طے پایا کہ آیندہ سے ایوان میں صرف ایک ہی ڈپٹی لیڈر ہوگا۔ اسی اجلاس میں مولانا آزاد کو ڈپٹی لیڈر چنا گیا اور کونسل آف اسٹیٹس میں وزیر قانون سی سی بسواس کو پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا۔

ملکہ الیزابیتھ کی تاج پوشی اور دولت مشترکہ کے وزرا کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جب ۱۸ر مئی ۱۹۵۳ء کو جواہر لال نہرو لندن کے لیے روانہ ہوئے تو انھوں نے مولانا آزاد کو

قائم مقام وزیراعظم نامزد کیا اور اس کا اعلان پریس میں بھی ہو گیا لیکن بمبئی کے نیشنل ہیرالڈ نے وزیر داخلہ ڈاکٹر کاٹجو کے حوالے سے اس خبر کی تردید کر دی۔ جب مولانا آزاد نے ڈاکٹر کاٹجو کو اس خبر پر توجہ دلائی تو انھوں نے تعجب کا اظہار کیا اور مولانا آزاد سے کہا کہ اس کی تردید کرادیں۔ چونکہ اس بیان میں ڈاکٹر کاٹجو کا نام لیا گیا تھا مولانا آزاد نے یہ مناسب سمجھا کہ یہ معاملہ ڈاکٹر کاٹجو پر چھوڑ دیا جائے۔ جب رات مولانا آزاد نے ٹیلیفون کیا تو ڈاکٹر کاٹجو نے کہا کہ مسٹر پائی نے ایک بیان پریس کو دے دیا ہے۔ دوسرے دن دلی اور دلی کے باہر کے لوگوں نے جب مولانا آزاد سے کہا کہ پی ٹی آئی نے یہ خبر شائع کی ہے کہ پرائم منسٹر کے آفس کے لیے کوئی آفشیٹنگ ارینجمنٹ نہیں کیا گیا ہے تو انھوں نے اخبار منگوا کر دیکھا تو واقعی پی ٹی آئی نے مستند ماخذ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بات لکھی تھی۔ مولانا آزاد نے فوراً ڈاکٹر کاٹجو کو لکھا ''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اس طرح کی غلط بات کا پریس میں دینا مناسب تصور کیا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا'' ۳۰ رمئی ۱۹۵۳ء کو حکومت کی جانب سے یہ اعلان شائع کیا گیا کہ مولانا آزاد نے قایم مقام وزیراعظم کی حیثیت سے کام شروع کر دیا ہے۔'' (مولانا آزاد...... ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۹۵)

قایم مقام وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد مولانا آزاد نے ڈاکٹر کاٹجو کو لکھا ''آپ نے ابھی مجھ سے کہا تھا کہ دلی کے سوکالڈ ستیہ گرہ کی جو حالت روزانہ رہتی ہے اور اس سلسلے میں اور جو ضروری باتیں ہوتی ہیں ان کی روزانہ رپورٹ میں تیار کروں گا۔ تاکہ پرائم منسٹر کو بھیجی جائے۔ مہربانی کر کے کل سے ایسا انتظام کیجیے کہ رپورٹ کی ایک کاپی روزانہ شام کو مجھے بھی مل جایا کرے۔ آپ دو کاپیاں تیار کرائیے ایک لندن بھیج دیجیے اور ایک مجھے بھیج دیجیے۔''

دلی کی طرح مشرقی پنجاب میں بھی جن سنگھ نے اسی قسم کا ستیہ گرہ شروع کر رکھا تھا۔ پنجاب کے گورنر سی پی این سنگھ کو مولانا آزاد لکھتے ہیں ''سنگھ ایجی ٹیشن کے بارے میں آپ کی ریڈنگ بالکل درست ہے ہماری بھی ایسی ہی رائے رہی۔ دراصل یہ سارا ایجی ٹیشن ایک آرٹی فیشل ایجی ٹیشن ہے جس کے پیچھے نہ کسی گروپ کا سنٹی منٹ ہے اور نہ کسی طرح کا انٹریسٹ۔ ڈاکٹر مکرجی اس غلط فہمی میں تھے کہ شاید وہ اپنے آپ کو گرفتار کرا کے ایک نیا جوش پیدا کر دیں

گے لیکن جو کچھ نتیجہ نکلا وہ ملک کے سامنے ہے۔''

ڈاکٹر مکرجی کو حکومت جموں و کشمیر نے ۱۱ رمئی ۱۹۵۳ء کو اس وقت گرفتار کیا جب ان کے جن سنگھ نے کشمیر میں ستیہ گرہ شروع کیا۔ ڈاکٹر مکرجی کو پلورسی کی شکایت تھی۔ چنانچہ ۱۲ رجون کو جب ان کی طبیعت خراب ہوئی تو جموں اور کشمیر کی حکومت نے انھیں سری نگر نرسنگ ہوم میں پہنچا دیا اور ان کے جو دوست وہاں موجود تھے انھیں بھی نرسنگ ہوم بھیج دیا۔ ۲۳ رجون ۱۹۵۳ء کو صبح ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی روز مولانا آزاد نے بذریعہ بحری تار جواہر لال نہرو کو اطلاع دی، ڈاکٹر شاما پرشاد مکرجی کی طبیعت سری نگر میں خراب ہوئی پلورسی کی شکایت تھی گورنمنٹ کشمیر نے انھیں نرسنگ ہوم میں پہنچا دیا لیکن آج صبح ۴ بجے ان کا انتقال ہو گیا اسپیشل ہوائی جہاز کے ذریعے ان کی لاش کو کلکتہ پہنچانے کا انتظام کر دیا ہے۔''

ابھی جن سنگھ کا ستیہ گرہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل کے مسئلے پر مظاہرے شروع ہو گئے۔ ۳ راپریل ۱۹۵۳ء کو ہبلی میں بلاری کے مسئلے پر ہڑتال ہو گئی۔ ۱۹ رمئی ۱۹۵۳ء کو حکومت نے کمیشن کی سفارشات پر بلاری کا الحاق میسور کے ساتھ تسلیم کر لیا۔ اس فیصلے کے خلاف آندھرا کے حامیوں نے ایجی ٹیشن شروع کر دیا اور کنڑ لوگوں کے اسکولوں اور ہوٹلوں پر حملے کر دیے۔ دُکانیں لوٹ لیں اور عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ قایم مقام وزیر اعظم کی حیثیت سے مولانا آزاد نے مدراس کے وزیر اعلیٰ راج گوپال آچاریہ کو بذریعہ تار ہدایت کی کہ پولیس اور آفیشلز میٹنگ ان ڈیوٹی (اسٹاپ) اگر یہ صحیح ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ ضروری ایکشن لے رہے ہوں گے۔'' اس کے فوراً بعد ایک دوسرے تار کے ذریعہ راج گوپال آچاریہ کو کہا'' آندھرا میں بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ وائلینٹ ڈسٹربنس کر کے آندھرا اسٹیٹ کا فیصلہ کرایا ہے اور اب ایک دوسرا قدم اُٹھا کر بلاری کا فیصلہ اُلٹا دیں گے۔ مجھے آپ کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ وقت ٹف ہونے کا ہے سوفٹ ہونے کا نہیں ہے۔''

ایک تجربہ کار منتظم کی حیثیت سے مولانا آزاد جانتے تھے کہ عوام کے معاملے میں کب سختی برتنی چاہیے اور کب نرمی۔ کلکتہ میں میدان کے عوامی اجلاس پر پولیس نے حملہ کر دیا اور بھاگتے ہوئے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر مارا۔ رپورٹر اور فوٹو گرافر زخمی ہوئے۔ اس قسم کی سختی سے رائے عامہ

صوبائی کانگریس حکومت کے خلاف ہوگئی۔ جب مولانا آزاد کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مغربی بنگال کے وزیر غذا پرفلو چندر سین کو بذریعہ کوڈ مسیج ہدایت کی ''پولیس کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں تھا میرے پاس ایسے لوگوں کی شکایتیں آ رہی ہیں جو ٹریموے ایجی ٹیشن کے مخالف ہیں لیکن وہ لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کا طریقہ کار بھی صحیح نہیں ہے اور اس نے اپنی ہمدردی کھودی ہے۔ مہربانی کر کے حالات کو سنبھالیے۔''

غرض مولانا آزاد کا گیارہ سالہ عہد وزارت جدید ہندستان کی تعمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مسند وزارت کو ملک کی معاشی فلاح اور سماجی بہبود کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس غرض سے انھوں نے یونیورسٹیوں، تکنیکی اداروں اور صنعتوں میں ارتباط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ تکنیکی تعلیم کو ہر سطح پر رائج کیے بغیر نہ تو ملک میں تکنیکی ترقی ہو سکتی ہے اور نہ اسے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تکنیکی تعلیم کے لیے انھوں نے کھڑک پور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی قائم کیا۔ ان کے دور وزارت میں انجینئری اور ٹیکنالوجی کی درس گاہوں کی تعداد ملک میں دوگنی ہوگئی۔ بورڈ آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نے ملک بھر میں لیبارٹریوں کا جال بچھا دیا جو اعلیٰ پیمانے کی سائنسی تحقیقات کا مرکز بن گئیں۔ سائنسی اداروں کی سرپرستی اور سائنس دانوں کی ہمت افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے عہد وزارت میں عقل انسانی کا عزم ایورسٹ کی چوٹی فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کو مولانا آزاد ملک کی معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے پنج سالہ منصوبہ بندی کی حمایت کی لیکن ان کی نظر میں منصوبہ بندی کا مقصد مادی وسائل اور ذرائع کی توسیع ہی نہیں، بلکہ ایک نیا ذہن اور ایک نئی سیرت پیدا کرنا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت جب صنعتوں کو قومیانے کا مسئلہ پیش آیا تو مولانا آزاد کی مضبوط رائے تھی کہ پرانی صنعتوں کو بدستور پرائیویٹ سیکٹر میں رہنے دیا جائے اور نئی صنعتوں میں سے صرف ان صنعتوں کو قومیایا جائے جو عملی طور پر حکومت کے لیے ممکن ہو۔ منصوبہ بندی کے فایدے وہ کسانوں تک پہنچانا چاہتے تھے چناں چہ انھوں نے خوش حال کسانوں کے لیے لازمی جیون بیمہ کی اسکیم پیش کی۔ مولانا آزاد کے ان اقتصادی نظریات کی جھلک اس

سوشلسٹ سماج کی تجویز میں ملتی ہے جو کانگریس کے اودی اجلاس میں منظور کی گئی۔

اقتصادی معاملات کی طرح بین الاقوامی سیاست میں بھی مولانا آزاد نے اپنی حیرت انگیز بصیرت کا لوہا ملکی اور غیر ملکی مدبروں سے منوایا۔ متضاد نظریوں میں مصالحت کرانے میں مولانا آزاد کو خاص صلاحیت حاصل تھی۔ وہ ملک کی تقسیم کے سخت مخالف تھے لیکن بٹوارا ہو جانے کے بعد ہندستان اور پاکستان میں خوشگوار تعلقات قایم کرنے کے لیے انھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اسی طرح انھوں نے لسانی اور ریاستی اُلجھنوں کو حل کرنے میں جس سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اس کی نظیر کم ملتی ہے۔

سیاست کے علاوہ تعلیمی معاملات میں انھوں نے نہایت ہی دانش مندانہ اقدام اُٹھائے۔ ان کا خیال تھا کہ مشرق اور مغرب کی مشترکہ آگہی سے ہی صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کمیشن بٹھائے اور ان کمیشنوں کی سفارشات پر عمل کر کے ملک میں تعلیم کا معیار بلند کیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قایم کیا اور اس کے ذریعے ملک میں یونیورسٹیوں کا جال ہی نہیں بچھایا بلکہ تمام دانش گاہوں کو نظریاتی طور پر سمت اور رفتار کا تصور بخشا۔

تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ ہندستان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ چاہتے تھے۔ وزارت تعلیم کی جانب سے دو جلدوں میں ''اے ہسٹری آف فلاسفی ایسٹرن اینڈ ویسٹرن'' مرتب کی گئی جس کا فاضلانہ مقدمہ خود مولانا آزاد نے اپنے قلم سے لکھا۔ اس کتاب میں ہندستانی فلسفے کو وہ جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے جس کا وہ حقدار ہے۔ فلسفے کے ساتھ ادب اور فنون لطیفہ کے فروغ کے لیے اکیڈمیاں قایم کیں، ہندستان کی مشترکہ تہذیب کو دوسرے ملک سے روشناس کرانے کی غرض سے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز قایم کی اور یونیسکو سے اشتراک عمل کی غرض سے ''انڈین کمیشن فار کواپریشن ود یونیسکو'' کی بنیاد ڈالی۔

مولانا آزاد کے ان ہمہ جہت اور ہمہ گیر کارناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک انقلابی مفکر تھے۔ انھوں نے تمام مذاہب میں ''مشترکہ حق'' ڈھونڈھ نکالا اور اسی ''مشترکہ حق'' کی اساس پر انھوں نے ''وحدت دین'' اور ''مذہبی ہم وجودیت'' کے نظریات کی بنیاد رکھی۔ (۱) انسانی وحدت پر انھیں پورا یقین تھا۔ انسان دوستی اور انصاف پسندی کے جذبات ان میں کوٹ

کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ وہ انسانی قدروں کو صحیح نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور ہندستان کے سبھی فرقوں میں عدل وانصاف کے جویا تھے۔ انصاف پسندی کو اور سماجی مساوات کے علم بردار کی حیثیت سے وہ مردوں اور عورتوں کے حقوق میں کسی قسم کی تفریق گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے پسماندہ طبقوں کی تعلیم کے لیے وظائف کی ایک اسکیم جاری کی تاکہ وہ سماجی مساوات اور جمہوری برابری حاصل کرسکیں۔ سماجی بہبود کو فروغ دینے کی غرض سے انھوں نے ''سوشل ویلفیئر بورڈ'' قایم کیا۔ مولانا آزاد نے جدید ہندستان کی تعمیر میں جو تاریخی کردار ادا کیا اس کے مثبت نتائج مسلسل نمودار ہورہے ہیں اور ان کے انقلابی نظریات عہد حاضر کی فکری اساس استوار کرنے میں معاون ثابت ہورہے ہیں۔

دراصل مولانا آزاد سیاس امروز نہیں بلکہ مدبر فردا تھے۔ وہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو اپنے وقت سے پہلے ظہور میں آجاتی ہیں۔ وہ اپنے عہد سے کم از کم نصف صدی آگے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے سچ کہا تھا کہ مولانا آزاد کی عمر کے بارے میں مت پوچھو وہ پچاس سال کے تھے جس دن وہ پیدا ہوئے۔ مولانا آزاد کو خود اس بات کا احساس تھا کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوگئے اور انھیں سمجھنے والا زمانہ آگے آئے گا، وہ لکھتے ہیں ''میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالہ کردیا گیا'' ان کے نظریات، جو زمانہ ان کی زندگی میں سمجھنے سے قاصر رہا وہ ان کی وفات کے بعد سارے عالم پر آشکارا ہوگئے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا آزاد کے نظریات کو ہم اپنے دلوں میں بسائیں اور ان کی فکری اساس پر جدید ہندستان میں جمہوری، سیکولر اور اشتراکی سماج کی تعمیر کریں۔

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تمام مذاہب میں نہ تو مشترکہ حق ڈھونڈھ نکالا اور نہ ''مذہبی ہم وجودیت'' کے کسی نظریے کی بنیاد رکھی ہے۔ قرآنی آیات کی روشنی میں ایک حقیقت کو بیان کیا ہے جس کی طرف مفسرین نے عام طور پر توجہ نہیں کی تھی۔ اس سلسلے میں ان کا ٹھیک وہی مسلک ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور دیگر اسلاف کا تھا۔ دورِ آخر میں علامہ سیّد سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی وعلیہ الصلوٰۃ والسلام میں اس مسئلے پر نہایت جامع اور مدلل بحث کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن (جلد اوّل) کے پہلے ایڈیشن، دہلی، ۱۹۳۰ء، دوسرے ایڈیشن، لاہور ۱۹۴۷ء اور تیسرے اور آخری ساہتیہ اکیڈمی ایڈیشن، دہلی میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بہ ضمن ''اهدنا الصراط المستقيم'' بہ عنوان ''وحدت دین کی اصل عظیم اور اور قرآن حکیم'' تفصیل و تدلیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس بارے میں مولانا کی رائے، وہیں تلاش کرنی چاہیے! (ا-س-ش)

مولانا ابوالکلام آزاد اور قومی یک جہتی

غلام ربانی تاباں

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے بہت سے پہلو تھے۔ وہ مذہبی رہنما تھے، عالم تھے، صاحب طرز ادیب تھے، شعلہ نوا مقرر تھے اور سیاست داں تھے، یہ سب کچھ تو تھے ہی لیکن سب سے زیادہ وہ انسان دوست تھے اور رنگ، نسل اور مذہب کے تعصبوں سے پاک۔ وہ ہمیشہ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ کانگریس کا ۵۳ واں اجلاس رام گڑھ میں ہوا تھا۔ مولانا نے اُس کی صدارت کی تھی اور اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا:

''ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی تعمیر سامانیوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ کی زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کیا، ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ سب مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اُسے چھوڑ کر اُس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع

نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں اُن سے کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جلد بیدار ہو جائیں تو بہتر ہے کیوں کہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔''

مولانا نے اپنے خطبے میں ہندو اور مسلم فرقہ پرستی کی طاقتوں کو للکارا اور ہندستان کی متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کی تصدیق کی لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہم نے نہ صرف مولانا بلکہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کی طرح کے اُن کے محترم ساتھیوں کے بھی تصورات ونظریات کو یکسر بھلا دیا ہے۔ فرقہ پرستی اور انتشار پسندی کی طاقتیں ملک میں ہر طرف سر اُٹھا رہی ہیں اور نہ صرف استحکام و سالمیت بلکہ ملک کے بنیادی جمہوری ڈھانچے کے لیے خطرہ بنتی جا رہی ہیں۔ اس اندھیرے میں اُمید کی کرن ہیں ہمارے عوام۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دوسرے عام لوگ جو فرقہ پرست نہیں ہیں۔ حال آں کہ مذہب کے نام پر انھیں آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کی طرح مولانا آزاد بھی بڑے مذہبی انسان تھے لیکن اُن میں قدرِ مشترک تھی انسان دوستی اور سیکولرازم۔ اُن کے دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھے۔ قومی ایکتا اور ہندستان* کے مختلف مذہبی، نسلی، لسانی اور علاقائی فرقوں کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی کو وہ ملک کے خوشحال مستقبل کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ دونوں کی زندگیاں وقف تھیں۔ فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کے لیے مہاتما گاندھی نے جان کی بازی لگا دی۔ ایک ہندو فرقہ پرست نے انھیں قتل کر دیا۔ مسلمان فرقہ پرستوں نے مولانا کو اپنی گندی سازشوں کا نشانہ بنایا۔ اُن پر کیچڑ اُچھالی گئی، ناروا حملے کیے گئے، اتہام لگائے گئے، برا بھلا کہا گیا لیکن مولانا نے فرقہ پرستوں

اور ظلمت پسندوں کی مخالفت کا کبھی اثر قبول نہیں کیا۔ منزل پر نظر جمائے وہ اپنے راستے پر چلتے رہے۔ راستے کے کانٹوں نے اُن کے تلووٗں کو لہولہان کر دیا لیکن انھیں سفر ترک کرنے پر مجبور نہ کر سکے۔

ایک جگہ مولانا نے لکھا ہے:

''ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اُس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔''

مولانا کو اس پر پورا یقین تھا کہ قدرت کے اس اٹل فیصلے کو فرقہ پرست اور دوسری رجعت پسند طاقتیں بدل نہیں سکتی ہیں۔ اس یقین نے اُن کے عزم کو تقویت پہنچائی اور انھوں نے ہمیشہ سیکولرازم اور جمہوریت کی طاقتوں کا ساتھ دیا۔ ہندووٗں اور مسلمانوں میں ایسے عناصر کی کمی اُس وقت تھی نہ آج ہے جو مذہب اور کلچر کے نام پر منافرت پیدا کرتے ہیں۔ یہ تنگ نظری ہمارے دستور اساسی کی نفی کرتی ہے۔ مولانا آزاد نے ہمیشہ اس تنگ نظری کی مذمت کی اور ملک کے لیے اس کے خوفناک نتائج کی طرف اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار اشارے کیے:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو سال کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اُس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اُس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دایرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اُس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ اسلام کی روح مجھے اُس سے روکتی نہیں۔ وہ اس راہ میں

میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں جس کے بغیر اُس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس تکون کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا ہوں۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے۔ فرقہ پرستی کے طوفان اُن سے ٹکرائے لیکن وہ ایک بھاری چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے۔ اُنھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ مذہب لوگوں سے نفرت کرنے اور ان کا خون بہانے کی تعلیم نہیں دیتا ہے اور یہ کہ جو شخص مذہب کی صحیح روح سے واقف ہے وہ انسان دوست ہوگا اور دوسروں کی بھلائی کا خواہش مند۔ جو لوگوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کے لیے مذہب کو استعمال کرتے ہیں وہ ہمارے بھی دشمن ہیں اور مذہب کے بھی اور اپنے مفاد کے لیے مذہب کا استحصال کرتے ہیں۔

ہمارے دستور میں کہا گیا ہے کہ ہندستان سیکولر، سوشلسٹ جمہوریہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سب سے اہم قدر ہے سیکولرازم جس کے بغیر سوشلزم کا تصور کیا جا سکتا ہے نہ جمہوریت کا! ملک میں سیکولر عناصر کی کمی بھی نہیں لیکن چوں کہ ان میں بکھراؤ ہے، اس لیے وہ کوئی موثر اقدام نہیں کر پاتے ہیں۔ اگر وہ متحد ہو کر میدان عمل میں اُتر آئیں تو فرقہ پرستی اور انتشار پسندی کی سیاہ طاقتوں کو شکست دی جا سکتی ہے۔

معین شاکر کے بقول ''مولانا آزاد سے زیادہ پرکشش شخصیت جدید ہندستان کے اسٹیج پر شاید ہی کبھی نمودار ہوئی ہو۔'' لیکن اس کے باوجود اُن کے مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ اُن میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو مولانا کے جمہوری اور سیکولر تصورات کو ناپسند کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی اُن کے سخت مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جو شخص اسلام اور قوم پرستی دونوں سے اپنی وفاداری کا اعلان کرتا ہے اس کا ذہن اُلجھا ہوا ہے اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ مولانا مودودی قوم پرستی کو مغرب کی نقل سے تعبیر

کرتے تھے اور اُن لوگوں کو گمراہ سمجھتے تھے جو برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کی نظر میں انڈین نیشنل کانگریس ایک ہندو تنظیم تھی جس میں کسی مسلمان کے لیے گنجایش نہیں تھی۔ وہ جمہوریت اور سیکولرازم کو اسلام کے منافی تصور کرتے تھے۔ وہ اور اُن کے پیرو مسلسل مولانا کی مخالفت کرتے رہے لیکن دوسرے فرقہ پرستوں کی طرح وہ بھی انھیں راہ راست سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مولانا آزاد ہندستانی قوم پرستی کو ہندو قوم پرستی سمجھتے تھے نہ مسلم قوم پرستی، اُن کی نظر میں محض سیکولر قوم پرستی تھی۔ قوم پرستی اور سیکولرازم کو مغربی تصورات کہنے والوں کو انھوں نے بڑا معقول جواب دیا تھا:

> ''یہ بات مناسب نہیں ہے کہ آپ مغرب کی تہذیب اور ادب سے اس حد تک متاثر ہو جائیں کہ اپنے ملک کی عظیم تہذیب کو بھلا دیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح نہیں کہ آپ اپنے کو خول میں اس طرح بند کر لیں کہ مغربی علوم اور تہذیب کی ایک کرن بھی آپ تک نہ پہنچ سکے۔ اس بات کو نہ بھولیے کہ آپ دنیاوی اشیاء کو قومی اور جغرافیائی حدود میں قید کر سکتے ہیں لیکن علم اور تہذیب کو خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔''

وہ مغربی تعلیم اور تہذیب کو مذہب کے لیے مضر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے کہا ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور یسوع مسیح کی تعلیمات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ خدا کی وحدت کے اصول کی بنیاد پر مولانا آزاد نے انسانوں کو اتحاد کا درس دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ تمام انسان ایک خاندان کے رُکن ہیں جو خدا کا خاندان ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ تمام مذاہب کا مقصد ہے گناہ پر فتح حاصل کرنا۔ ہر مذہب اخلاقی قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ اُنھیں یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب سب انسانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جائے گا۔ ایک جگہ انھوں نے کہا ''جس طرح تم اپنے مذہب کو سب سے اچھا سمجھتے ہو اُسی طرح دوسرے بھی سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں رواداری بہت ضروری ہے۔'' کون نہیں جانتا کہ تنگ نظری کے نتائج ہمیشہ برے ہوتے ہیں۔

پنڈت جواہرلعل نہرو کے مولانا کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات تھے۔ اُن کے تصورات و خیالات سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اُنھوں نے سنجیدہ علمی انداز سے چند الفاظ میں مولانا کی شخصیت کا احاطہ کیا ہے:

''ہندستان کی رنگارنگ زندگی میں کچھ لوگوں کو تصادم کی جھلک نظر آتی ہے لیکن مولانا آزاد کی نظر اُس بنیادی یکجہتی پر جمی رہتی تھی جو مجموعی طور سے ہندستان اور اُس میں بہنے والے قومی دھاروں میں پائی جاتی ہے۔ یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے لیکن کبھی کبھی تو اُن کی تحریروں اور تقریروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قومی اتحاد اُنھیں ملک کی آزادی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ وہ فرقہ پرستی کو دنیا کا بدترین گناہ سمجھتے تھے چاہے وہ ہندوؤں کی فرقہ پرستی ہو یا مسلمانوں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے قومی ایکتا اور ملک کی آزادی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ گاندھی جی کی طرح وہ بھی مذہبی انسان تھے لیکن سماجی اور سیاسی معاملات میں دونوں کا نقطہ نظر سیکولر تھا۔ وہ ہندستان کی آزادی اور ترقی کے نقیب تھے۔ ایسے ہندستان کے نقیب جس میں مذہب، ذات اور نسل کی تفریق نہ ہو، جس میں سماجی نابرابری نہ ہو، جس میں انسان، انسان کا استحصال نہ کر سکے۔ اُن کی نظر ہندستان کے روشن مستقبل پر جمی ہوئی تھی۔ وہ ہر قسم کے بھید بھاؤ، ہر طرح کے اختلافات کو ختم کرنا چاہتے تھے اور ہندستان کو ایک خوش حال ملک دیکھنا چاہتے تھے۔''

پوری زندگی مولانا آزاد فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ مہاتما گاندھی کے بقول قومیت پر مولانا آزاد کا ایمان اتنا ہی پختہ تھا جتنا اسلام پر۔ اُن کا خیال تھا کہ ہر فرقہ پرست چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی نہ صرف ملک بلکہ پوری انسانیت کا دشمن ہے۔ انھیں ایک طرف اگر مسلم فرقہ پرستی سے مقابلہ کرنا پڑا تو دوسری طرف ہندو فرقہ پرستی سے بھی ٹکر لینی پڑی۔ اُن کا خیال تھا کہ سیاسی طاقت چھن جانے کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کے

درمیان رواداری اور خود اعتمادی باقی نہیں رہی ہے جو قومی یکجہتی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن وہ مایوس نہیں تھے اور قومی اتحاد کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہتے تھے اور اُس کے لیے ہر مفاد کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ بدیسی حکومت ظاہر ہے کہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کرتی تھی۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندستان کے لوگوں میں اگر اتحاد ہو گیا اور انھوں نے فرقہ پرستی کی لعنت سے چھٹکارا پالیا تو وہ اس ملک پر زیادہ دن حکومت نہیں کر سکے گی۔ جیمس مل جیسے سامراجی مؤرخوں نے ہماری تاریخ کو مسخ کر کے نوجوانوں کے ذہنوں کی تخریب کی اور نفرت کا زہر بھرا۔ ہماری تاریخ کو قدیم، وسطی اور جدید ادوار کے بجائے ہندو، مسلم اور برطانوی دوروں میں تقسیم کیا گیا اور از منہ وسطیٰ کے ہندو اور مسلمان بادشاہوں کی جنگوں کو اسلام اور ہندو دھرم کی جنگوں کا نام دیا گیا۔ مثلاً ہلدی گھاٹی کی جنگ میں اکبر کی فوجوں کا سپہ سالار تھا راجہ مان سنگھ اور رانا پرتاپ کی فوجوں کا حکیم خاں سور۔ اس کے باوجود نہ صرف سامراجیوں بلکہ فرقہ پرست مؤرخوں نے بھی اسے اسلام اور ہندو دھرم کی جنگ سے تعبیر کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب ایک مقصد کے پیش نظر کیا جا رہا ہے۔ سامراجی مؤرخوں کے تصورات کا پرچار کر رہے ہیں فرقہ پرست اور رجعت پسند مؤرخ کہ وہ ان کے مفادات کے حق میں ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں سیکولر اور لبرل مؤرخوں کی بھی کمی نہیں جو بڑی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ فرقہ پرستوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

ہمارے قومی رہنماؤں کو ایک طرف انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی اور دوسری طرف ملک کی فرقہ پرست اور انتشار پسند طاقتوں کے خلاف جو تیزی کے ساتھ سر اُٹھا رہی تھیں اور ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں زہر گھول رہی تھیں۔ ان رہنماؤں میں مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد پیش پیش تھے۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ بدیسی حکومت فرقہ پرستی کو ہوا دیتی ہے اور یہ کہ ہندستان کی آزادی کے بعد یہ افسوس ناک صورت حال از خود ختم ہو جائے گی لیکن آزادی کے چالیس سال بعد بھی فرقہ پرستی کی لعنت سے ملک کو چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔ فرقہ پرست اور انتشار

پسند طاقتیں پہلے سے زیادہ تخریب کاریوں میں مصروف ہیں۔ ہمارے سیدھے سادے عام لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر کے یہ سیاہ طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے بیج بوتی ہیں اور شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہیں جس کا نتیجہ ہوتا ہے فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد جس میں اکثر بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیے جاتے ہیں، بچے یتیم ہوتے ہیں، عورتیں بیوہ ہوتی ہیں، جائیدادیں تباہ ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ اب تو فرقہ وارانہ فسادات روزمرہ کی زندگی کے حصے بن گئے ہیں۔ روز اخبار میں کسی چھوٹے بڑے فساد کی خبر دیکھنے میں آتی ہے۔ ملک کے کچھ حصوں میں دہشت پسندی کی کارروائیاں کی جا رہی ہیں جن کے شکار ہوتے ہیں زیادہ تر بے گناہ لوگ۔ دہشت پسندی سے زیادہ غیر انسانی اور وحشیانہ عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں میں دہشت پھیلانے کے لیے بے گناہ اور بے قصور لوگوں کا خون بہانا انتہائی سفاکانہ فعل ہے۔ اس بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور تخریب کاری کے مضر اثرات ہماری سماجی اور معاشی زندگی پر پڑ رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم سب اس کی مذمت کرتے ہیں، اس کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، لیکن مسئلے سے جوجھنے، اس سے نبٹنے، اس کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم آگے آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ضمیر وشعور پر جمود طاری ہے۔ ہمارا احساس خوابیدہ ہے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے قومی اتحاد اور یکجہتی کا جو خواب دیکھا تھا کیا وہ پورا ہوگا؟ اس کا جواب ہمیں دینا ہے۔ ہمیں جو دنیا کی عظیم ترین تحریک آزادی کی شاندار روایتوں کے وارث ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور متحدہ قومیت

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ملک کے عظیم رہنما و مدبر اور سیاست داں تھے۔ جنگ آزادی کے میر کارواں اور جدید ہندستان کے معمارِ اعظم کی حیثیت سے انھوں نے گونا گوں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں صرف ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور ملک کے سیاسی استحکام سے متعلق ان کی کوششوں اور خدمات کا مختصر جایزہ لینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مولانا نے آزادی وحریت کی سرفروشانہ دعوت دینے اور ملک وقوم خصوصاً مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے علاوہ سیکولرازم اور ہندستان کی متحدہ قومیت کے استحکام، فرقہ وارانہ اتحاد وہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے فروغ کو اپنی زندگی کا خاص مشن بنایا تھا، ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ انھوں نے ۱۹۱۱ء ہی سے بلند کرنا شروع کر دیا تھا اور ۱۹۱۲ء میں الہلال نکالا تو وہ آزادی واتحاد کی تحریک کا نقیب بن گیا۔ اس کے اجرا کا ایک اہم مقصد ہندو مسلم میل ملاپ پیدا کرنا تھا، اس میں ہندستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کے حصول کے لیے تعاون کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''الہلال کی اشاعت سے اُردو صحافت کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دل عزیزی حاصل ہوئی، پبلک کے لیے صرف اس کی اعلیٰ طباعت باعث کشش نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ قوی جذبہ تھا جس کی وہ دعوت دیتا تھا۔''[1]

۱- انڈیا ونس فریڈم: (مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری) کراچی ۱۹۹۷ء، ص ۷۸

مولانا کی دوسری تحریروں سے بھی اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے جو اس کتاب میں پہلے نقل کی جا چکی ہیں۔ مولانا مسلمانوں کے لیے تعمیر جہاں ہی کی طرح اس کو بھی ضروری اور مقدم سمجھتے تھے کہ وہ اپنے وطن کی تعمیر و ترقی میں لگ جائیں کیوں کہ خاکِ وطن ان کی محبت اور ابنائے وطن ان کے احترام کے زیادہ مستحق ہیں:

''اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لیے محترم ہے تو وہ خاک تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترام محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں، اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں، تو وہ انسان تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترامِ اخوت کے مستحق ہیں جو اس خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بہنے والے پانی کے پینے والے اور اسی فضائے محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔''(۱)

ان کے نزدیک مسلمانوں کے لیے جہاں اسلام مایہ فخر ہے وہاں ہندستانی قومیت کا ان کا عنصر ہونا بھی ان کے لیے مایۂ ناز ہے، ان دونوں تصورات کو وہ متضاد نہیں سمجھتے تھے، اسلام کی روح انھیں اس بات سے باز نہیں رکھتی بلکہ اس کی جانب راہنمائی کرتی ہے کہ وہ اپنے ہندستانی ہونے اور اس کی متحدہ قومیت کا جز ولاینفک ہونے پر فخر کریں، نہ اسلام کی وسعتِ نظر سے یہ بعید ہے کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہ ہو اور نہ قومیت کا یہ اقتضا ہے کہ اس کے لیے خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دایرہ تنگ کیا جائے، رام گڑھ کے خطبہ صدارت میں اسی حقیقت کو پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ انھوں نے اپنے الہامی لفظوں میں بیان کیا تھا جس کا حوالہ پچھلے کئی مضامین میں گزر چکا ہے اس لیے یہاں پھر اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

مولانا کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں خواہ کلچر و مذہب کے لحاظ سے کتنا ہی فرق و اختلاف کیوں نہ ہو اور وہ اپنے اپنے روایتی ورثے پر الگ الگ خواہ کتنا ہی فخر کریں لیکن دونوں بہرحال ایک ہی قومیت کا جز ہیں، ایک دفعہ کلچر اور تہذیب کے مسئلے پر آنجہانی

۱- مضامین مولانا ابوالکلام آزاد، (حصہ چہارم)، ص ۵۷، مرتبہ منشی مشتاق احمد، بحوالہ ایوانِ اُردو (مولانا ابوالکلام آزاد نمبر)، ص ۱۲۱

سمپورنا نند سابق وزیر تعلیم یو پی کے بعض خیالات ومیلانات کا جائزہ لیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

''اگر سمپورنا نند جی نے یو پی اسمبلی میں کہا ہے کہ وہ تعلیم کے مسئلے میں ہندو مسلم کا امتیاز دیکھنا نہیں چاہتے اور نہ کلچر اور تہذیب کے معاملے میں ہندو مسلم امتیاز دیکھنا پسند کرتے ہیں تو یقیناً انھوں نے ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا، نہ ہی کانگریس کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان اس مقصد سے قیامت تک متفق ہو سکتے ہیں کہ ہندستان سے مسلم تعلیم، مسلم کلچر، مسلم تہذیب اور مسلم خصایص کے امتیازی اوصاف فنا ہو جائیں۔......کانگریس نے اقلیتوں کے تحفظ کی جو دفعہ ۱۹۳۱ء کے اجلاسِ کراچی میں پاس کی ہے، اس میں مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو باقی رکھنے کا یقین دلایا گیا ہے۔ ......گزشتہ سال کلکتہ کی کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں جو تجویز پاس ہوئی تھی،......اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہا گیا ہے کہ ہم نہ صرف اقلیتوں کے رسم خط، زبان اور کلچر وغیرہ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کو ترقی بھی دیں گے۔''(۱)

مولانا کے نزدیک کانگریس کی اس تجویز کا مقصد مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو ہندستان کی متحدہ قومیت میں جذب کر دینا ہرگز نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان کو صاف طور پر چلا کر اور پکار کر یہ اعلان کر دینا چاہیے اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیے کہ وہ ہندو مت میں جذب ہونے کے لیے ایک لمحے کے واسطے بھی تیار نہیں، بہ حیثیت مسلمان کے ان کی جو قومی خصوصیات ہیں ان کو وہ نہ صرف باقی رکھیں گے بلکہ ان کو ترقی دیں گے۔

مولانا نے دو قومی نظریے کی ہمیشہ وضاحت کی اور اسے حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت بتایا۔ دو قومی نظریے اور اقلیت و اکثریت کے مسئلے پر ایک جگہ الہلال میں لکھتے ہیں:

''ہندو مہا جارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال

۱- مولانا ابوالکلام آزاد: عابد رضا بیدار، رام پور، ۱۹۶۸ء، ص ۷۲-۲۷۱

دیجیے، یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا، جو مسلمانوں کے قلوب میں القا کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی طاقت ہے، جو اس کے اخلاق، اس کے کیریکٹر، اس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیتِ الٰہی اور اعمالِ حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔''(۱)

مولانا نے انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ دہلی (۱۹۲۳ء) میں پھر مسلمانوں کے اسی خدشہ کا ذکر کیا ہے، ہندستان میں ان کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے، تعلیم اور دولت میں بھی ان سے پیچھے ہیں، اگر وہ کسی متحدہ حرکت میں شریک ہوں گے تو ان کی ہستی پامال ہو جائے گی۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء میں اس طرزِ عمل کے خلاف سب سے پہلی صدا بلند کی کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں۔ کانگریس میں شریک ہوں، ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں اور فرقہ وارانہ تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ (۲)

مسلم لیگ کی طرف سے دوقومی نظریے کو خاص طور پر ہوا دی جا رہی تھی اور یہ کہا جاتا تھا کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں، ایک ہندو اور دوسری مسلمان، اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی، اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ (۳)

مولانا کی عقابی نظر اس پس پردہ ہاتھ پر تھی جو ان فتنوں کو ہوا دے رہا تھا، وہ کہتے تھے کہ یہ شک مسلم لیگ کے دماغ کی اپج نہیں ہے بلکہ انگریزوں نے آزادی اور اتحاد کی تحریک کو روکنے کے لیے یہ ہوا کھڑا کر رکھا ہے، وہ اپنے یادگار عدالتی بیان (قولِ فیصل) میں فرماتے ہیں:

''گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا رکھا

---

(۱) الہلال مقالہ الجہاد فی سبیل الحریت: ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۹

۲- خطباتِ آزاد: ص ۲۰۶ و ۲۰۷ ۳- ایضاً: ص ۲۹۱

تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہندستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی مگر الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتقاد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت وسوراج ہے۔''(۱)

ہندوؤں کے فرقہ پرست افراد اور جماعتیں بھی مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کر کے مسلم لیگ کو اس کا موقع دیتی تھیں کہ وہ مسلمانوں کا رُخ دوقومی نظریے کی جانب مائل کر کے ان کو ہندوؤں کے دوش بہ دوش ہو کر ملک کی آزادی اور اس کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے سے روک دیں۔ مولانا کی نظر اس پہلو کی جانب بھی رہتی تھی کہ ہندو فرقہ پرستوں نے مسلمانوں کے خلاف بدگمانی اور نفرت کا جو رویہ اختیار کیا ہے، اس نے مسلم لیگ کے لیے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا راستہ آسان کر دیا ہے۔ حضرت مولانا نے رام گڑھ کے اپنے تاریخی اور یادگار خطبۂ صدارت میں اس صورتِ حال کا مکمل تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے، ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہ ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی، انھیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا، یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا، یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا، یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو

۱۔ قول فیصل: کلکتہ، البلاغ پریس، ص ۶۷، ۶۸

ایک سنگم میں مل جانا پڑا، ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا، جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا......

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے...... ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو، ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بے گانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا، ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی...... ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے، ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بہ خود بنا کرتے ہیں، اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں، علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل

ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"(۱)

ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت:

ملک کی آزادی سے زیادہ مولانا کو ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی عزیز تھی، اس کے لیے وہ ہمیشہ فکرمند اور بے چین رہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اخوت و محبت اور اتحاد و اتفاق کے رشتے میں منسلک رہنے کی ہمیشہ تاکید فرماتے رہے، ان کے دل و دماغ پر متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ و تصور ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں ملک کی آزادی کو بھی بے سود اور بے حقیقت بتاتے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ دہلی کے خصوصی اجلاس میں انھوں نے یہی حقیقت واضح کی تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی بھی نہیں مل سکتی۔ اگر آسمان سے کوئی فرشتہ بھی اُتر کر قطب مینار پر کھڑے ہو کر ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو کر ۲۴ گھنٹے میں سوراج مل جانے کی بات کہتا تو وہ سوراج سے دست بردار ہو جاتے مگر ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار نہ ہوتے کیوں کہ سوراج نہ ملنے میں صرف ہندستان کا زیاں ہوتا لیکن ہندو مسلم اتحاد جاتے رہنے سے عالم انسانیت کا نقصان ہوتا جو کسی حال میں مولانا کو گوارا نہیں تھا۔(۲)

الہلال کے اجرا کے وقت ہی سے وہ دلوں پر یہ نقش بٹھاتے رہے کہ ہندستان میں ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین فرایض انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک وہ احکامِ اسلامیہ کے ماتحت ہندستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں۔

اس اعتقاد کو وہ قرآن مجید کی نص قطعی پر مبنی بتاتے ہیں۔ ان کا اشارہ سورۂ ممتحنہ کی بعض آیتوں کی طرف ہے جس کی وضاحت مجلس خلافت کے اجلاسِ آگرہ کے خطبہ صدارت میں اس طرح کی ہے:

"قرآن مجید نے دنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱- خطباتِ آزاد: ص ۲۹۸ تا ۳۰۰ ۲- ایضاً: ص ۲۰۵

ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں، مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں، ایسی غیر مسلم قومیں جنھوں نے نہ تو حملہ کیا اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں، ایسی قوموں کے لیے قرآن ایک لمحے کے لیے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ مصالحت کریں اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں، لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمان قوموں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں، ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے جائیں اور قرآن مجید کا یہ قانون کامل انصاف اور عدالت پر مبنی ہے جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے، اس عالمگیر اور ہمہ گیر عدالت کی بنا پر قرآن مجید کا یہ اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں جو محبت، دوستی، صلح و وفاداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو، یہ حکم قطعی متعدد آیاتِ قرآنی میں موجود ہے۔"(۱)

آگے پھر فرماتے ہیں:

''اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندستان کی نجات کے لیے ہندستان میں مسلمانوں کے بہترین فرایض کے انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان میں ۱۹۱۲ء میں الہلال کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں۔ ہندستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اُسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر جو انھوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا وہ نمونہ جو خود سرورِ کائنات

۱- خطباتِ آزاد: خطبہ صدارت، مجلس خلافت آگرہ، اکتوبر ۱۹۲۱ء

نے عملاً پیش کیا ہے اور عملاً و حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے، ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرضِ شرعی ہے کہ وہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں، میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں، اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تھی، اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا، بجنسہ اس کے الفاظ ہیں انہ امۃ واحدۃ ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک اُمۃ واحدۃ بنا چاہتے ہیں، اُمۃ کے معنی ہیں قوم اور نیشن اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔"(۱)

برطانوی سامراج سے نبرد آزما ہونے اور احیاے خلافت کے لیے مسلمان رہنماؤں نے خلافت کی تحریک چلائی، جس میں مولانا نے بھی بہت سرگرم حصہ لیا اور مسلمانوں کی ہمدردی اور برطانوی حکومت سے نفرت کی بنا پر اس تحریک میں غیر مسلم رہنما بھی جوش و خروش کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، جس کے نتیجے میں قومی یکجہتی کی راہ ہموار ہوئی اور ہندو مسلم اتحاد نقطہ عروج پر پہنچ گیا، ہر طرف گاندھی جی کی جے اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر بیک آواز ہندو مسلمان کی زبان پر تھا اور سب شانہ بہ شانہ آزادی کی جنگ میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا ایسا روح پرور منظر پھر دیکھنے میں نہیں آیا، جس کی آج آزاد ہندوستان کو سخت ضرورت ہے۔

مسئلہ خلافت کے بارے میں مولانا نے جو تقریریں کیں ان کا مرکزی نقطہ قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت تھا، ۱۹۲۱ء کے جلسہ منعقدہ آگرہ کے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں:

"ہندستان کے لیے، ہندستان کی آزادی کے لیے، صداقت و حق پرستی

---

(۱) ایضاً: ص ۵۰ و ۵۱

کے بہترین فرایض ادا کرنے کے لیے ہندستان کے ہندو مسلمان کا اتفاق اوران کی یکجہتی ضروری ہے۔،،(۱)

مصالحانہ کوششیں:

ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دینے کے ساتھ ہی مولانا نے تحریک آزادی کے کارکنوں میں بددلی اور انتشار نہ پیدا ہونے اور خود کانگریس کے لیڈروں کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے بھی اہم اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں، گیا کے اجلاس میں کانگریس کے اندر شدید اختلاف رونما ہو گیا تھا، ایک طرف گاندھی جی اوران کے ساتھی ترکِ موالات کے پروگرام کو جاری رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف سی آر داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں کونسلوں میں داخل ہو کر آئینی محاذ پر جنگ کرنا چاہتے تھے، ان لوگوں نے سوراج پارٹی کے نام سے ایک الگ جماعت بنالی تھی۔ مولانا ابوالکلام اس وقت جیل میں تھے، رہا ہونے کے بعد انھوں نے کانگریس کے منتشر شیرازے کو درہم برہم ہونے سے بچانے کے لیے دونوں گروہوں میں مصالحت کی جدوجہد شروع کردی۔ گاندھی جی نے اتحاد کے لیے ۲۱ دن کا برت رکھا تھا، مولانا کی کوششوں سے دلی میں ہندو مسلم لیڈروں کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوا اوران لوگوں نے اتحاد قایم کرنے کا عہد کیا، گاندھی جی نے بھی اپنا برت ختم کردیا۔(۲)

ہندو مسلم جھگڑے ختم کرانا:

فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرانے میں مولانا پیش پیش رہتے۔ ملتان کے فرقہ وارانہ جھگڑے کی تحقیقات کے لیے جو کمیٹی بنی اس میں موتی لال نہرو کے ساتھ مولانا بھی شریک تھے، ناگ پور کے جھگڑے میں بھی موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر انھوں نے دونوں فرقوں میں سمجھوتا کرایا، بمبئی اور کلکتہ میں متعدد بڑے اجتماعات کی قیادت کی اور اتحاد کی تلقین کی،(۳) اس طرح جماعتی اتفاق اور ملکی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے مسلسل تگ ودو کی، دراصل

---

(۱) ایضاً ص ۴۶ (۲) انوار ابوالکلام: ص ۱۹۷ تا ۱۹۹

(۳) ایضاً: ص ۱۹۹

اتحاد ان کا محبوب ترین نعرہ تھا۔ جس کو عملی شکل دینے کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ فرقہ واریت کا زور توڑنے ہی کے لیے ایک موقع پر مولانا نے چودہری خلیق الزماں کو کانگریس وزارت میں شمولیت کے لیے آمادہ کرلیا تھا۔ (۱)

اشتعال انگیز بیان سے پرہیز:

مولانا فرقہ وارانہ اتحاد قایم رکھنے کے لیے ہمیشہ ایسے بیانات دینے کو ناپسند کرتے تھے جن سے فرقہ وارانہ جذبات میں اشتعال و ہیجان پیدا ہو اور ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچے۔ وہ نہ خود اس طرح کے منافرت پر مبنی، اشتعال انگیز اور غیر ذمے دارانہ بیانات دیتے تھے اور نہ دوسروں کو ایسے بیانات دینے دیتے۔ ان کے ساتھی اور کانگریس کے ارکان بھی اس طرح کا کوئی بیان دیتے تو مولانا ان کا احتساب کرتے، یہاں تک کہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح بھی ایسا نامناسب بیان دیتے تو مولانا اس پر شدید ردِ عمل ظاہر کرتے، چنانچہ ۹/جون ۱۹۳۸ء کو ان کا یہ بیان نکلا:

> ''اس وقت میں جب کہ لیگ اور کانگریس کے مابین مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور کانگریس اپنے عزیز مقصد ہندو مسلم اتحاد کے لیے اتنا آگے بڑھ چکی ہے، ایک دوسرے پر علانیہ الزام تراشی اور عام جلسوں میں بے کار کے مسائل چھیڑنا زیب نہیں دیتا۔ کم از کم ذمے دار لیڈروں کو اپنی پوزیشن اور وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات میں ایسے پر جوش اظہار سے باز رہنا چاہیے، یہ رنج کی بات ہے کہ پچھلے دنوں میں مسٹر جناح کی تقریروں کے جو حصے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان میں خلافِ توقع طور پر الزام تراشی سے کام لیا گیا۔'' (۲)

یہی تلقین وہ ہندو رہنماؤں اور کانگریس کے لیڈروں کو بھی کرتے تھے۔

---

(۱) ایضاً: ص ۲۰۹ (۲) ایضاً: ص ۲۲۴

مولانا کے افکار کی معنویت:

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بارے میں مولانا کے ان احساسات وخیالات کی معنویت آج بھی نہ صرف پوری طرح قایم وباقی ہے بلکہ پہلے سے زیادہ اہم اور ضروری ہوگئی ہے۔ ملک میں اختلاف وانتشار کا جو ماحول بن رہا ہے اور فرقہ واریت جو بال وپر نکال رہی ہے وہ ہمیں تفریق غلامی کی طرف لے جارہا ہے، اس کو ختم کرنے کے لیے مولانا کے بتائے ہوئے اصول وخطوط کی روشنی میں ملک کی تعمیر وترقی کا نیا نقشہ بنانے کی ضرورت ہے ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا اور اس کی سیاسی آزادی بھی باقی نہیں رہے گی، آزادی کے بقا وتحفظ اور اسے مفید وبامقصد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہندو مسلمانوں کو شک وشبہ کی نظر سے نہ دیکھیں، ان پر اعتماد کریں، کروڑوں انسانوں کو نہ فساد اور دنگے سے معدوم اور نیست ونابود کیا جاسکتا ہے اور نہ انھیں غیر مطمئن، پریشان اور پست وذلیل رکھنے میں ملک وقوم کی بھلائی ہے، ہندوؤں کی فسطائی جماعتیں اور احیائی تحریکیں اپنی موجودہ روش کو بدلیں، مسلمانوں کو ان کے جائز وجمہوری حقوق سے محروم کر کے نہ ملک وقوم کا سر اُونچا کیا جاسکتا ہے اور نہ آزادی کو باقی رکھا جاسکتا ہے، قدرت کے فیصلے کو یہ احیائیت پسند جماعتیں بدل نہیں سکتیں البتہ اپنی سرگرمیوں سے ملک کے اتحاد دیک جہتی کو نقصان پہنچا سکتی اور ہندستان کو انتشار اور تباہی سے دوچار کرسکتی ہیں۔

مسلمانوں کو بھی حقیقت پسندی سے کام لے کر قدرت کا یہ فیصلہ ماننا ہوگا کہ ہندستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مشترک زندگی ان کا مقدر بن چکی ہے، جو سانچا وجود میں آگیا ہے، اسے توڑا نہیں جاسکتا۔ اس لیے مسلمانوں کو علاحدگی پسندی کا رجحان چھوڑ کر ان طاقتوں کا ساتھ دینا ہوگا جو ملک میں سیکولرازم، قومی یک جہتی اور جمہوریت کو فروغ دینا چاہتی ہیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ ملک کی آزادی کی کامیابی کا انحصار ہندو مسلم اتحاد کی مضبوطی اور پائیداری پر ہے۔

ملک کی آزادی وسالمیت کی طرح یہ بھی مولانا کا ایک اہم مقصد تھا، وہ آزادی سے

دست بردار ہو سکتے تھے مگر ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی وحدت و سالمیت سے کسی قیمت پر نہ کبھی دست کش ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ملک کا معیار و مذاق روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے، اخلاق و روحانیت کا تصور ہی مٹ گیا ہے، عوام میں سیاسی شعور، پختگی، بالغ نظری اور نفع و نقصان کی پہچان نہیں ہے اور سیاست دانوں اور لیڈروں کو ملک کی لوٹ کھسوٹ کا چسکا لگ گیا ہے، وہ عہدے، اقتدار اور وزارتوں کے لالچ میں ہر بے اصولی و بدعنوانی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں خدا جانے آزاد ہندستان کا وہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوگا جسے مولانا آزاد اور ان کے رفقاے کار نے دیکھا تھا۔

مولانا آزاد کی روح اپنے ہم وطنوں اور خصوصاً ہم مذہبوں کو یہ پیام دے رہی ہے۔

''اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں''

آزادی کے بعد مسلم مسایل اور مولانا آزاد

پروفیسر عبدالمغنی

آزادی کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے تناظر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ دو جہتوں سے کیا جاسکتا ہے یا تو ہم اپنے مطالعہ کو آزادی کے صرف ان دس برسوں کی مدت میں محدود رکھیں، جس کے شاہد خود مولانا آزاد بھی تھے یا پھر پچھلے چالیس بیالیس برسوں پر اس حیثیت سے نظر ڈالیں کہ اگر مولانا آزاد آج زندہ ہوتے تو وہ ہمیں کس قسم کی رہنمائی مہیا کرتے۔ پہلی صورت کو ہم مسئلے کا تاریخی اور دوسری کو تخمینی مطالعہ کہہ سکتے ہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تخمینی مطالعہ کرنے کے بجائے ہم صرف دس برسوں تک اپنے کو محدود رکھیں اور دیکھیں کہ اس مدت میں مولانا آزاد نے مسلمانوں کو کس طرح کی رہنمائی عطا کی تو ہمارا یہ مطالعہ نسبتاً ٹھوس بنیادوں پر مبنی ہوگا۔ یہ خیال بہت حد تک درست ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں دونوں جہتوں سے مطالعہ کرنا چاہیے کیوں کہ اگر ہم نے اپنے آپ کو انھیں دس برسوں میں محصور رکھا تو مطالعہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہ ہوگا۔

آزاد کے ابتدائی دن کچھ ایسے ذہنی، سیاسی اور فکری انتشار کے دن تھے کہ بڑے بڑے بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج کے حالات کل کیا رُخ اختیار کریں گے۔ اگرچہ ملک کی تقسیم ہو چکی تھی اور اصولی طور سے مسلمان پاکستانی اور ہندستانی دو قومیتوں میں بٹ چکے تھے لیکن اس واضح خط تقسیم کے باوجود ''جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی تھا اور یوں بھی'' سب تو نہیں تاہم بہت سارے مسلمان اس وقت ہندستان میں رہتے ہوئے بھی عملاً پاکستان میں رہ رہے تھے اور اپنے کو ایسا پاکستانی سمجھ رہے تھے جو حالات کا شکار ہو کر دیارِ غیر میں پھنس گیا ہو اور

اس انتظار میں چاروناچار وقت کاٹ رہا ہو کہ کب موقع ملے اور کب بھاگ نکلے۔ اس وقت ملک کی کیفیت وہ تھی جس سے مولانا آزاد نے تقسیم سے قبل ۱۵/اپریل ۱۹۴٦ء کو خبردار کر دیا تھا کہ:

''آیئے جذبات سے الگ ہو کر ذرا ان نتائج پر غور کریں جو پاکستان بن جانے کے بعد لازماً پیدا ہوں گے۔ ہندستان دو مملکتوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک میں مسلمان اور دوسری میں ہندو اکثریت میں ہوں گے۔ ہندستان کے مختلف صوبوں میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان اقلیت کی شکل میں کچھ اس طرح بکھر کر رہ جائیں گے کہ وہ اس وقت کی ہندو اکثریت کے صوبوں میں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور ہوں گے جن علاقوں کو وہ ایک ہزار سال سے اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں اور جہاں انھوں نے مسلم تہذیب و ثقافت کے اہم مراکز بنا رکھے ہیں وہاں ایک روز صبح کو جب وہ بیدار ہوں گے تو انھیں اچانک معلوم ہوگا کہ وہ اجنبی اور غیر ملکی بن گئے ہیں۔ صنعتی، تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ ہوتے ہوئے وہ اس صورت میں بننے والے خالص ہندو راج کے رحم و کرم پر زندہ رہنے پر مجبور ہوں گے۔''

(انڈیا ونس فریڈم: ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۱)

تقسیم کے بعد مولانا کی یہ پیشین گوئی صحیح نکلی۔ مسلم قومی قیادت جو تمام عمر متحدہ ہندستان کے لیے لڑتی رہی تھی کچھ اس طرح سے بے اثر اور بے آواز بن گئی گویا اس کا وجود ہی نہ ہو۔ تقسیم پسند قیادت تو یہاں سے رُخصت ہو چکی تھی لیکن اس کے کیے کا خمیازہ ہندستان میں رہ جانے والے مسلمان بھگت رہے تھے۔ ایسے موقع پر اگر کوئی سامنے آیا تو وہ مولانا آزاد ہی تھے۔ اگرچہ انھیں مسلمانوں سے شکایت تھی جس کا اظہار انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مسلمانانِ دہلی کے سامنے کیا بھی تھا کہ جب تقسیم سے قبل اُنھوں نے مسلمانوں کو صحیح سیاسی راہ پر چلنے کی دعوت دی تو ان کی زبان تراش دی گئی، جب انھوں نے قلم اُٹھایا تو ان کے ہاتھ قلم کر دیے گئے، جب انھوں نے چلنا چاہا تو ان کے پاؤں کاٹ دیے گئے، جب انھوں نے کروٹ

لینی چاہی تو ان کی کمر توڑ دی گئی۔ اب وہ دور افتادہ صدا تھے۔ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی ایک غریب الوطن۔ ایسی صورت میں اگر وہ مسلمانوں سے منہ موڑ لیتے تو ہمیں ان سے شکایت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ خود انھوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ جو لوگ ہمت ہار چکے تھے ان کی بھی ہمت بندھائی۔ مولانا اگرچہ بقول خود کنایوں اور اشاروں میں باتیں کرنے کے عادی تھے، لیکن ایسے موقع پر اپنی عادت کے برخلاف انھوں نے اسی جلسے میں علی الاعلان کہا کہ ہراس کا موسم عارضی ہے، میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی دوسرا زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اُٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں سے سنی ہیں۔ اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش وخروش بے جا تھا، اسی طرح آج یہ خوف وہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر کوئی طاقت تمھیں بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے۔ میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ قرآن کا یہ اعلان ہے کہ:

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

اس طرح مولانا نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ہندستانی مسلمانوں کو ایسے وقت میں جب وہ بلا امتیاز اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہے تھے۔ یہ بات سمجھائی کہ تقسیم کے باوجود ہندستان پر دوسروں کی طرح ان کا بھی حق ہے اور ان کی قسمت کے بنانے یا بگاڑنے میں دوسروں کے ساتھ ان کا بھی ہاتھ ہوگا۔ آج چار دھائیاں گزر جانے کے بعد کچھ لوگ یہ کہہ

سکتے ہیں کہ مولانا نے لفظی ڈھارس بندھانے کے سوا اور کیا کیا۔ انھوں نے کچھ طعن و تشنیع کے تیر چلائے زخموں پر کچھ نمک پاشی کی اور جب تڑپ زیادہ دیکھی تو سکون کے لیے کچھ شبنم افشانی بھی کی اور پھر اس کے بعد وزارت کے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ حال آں کہ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ زندگی کے بقیہ دن حکومت کے وزیر بننے کے بجائے مسلمانوں کے سفیر بن کر گزارتے۔ یہ بھی ایک اندازِ فکر ہے اور ہم اسے بالکلیہ نظرانداز نہیں کر سکتے، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ خواہشات اور اُمیدوں کا نام نہیں ہے تاریخ واقعات اور حادثات سے بنتی ہے۔ جس طرح جماعتوں کے فیصلے کی تصحیح یا تغلیط بعد میں تاریخ کرتی ہے اسی طرح فرد کے ہر اقدام کا فیصلہ بھی تاریخ ہی کرتی ہے۔ فرد حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے لیے ایک لائحہ عمل طے کرتا ہے اور کبھی کبھی پوری دیانت داری کے ساتھ ایک ایسا قدم اُٹھاتا ہے جسے دنیا غلط سمجھتی ہے لیکن یہ فیصلہ بعد میں ہوتا ہے کہ کیا صحیح تھا اور کیا غلط؟ بہر حال مردِ مومن وہ ہوتا ہے جو تجربے میں آئی ہوئی غلطیوں کو بار بار نہیں دہراتا۔ تقسیم کے بعد مولانا کے سامنے بھی دو راستے تھے۔ حکومت میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی بہبود کے لیے اپنے اثرات کو کام میں لائیں یا پھر حکومت سے الگ ہو کر مسلم حزبِ مخالف کے قاید کا رول ادا کریں۔ انھوں نے اپنے گزشتہ تجربات کی روشنی میں اوّل الذکر راستہ کو ترجیح دی۔

مولانا آزاد کی زندگی میں ۱۹۴۷ء سے پہلے دو ایسے ہی فیصلہ کن مواقع آئے تھے۔ جب انھوں نے اپنے ہمدردوں اور مخلص مشیروں کی رائے کے برخلاف اپنی اس رائے پر عمل کیا تھا کہ پارٹی یا حکومت کے عہدوں کو چھوڑ کر آزادانہ طریقے سے وہ ملک و ملت کی خدمت کریں گے لیکن وقت نے ان کی زندگی ہی میں یہ ثابت کر دیا کہ ان کا فیصلہ صحیح نہ تھا۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں جس وقت تبادلہ اختیارات کی گفتگو نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ کانگریس کے نئے صدر کے انتخاب کا وقت آ گیا۔ مولانا نے اپنی بعد از مرگ سوانح ''انڈیا وِنس فریڈم'' میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے کانگریسی لیڈر یہ چاہتے تھے کہ مولانا ہی دوبارہ صدر بنیں لیکن سب کے اصرار کے باوجود وہ اپنی اس رائے پر اڑے رہے کہ جمہوری اقدار کا تقاضا ہے کہ کوئی ایک ہی شخص ایک طویل مدت تک صدارت کی

کرسی پر نہ بیٹھا رہے اس لیے انھوں نے لوگوں کے اصرار کے باوجود اپنے نام کو صدارت کے عہدے کے لیے پیش کرنے کی اجازت نہ دی لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ مولانا کی رائے درست نہ تھی۔ اگر وہ صدر کی حیثیت سے تبادلہ اختیار کی گفتگو کو آخری مرحلے تک پہنچاتے تو شاید ہندستان کا نقشہ وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ مولانا کو اپنے اس اقدام پر ہمیشہ افسوس رہا اور اسے وہ گاندھی جی کے الفاظ میں ہمالیائی غلطی سے تعبیر کرتے رہے۔

ایسا ہی ایک اور فیصلہ کن لمحہ عبوری حکومت کی تشکیل کے وقت اگست ۱۹۴۶ء میں مولانا کے سامنے پھر آیا۔ مولانا کے ساتھیوں کی رائے تھی کہ وہ بھی عبوری حکومت میں شریک ہو جائیں لیکن خود مولانا کا خیال تھا کہ وہ ایوانِ حکومت سے باہر رہ کر زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے لوگوں کے اصرار کے باوجود حکومت میں شرکت منظور نہیں کی لیکن ان کا یہ فیصلہ بھی وقت نے غلط ثابت کر دیا اور انھیں اپنی سوانح میں اقرار کرنا پڑا کہ وہ حکومت کے اندر رہ کر ملک وملت کی خدمت زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے تھے۔

کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کو واپس لانا تو مولانا کے لیے ممکن نہ تھا، لیکن یہ تو ان کے بس میں تھا کہ دو بار کے تجربوں کے بعد پھر اسی قسم کا تجربہ نہ کریں۔ شاید اسی لیے انھوں نے ۱۹۴۷ء کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ ایوانِ وزارت میں رہتے ہوئے وہ حالات پر زیادہ آسانی کے ساتھ قابو پا سکتے ہیں اور ہمیں اس بارے میں ان کی نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہیے دیکھنا صرف یہ چاہیے کہ ان چند برسوں میں انھوں نے کچھ ایسے کام کیے یا نہیں جن کا فایدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ مسلمانوں کو پہنچا ہو۔

اُردو اگرچہ خالصتاً مسلمانوں کی زبان نہیں ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہندستان میں اُردو کا رشتہ مسلمانوں سے جڑا ہوا ہے۔ اُردو سے محبت کرنے والے اس کے لیے جینے اور مرنے والے بہتیرے غیر مسلم ملیں گے لیکن جماعتی حیثیت سے اُردو اگر کسی کی مادری زبان کہی جا سکتی ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں۔ تقسیم سے قبل اُردو ہندی کے قضیے پر جتنی بحثیں ہوتی تھیں وہ جب آج بھی ذہنوں میں تازہ ہیں تو ۱۹۴۷ء میں اس مسئلے پر لوگوں کے دل و دماغ کی جو کیفیت رہی ہوگی اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اعلانِ

آزادی نے اُردو مسلم پاکستان...... ہندی ہندو ہندستان کی صدائے بازگشت کو بالکلیہ محو تو نہیں کر دیا ہوگا۔ ایسے ماحول میں ماضی کی تلخ یادوں کے ساتھ ہندستان کے لسانی شیڈول میں دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی باعزت جگہ دلانے میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مولانا آزاد کا ہاتھ نہیں تھا اور کیا یہ خدمت وہ اس وقت کے ماحول میں ایوانِ حکومت سے باہر رہتے ہوئے کر سکتے تھے؟ اسی طرح انجمن ترقی اُردو کی نشاۃ ثانیہ بھی مولانا ہی کی مرہونِ منت ہے؟ آج مختلف ریاستوں میں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے جو مختلف اکیڈمیاں اور بورڈ کام کر رہے ہیں وہ اگرچہ براہِ راست مولانا آزاد کے کھاتے میں نہیں ڈالے جا سکتے لیکن انھیں مولانا آزاد کی ابتدائی کوششوں کی توسیع تو بہرصورت کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہمارا مقصد ''وزیرِ تعلیم مولانا آزادؒ'' کی خدمات اور کارناموں سے بحث کرنا نہیں ہے اس لیے ہم نے یہاں صرف اُردو زبان کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق براہِ راست مسلمانوں سے ہے، ورنہ انھوں نے اعلیٰ جامعاتی تعلیم، سائنسی تحقیق و تفتیش اور فنون و ثقافت کی ترویج و اشاعت کے لیے جو کچھ کیا ہے اُن کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان سے استفادہ، بالواسطہ ہی سہی، مسلمان بھی کر رہے ہیں۔

ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مولانا آزاد مسائل کو ہندو مسلم خانوں میں تقسیم کر کے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر مسئلہ ہندستان کا ہوتا تھا۔ ہندستان کی ترقی ان کے خیال میں اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی تھی جب تک ہندستانی قوم کا ایک ایک جز ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو۔ مولانا اور دوسرے زعما کی طرزِ فکر کا یہ بنیادی فرق ہے جسے عام طور سے لوگ صرف نظر انداز ہی نہیں کرتے بلکہ اسی کے باعث مولانا کے بارے میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کے قاید کی حیثیت سے کھل کر سامنے نہیں آئے۔ حال آں کہ مولانا کی کتابِ زندگی کا ایک ایک ورق شاہد ہے کہ تقسیم سے قبل بھی جب فرقہ وارانہ مسئلہ ہر قسم کے سیاسی حل کی راہ میں پہاڑ بن کر سامنے آجاتا تھا تو وہ ہندو مسلم کی عینک سے مسائل کو دیکھنے کے بجائے ہندستان کی عینک سے دیکھتے تھے۔

اس فکری اختلاف کی واضح مثال کے لیے ہمیں اس صدی کی تیسری دہائی کی طرف واپس جانا ہوگا۔ ۱۹۳۷ء میں جب کئی صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے

حکمرانی کے نشے اور جوش میں بعض ایسے قدم بھی اُٹھائے جسے مسلمانوں نے عام طور سے ''مسلم دشمنی'' قرار دیا۔ وہ اس بات پر برافروختہ ہوئے کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کو ان کی تہذیبی اور مذہبی روایات سے منقطع کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مسلم لیگ کے لیے تو ضروری تھا کہ وہ معاملات کو اپنی خاص عینک سے دیکھے اور رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرے۔ اس لیے اس کے رویے پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ اس وقت ایسی قوم پرست مسلم جماعتیں بھی موجود تھیں جو بالواسطہ طور سے مسلم لیگ کے موقف کو تقویت پہنچا رہی تھیں۔ دو سال کے اندر ہی اندر کانگریسی وزارتیں جنگ میں شرکت کے سوال پر مستعفی ہو گئیں۔ اس وقت مسلم لیگ نے راجا صاحب پیرپور کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی، جس کی رپورٹ پیرپور رپورٹ کہلاتی ہے۔ اس رپورٹ کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے اس لیے انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن شکایات کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مشہور کناڈین محقق ڈبلو سی اسمتھ کے تبصرے کو یاد کر لیں! واضح رہے کہ اسمتھ ایک غیر ہندی عیسائی ہیں۔ انھوں نے اسی زمانے میں اپنی مشہور کتاب ''ماڈرن اسلام اِن انڈیا'' میں پیرپور رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ''بعض جرایم جن کی اس میں شکایت کی گئی تھی، واضح طور پر احمقانہ تھے۔ مثال کے طور پر یہ شکایت کہ کانگریسی حکومت نے بندے ماترم کے گائے جانے اور قومی ترانے اور ترنگے جھنڈے کے استعمال پر سے وہ پابندی ہٹا دی جو برطانوی حکومت نے عاید کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ بعض ادنیٰ قسم کی ناانصافیاں تھیں جنھیں سمجھ دار لوگ بمشکل ''شکایات'' کے زمرے میں رکھیں گے مثلاً صوبہ متوسط میں مسلمانوں کی کل آبادی چار فیصد تھی اور ان میں بھی یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنے اُردو خواں تھے تاہم اس صوبے کی اسمبلی میں اُردو میں تقریر کرنے کی اجازت تو دی گئی لیکن انھیں قلم بند ہندی یا انگریزی میں کیا گیا۔''
>
> (لاہور، طبع دوم ۱۹۶۳ء، ص ۲۴۰)

بہر حال الزامات کے ادنیٰ یا احمقانہ ہونے سے جو کمیٹی کی نظروں میں ''حقیقی'' اور سچے تھے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ مسلم لیگ کی رپورٹ اس کے اپنے نقطہ نظر سے تھی لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس معاملے میں جمعیۃ العلماء ایسی قوم پرست مسلم جماعت نے بھی کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کی آواز سے آواز ملائی تھی۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ مسلم لیگ اپنی تنقید کا نشانہ کانگریس کو بنا رہی تھی اور جمعیۃ العلماء جس کا کانگریس سے برادرانہ تعلق تھا کانگریسی وزارتوں کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی لیکن نتیجہ تو دونوں کا بہر حال ایک ہی تھا۔ ہم سردست اعتراضات کی ان تفصیلات میں نہیں جا سکتے جو جمعیۃ العلماء نے اپنے گیارھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۹ء میں ایک ریزولیوشن کے ذریعے کانگریسی وزارتوں پر لگائے تھے۔ ہاں ان شکایات کو دور کرنے کے لیے اس نے جو مطالبات کیے تھے، انھیں یہاں مختصراً پیش کرتے ہیں کہ ان سے شکایات کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں کے لیے مطالبہ کیا تھا کہ:

۱- بالکل ابتدائی درجات میں بھی مخلوط تعلیم بندی کر دی جائے۔

۲- قرآن حفظ کرنے والے لڑکوں اور بارہ سال کی عمر کی لڑکیوں کو جبری تعلیم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

۳- مسلمان بچوں کے لیے موسیقی، مصوری، رقص کی تعلیم ممنوع قرار دی جائے۔

۴- مسلمان بچوں سے خلافِ مذہب کوئی کام نہ کرایا جائے مثلاً انھیں مجسموں کی تعظیم کرنے یا ہاتھ جوڑ کر غیر اسلامی طریقے سے دُعائیہ نظمیں پڑھنے یا غیر اسلامی گیت گانے پر مجبور نہ کیا جائے۔

ہمارا مقصد یہاں ان ساری شکایات اور تجاویز کا اعادہ کرنا نہیں ہے جن کا اظہار قوم پرست علماء کی طرف سے کانگریسی وزارتوں کے خلاف کیا گیا تھا اوپر جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ قوم پرست علماء جن کی نظروں میں ہر ہندستانی بلا لحاظ عقیدہ ہندستانی قوم کا ایک اٹوٹ حصہ تھا متحدہ قومیت کی فکر کے منطقی نتائج کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس معاملے میں ان کا موازنہ آزاد کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا

کیوں کہ آزاد کے نزدیک کسی بھی مذہبی گروہ کے سارے اعمال جزو مذہب نہیں ہوتے اس لیے ان میں کوئی بھی تبدیلی اس جماعت کے مذہبی اور ثقافتی ورثہ کے لیے لازمی طور سے خطرہ نہیں بنتی۔ شاید یہی سبب تھا کہ مولانا آزاد نے کانگریسی وزارتوں کی خامیوں کو ہندو مسلم نقطہ نظر سے نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنی بعداز مرگ سوانح میں لکھا ہے کہ:

> ''میں کئی صوبوں میں پارلیمانی معاملات کا انچارج تھا۔ ہر واقعہ جس کا تعلق فرقہ وارانہ معاملات سے ہوتا تھا میرے سامنے آتا تھا۔ اس لیے میں ذاتی علم کی بنا پر پوری ذمے داری سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کے الزامات بالکل غلط تھے۔ اگر ان الزامات میں ذرّہ برابر بھی صداقت ہوتی تو میں اس بات کی پوری کوشش کرتا کہ ان ناانصافیوں کی تلافی ہو جائے۔ اگر ضرورت ہوتی تو اس مسئلے پر میں استعفا بھی دے دیتا۔'' (ص ۲۵)

ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ تقسیم کے بعد بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ اختلافات کے سیلاب کا مولانا پر کچھ اثر نہ ہوا ہوگا کیونکہ بہت سارے دوسرے سیاسی اکابرین کی فہم کے برخلاف مولانا آزاد کے خیال میں ہندو مسلم اتحاد ایک حکمت عملی نہیں بلکہ بذاتِ خود مطلوب تھا۔ ان کے نزدیک نہ صرف ہندستان بلکہ پوری انسانیت کی بقاء اس فرقے وارانہ اتحاد پر مبنی تھی۔ وہ ۱۹۲۳ء میں دہلی کے اجلاس خصوصی (کانگریس) میں اپنے اس خیال کا اظہار کر چکے تھے کہ:

> ''آج اگر آسمانوں سے ایک فرشتہ قطب مینار پر اُتر کر اعلان کرے کہ ہندستان کو ابھی آزادی مل جائے گی بشرطے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی بات کرنا چھوڑ دے تو میں یقیناً ایسی آزادی کو رد کر دوں گا اور اتحاد کی تبلیغ کرتا رہوں گا۔ اگر آزادی ملنے میں تاخیر ہو جائے تو یہ صرف ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر اتحاد جاتا رہے تو یہ انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

یہ جو کچھ مولانا نے کہا تھا وہ صرف لفظی بازی گری نہیں تھی بلکہ وہ ان کے دل کی آواز تھی

اور زمانہ شاہد ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں اکابرین سیاست نے ہندو مسلم اتحاد کی قیمت پر آزادی قبول کی تو اس وقت بھی اس طرزِ عمل کے خلاف تنہا آواز صرف مولانا کی تھی لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ اسے ہم مولانا کی بدنصیبی ہی کہہ سکتے ہیں کہ انھیں نہ ان کے دوستوں نے سمجھا اور نہ دشمنوں نے۔ سچ جب کوئی شخص مستقبل کو حال کے صیغے میں بیان کرنے لگتا ہے تو اس کی بات سننے والوں کے سر کے اُوپر سے گزر جاتی ہے۔ تقسیم کے بعد انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو سمجھایا تھا کہ:

> ''ایک ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اُٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔ کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہوسکتا ہے لیکن قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورت حال سے نمٹ سکتے ہیں مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے۔''

(بحوالہ ''ایوان اُردو۔ دہلی''، آزاد نمبر ۱۹۸۸ء)

مولانا کی یہ پیشین گوئی آج ہر قسم کے تبصروں سے بالا ہے۔ چالیس سال پہلے جو انھوں نے دیکھا تھا وہ ہم آج دیکھ رہے ہیں۔

''انڈیا وِنس فریڈم'' کے بقیہ اجزا کی اشاعت کے بعد تو اس بات میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ جاتا کہ مولانا آزاد فرقہ وارانہ اتحاد کی قیمت پر آزادی خریدنے کو تیار نہیں تھے۔ اب یہ بات بالکل دوسری ہے کہ انھیں صفحات کی بنیاد پر بعض بڑے بڑے سیاسی دانشور آج ہمارے ذہنوں میں یہ بات اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سہارے بٹھانا چاہتے ہیں کہ مولانا آزاد خود بڑے مسلم فرقہ پرست تھے اور وہ آزادی کو تعویق میں ڈال کر پورے ہندستان پر مسلم سیاسی بالادستی قایم کرانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!

مولانا آزاد نے اقلیت اور اکثریت کے سوال کو ریاضی کے اصولوں سے حل کرنے کی کوششوں کو کبھی نہیں سراہا۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ مسلمان غیر منقسم ہندستان میں بحثیت مجموعی تعداد کے اعتبار سے ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے لیکن ان کا خیال تھا کہ ضروری نہیں ہے کہ جو گروہ ریاضی کے اعتبار سے اقلیت میں ہو وہ سیاسی اعتبار سے بھی ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ سیاست اور ریاضی کے اصول الگ الگ ہوتے ہیں۔ ریاضی میں دو ہمیشہ ایک سے بڑا ہوگا لیکن سیاست میں ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ ایک اپنے کو دو سے بڑا ثابت کرنے کا اہل ہو جائے۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

> ''بنیادی غلطی یہ ہے کہ مسلمان کو اقلیت میں ہونے کا خوف لاحق ہے۔ وہ اپنی تعداد کی طرف سے فکرمند رہتے ہیں حال آں کہ خدا کی نظروں میں تعداد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ تعداد کا مسئلہ ہماری سیاسی سرگرمیوں کا محور بن گیا ہے۔ ہم انڈین نیشنل کانگریس میں اس لیے شریک نہیں ہو سکتے کہ ہندو ہمیں ہضم کر جائیں گے۔ ہم حکومت خوداختیاری کا مطالبہ اس خوف سے نہیں کر سکتے کہ حکومت ہندوؤں کی ہو جائے گی۔ ہمیں ہندوؤں سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ خوف صرف خدا سے لازم ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندستان میں رہنا ہے تو انھیں اپنے پڑوسیوں کو گلے لگانا ہوگا۔ اگر پڑوسیوں کی طرف سے تعاون میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اسے نظرانداز کر دینا چاہیے۔ مسلمان زمین پر خدا۔ کے خلیفہ ہیں اس لیے انھیں خدا کی طرح معاملات پر اُوپر کی سمت سے نظر ڈالنی چاہیے۔ اگر دوسرے ان سے اچھی طرح پیش نہیں آتے تب بھی انھیں بھلے مانسوں کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ بڑے بچوں کے چھیڑنے پر چیختے چلاتے نہیں۔ ان کی حرکتوں کو مسکرا کر

نظر انداز کر دیتے ہیں۔"

یہ صرف ایک جذباتی تقریر نہ تھی بلکہ ان کے دل کی آواز تھی جوان کے اس عقیدے کی صدائے بازگشت تھی کہ قومیں مذہب کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتیں۔ تقسیم سے قبل اس موضوع پر بڑے بڑے مباحثے ہو چکے تھے جن کی تفصیلات بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ آزاد چوں کہ فطرتاً بحث و مباحثہ سے دامن بچائے رکھتے تھے اس لیے وہ ان مباحثوں میں تو نہیں پڑے لیکن اپنے اس خیال پر وہ ہمیشہ قایم رہے اور مرتے دم تک اس خیال سے دست بردار نہیں ہوئے۔

۱۹۴۸ء میں جب انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کو لکھنؤ کنونشن میں مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ جداگانہ سیاست کا کھیل بند کر دیں اور اپنی اپنی پسند کی غیر مذہبی سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر جمہوری ہندستان کی ترقی اور بقا کے لیے جدوجہد کریں تو یہ کوئی اعتراف شکست نہ تھا۔ یہ وہی ریاضی اور سیاست کے اصولوں کی بات تھی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آزاد کے نسخے پر عمل کرنے کی وجہ سے حالات بالکلیہ تبدیل ہو گئے لیکن یہ سوال تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ ہم نے اس نسخے پر عمل ہی کتنے دنوں تک کیا۔ ۱۹۵۸ء کے اوائل میں مولانا آزاد ہم سے جدا ہو گئے تھے اور ان کے جانے کے پانچ ہی برس کے اندر اندر ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈال کر ہم پھر اپنی ڈگر پر واپس چلے گئے۔ کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دس پندرہ برسوں میں جو کچھ ہوا اور اب تک جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیش نظر ضروری تھا کہ ہم معالج کو بدل دیں۔ مولانا آزاد تو اب موجود نہیں ہیں جو یہ شکایت کریں کہ تم نے معالج کے بدلنے میں عجلت سے کام لیا لیکن اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مرض ختم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ کون سا نسخہ زیادہ مفید ہے۔ اس بات کا پتا چلانا خود مریض کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہم نے ابھی تک اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا ہے کہ پہلے دس پندرہ برسوں میں حالات کیا تھے اور اب کیا ہیں اور مرض میں جو اضافہ ہوا ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ یہ مطالعہ ہمیں جذبات سے بلند ہو کر خالص علمی نہج پر کرنا ہوگا۔ آزادی کے ابتدائی برسوں میں مسلمانوں پر جو بھی قیامت گزری وہ تقسیم کا منطقی نتیجہ تھی اور آپ جانتے ہیں کہ منطق کی اپنی منطق ہوتی ہے وہ کسی کی پسند یا ناپسند پر مبنی نہیں ہوتی اس لیے ہمیں ان چالیس برسوں کو

مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہر ہر دور کا جدولی مطالعہ کرنا چاہیے۔

پہلا دور تو وہ ہے جب مسلمانوں نے خواستہ یا ناخواستہ مولانا آزاد کے نسخے پر عمل کیا۔

دوسرا دور وہ ہے جب مسلمان اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کے لیے پھر سے الگ مسلم سیاسی پلیٹ فارم بنانے لگے اور

تیسرا دور وہ ہے جب دوسروں کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی اپنے سیاسی پلیٹ فارم کا حصہ بخرا کرنے لگے اور اس منزل پر پہنچ گئے جہاں جماعتوں کی شناخت قوسین میں لکھے ہوئے حروف تہجی کے ذریعے ہوتی ہے۔

ان تینوں ادوار کے گراف بنا کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہر ہر دور میں مرض اور صحت کے جدولی خطوط کے پیچ وخم میں کیا تناسب رہا ہے۔ اس قسم کے مطالعے کی سنجیدہ کوشش ہم نے ابھی تک نہیں کی ہے اور جب تک ہم اس قسم کا مطالعہ نہ کرلیں اس وقت تک یہ کہنا دیانت داری کے خلاف ہوگا کہ مولانا آزاد نے ہندستان کے آزاد ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے مسائل کے دیرپا حل کے لیے کوئی مناسب قدم نہیں اُٹھایا۔

باب ۵

آثار وافادات

سیاسیہ وتاریخیہ

فہرست مضامین

مولانا آزاد...... کچھ دستاویزی حقائق "آثارِ آزاد" کی روشنی میں

پروفیسر اختر الواسع

مولانا نے آزاد ہندستان کے دس بارہ برسوں میں زندگی کا جو راستہ اختیار کیا اس کے بارے میں غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ یہ بات تقریباً ہر شخص بھلا دیتا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر بڑے ادارے کی تشکیل میں کسی نہ کسی سطح پر مولانا کی بصیرت سرگرم دکھائی دیتی ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی، لَلِت کلا اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکیڈمی اور آئی سی سی آر کے قیام سے قطع نظر آزاد ہندستان کے ابتدائی برسوں میں تعلیم و تحقیق کے جو بھی مراکز قائم ہوئے ان کے خواب نامے اور ان کے لائحہ عمل دونوں پر مولانا کے شعور کی مہر ثبت ہے۔ مولانا جس بسیط اور ہمہ گیر نظامِ اقدار کی روشنی میں ایسے تمام مراکز اور اداروں کو فروغ پذیر دیکھنا چاہتے تھے ہمارے عہد کے سیاسی کلچر نے اس کے خدوخال بڑی حد تک مسخ کر دیے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا نے عافیت کوشی کی خاطر اپنے مقاصد کو قربان کر دیا اور اس راستے سے ہٹ گئے جو وہ اس ملک کی اجتماعی تہذیب اور تاریخ کی خاطر ہموار کرنا چاہتے تھے۔ یہ ایک پر پیچ اور طویل موضوع ہے اور اس پر تفصیل سے گفتگو کی جانی چاہیے۔ لیکن سردست میں اپنے معروضات اس سلسلے کی صرف ایک کڑی تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

مارچ ۱۹۹۰ء میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ مولانا کی کچھ اہم اور نادر تحریروں پر مشتمل ایک کتاب "آثارِ آزاد" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مرتب آرکائیوز کے

ڈائریکٹر ڈاکٹر راجیش کمار پرتی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب چھپتے ہی متنازعہ قرار دے دی گئی۔ اور بعض مصلحتوں کے پیش نظر اس کی عام اشاعت پر پابندیاں عاید کر دی گئیں۔

اس کتاب میں مولانا کی دوسوسترہ (۲۱۷) تحریریں شامل ہیں۔ یہ تحریریں نوٹس اور خطوط کی شکل میں ہیں۔ مولانا کی تحریریں جن لوگوں کی نظر سے گزری ہیں وہ ان خطوط اور نوٹس میں مولانا کا ایک الگ انداز دیکھیں گے۔ یہ تحریریں ان معاملات اور مسائل سے متعلق ہیں جو آزادی کے اوایل میں سامنے آئے۔ مولانا ان پر اپنی مخصوص بے باکی اور صاف گوئی سے رائے زن ہیں۔ یہاں مولانا ٹھوس حقایق سے نبرد آزما ہیں اور ان کے انداز سے صاف ظاہر ہے کہ باوجود تقسیم کی ٹریجڈی کے انھوں نے احساسِ ناکامی اور مایوسی کو اپنی معاملہ فہمی اور بصیرت پر اثر انداز نہیں ہونے دیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے نہ تو شکست قبول کی تھی اور نہ ملکی سیاست میں اپنی حیثیت میں کوئی کمی محسوس کی تھی۔ اگرچہ تھے محض وزیر تعلیم اور کابینہ کے ایک رُکن لیکن ان کی نظر ملک کے انتظامی اور سیاسی پہلوؤں پر بھی تھی اور ان پر بلاکم و کاست اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر سختی سے فہمایش و سرزنش سے بھی پہلوتہی نہیں کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ تو گوشہ نشینی اختیار کی تھی اور نہ ہی اپنے مقاصد سے دست بردار ہوئے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد مسلمانانِ ہند کو مختلف قسم کی مشکلات انفرادی اور اجتماعی سطح پر پیش آئیں۔ مولانا نے متعلقہ مرکزی اور ریاستی وزرا کی توجہ ان ناانصافیوں کی طرف دلائی اور اگر بروقت مناسب کارروائی میں تاخیر دیکھی تو فہمایش سے بھی گریز نہیں کیا۔ مثلاً اجیت پرشاد جین جو وزیر باز آبادکاری تھے، اُن کی توجہ ان لوگوں کی جائیدادیں بحال کرنے کی جانب دلائی جو غیر منصفانہ طور پر کسٹوڈین (Custodian) اپنی تحویل میں لے رہے تھے۔ ایک کیس میں لکھتے ہیں:

> ''اگر ایک شخص کے لڑکوں میں سے کچھ پاکستان چلے گئے ہیں اور کچھ انڈیا میں ہیں اور شخص کا انتقال ہو گیا ہے تو اس کی جائیداد کا صرف وہ حصہ ایویکیو جائیداد قرار دیا جا سکتا ہے جو پاکستان جانے والوں کے

حصے میں آنا چاہیے۔ نہ کہ تمام جائیداد مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کیس میں تمام جائیداد پر کسٹوڈین نے قبضہ کرلیا ہے۔ مہربانی کر کے اس بارے میں تحقیقات کیجیے۔ (آثارِ آزاد: ص ۴۷)

یہ کیس مولانا کے پاس کرنل زیدی نے بھیجا تھا۔ اسی طرح بہار کا ایک کیس ان کے علم میں آیا اور انھوں نے لکھا۔ اس میں ایک شخص محمد مجتبیٰ کے خاندان کے کچھ لوگ پاکستان چلے گئے تھے اور کچھ نہیں گئے۔ اس معاملے میں مولانا نے لکھا:

''جو پاکستان چلے گئے ہیں ان کا شیر کسٹوڈین لے لے مگر جو لوگ انڈیا میں رہے ان کا شیر انھیں ملنا چاہیے۔ دو تین برس سے یہ شخص کوشش کر رہا ہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اب اس نے پرائم منسٹر کو یہ درخواست بھیجی ہے جس کی کاپی میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔'' (آثارِ آزاد: ص ۵۹)

اسی طرح کا ایک اور خط قابل غور ہے۔ جس میں بمبئی کے کسٹوڈین کی شکایت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''روبا بائی ویڈو آف غلام حسین ابراہیم مچس والا (بمبئی) اس کے لڑکے اور اس کی بہو کا کیس آپ کے علم میں آ چکا ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ کسٹوڈین بمبئی کے فیصلے کے خلاف انھیں کسٹوڈین جنرل کے پاس اپیل کرنی چاہیے۔ اگر وہ کسٹوڈین کے فیصلے کو انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کا معاملہ کسٹوڈین جنرل کے پاس بھیجا گیا ہے، لیکن اس اثنا میں معلوم ہوا ہے کہ کسٹوڈین بمبئی ان کی جائداد کو نیلام کرانا چاہتا ہے۔ انھوں نے جو درخواست آپ کو بھیجی ہے، میں اس کی کاپی آپ کو بھیجتا ہوں۔ میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ کسٹوڈین بمبئی نے ان لوگوں کے کیس میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ مجھے مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔''

(آثارِ آزاد: ص ۹۰)

اس خط کے ساتھ ہی ایک خط اس شخص کو بھجوایا جس کی شکایت کا ازالہ مقصود تھا۔ اپنے

سیکرٹری کو نوٹ لکھا:

''اس شخص کو لکھیے کہ آپ کی درخواست ری ہیبلٹیشن منسٹر کو بھیجی گئی ہے۔ آپ فوراً وہاں جایئے اور شری اجیت پرشاد جین سے ملیے۔ مولانا نے ان سے گفتگو کر لی ہے۔ پھر اس کے بعد یہ درخواست مسٹر اجیت پرشاد جین کو اس نوٹ کے ساتھ بھیج دیجیے کہ اس درخواست کے بارے میں آج مولانا نے آپ سے فون پر باتیں کی تھیں۔ درخواست جس آدمی کی ہے وہ بھی آپ کے یہاں حاضر ہوگا۔'' (آثارِ آزاد: ص ۹۰)

پنجاب میں شیخ احمد سرہندی کی درگاہ بھی تقسیم سے بری طرح متاثر ہوئی۔ اس سے پہلے ریاست پٹیالہ اس کی دیکھ بھال کرتی تھی اور مہاراجہ پٹیالہ کی جانب سے نذرانہ جاتا تھا لیکن تقسیم کے بعد یہ پنجاب گورنمنٹ کی زیرنگرانی آ گئی جس کی طرف سے درگاہ کے مصارف کے لیے محض سات ہزار روپے سالانہ گرانٹ مقرر کی گئی جو درگاہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ درگاہ کے سجادہ نشین کی کوششیں کارآمد نہیں ہو رہی تھیں تو غالباً انھوں نے مولانا سے رجوع کیا۔ اس پر مولانا نے ہوم منسٹر ڈاکٹر کاٹجو کو درگاہ کی اہمیت سمجھاتے ہوئے ایک خط لکھا تاکہ وہ حکومت پنجاب سے مناسب رقم فراہم کروانے کی کارروائی کریں۔ درگاہ کے بارے میں لکھا:

''آپ کو معلوم ہے کہ سرہند میں شیخ احمد سرہندی کی درگاہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تیرتھ کی جگہ ہے اور ہندستان سے باہر افغانستان اور سنٹرل ایشیا کے مسلمان بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

(آثارِ آزاد: ص ۱۶۴)

اسی طرح راجستھان کے وزیراعلیٰ جے نارائن دیاس کو تاکیدی خط جامع مسجد بھرت پور کا ایک حصہ اور اس کی جائیداد مسجد کمیٹی کو واپس کرنے کے بارے میں لکھا۔ اسی خط میں الور کی مسجدوں کے معاملے پر بھی ان کی توجہ دلائی اور لکھا:

''یہ بات کہ ابھی تک مسجدوں کا قبضہ مسلمانوں کو نہیں مل سکا ہے بہت

افسوس ناک ہے اور اس سے انڈیا کے مخالفوں کو ہمیں بدنام کرنے کا موقع ملتا ہے۔'' (آثارِ آزاد: ص ۱۶۳)

تقسیم کے فوراً بعد کے حالات میں اکثر مسلم رہنما احساسِ شکست، احساسِ کمتری اور بے بسی کا شکار ہو گئے۔ اگر مولانا کے ذہن میں بھی وہی احساسات کارفرما ہوتے تو وہ اس انداز سے مسلم اداروں کے تحفظ میں پیش پیش نہ رہتے۔ ریاست حیدرآباد کے وزیرِاعلیٰ کو ایک خط لکھ کر یاد دلاتے ہیں کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے لیے ریاست کی طرف سے منظور شدہ گرانٹ بھیجنے کا انتظام کرائیں۔

حیدرآباد سے رسالہ اسلامک کلچر نکلتا تھا جس کی گرانٹ حیدرآباد گورنمنٹ نے کم کر دی تھی جس سے رسالے کے بند ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس پر مولانا نے چیف منسٹر کو لکھا:

''اسلامک کلچر کا سالانہ خرچ صرف بارہ ہزار روپے تھا۔ بارہ ہزار کو آپ کی گورنمنٹ نے کم کر کے دس ہزار کر دیا تھا لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ نئے سال کے بجٹ میں اس کے لیے صرف تین ہزار روپے کی رقم رکھی گئی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میگزین بند کر دیا جائے۔ مجھے نہایت رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ محض چند ہزار روپیوں کے لیے آپ لاکھوں روپے کی دولت ضائع کر رہے ہیں۔ بہر حال مجھے صورتِ حال سے اطلاع کر دیجیے۔'' (آثارِ آزاد ص ۱۵۹)

صورت حال کی اطلاع تو وضعداری کی اصطلاح ہے ورنہ چیف منسٹر کو گرانٹ بحال کرنے میں تامل کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی طرح شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) کو بھوپال سے ملنے والی گرانٹ کا معاملہ اسٹیٹ کی انٹی گریشن کے بعد سنٹرل گورنمنٹ کے پاس آ گیا اور گرانٹ نہیں پہنچی۔ اس کے بارے میں مولانا نے وزیر داخلہ ڈاکٹر کاٹجو کو لکھا:

''شبلی اکیڈمی ملک کی ایک اہم اکیڈمی ہے اور نہایت قیمتی لٹریری خدمت انجام دے رہی ہے۔ اگر بھوپال کی یہ گرانٹ بند ہو گئی تو اسے نقصان پہنچے گا۔ علاوہ ازیں یہ اس معاہدے کے بھی خلاف ہوگا جو بھوپال کے

انٹی گریشن کے وقت ہم کر چکے ہیں۔'' (آثارِ آزاد: ص ۷۷)

معاہدے میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ ''ملک کے علمی اور لٹریری کاموں کے لیے اسٹیٹ جو گرانٹ دیتا رہتا ہے اسے بدستور جاری رکھا جائے گا۔''

مایوس اور شکست خوردہ ذہن انفرادی نوعیت کی ناانصافی کا ازالہ کرنے کی کوشش سے گریزاں رہتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ایسے معاملات میں بلا جھجک رائے ہی نہیں دیتے بلکہ انصاف دلانے کی مثبت کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر ایسی سفارش یا کوشش کے ناکارہ ثابت ہونے کا احتمال بھی ہوتا تو مولانا کی خودداری ان کو ایسے سفارشی خطوط لکھنے سے باز رکھتی۔ مثلاً ریاست حیدر آباد کے کچھ اہل کاروں کا معاملہ تھا جس پر انھوں نے وزیرِ اعلیٰ حیدر آباد کو لکھا:

''مائی ڈیئر رام کرشنا راؤ!

محمد عبدالحمید خاں سابق صدر المہام کوتوالی اور نواب فضل نواز جنگ حیدر آباد میں مجھ سے ملے تھے اور اب پھر انھوں نے اپنے معاملے پر توجہ دلائی ہے۔ یہ دونوں بھی بعض دوسرے منسٹروں کے ساتھ پولیس ایکشن کے بعد نظر بند کیے گئے تھے لیکن بعد کو چھوڑ دیے گئے۔ ان کی رہائی پر پندرہ مہینے گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک ان کے ''وظیفہ'' کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے اور وہ مالی مشکلوں میں مبتلا ہیں۔ ان کے ایک ساتھی شری راج موہن لال تھے۔ رہائی کے تین ماہ بعد ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا لیکن ان دونوں صاحبوں کا معاملہ تاخیر میں ڈال دیا گیا ہے۔ حال آں کہ یہ سب ایک ہی بوٹ میں سوار تھے۔ ذمے داری سب کی یکساں تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ مہربانی کر کے آپ ان دونوں کے معاملے کا جلد تصفیہ کرا دیں گے۔'' (آثارِ آزاد: ص ۵۰)

اسی طرح ایک شخص کرم اللہ کا کیس تھا۔ اس پر وہ رام کرشنا راؤ کو لکھتے ہیں:

''مجھے معلوم نہیں مسٹر کرم اللہ کا کیس آپ کے سامنے آیا ہے یا نہیں؟

میں ان کے کاغذات آپ کو بھیجتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ ہمدردی
کے ساتھ ان کے کیس پر غور کریں گے۔ سردست اور تو کچھ نہیں ہوسکتا
لیکن کم از کم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انھیں آئی اے ایس کی لسٹ ۳ سے
نکال کر لسٹ ا میں داخل کر دیا جائے جو حالات میرے علم میں آئے
ہیں ان کی بنا پر میں انھیں ہر طرح اس کا حق دار سمجھتا ہوں۔''

(آثارِ آزاد: ص ۸۷)

ایسا ہی ایک اور معاملہ لیفٹنٹ کرنل امیر الدین کا تھا۔ اس پر ایک نوٹ بھیج کر وزیر اعلیٰ کو لکھا:

''مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ امیر الدین کے ساتھ سخت ناانصافی
ہوئی ہے اور ضروری ہے کہ اس ناانصافی کی تلافی کی جائے۔''

(آثارِ آزاد: ص ۹۴)

مولانا کی امداد صرف اہم اور بڑے آدمیوں تک محدود نہیں تھی۔ اس میں ایک خط ہے ریلوے منسٹر لال بہادر شاستری کے نام جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی آدمی بھی ان کی طرف رجوع کرتے اور فیض یاب ہوتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''عبدالرحیم نے آپ کو جو درخواست بھیجی ہے اس کی کاپی میں آپ کو
بھیجتا ہوں۔ یہ ریلوے میں خلاصی تھی۔ اس نے پاکستان کے لیے
اوپٹ کیا تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ چھ مہینے کے اندر اگر چاہے گا تو پھر
انڈین سروس میں واپس آ جائے گا۔ یہ وہاں سے واپس آ گیا لیکن پانچ
برس سے بھوکا مر رہا ہے۔ اس کی درخواستوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیا
آپ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ یہ کوئی ریلوے افسر نہیں ہے۔ محض
انجن کا خلاصی ہے۔ کیا ایک غریب خلاصی کے لیے ریلوے میں کوئی
جگہ نہیں نکل سکتی؟'' (آثار آزاد: ص ۴۷)

اب آیئے ایک بنیادی معاملے کی طرف جو آج ہو رہی، کنورشن بحث کے بھی حسب حال ہے۔ اس معاملے میں اس وقت کے ہوم منسٹر ڈاکٹر کاٹجو کے ایک بیان پر کارڈینل

گریشیاس نے تشویش کا اظہار کیا تھا کیوں کہ انھوں نے اس بیان سے تاثر لیا تھا کہ حکومت مذہبی کنورشن کے خلاف ہے۔ اس پر مولانا نے تبدیلی مذہب کے جائز اور ناجائز طریقوں پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کارڈنیل گریشیاس کو لکھا کہ اگر سوشل یا اکانمک بنیاد پر ایسے لوگوں کو اجتماعی طور پر مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے یا نابالغ بچوں کو کنورٹ کیا جاتا ہے تو اسے جائز طور پر تبدیلی مذہب نہیں کہا جاسکتا۔ جہاں تک کسی شخص کے فری چوائس کا سوال ہے تو قابل اعتراض نہیں۔ اگر کوئی اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کرنا چاہتا ہے اسے حق حاصل ہے۔ انھوں نے لکھا:

> ''انڈین کانسٹی ٹیوشن نے اس حق کا اعتراف کیا ہے اور ایک منٹ کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس حق میں انٹرفیر کرے۔'' (آثارِ آزاد: ص ۸۶)

لیکن دوسری طرح کے یعنی غیر مذہبی بنیادوں پر ماس کنورشن کے طریقے کو انھوں نے غیر مناسب قرار دیا۔ پالیسی کی اس تشریح کے ساتھ مولانا نے عیسائی مشنریوں کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور لکھا:

> فارن مشنریز نے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے اندر جو عظیم الشان ایجوکیشنل اور ہیومنسٹریشن سروس انڈیا کی انجام دی ہے۔ اس کا ہم سب کو پورا پورا اعتراف ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک عرصے تک اس کی مخالف رہی تھی کہ ماڈرن ایجوکیشن کا ہندستانیوں کے لیے انتظام کرے۔ یہ سیرامپور کی مشنری سوسایٹی تھی جس نے سب سے پہلے ماڈرن ایجوکیشن کا اسکول اور کالج کھولا اور ہندستان کی انٹلکچول لائف میں ایک نئے انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ ہندستان کی متعدد زبانیں اپنی ماڈرن لٹریری لائف کے لیے انھی مشنری سوسائٹیوں کے زیر بار احسان ہیں جنھوں نے بائبل کا ترجمہ کرنے کے لیے ان زبانوں کی گرامر اور ڈکشنری تیار کی۔ پروگرس کے نئے نمونے پیدا کیے اور پھر ان کے اسکرپٹ کا ٹائپ

ڈھال کر انھیں ڈیولپ منٹ اور پروگریس کی شاہ راہ پر لگا دیا۔ انڈین لیڈرز ان واقعات سے بے خبر نہیں ہیں، انھوں نے ان خدمتوں کی قدر و قیمت کا ہمیشہ کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ انڈین انڈیپنڈنٹ کے بعد مشنری سوسائٹیوں نے ہم سے کہا تھا کہ اگر ہم آپ کی موجودگی انڈیا میں پسند نہیں کرتے تو وہ خدمات آئندہ جاری نہیں رکھی جائیں گی لیکن ہم نے انھیں اطمینان دلایا کہ ہم ان کی خدمات کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔''

(آثارِ آزاد: ص ۸۳)

ہوم منسٹر کے بیان کے بارے میں صفائی دیتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ وہ بیان ایک مخصوص شکایت کے متعلق تھا اور اس سے تشویش ناک نتائج اخذ کرنا مناسب نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصلی سوال یہ ہے کہ فارن مشنریوں کے بارے میں اس وقت تک گورنمنٹ آف انڈیا کی جو پالیسی رہی ہے کیا اس میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے اور جو اندیشے آپ کی طبیعت میں پیدا ہوئے ہیں وہ یک قلم بے بنیاد ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ اگر ضرورت ہوئی تو آپ دلی آئیں گے اور پرائم منسٹر سے ملیں گے۔ میں پرائم منسٹر کی جانب سے اور اپنی جانب سے آپ کو یقین دلاؤں گا کہ آپ جب کبھی ملنا چاہیں گے ہم نہایت خوشی کے ساتھ وقت نکالیں گے اور آپ کی ملاقات کی خوشی حاصل کریں گے۔'' (آثارِ آزاد: ص ۸۴)

ان تمام دستاویزی حقائق کے آئینے میں آزاد ہندستان میں مولانا آزاد کی جو تصویر اُبھر کر آتی ہے وہ ان تمام مفروضات سے یکسر مختلف ہے جو مولانا کی شخصیت اور رول کے بارے میں درجہ یقین کو پہنچا دیے گئے۔ ان دستاویزی حقائق سے پتا چلتا ہے کہ مولانا ہندستانی شہری

کی حیثیت سے کیا خود ہندستانی حکومت میں بھی دوسرے درجے کی پوزیشن کو قبول کرنے کو کبھی تیار نہ ہوئے بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ ملک اور حکومت دونوں میں نمبر ایک ہی سمجھا۔ مولانا حکومت میں بھی اسیر آشیانہ بن کر نہ رہے، بلکہ ضمیر دشت و دریا کی حیثیت سے انھوں نے ہمیشہ اپنے رفقاء اور دیگر شہریوں کو ان کی غلطیوں پر ٹوکا اور ایک صحیح و منصفانہ رویے پر چلنے کی ترغیب دی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم لوگ جو پرشور اور کھوکھلے نعروں پر مبنی سیاست کے عادی ہیں، وہ مولانا کی حکیمانہ خاموشی اور کمال دانائی سے عبارت طرزِ عمل کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہی آزادی سے پہلے بھی ہوا اور بد نصیبی سے یہی آزادی کے بعد بھی اور یہی مولانا آزاد سے زیادہ ملک اور مسلمانوں کا المیہ رہا ہے۔

الجہاد فی سبیل الحریت

الہلال کا پہلا تفصیلی و تاریخی سیاسی مطالعہ

ابوالکلام آزاد

الجهاد! الجهاد!!

كالجهاد فى سبيل الرحرية

انفروا خفافا وثقالا!

وفاداری اور بغاوت

دونوں کا وقت آ گیا

وفاداری گورنمنٹ سے اور بغاوت مفسد لیڈروں سے

فلا تخافوهم، وخافون ان كنتم مومنين (۳:۱۷۰)

کسی سے مت ڈرو، اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وقت میر!
ایک نعرہ تو بھی پیشکش صبح گاہ کر!

یا صاحبی السجن! ارباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهار؟ ما تعبدون من دونه الا اسماء سمیتموها انتم واباو کم ما انزل الله بها من سلطانه ان الحکم الا لله! امر الا تعبدوا الا ایاه ذلك الدین لقیم، ولکن اکثر الناس لا یعلمون (۱۲:۳۹،۴۰)

اے یارانِ محبس! بہت سے مالک اور آقا بنا لینا اچھا ہے یا ایک ہی خدائے قہار کے آگے جھکنا؟ تم جو اللہ کو چھوڑ کر اور معبودوں کو پوج رہے ہو، تو یہ اس کے سوا کیا ہے کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے پیش رووں نے گھڑ لیے ہیں؟ حال آں کہ خدا نے تو ان کے لیے کوئی سند بھیجی نہیں۔ اے گمراہو! یقین کرو کہ تمام جہان میں حکومت صرف اُس ایک خدا ہی کے لیے ہے! اُس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کے آگے جھکو! یہی دین اسلام کا سیدھا راستہ ہے، لیکن اے وائے کہ اکثر لوگ ہیں جو نہیں جانتے۔

تاریخ آزادی ہند، جو لکھی جائے گی

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جبکہ ہندستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا، غلامی کی وہ بیڑیاں جو اس نے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو چکے گا، جس کا ہونا ضرور ہے۔ فرض کیجیے کہ اس وقت ہندستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ

لکھی گئی، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بد بخت اور زبوں طالع قوم، جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہ آزادی میں سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست اجانب میں بازیچہ لعب، ہندستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی!!

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابل رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ، جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا، جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنے گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی، جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حکومت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی، نہ اپنی آواز سے بدل سکتی تھی۔ نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اُٹھا سکتی تھی۔ ایک معمول، جو مسمرائزر کے ارادے پر زندہ ہو۔ ایک وجود شل، جو صرف زمین کے لیے بار ہو۔ ایک درخت، جو حرکت کے لیے ہوا کا منتظر ہو، ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دیے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ، جو انسانیت کی پیشانی پر ہو:

> لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا اولئک کالانعام بل ھم اضل اولئک ھم الغافلون
>
> (۱۷۹:۷)
>
> ’’ان کے پاس دل ہیں، مگر سوچتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ ان کی مثال چارپایوں کی سی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر، وہی ہیں جن کو غفلت کی سرشاری نے انسانیت سے محروم کر دیا ہے۔‘‘

اسلام کی تذلیل کا ایک دردانگیز منظر:

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اُس قوم کی تھی جو آہ ثم آہ! کہ ''مسلم'' تھی، جو اپنے ساتھ انسانی شرف وجلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی، جس کو دنیا کی وراثت اور خلافت دی گئی تھی، جو دنیا میں اس لیے بھیجی گئی تھی، تاکہ انسانی استبداد واستعباد کی زنجیروں سے بندگان الٰہی کو آزاد کرائے۔ جو اس لیے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو گاٹے، نہ اس لیے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے، جو اس لیے آئی تھی کہ تمام ان زنجیروں کو، جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی (اور ہر وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے، اسلام کی اصطلاح میں یہی نام رکھتا ہے) انسان کی گردنوں میں پڑی ہیں، ٹکرے ٹکرے کردے، نہ اس لیے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنائے۔ جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی، تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے۔ نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے۔ جس کے قدموں پر قدموں کو گرنا تھا تاکہ وہ اُٹھائے، نہ یہ کہ وہ خود خاک مذلت وغلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔ جو اس ملت حنیفی کی پیرو تھی، جو دنیا میں صرف اس لیے ہے کہ حاکم ہو نہ اس لیے کہ غلام ومملوک ہو۔ آہ! جو ''مسلم'' تھی اور پھر کون انسانی شرف باقی رہ گیا ہے، جو اس اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے خطاب محبوب واقدس میں نہیں ہے؟ جو ''مسلم'' تھی، اور اس لیے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ ہندستان میں وہ سب کچھ کرتی، جو آوروں نے کیا اور جس کو اپنے وجود زبوں سے اس نے ہمیشہ روکا۔ جو مسلم تھی، پس چاہیے تھا کہ ہندستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں، کیوں کہ اس کے پاس ''اسلام'' تھا اور ''اسلام'' آگے رہنے کے لیے ہے، پیچھے رہنے کے لیے نہیں۔ وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی وجسمانی نجات پائیں، پر وہ کسی کے آگے جھکنے کا محتاج نہیں ہے:

وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (۲:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے مسلمانوں کو درمیانی قوم بنایا تاکہ وہ تمام

انسانوں کی ہدایت کے شاھد ہوں اور ختم المرسلین ان کے لیے شاہد ہو!''

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ...... تا ...... وَنِعْمَ النَّصِيرُ (۲۲:۷۸)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جو حق جہاد کرنے کا ہے۔اس نے تم کو تمام دنیا کی قوموں میں سے برگزیدگی اور امتیاز کے لیے چن لیا۔ پھر جو دین تم کو دیا گیا ہے وہ ایک ایسی شریعت فطری ہے جس میں تمھارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہی ملت تمھارے مورث اعلیٰ ابراہیم خلیل کی ہے اور اس نے تمھارا نام ''مسلمان'' رکھا ہے، گزشتہ زمانوں میں بھی اور اب بھی۔ تا کہ رسول تمھارے لیے اور تم تمام عالم کی ہدایت اور نجات کے لیے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتے کو اور مضبوط پکڑو، جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹاؤ، وہی تمھارا ایک آقا اور مالک ہے اور پھر جس کا خدا مالک وحاکم ہو، اس کا کیا اچھا مالک ہے اور کیا قوی مددگار!

دماغ سوچنے کے لیے ہے نہ کہ غفلت کے لیے۔ پس تمھارے پاس دماغ ہے تو اے غفلت کو بیداری اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدارا مجھ کو بتلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمھاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو کہ اس وقت، جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہے۔ میری روح بے چین ہے، میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں اور میرے ہیجان افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آ گیا ہے۔ یہ کیا ہے کہ میں ایک شے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں، لیکن تم کو نظر نہیں آتا؟ یہ کیا ہے کہ ایک آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے، میں سن رہا ہوں پھر تم نہیں سنتے؟ آہ! اے لوگو کہ میں نہیں سمجھتا تم کو کیا کہوں، مجھ کو خدارا بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم دین قدیم کے پیرو، خطاب اسلام سے متصف اور امانت الٰہی کے حامل ہو۔ یہ سچ ہے تو تم صرف اس لیے ہو تا کہ نڈر رہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو، خودمختار ہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بندِ استعباد سے نجات دلانے والے ہو اور میں

آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لیے ہو، تا کہ جانفروش ہو، تا کہ راہِ حق میں سر بکف ہو، پھر یہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں لیکن اے بدبختو! تم ان سے محروم ہو۔ یہ کیا بوالعجبی اور کیا تماشائے عقل سوز ہے؟

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست؟

تاریخ ہند کا ایک خاص باب:

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی ایک شرف وعظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اُسے پڑھ دوں۔ بے شک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ اُنھوں نے پکارا مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دیے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا، ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی، بلکہ مجنونانہ چیخ اُٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

افسانۂ استبدادِ ہند:

ملک کہ ایک خالص زرعی ملک تھا، اس کے کاشتکار تباہ و برباد ہو رہے تھے۔ ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جا رہی تھی اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ھل من مزید کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دیے جا رہے تھے تا کہ وہ دولت جذب کرے، مگر آب پاشی کے لیے روپیہ نہ تھا، کہ ہندستان کی زمین اپنی دولت اُگلے۔ زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ تم وفادار ہو، مگر اسلحہ کو چھونے کی اجازت نہ تھی کہ تم غدار ہو۔ ملک کی تمام دولت ستر ہزار سرخ رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی تھی، مگر ملک کے فاقہ مست کالے تعلیم اور حفظ صحت کے انتظام سے محروم تھے۔ نمک بھی ملتا تھا تو محصول دے کر اور تعلیم بھی ملتی تھی تو گھر بار بیچ کر۔ پھر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے

محبت کے لہجے میں وعدہ کیا گیا تھا کہ تمیز رنگ وزبان اور امتیاز حاکم ومحکوم کا یہاں سوال نہیں اور جوراہ اپنے لیے باز ہے، وہی سب کی آمد کی منتظر، لیکن جب پاؤں اُٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی تو تمام دروازے بند تھے اور امتیاز حاکم ومحکوم کے نشے سے انگلستان کی مٹی کا ہر پتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے جن میں ملک مبتلا تھا۔ ہندو اُٹھے اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لیے وقف کر دیا لیکن عین اُس وقت جب کہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے، بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا ہی سا لولا لنگڑا بنا دیں۔ جب کہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ لگا رہے تھے، تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لیے بیٹھے تھے، ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا کہ ''وقت نہیں آیا'' اور یہ اسی میں مسحور تھے۔ ایک الف لیلہ کا عفریت تھا، جس نے جبر کے زور سے ان کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا، پس یہ ملک کی ترقی کی راہ میں روک بن کر پڑے تھے۔

مسلمانوں کے ملکی کارنامے:

اس کے بعد آنے والا مورخ، جو ہندستان کا وقایع نگار ہوگا، لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا، بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا، برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ تھی، چنگیز خاں کا تخت قہر نہ تھا۔ پس ملک آزاد ہوا اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کر دیا، لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا اُس قوم کی سرفروشی سے ہوا۔ جو مسلم نہ تھی، پر جو ''مسلم'' تھے، انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ مذلت کی کوشش کی۔ ہندستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت اور عزت کی یادگار ہے، لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم ہوئی، نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم جبری اور عام ہوئی، فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت خود اختیاری ملی تو صرف ہندوؤں، قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے، کیوں کہ انھوں نے پالیٹکس کو شروع کیا اور پھر پالیٹکس ہی کو سمجھا مگر مسلمانوں نے اس کو

معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے یہ سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لیے روئیں اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے!

ذلك مثل القوم الذين كذبوا بأيتنا فاقصص القصص لعلهم يتفكرون (۷:۱۷)

مسلم لیگ:

بے شک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے جس کو کفر کہا تھا اس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتوا دینا پڑے لیکن کیوں کر؟ اپنی قوت سے، اپنے دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے؟ نہیں بلکہ

ان ہم بسعی غمزہ مردم شکار دوست!

پہلے جن کے حکم سے گمنامی کی غاروں میں چھپے تھے، اب انھی کے حکم سے باہر نکلے تاکہ مندر میں جا کر ان کے آگے سربسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام ''لیگ'' رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتش کدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارا ہو جائے گی؟ اگر تم ایک کھلونے کا پتلا لے کر اس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے، تاکہ اپنے دونوں ہاتھ ہلا کر تالی بجائے، تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا؟ نادانو! چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو! شاید ہی آج تک دنیا میں کسی قوم نے پالیٹکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہوگی جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ تم نے اے چاندی اور سونے کو پوجنے والو! تم نے کی۔ تمھارا وجود یکسر سیاست کی تحقیر اور تمھارے اعمال اس کی معزز پیشانی پر ایک کلنگ کا ٹیکا ہیں۔ تم نے غلامی کا ایک بت کدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے سجدے کا سر جھکایا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں۔ تم دلدل میں اپنے پاؤں ڈال کر کودرہے تھے تاکہ اور خسف وغرق ہو، لیکن قوم کو کہتے تھے کہ ہم میدانوں میں دوڑ رہے ہیں۔ تم خود گمراہ تھے، پر اس پر بس نہ

کی اور پوری قوم کو گمراہ کرنا چاہا۔ ضلوا فاضلوا، فویل لهم ولا تباعهم:

حریفاں رہ دیر کردند گم

فریل لہم، ثم ریل لہم!!

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم

کہ سوال چھت کا نہیں بلکہ اُن اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں۔ یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے، دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد تو ٹیڑھی نہیں؟ پالیٹکس ایک آگ ہے جو خود بھڑکتی ہے اور پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ وہ برف کا گلاس نہیں ہے جو کسی سرد مہر ساقی کی بخشش پر موقوف ہو۔ اوّلین گمراہی یہ تھی کہ برسوں کی موت کے بعد زندگی کی کروٹ لی بھی تو اپنی اُمنگ، اپنے جوش اور اپنی کسی قوت کے اعتماد پر نہیں، بلکہ محض کسی کے اشارۂ چشم اور جنبش دستِ دعوت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پالیٹکس غلامی کی ایک دوسری شکل بن گیا اور راہ مقصود سے باز رہنے کے لیے ایک کھلونے کا کام دینے لگا۔ پھر اس کے بعد ساری قوت اس پر صرف کی جانے لگی کہ گورنمنٹ سے مراعات طلب کی جائیں اور جس طاقت کو گورنمنٹ کے مقابلے میں خرچ ہونا تھا اس کو ہندوؤں کے مقابلے میں صرف کیا جائے۔ یہ اُس خمار کے لیے ترشی کا ایک پورا جرعہ ثابت ہوا۔ اصل شے قوم کا یہ محسوس کرنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے نہ کہ کسی لکڑی کے سہارے! لیکن مراعات کی طلب جب پیدا ہوگی، خواہ اس کا کچھ ہی نام رکھا جائے، یقیناً اپنی قوت کی جگہ، محض معطی کے احسان و کرم پر اعتماد ہوگا۔ بے شک مسلمانوں کو اپنے حقوق قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اس کی ہونی چاہیے کہ درخت اپنی جگہ پر مضبوط ہو! تم درختوں کے سایے میں آرام و راحت لیتے ہو، لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تمھارے باورچی خانوں میں کون سی شے جاتی ہے؟ وہ بھی درخت ہے لیکن جو درخت اپنی قوتِ نشر و حیات سے محروم ہو جاتا ہے، اس کو کاٹ کر چولہے ہی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ پس زندگی صرف قوت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہے نہ کہ کسی کی چوکھٹ:

ملک کی غلامی کے لیے مسلمانوں کی قربانی:

ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے۔ یہ خیال کہ ''تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی، اس لیے تمھارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو'' غور کرو کہ حریف شاطر کی کس قیامت کی چال تھی؟

وہ رہزن اور پھر ایسے کمین سے!

سات کروڑ انسانوں کی قوت کا نشانہ وہ خود کیوں بنے، جب کہ تم اُس قوت کو کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہو؟ یاد ہوگا کہ ہم نے ایک بار اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہندستان میں قدرتی طور پر برٹش گورنمنٹ کو اپنے فواید کے استحکام کے لیے ایک بڑی قربانی کی ضرورت تھی، کہ کوئی ایک قوم ملک کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو جائے اور اپنے ملک کی اُمیدوں کی قربانی کے خون سے اس کے اغراض کے درختوں کو سینچے۔ مسلمانوں نے خود اپنے تئیں اس قربانی کے لیے پیش کر دیا اور جس بوجھ کے اُٹھانے سے ہندستان کی تمام قوموں نے انکار کر دیا تھا اس کے لیے اوّل روز خود ہی اپنی گردن پیش کر دی کہ:

بنشین در دل ویرانہ ام اے گنج مراد!
کہ من ایں خانہ بسودائے تو ویراں کردم

الذین انسو الله، فانساهم انفسهم!

اگر مسلمانوں کی آنکھوں کو لیڈروں کے عمل السحر نے بند نہ کر دیا ہوتا تو وہ اس منظر کو دیکھتے اور خون کے آنسو روتے۔ وہ دیکھتے کہ یہ کیا بدبختی ہے کہ ملک کی ترقی و فلاح کا مسئلہ ہی سرے سے ''ہندو مسئلہ'' ہو گیا ہے اور مسلمانوں کو من حیث القوم اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہاؤس آف کامنس میں بحث آئے یا کانگریس کے اسٹیج پر ''مسئلہ ہند'' کے معنے ''ہندو مسئلہ'' کے ہیں، حال آں کہ ملک کی ترقی و آزادی کی ذمے داری اگر ہندوؤں پر ملک کی طرف سے تھی تو اے اپنے تئیں بھولنے والو! تمھارے سر تو خدائے ذوالجلال کے طرف سے تھی! دنیا میں

صداقت کے لیے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے۔ پس تم تھے کہ تم کو خدا آگے کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو اور پھر اپنے آپ کو بھلایا، نتیجہ یہ نکلا کہ پیچھے کی صفوں میں بھی تمھارے لیے جگہ نہیں، فیا حسرتا! ویا ویلتا!!

ولا تکونوا کالذین نسو اللّٰہ فانساھم انفسھم اولائک ھم الفاسقون (۵۹:۱۹)

''اوران لوگوں کی طرح مت بنو، جنھوں نے خدا کو بھلا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا
کہ خود اپنے ہی کو بدل گئے۔ وہ یقیناً فاسقوں میں سے تھے۔''

جمودِ حرکت نما:

ممکن ہے کہ آپ فرمائیں، یہ قصہ طویل اب داستان بے وقت ہے۔ کیوں کہ دراصل تمام پچھلی باتیں بھلائی جا چکی ہیں، غلطیوں کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کی ضرب محکم نے (کہ فی الحقیقت آغاز عہد برطانیہ سے لے کر اس وقت تک ایک سب سے بڑی انسانی خدمت ہے، جو اس نے انجام دی) اُن ہاتھوں کو بھی جو شل ہو گئے تھے پیٹھ تک پہنچا دیا ہے کہ چوٹ سخت لگی ہے۔ خود اب لیگ پچھلی غلطیوں کی تلافی اور آیندہ کی اصلاح پر ملتفت ہے، مانا کہ اس کا سر برسوں بادۂ غرور و کبر سے سرشار رہا مگر اس عجز خمار کو بھی تو دیکھیے کہ اب قومی خواہشوں کے آگے:

سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

آپ نے کہا کہ اوّلین شے لیگ کے نظام کی تبدیلی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت بہتر! آپ نے شکایت کی کہ اگر ہلال احمر فنڈ کی فکر نہ کی تو پھر لیگ کس مرض کی دوا ہے؟ ارشاد ہوا کہ اب کے یہ بھی لیجیے، آپ کا بڑا رونا یہ تھا کہ سفر بے منزل اور سعی بے مقصود ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے بھی انکار نہیں، اب کے ''نصب العین'' کی جستجو میں بھی نکلیں گے۔ ابھی سامنے کی بات ہے کہ لیگ کے التوا پر آپ کو بہت غصہ آیا تھا، تجویزیں تھیں کہ ایک علاحدہ کانفرنس کا انعقاد ہو، انھوں نے معاً کہا کہ اور طرف کیوں جاتے ہیں کہ یہاں ایک صحبت خاص اس کے لیے بھی تیار ہے۔ پھر جب حالت یہاں تک رو با صلاح ہو چکی ہے تو اب پچھلے گلے شکوے کا

کون موقع ہے؟ اب تو پرانی باتوں کو تہہ کیجیے اور اُمیدوں کا دروازہ کھولیے کہ مدتوں کے دبے دبائے ارمانوں کے نکلنے کا وقت آ گیا:

دیدار شد میسر و بوس و کنار ھم
از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

لیکن میں عرض کروں گا کہ ذرا صبر کیجیے اور زبانوں کو نہ روکیے کہ دراصل شکوے شکایت کا وقت پہلے نہ تھا، وقت تو اب آیا ہے، ہم بھی اسی روزِ آزمایش کے منظر تھے:

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ:

حکم اخیر کی تھی توقع بروز حشر
باقی رہا نہ دن ہی جب اظہار ہو چکا!

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا:

اول تو:

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

اور پھر یہ جو کچھ ہے، صرف الفاظ ہیں، جن میں معانی کا نزول باقی ہے۔ محض جستجو کے ارادے سے منزل نہیں مل سکتی۔ آپ سرخی اور چونا مہیا بھی کر لیں پھر بھی مکان نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ معمار نہ ہو۔ شاھد لیگ کی یہ نئی ادائیں توبہ شکن ضرور ہیں، لیکن ابھی ایسی نہیں ہیں کہ واپس لیا ہوا دل پھر اس کے حوالے کر دیں:

کھلے کیا دل در و دیوار کے آثار باقی ہیں
ہوا ہر چند گھر ویران، صحرا پھر بھی صحرا ہے

البتہ بعض خام کاران ہوس پیشہ سے کھٹکا ضرور لگا ہے کہ کہیں ان صبر آزما اداؤں پر لوٹ نہ ہو جائیں:

وہ حلقہ ہائے زلف، کمیں میں ہیں اے خدا!
رکھ لیجیو میرے دعوے وارستگی کی شرم!

نظام ترکیبی کی اصلاح اور نصب العین کی جستجو یقیناً ازالہ مرض کے لیے اصلی علاج کی تلاش ہے مگر تلاش کا ہونا ہی صحیح تشخیص اور مفید نسخے کے مہیا ہو جانے کے لیے کافی نہیں، ضرورت ہے کہ تشخیص کی جستجو صحیح راہ پر ہو، اور نسخہ جو تجویز کیا جائے وہ دفع مرض کا اصل علاج ہو۔ لیگ اگر یہاں تک کے لیے راضی ہو گئی ہے تو زہے نصیب! لیکن ابھی یہ پوچھنا باقی ہے کہ:

''کہیے کچھ بڑھ کے بھی ہمت ہو گی؟''

راضی نامہ:

اصل یہ ہے کہ لیگ کی طرف سے پوری مایوسی تھی اور ہے۔ جب تک کہ وہ اپنے تئیں اب اُمید کا مستحق ثابت نہ کر دے۔ قوم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ نہ صرف اہم امور سیاسیہ کے لیے، بلکہ ادنیٰ درجے کی سیاسی ضروریات کے لیے بھی لیگ بیکار ہے اور اس لحاظ سے سخت مضر کہ قوم کا آیندہ راستہ روک کر کھڑی ہے۔ پس عین اُس وقت جب کہ صاف صاف یہ ہے کہ ہم لیگ کو کالعدم یقین کر کے اپنی راہ ڈھونڈ رہے ہیں اور دل کے ایک نئے ٹھکانے کی فکر میں (الحمدللہ) کہ پہلے سے اچھی حالت میں ہیں۔ لیگ مکرر سامنے آئی ہے اور کہتی ہے کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ اور اب پھر مجھی کو دیکھو! اچھی بات ہے، پہلی پہر خواہ کیسی ہی بے مزہ گزری ہو، لیکن رات کا آخری حصہ تو ابھی باقی ہے، اور گو مرغ سحر کی چیخیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی ہیں، مگر ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ جو کچھ گزر چکا ہے دن تھا اور دراصل شب وصل اب سے شروع ہوئی ہے:

وصال پر ہے جو وصل، امتحاں کر دیکھو
امید یوں ہی سہی، چند روز مر دیکھو!

اگر لیگ اب پھر ہمارے دلوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے، تو بہتر ہے کہ ہم میں اور اس میں

ایک راضی نامہ ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نے اُسے طلاق دے دی تھی، لیکن اب پھر وہ آنا چاہتی ہے تو عقد رجعت سے انکار نہیں۔ البتہ اس کو تو اپنی غیرت کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ وہ ''حلالہ'' کو منظور کر لیں:

ہمہ غیری و می گوئی بیا عرفی تو ہم
لطف فرمودی برو کین پاے را رفتار نیست

یہ راضی نامہ بالکل ایک منصفانہ معاہدہ ہوگا اور شرایط میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ لیگ پچھلی باتوں کو بھلا دے۔ اپنے گھر کو صحبت اغیار سے خالی کرے اور ہم سے لگاؤ رکھنا ہے تو غیروں سے لگاوٹ چھوڑ دے۔ پھر ہم بھی دوسرے ٹھکانوں کی فکر چھوڑ کر اُس کے ہو رہتے ہیں لیکن یاد رہے کہ یہ معاہدہ آخری ہوگا۔ اگر پھر کبھی اغیار کی پرچھائیں بھی نظر آئی تو:

''بس! لیجیے سلام، اپنا بھی وعدہ ہے کسی سے''

اس کو بھی کھول کر کہہ دیں کہ صحبت غیر سے کیا مطلب ہے؟ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ آپ سے غیرتِ عشق کے انتہائی مطالبات کیے جائیں۔ ہمیں اس سے کوئی چڑھ نہیں کہ گورنمنٹ سے پورے تعلقات رکھیے، کانگریس کی موجودہ حالت کی نظیر آپ کے سامنے ہے، اب تو گورنمنٹ خود اُمیدوں کی جرأت افزائی کر رہی ہے لیکن تعلقات کے یہ معنی سمجھئے کہ اچھے وقتوں میں اپنے وقار اور متانت کے تحفظ کے ساتھ دو چار گھڑی ہنس بول لیا، یہ نہیں کہ:

''ہمہ شب شراب خوردن، ہمہ روز خواب کردن

شرایط صلح

نصب العین:

سب سے مقدم تر مسئلہ پولیٹکل جدوجہد کے لیے ایک نصب العین کی جستجو ہے اور اگر آپ کو زندہ رہنا ہے تو کسی مقصد بلند کی انگیٹھی سلگائیے، جو ہر وقت آپ کے دل کو گرم رکھے۔ یہ بار بار کہا جا چکا ہے، کوئی قوم اپنے جدوجہد میں اصلی سرگرمی اور جذبات وقویٰ کا ایثار نہیں کر سکتی جب تک اس کے سامنے ایک جاں طلب نصب العین نہ ہو اور اب آپ کو کیا

سمجھائیں کہ آزادی تو وہ مصود ہے، جس کا تصور بھی دل کی زندگی کے لیے کافی ہے۔

رہے پہلو میں وہ یا اُس کا خنجر
غرض دل ٹھہرتا ہے ہم نشیں سے

لیگ تلاش میں نکلی ہے تو اس کو بھٹکنا نہیں چاہیے۔ ہندستان میں سیاسی نصب العین کا سوال ایک ہی ہے، گو اس بارے میں ہماری راہ عام شاہراہ سے الگ ہے اور ہم اس چیز کو دوسری طرف سے آ کر لینا چاہتے ہیں لیکن لیگ سے اس کی توقع لاحاصل ہوگی۔ پس اس کو چاہیے کہ اس ایک ہی نصب العین کا اعلان کر دے کہ ''انگلستان کے ماتحت ہندستان کی حکومت خوداختیاری''

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز:

یادرکھو کہ یہ نصب العین جو ہم نے تجویز کیا، تو کوئی بہت اُونچے درجے کی بات نہیں کہی کہ ہماری ہمت کا آشیانہ اس شاخ سے بھی بلند تر جگہ ڈھونڈتا ہے۔ تاہم یہی بہتر ہے کہ آپ ''سیلف گورنمنٹ'' کو اپنا نصب العین سیاسی قرار دیں اور آج کے دن سے سفر شروع کر دیں۔ اگر ایک دل کش منزل آپ کے سامنے ہوگی تو پھر سفر کی تکلیفیں بھی بھول جایئے گا!

راہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہست و ہم خود منزل ست

تیس برس سے جو پیچ اس مسئلے کی نسبت پڑے ہوئے ہیں ان پر ادھر بار بار لکھا جا چکا ہے۔ ہندوؤں کی مجارٹی، مختلف عناصر کی باہمی رقیبانہ کشاکش، ہندو مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ کے اثرات، ملک کی عدم تیاری، مسلمانوں کے لیے ہندستان میں باہر کی حکومت کی بہتری اور اسی طرح کے وہ تمام وساوس ونزغات نفسانیہ جو مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں کیے گئے تھے، ہمیں حسن ظن ہے کہ اب بھلائے جا چکے ہیں۔ سیلف گورنمنٹ اسی لیے نہیں مانگی جاتی کہ ملک کی استعداد اور عدم استعداد کا افسانہ دہرایا جائے۔ مقصود ایک نصب العین کو سامنے رکھنا اور بتدریج اُس تک پہنچنا ہے۔ ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال

دیجیے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا۔ طاقت نفس تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی طاقت ہے جو اس کے اخلاق، اس کے کیریکٹر، اس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیتِ الٰہی اور اعمالِ حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔

وکم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله (۲۴۹:۲)

اسلام کی طاقت کبھی بھی وابستہ دامِ قلت و کثرت نہیں رہی ہے اور اب بھی جن دلوں میں اسلام ہو، وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے۔ **لا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين** (۱۳۹:۳) یہ تمام وساوس اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ ملک کے سامنے کوئی مشترک اور بلند نصب العین نہیں ہے۔ اگر روزِ اوّل ہی سے یہی ہو گیا ہوتا کہ سب مل کر ایک ہی نصب العین اعلیٰ کی طرف دیکھنے لگتے تو اور کسی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی اور وہ تمام قوتیں جو آج باہمی جدال وقتال میں صرف ہو رہی ہیں، اسی کے پیچھے صرف ہوتیں۔

بے توجہی سے نہ سنیے کہ ایک بہت بڑا نکتہ عمل کہہ رہا ہوں اور اپنے طرز بیان کا شاکی ہوں کہ اسرار و رموز کی باتیں بھی حسن و عشق کی کہانی بن جاتی ہے۔ اپنے سامنے ایک جانستان جلوہ گاہ حسن پیدا کر لیجیے، پھر اگر آپ دوسری طرف دیکھنا چاہیں گے بھی تو نہیں دیکھ سکیں گے۔ آپ کی تمام بے راہ روی، نفس پرستی، اغراض پسندی، باہمی جنگ و جدال ایثار و فدویت فراموشی اور ہر قسم کے اشغالِ ضلالت صرف اس لیے ہیں کہ سامنے کوئی کشش نہیں اور جس بلائے عقل و ہوش کو ہم دیکھ رہے ہیں، آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں۔ جس دن ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی ''آزادی'' کے حسن پر پڑ گئی پھر آپ خود بخود یہ تمام قصے بھول جائیں گے:

لو يسمعون كما سمعت كلامها
خروا لغرة سجدا و ركوعا

مشکلاتِ راہ:

بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آ گئے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی یہی نصب

العین اپنے لیے تجویز کرنا چاہیے۔ مگر مشکلات راہ سے گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شراب کڑوی ہے۔ نشہ و سرور کے انتظار میں حلق و دھان کو کون بدمزہ کرے؟ لیکن اب ہم ان سے کیا کہیں کہ کوئی گھونٹ حلق سے نیچے اُترا ہی نہیں۔ کسی طرح منہ بنا کر ایک جرعہ اُتار لیجیے، پھر پوچھیں گے کہ کڑوی ہے یا میٹھی؟

حریف صافی و دردی نئی خطا اینجا ست
تمیز ناخوش و خوش مکینی بلا اینجا ست

اے اخوان غفلت شعار! نہیں معلوم اب تک آپ کس وہم میں پڑے ہیں؟ یہ مقتل سیاست ہے، یہ مشہدِ آزادی و حریت ہے۔ آپ کا سہ سالہ میدان لہو و لعب نہیں ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے، یہ آپ سے کس کم بخت نے کہا ہے کہ اس خارزار میں قدم رکھیے؟ یہاں آیئے گا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے۔ ہر لمحے مصائب کا نزول ہوگا۔ آپ مشکلات سے گھبرا رہے ہیں، حال آں کہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے۔ یہاں ہوس پرستوں کا گزر نہیں، اس میدان کے مردوہ جانفروشانِ الٰہی اور مجاہدین حق پرست ہیں جن کے سر گردنوں پر نہیں، بلکہ ہتھیلیوں پر رہتے ہیں:

در مدرسہ کس را نرسد دعوے توحید
منزل گہ مردان موحد سر دار ست

سیاست کی جنس اتنی سستی نہیں ہے کہ چند تجویزیں گھڑ کر اور شکریے کے سجدے کر کے اپنے عیش کدوں میں چھپ جایئے گا، اور وہ آسمان سے ڈھونڈتی ہوئی آپ کے سامنے آ موجود ہوگی۔ آپ سے کوئی نہیں کہتا کہ آیئے، لیکن آنے کا ارادہ ہے تو اپنے دل و جگر کی طاقت کو ٹٹول لیجیے کہ اس طریق عشق کی شرطیں آپ کو معلوم نہیں:

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریقِ عشق اوّل منزل ست

غلامی کے پتلے اور سیاست کی روح کا دعوا:

آپ کے گزشتہ اعمال سیاست سامنے آ جاتے ہیں تو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ آپ نے برسوں سیاست کے ساتھ جو تمسخر کیا ہے اس کی نظیر شاید ہی کسی قوم کی ضلالت و گمراہی میں ملے۔ ہر خوشامد و غلامی کی غلاظت کا کیڑا جس کا وجود اغراض پرستی کی کثافت سے متعفن ہوتا تھا، نکلتا تھا اور دعوا کرتا تھا کہ میں مردِ میدانِ سیاست ہوں اور قوم کے پولیٹکل اعمال کا مصلح! جن عیش پرستوں کو کسی آزمائش میں پڑنے کی ہمت ایک طرف، اتنے کی بھی برداشت نہ تھی کہ گورنمنٹ کے چشم و ابرو کی ذرا سی بے مہری بھی گوارا ہو۔ اس کا دعویٰ ہوتا تھا کہ ہم قوم کے پولیٹکل کارزار اعمال کے سپہ سالار ہیں اور نکلے ہیں تا کہ اس معرکے میں اپنی تلوار کے کاٹ دکھلائیں! اربابِ نظر ان ہوس پرستوں کو دیکھتے تھے، ہنستے بھی تھے اور زمانہ کی بوالعجبی پر روتے بھی تھے:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب ابروے شیوہ اہلِ نظر گئی

اللہ اللہ! جس متاع یوسفی کے لیے زلیخا آبادِ حریت میں تڑپتی ہوئی لاشیں اور کٹی ہوئی گردنیں بھی طلب کی جائیں تو اپنے اوجِ طالع پر ناز کریں کہ مفت ہاتھ آئی۔ اس کی قافلہ لیگ میں یہ ارزانی کہ چند کھوٹے درہم ہاتھوں میں لے کر بولیاں بولی جاتی ہیں! رشروہ بثمن بخس دراہم معدودۃ، وکانوا فیہ من الزاہدین (۱۲: ۲۰):

لیجایئے دکھلانے اُسے مصر کا بازار
خواہاں نہیں پر کوئی وہاں جنس گراں کا

اے بے خبرو! یاد رکھو کہ زندگی کی خواہش ہے تو مشکلات سے گھبرانا لاحاصل ہے۔ کیوں کہ مشکلیں زندہ اور متحرک انسانوں ہی کے لیے ہیں، ایک بے روح لاش کے لیے نہیں ہیں۔ آرام کی خواہش ہے تو اس کی سب سے بہتر جگہ قبر ہے، بیٹھے رہو گے تو یقیناً ٹھوکر نہیں لگے گی۔ پر جب چلو گے تو ٹھوکریں کھانا ضرور ہے۔

اصلاح وتغیر نظام:

آخر چند الفاظ لیگ کے نظام کی تبدیلی کی نسبت بھی کہہ دینا چاہتے ہیں۔ نہیں معلوم کارفرمایانِ لیگ نے اس کا کیا مطلب سمجھا ہے، مگر ہم نے مدتوں سے جو کچھ سمجھا ہے، اس کے سوا چارۂ کار نہیں۔ یاد رہے کہ لیگ کی اصلی بنیادی گمراہی اسی مسئلے میں پوشیدہ ہے۔ دنیا میں تمام کاموں کے لیے تقسیم عمل کا اصول ہے اور پھر ہر گروہ کے حالات مختلف اور اس لیے ایک ہی کام کے لیے سب موزوں نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں نے اصولی غلطی یہ کی کہ پولیٹکل کاموں کے لیے بھی طبقہ خواص وامرا کی رہنمائی میں ہاتھ دیا۔ جو سر سے لے کر پاؤں تک ہزاروں زنجیروں میں لپٹا ہوا ہے اور آپ سے بھی ملے گا تو انھیں زنجیروں میں جکڑ بند کر کے چھوڑے گا۔ اس کے پاس یا دولت ہے یا زنجیریں تیسری شے نہیں ہے۔

پس اصول عمل یہ ہے کہ آزادی کے کام کرنے والے صرف آزاد ہوں اور پھر ان میں جو دولت کے ساتھ دماغ بھی رکھتے ہوں، وہ صرف اپنی دولت اور دماغ سے الگ رہ کر فایدہ پہنچائیں۔ امریکہ میں کارنیگی اور راکفیلر کے پاس بہت خزانہ ہے لیکن پھر یہ نہیں ہے کہ وہی امریکہ کے پریذیڈنٹ بھی ہوں۔

دراصل اُن بزرگان خواص کا بھی اتنا قصور نہیں، جس قدر کہ آپ کا قصور ہے۔ آپ ان کو اپنے میں کھینچتے ہیں تو ان کو آنا پڑتا ہے۔ حال آں کہ وہ اپنے حالات سے مجبور ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ ہم بھی ان کی جگہ ہوتے تو وہی کرتے جو وہ کر رہے ہیں۔ پس لیگ کی زندگی کے لیے ایک اقدم کام یہ بھی ہے کہ وہ اس امر کا قطعی فیصلہ کردے اور اپنے پالیٹکس کی باگ دولت کے ہاتھ سے نکال کر دماغ کے سپرد کرے۔ جس شخص کو اپنی دولت اور جائیداد کی حفاظت کی فکر سے رات کو نیند نہیں آتی، اس کی صبح کو زبان کیا کھلے گی؟

اسی اصل کی ایک شاخ یہ غلطی بھی ہے کہ لیگ نے پالیٹکس کا درخت علی گڑھ کی سرزمین میں بویا، حال آں کہ وہاں پیشتر ہی سے جو درخت موجود تھا اسی کی جڑ میں گھن لگ چکا تھا۔

قید کی بقیہ میعاد:

وقت آ گیا ہے کہ اشخاص کی جگہ قوم کے ہاتھ میں لیگ دے دی جائے اور طبقہ خواص کے آگے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا جائے کہ اب آیندہ کے لیے معاف کیجیے اور ہمارے قصوروں کو بخش دیجیے۔ ہمارے قصور واقعی بڑے سنگین ہیں، ہم نے آپ کی گاڑیاں کھینچیں، پھولوں کے ہار پہنائے، خود جانور بنے اور اپنی رسی آپ کے ہاتھ میں دے دی۔ یقیناً اس کی سزا بھگتنی تھی اور اچھی طرح بھگت لی۔ اب اگر آپ کے دفتر تعزیرات میں چند سال سزا کے اور باقی رہ گئے ہیں تو ہماری قید کے پچھلے سالوں کے چال چلن پر نظر ڈالیے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ قیدی اطاعت شعار ہو تو آخر کے چند مہینے معاف کر دیے جاتے ہیں۔ پس آپ بھی رحم کیجیے، ہم کو چھوڑ دیجیے اور حکم دیجیے کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں۔

محض لیگ کے قواعد وضوابط کی تبدیلی سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس مسئلے کا فیصلہ نہ ہو۔

مسلم پولیٹکل فنڈ:

ایک عملی سوال یہ ہے کہ اگر لیگ چند دولت نثار اشخاص کے بند غلامی سے آزاد کر دی جائے تو اس کے کاموں کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ اب تک تو ایک حاتم وقت کی فیاضی تھی، جس کی دریا دلی سے تمام خشک کھیتیاں سرسبز تھیں، لیکن اگر آزادانہ اسپرٹ پیدا کی گئی، نصب العین کا اعلان کیا گیا اور اصلی کاموں پر ملتفت ہوئے، تو وہ تمام لوگ جو کلکٹر صاحب کے حکم کے بغیر پانی پینا گناہ سمجھتے ہیں، یا جن کے نزدیک ڈپٹی کمشنر کی اجازت کے بغیر کسی جلسے کی رسیپشن کمیٹی کا صدر بننا حرام ہے، قطعاً الگ ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ ''اذھب انت وربک'' اور پھر اُس دست کرم کی بخشش بھی موقوف ہو جائے گی جس کی خاطر اب تک سجدے کیے ہیں اور موت کو زندگی پر ترجیح دی ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ایک لمحے کے لیے بھی مانع کار نہیں ہو سکتا۔ ہم نے جیسا کہ کلکتہ میں اپنے مکرم دوست جناب سیّد وزیر حسن صاحب سے زبانی بھی کہا تھا اگر آج لیگ

کی نسبت قوم کو یقین ہو جائے کہ وہ سر آغا خاں کی نہیں، بلکہ قوم کی ہے تو جس قدر روپیہ آپ کو مطلوب ہے ایک لمحے کے اندر جمع کر لیجیے۔ آپ قوم کے جذبات سے جب کام ہی نہیں لیتے تو قوتوں کا ظہور کیوں کر ہو؟

ہمارا خیال ہے کہ اگر لیگ اصلی راہ کی طرف متوجہ ہو تو اس کو فوراً ایک قومی سیاسی فنڈ کے قیام کا اعلان کر دینا چاہیے۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ پولیٹکل کاموں کے لیے روپیہ کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ لیگ کی ممبری کی رقوم بھی موجودہ تعداد سے المضاعف ہو سکتی ہیں اور چند دنوں کے اندر بغیر کسی دقت کے ایک ایسا مستقل مالی انتظام ہو سکتا ہے جو سر آغا خان کے موجودہ وظیفے سے دوگنے تگنے تک پہنچ جائے۔ ہم کامل یقین اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایک حقیقی پولیٹکل مجلس کی اعانت کے لیے تمام قوم تیار ہے۔ بشرطے کہ قوم محسوس کرے کہ یہ ہماری چیز ہے نہ کہ غیروں کی۔

فالجہاد فی سبیل الحریہ

مضمون بہت بڑھ گیا ہے لیکن اس بارے میں ہم اپنے خیالات کے ہجوم کے آگے مجبور محض ہیں۔ بہت سی باتیں ابھی باقی ہیں لیکن جو باقی ہے اس کی ترجمانی کو اپنی زبان کی جگہ آپ کے دل کے سپرد کرتا ہوں اور صرف چند لفظوں کے عرض کرنے کی اور اجازت چاہتا ہوں۔

غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں۔ اب خدا کے لیے بستر مدہوشی سے سر اُٹھا کر دیکھیے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ بھولیے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ ''مسلم'' ہیں، اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے۔ کب تک اس دین الٰہی کو اپنے اعمال سے شرمندۂ عالم کیجیے گا؟ کب تک دنیا کو اپنے اُوپر ہنسایئے گا اور خود نہ رویئے گا؟ اور کب تک ہندستان میں اسلام کی قوت کا خانہ خالی رہے گا؟ اگر مصائب کا تازیانہ غفلت کی ہشیاری کا ذریعہ ہے تو کون سے مصائب ہیں جن کا آپ پر نزول نہیں ہو چکا ہے؟ ولقد اخذناھم بالعذاب فما استکانوا لربھم وما یتضرعون

یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے۔ مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند استبداد وغلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں، یقین کیجیے کہ وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف، جس کے لیے دراصل سب سے پہلے آپ کو اُٹھنا تھا۔ پس اُٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اُٹھانا چاہتا ہے اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں بیدار ہوں اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔ ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا۔ حال آں کہ اب تمھارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ سب کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔ فجاهدوا فی الله حق جهاده (۷۸:۲۲) ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وهم لا یسمعون ان شرالدواب عند الله الصم البکم الذین لا یعقلون۔ (۸:۲۱ تا ۲۲)

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئك الذین هداهم الله واولئك هم اولو الالباب (۳۹:۱۷،۱۸)

''پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے، اللہ کے اُن بندوں کے لیے جو کلامِ حق کو کان لگا کر سنتے ہیں اور اس کی اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے ہدایت کے لیے کھول دیا ہے اور یہی عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں۔''

کیبنٹ مشن اور اس کا پلان
اور
مستقبل پر اس کے اثرات

میں نے فروری ۱۹۴۶ء میں [1] ہندستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ ملک کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور ایک بالکل نیا ہندستان وجود میں آ گیا ہے۔ تمام ہندستانی، خواہ سرکاری ملازم ہوں یا عام شہری، آزادی کے ایک نئے جذبے سے لبریز تھے۔ برطانیہ کا رویہ بھی کچھ بدل گیا تھا۔ مجھے شروع ہی سے توقع تھی کہ لیبر حکومت ہندستان کے معاملے کا صحیح زاویے سے مطالعہ کرے گی اور ایسا ہی ہوا بھی۔ اختیار حاصل ہونے کے بعد جلد ہی اس نے ایک پارلیمنٹری ڈیلی گیشن ہندستان بھیجا۔ یہ ڈیلی گیشن ۱۹۴۵ء کی سردیوں میں ہندستان آیا۔ اس کے ارکان سے گفتگو کر کے مجھے اطمینان ہو گیا کہ انھوں نے ملک کے بدلے ہوئے مزاج کا اندازہ کر لیا ہے۔ انھیں یقین ہو گیا ہے کہ ہندستان کی آزادی کو اب عرصے تک ٹالا نہیں جا سکتا، اور انھوں نے حکومت کو جو رپورٹ دی ہو گی اس سے یقیناً لیبر کیبنٹ کے اس ارادے کو تقویت نہیں پہنچی ہو گی کہ جلد سے جلد دوستانہ سمجھوتا کر لے۔

۱۷ ر فروری ۱۹۴۶ء کو رات کے ساڑھے نو بجے میں ریڈیو سن رہا تھا جب مجھے برطانیہ کے نئے فیصلے کی خبر ملی، لارڈ پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ برطانوی حکومت ہندستان کو ایک کیبنٹ مشن بھیجے گی جو ہندستان کے نمائندوں سے ملک کی آزادی کے سوال پر گفت و شنید کرے گا۔ یہی بات اس پروگرام میں بیان کی گئی جس کا خاکہ وائسرائے کی اسی

تقریر میں پیش کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ مشن لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، تجارتی بورڈ کے پریزیڈنٹ سر اسٹیفورڈ کرپس اور محکمہ بحر کے پہلے لارڈ، اے وی الیگزینڈر پر مشتمل ہوگا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے اندر ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک نمائندہ آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرے اُوپر اس خبر کا کیا اثر ہوا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ لیبر حکومت نے فیصلہ کن قدم اُٹھایا ہے۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ سر سٹیفورڈ کرپس مشن کے ایک رُکن ہوں گے۔ وہ ہم سے گفتگو کر چکے ہیں اس لیے ایک پرانے دوست کی طرح ہیں۔

میں نے یہ بھی کہا کہ میرے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ نئی حکومت ہندستان کے مسئلے سے جی نہیں چرا رہی ہے بلکہ جرأت کے ساتھ دشواریوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ یہ بہت اہم تبدیلی ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں ہندستان کی صورتِ حال کے متعلق ایک بیان دیا۔ اس بیان کی ہند برطانوی تعلقات کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ انھوں نے صاف تسلیم کر لیا کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور ان پر ایک نئے نقطہ نظر سے غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ان کے اس اعلان نے ہندستان پر بہت اچھا اثر ڈالا کہ اگر پرانے طریقوں پر قایم رہنے کی کوشش کی گئی تو اس سے مسئلے حل نہ ہوگا، بلکہ تعطل پیدا ہو جائے گا۔

چند نکتے جو مسٹر ایٹلی نے اپنی تقریر میں بیان کیے تھے، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: انھوں نے یہ بات تسلیم کی کہ دونوں فریقوں نے غلطیاں کی ہیں اور ساتھ ہی کہا کہ پچھلی باتوں کو دہرانے کے بجائے ہمیں مستقبل پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ انھوں نے یہ سمجھایا کہ پچھلے نسخوں کوئی صورتِ حال پر منطبق کرنے میں کوئی فایدہ نہیں ہوگا، کیوں کہ جو مزاجی کیفیت ۱۹۴۶ء میں ہے وہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۳۰ء یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء میں بھی نہیں تھی۔ انھوں نے اس سلسلے میں کہا کہ وہ نہیں چاہتے کہ ہندستانیوں میں جو اختلافات ہیں ان کی اہمیت نمایاں کریں، کیوں کہ اختلافات اور آپس کی پھوٹ کے باوجود تمام ہندستانی آزادی کی خواہش میں متحد ہیں۔ یہی تمام ہندستانیوں کا بنیادی مطلب ہے، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ یا مرہٹے، سیاست دان یا سول سروس کے لوگ، مسٹر ایٹلی نے صاف طور پر اس کا اعتراف کیا کہ قومیت کا تصور بتدریج

ترقی کرتا رہا ہے اور اب یہ ان فوجیوں میں بھی سرایت کر چکا ہے جنھوں نے دورانِ جنگ میں شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندستان میں کچھ سماجی اور معاشی دقتیں ہیں تو ان کو خود ہندستان کے لوگ ہی دور کر سکیں گے۔ انھوں نے اپنی تقریر کو اس اعلان پر ختم کیا کہ کیبنٹ مشن کا مزاج کچھ کر کے دکھانے کی طرف مائل ہے اور کامیابی حاصل کرنے کا ارادہ کر کے جا رہا ہے۔

کیبنٹ مشن ۲۳ر مارچ کو ہندستان پہنچا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اس سے پہلے جب ہندستان آئے تھے تو بنگال کے ممتاز کانگریسی لیڈر مسٹر جے سی گپتا نے میزبانی کے فرائض انجام دیے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ کرپس سے ملنے کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ میں نے سر اسٹیفورڈ کے نام ان کو ایک خط دیا جس میں ان کے دوبارہ ہندستان آنے پر ان کا خیر مقدم کیا تھا۔

۲ر پریل ۱۹۴۶ء کو میں دہلی پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ جس پر غور کرنا چاہیے ہندستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہندستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ شملہ کانفرنس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سیاسی مسئلہ مفاہمت کی ایک منزل تک پہنچ چکا ہے، مگر فرقہ وارانہ اختلافات اب بھی جوں کے توں باقی ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت ہی فکر مند تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض صوبوں کی اکثریت مسلم تھی اس لیے انھیں ان صوبوں کے معاملات میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا مگر مجموعی حیثیت سے وہ ہندستان میں اقلیت میں تھے۔ اس لیے وہ اس خوف سے پریشان رہتے تھے کہ آزاد ہندستان میں ان کی حیثیت اور ان کا مرتبہ شاید محفوظ نہیں رہے گا۔

میں اس مسئلے پر مسلسل غور کرتا رہا اور اس کی وجہ سے بہت فکر مند بھی تھا۔ تمام دنیا کا رجحان حکومت کے اختیار کی عدم مرکزیت کی طرف ہے۔ ہندستان جیسے بڑے ملک میں جہاں آبادی کے اندر زبان، روایات اور جغرافیائی حالات کا اس قدر اختلاف ہے وحدانی طرز کی حکومت بین طور پر ناموزوں ہوگی۔ وفاقی حکومت، جس میں اختیارات بٹے ہوں، اقلیتوں

کے اندیشوں کو دور کرنے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہاں کا دستور وفاقی ہونا چاہیے۔ نیز اس کو اس طرح وضع کرنا چاہیے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ امور میں خودمختاری حاصل ہو۔ ہمیں صوبائی خودمختاری اور قومی وحدت میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنا تھا اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات اور منصوبوں کی تقسیم کا کوئی اطمینان بخش اصول دریافت کر لیا جائے۔ کچھ اختیارات اور منصب بنیادی طور پر مرکز سے متعلق ہوں گے اور کچھ صوبوں کے پاس۔ کچھ ایسے ہوں گے جو نہ مرکز سے متعلق ہوں گے نہ صوبوں سے بلکہ ان کو باہمی رضامندی سے مرکز یا صوبے عمل میں لائیں گے۔ پہلا قدم یہ تھا کہ ایک ایسا فارمولا مرتب کیا جائے جس کی رو سے یہ طے کر دیا جائے کہ کم سے کم کتنے معاملات ہیں جو لازمی طور پر مرکزی حکومت کے ذمے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ایسے معاملات کی بھی ایک فہرست ہونی چاہیے جنھیں صوبائی حکومتیں چاہیں تو مرکز کے سپرد کر سکیں۔ انھیں مرکزی حکومت کی اختیاری فہرست میں شامل سمجھا جا سکے اور اگر کوئی صوبہ چاہے تو اس فہرست کے تمام یا چند معاملات میں اپنے اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کر سکے۔

میرے نزدیک یہ بات صاف تھی کہ دفاع، رسل و رسائل اور امور خارجہ ایسے معاملے ہیں جن کا حق اسی حالت میں ادا ہو سکتا ہے کہ وہ ہندستان کے مرکزی معاملے سمجھے جائیں۔ ان کو صوبائی سطح پر لانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وفاقی حکومت کا مقصد فوت ہو جائے گا اور اس کی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ ٹھیک اسی طرح کچھ امور قطعی طور پر صوبائی حکومت کی ذمے داری میں ہونے چاہییں مگر اس کے علاوہ امور کی ایک تیسری فہرست بھی ہونی چاہیے جن کے بارے میں صوبائی قانون ساز اسمبلیاں طے کریں کہ وہ انھیں اپنے ماتحت رکھیں گی یا مرکز کو سونپ دیں گی۔

اس مسئلے پر میں نے جتنا غور کیا اسی قدر یہ بات میرے ذہن میں واضح ہوتی گئی کہ ہندستان کا مسئلہ اسی طریقے سے حل ہو سکتا ہے۔ اگر اس اصول کی بنیاد پر دستور بنایا گیا تو اس کا یقین ہوگا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں تین معاملوں کے سوا باقی تمام امور کا انتظام خود صوبہ کرے گا۔ اس سے مسلمانوں کا یہ ذہنی خوف کہ وہ ہندوؤں کے ماتحت ہوں گے، دور ہو جائے

گا۔ جب ایک مرتبہ یہ خوف دور ہو جائے گا تو اس بات کا امکان پیدا ہوگا کہ صوبوں کو کچھ اور اختیارات مرکز کے حوالے کرنے میں اپنا فایدہ نظر آئے۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ فرقہ وارانہ نقطہ نظر کے علاوہ ہندستان جیسے ملک کے لیے یہ بہترین سیاسی حل ہے۔ ہندستان بہت وسیع ملک ہے جس کی آبادی متعدد اکائیوں پر مشتمل ہے، جو اپنے اندر یکسانیت رکھتی ہیں اور مختلف صوبوں میں آباد ہیں۔ قانونی مصلحت اور انتظامی سہولت کے لحاظ سے بھی صوبوں کو یقین دلانا ضروری تھا کہ انھیں زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل ہوگی۔

یہ نقشہ میرے ذہن میں بتدریج قایم ہوا تھا اور کیبنٹ مشن کے ہندستان آنے تک بالکل واضح ہو گیا تھا لیکن اب تک میں نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی سے اس مسئلے پر گفتگو نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب اس کا مناسب موقع آئے گا تو اپنے نقطہ نظر کو صاف اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کردوں گا۔ میں کیبنٹ مشن کے ممبروں سے پہلی مرتبہ ۶ راپریل ۱۹۴۶ء کو ملا۔ مشن نے تبادلہ خیال کے لیے پہلے سے کچھ سوالات تیار کر لیے تھے۔ پہلا سوال ہندستان کے فرقہ وارانہ مسئلے سے متعلق تھا۔ جب مشن نے مجھ سے سوال کیا کہ فرقہ وارانہ گتھی کو کس طرح سلجھا سکتا ہوں تو میں نے وہی حل پیش کیا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جوں ہی میں نے کہا کہ لازمی اختیارات کی فہرست جو کم سے کم ہوں گے مرکز کے پاس ہوگی اور اس کے علاوہ اختیاری امور کی بھی فہرست ہوگی، تو لارڈ پیتھک لارنس نے کہا دراصل آپ فرقے وارانہ مسئلے کا ایک نیا حل پیش کر رہے ہیں۔

سر اسٹیفورڈ کرپس نے خاص طور پر میری تجویز میں دلچسپی لی اور بڑی دیر تک مجھ سے جرح کرتے رہے۔ آخر میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے نقطہ نظر سے مطمئن ہو گئے ہیں۔

ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۲۱ راپریل کو منعقد ہوا جس میں میں نے کیبنٹ مشن سے اپنی گفتگو کی رپورٹ پیش کی۔ میں نے فرقہ وارانہ مسئلے کا جو حل پیش کیا تھا اس کو میں نے کافی تفصیل سے بیان کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب گاندھی جی اور دوسرے ساتھیوں کو میری اس اسکیم پر گفتگو کا موقع ملا۔ ورکنگ کمیٹی کو شروع میں اس حل کے بارے میں بہت سے شکوک تھے۔ چناں چہ ممبروں نے طرح طرح کی دقتیں اور شبہات بیان کیے۔ میں نے ان کے اعتراضات کے جواب میں

اور جو پہلو صاف نہیں تھے ان کی وضاحت کی، بالآخر ورکنگ کمیٹی کو میری تجویز کے صحیح ہونے کا یقین ہوگیا، اور گاندھی جی نے ظاہر کردیا کہ وہ اس حل سے پورے طور پر متفق ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہہ کر مجھے مبارک باد دی کہ میں نے ایک ایسے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ جس نے ہر ایک کو زِچ کردیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میرا حل کٹر مسلم لیگیوں کے خوف کو بھی دُور کردے گا۔ اسی کے ساتھ اس کی پشت پر فرقہ وارانہ رجحانات کے بجائے سچی قومیت کی روح ہے۔ گاندھی جی مصر تھے کہ ہندستان جیسے ملک میں صرف وفاقی دستور ہی قابل عمل ہوسکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی انھوں نے میرے حل کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگرچہ اس میں کوئی انوکھا اصول پیش نہیں کیا گیا ہے، مگر اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندستان کے ماحول میں وفاقیت کے اصول کے معنی کیا ہیں؟

سردار پٹیل نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا مرکزی حکومت کا دائرۂ عمل صرف معاملوں تک محدود ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ کچھ ایسے امور ہیں جیسے کہ کرنسی اور فنانس، جن کا اپنی نوعیت کے لحاظ سے مرکز میں ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تجارت اور صنعت کو صرف کل ہند بنیاد پر ترقی دی جاسکے گی اور یہی صورتِ حال تجارتی پالیسی کی بھی ہے۔

مجھے ان اعتراضات کے جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گاندھی جی نے خود ہی میرے نقطہ نظر کو اپنالیا اور سردار کو جواب دینے لگے۔ انھوں نے کہا کہ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صوبائی حکومتیں کرنسی اور محصول جیسے مسائل پر مرکز سے اختلاف کریں گی۔ اس میں ان کا اپنا فایدہ ہوگا کہ ان معاملات میں کوئی متفقہ پالیسی اختیار کی جائے۔ اس لیے اس پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کرنسی یا مالیات کو مرکزی امور کی لازمی فہرست میں شامل کیا جائے۔

مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے لاہور کے ریزولیوشن میں جو بعد میں پاکستان ریزولیوشن کے نام سے مشہور ہوا، ہندوستان کی تقسیم کا ذکر کیا۔ میں نے جو حل پیش کیا تھا اس میں مسلم لیگ کے اندیشوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب جب کہ میں نے اپنی اسکیم پر اپنے ساتھیوں اور کیبنٹ مشن کے ممبروں سے گفتگو کرلی تھی تو میں نے سوچا کہ اس کو ملک کے سامنے پیش

کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چناں چہ ۱۵ را پریل ۱۹۴۶ء کو میں نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مطالبے کے بارے میں ایک بیان جاری کیا۔ ہندستان کی تقسیم ایک حقیقت ہے اور اس کو دس سال ہو چکے ہیں۔ اب جو میں اپنے بیان پر دوبارہ نگاہ ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں نے جو کچھ کہا تھا، وہی ہوا۔ چوں کہ اس بیان میں ہندستانی مسئلے کے حل کے متعلق میں نے اپنی قطعی رائے ظاہر کی تھی، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پر مجھے اس بیان کو درج کر دینا چاہیے۔ یہ میں نے اس وقت کہا تھا اور اب بھی میں کہوں گا (کہ مسئلے کا یہی حل درست تھا)۔

مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے اس پر میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ ایک ہندستانی ہونے کی حیثیت سے میں نے سوچا ہے کہ پورے ہندستان کے مستقبل پر اس سے کیا اثر ہوگا، ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی پورے ہندستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی نقصان دہ ہوگی، اور دراصل جتنے مسئلے اس کے ذریعے حل ہوں گے، ان سے زیادہ نئے مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نہیں اُترتا، اس سے یہ خیال پیدا کیا جاتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے، بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔ اسلام کسی ایسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں ''خدا نے ساری زمین کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔''

اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردہ ذہنیت کی علامت ہے اور اس کا خیال اسی طرح پیدا ہوا ہے جیسے یہودیوں میں قومی وطن کا خیال! یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان، ہندستان میں اپنی حیثیت قایم نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی ہیں کہ ایک کونے میں، جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو، سمٹ کر بیٹھ جائیں۔

یہودیوں کی اس آرزو سے ہمدردی کی جاسکتی ہے کہ ان کا ایک قومی وطن ہو، کیوں کہ وہ پوری دنیا میں منتشر ہیں اور کسی ایک علاقے میں بھی وہ حکومت کے انتظامات پر اثر نہیں ڈال سکتے۔ ہندستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نو کروڑ سے اُوپر ہے اور کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے وہ ہندستانی زندگی کا اتنا اہم عنصر ہیں کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن حد تک اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرت نے ان کو چند مخصوص علاقوں میں بڑی تعداد میں یکجا بھی کر دیا ہے اور اس طرح انھیں تقویت پہنچائی ہے۔

ان حالات میں پاکستان کے مطالبے میں کوئی جان نہیں رہتی، کم از کم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اس حق کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں کہ پورے ہندستان کو میدانِ عمل سمجھوں اور اس کی سیاسی اور معاشی زندگی کی تشکیل میں شرکت کروں۔ میرے نزدیک بزدلی کی بات ہے کہ میں اپنی آبائی جائیداد سے دستبردار ہو جاؤں اور اس کے ایک ٹکڑے پر قناعت کرلوں۔

جب کہ سب کو معلوم ہے کہ مسٹر جناح کی پاکستان کی اسکیم دو قومی نظریے پر مبنی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندستان میں بہت سی قومیں آباد ہیں جن کے درمیان مذہب بنائے امتیاز ہے۔ ان میں جو دو بڑی قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلمان۔ ان کی اس اعتبار سے کہ وہ دو الگ قومیں ہیں دو الگ ریاستیں ہونی چاہییں۔ ڈاکٹر ایڈورڈ ٹامس نے ایک مرتبہ مسٹر جناح سے کہا کہ ہندو اور مسلمان ہندستان کے ہزاروں شہروں، قصبوں اور گانوؤں میں مل جل کر رہتے ہیں۔ تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا ان کی جداگانہ قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مسٹر جناح کے نظریے کے مطابق چوں کہ یہ دونوں قومیں ہر بستی، ہر گاؤں اور ہر شہر میں ایک دوسری سے ٹکراتی رہتی ہیں اس وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ ان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

میں اس کے لیے تیار ہوں کہ اس مسئلے کے باقی تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس پر صرف مسلمانوں کے مفاد کے نقطہ نظر سے غور کیا جائے۔ میں اس سے بھی آگے جانے اور یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ پاکستان کی اسکیم سے مسلمانوں کو کسی طرح سے بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں اس کو منظور کرلوں گا اور دوسروں کو اسے منظور کرنے پر

آمادہ کرنے کے لیے کوشش کروں گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اس اسکیم کا خود مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے نقطہ نظر سے جایزہ لوں تو بھی اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس سے ان کو ذرا بھی فایدہ نہیں ہوسکتا اور ان کے جایز اندیشے دور نہیں ہوسکتے۔

آیئے ذرا ٹھنڈے دل سے ان نتائج پر غور کریں جو پاکستان بن جانے سے برآمد ہوں گے۔ ہندستان دو ریاستوں میں تقسیم ہوجائے گا جن میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور دوسری میں ہندوؤں کی۔ ہندستان میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان باقی رہ جائیں گے جو پورے ملک میں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں گے۔ وہ یوپی میں ۱۷ فیصد، بہار میں ۱۲ فیصد اور مدراس میں ۹ فیصد ہوں گے۔ انھوں نے تقریباً ایک ہزار سال سے ان علاقوں کو اپنا وطن سمجھا ہے اور ان میں سے اسلامی تہذیب اور تمدن کے مشہور مراکز تعمیر کیے ہیں۔

ان لوگوں کی ایک روز صبح کو آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھیں گے کہ راتوں رات اجنبی اور پردیسی بن گئے ہیں۔ وہ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہوں گے اور ایسی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے جو خالص ہندو بن گئی ہوگی۔

دوسری طرف خود ریاست پاکستان میں وہ غیر محفوظ اور کمزور ہوں گے۔ پاکستان کے اندر کہیں بھی ان کی اتنی بڑی اکثریت نہیں ہوگی جتنی ہندستان کی ریاست میں ہندوؤں کی۔

دراصل مسلمانوں کی اکثریت اتنی کم ہوگی کہ ان علاقوں کے غیر مسلمانوں نے جو تعلیمی اور سیاسی سبقت حاصل کرلی ہے وہ اس کو بے اثر کردے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور پاکستان میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، تب بھی اس کی وجہ سے ہندستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تو حل نہ ہوتا وہ تو باقی ہی رہتا۔

اس بات سے کہ دو ملک ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں، ان دونوں کی اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس سے صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اقلیتوں کو یرغمال سمجھنے کا طریقہ جاری ہوجائے اور سزا دینے اور بدلہ لینے کی کارروائیاں ہونے لگیں۔ اس وجہ سے پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کی کسی دشواری کا علاج نہیں ہے، وہ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان

کے حقوق کا تحفظ نہیں کرتی اور پاکستان کے شہری ہوتے ہوئے انھیں ہندستانی یا بین الاقوامی امور میں وہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی جو کہ انڈین یونین جیسی کسی بڑی ریاست کے شہری بن کر وہ حاصل کر سکتے ہیں۔

بحث کی خاطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے مفاد کے لیے اس قدر مضر ہے تو مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد اس کے فریب حسن میں کیوں کر مبتلا ہوگئی۔ اس کا جواب ہمیں انتہا پسند فرقہ پرست ہندوؤں کے رویے میں ملتا ہے جب مسلم لیگ نے پاکستان کی گفتگو چھیڑی تو انھیں اس میں اتحادِ اسلامی کی ایک ناپاک سازش نظر آنے لگی اور انھوں نے اس خوف میں اس کی مخالفت شروع کی کہ یہ ہندستانی مسلمانوں اور مسلمانوں کی ریاستوں کے درمیان جتھابندی کا پیش خیمہ ہے۔

اس مخالفت نے لیگ کے حامیوں کو اور اُکسایا انھوں نے ایک سیدھے سادے مگر غیر معمولی منطقی استدلال سے کام لے کر کہا کہ چوں کہ ہندو اتنی شدت سے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے یقیناً اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہوگا؟ اس طرح جذباتی ہیجان کی ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں سوچ سمجھ کر اچھے برے کے درمیان تمیز کرنا ناممکن ہو گیا اور خاص طور پر مسلمانوں کا نوجوان اور اثر پذیر طبقہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ مگر مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جب موجودہ ہیجانی کیفیت دور ہو جائے گی اور اصل مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکے گا تو جو لوگ اس وقت پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں وہ خود ہی اس کو مسلم مفاد کے لیے مضر ٹھہرا کر اس سے منہ پھیر لیں گے۔

میں نے کانگریس کو جو فارمولا قبول کرنے پر راضی کر لیا ہے اس میں وہ تمام خوبیاں جو پاکستان اسکیم میں ہیں، حاصل ہو جائیں گی اور اس اسکیم میں جو خامیاں اور خرابیاں ہیں ان کے مضر اثرات سے بچا جا سکے گا۔ پاکستان کی بنیاد مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں میں مرکز کی مداخلت کا خوف ہے، کیوں کہ مرکز میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ کانگریس اس خوف کو اس طرح دور کرتی ہے کہ صوبوں کو پوری خود مختاری دی جائے گی اور جو اختیارات مرکز کو نہ دیے جائیں گے وہ بھی صوبوں کو حاصل ہوں گے۔ اس نے مرکزی معاملات کی دو فہرستیں رکھی

ہیں؟ ایک لازمی اور دوسری اختیاری۔ اس طرح اگر کوئی صوبہ چاہے تو سوائے ان اختیارات کے جو مرکز کے سپرد کیے جائیں گے اور کم سے کم ہوں گے۔ وہ باقی تمام معاملات اپنے انتظام میں رکھ سکتا ہے۔ اس بنا پر کانگریس کی اسکیم کے ذریعے اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو اندرونی معاملات میں آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہیں اپنی ترقی کی تدبیریں کریں اور اسی کے ساتھ ان معاملوں میں جن کا تعلق پورے ہندستان سے ہے، وہ مرکز پر اپنا اثر ڈال سکیں گے۔

ہندستان کی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ مرکزیت پرمبنی وحدانی حکومت قائم کرنے کی ہر کوشش لازمی طور پر ناکام ہوگی۔ اسی طرح ہندستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی کوشش بھی ناکام ہوکر رہے گی۔ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسائل کا حل صرف اس طریقے پر ممکن ہے جو کانگریس کے فارمولے میں مضمر ہے اور جس میں صوبوں اور پورے ہندستان کے لیے ترقی کی گنجایش ہے۔ کانگریس کا فارمولا مسلم اکثریت کے علاقوں کے اس خوف کو دور کرنے کے لیے بالکل کافی اور مناسب ہے، جس کی وجہ سے پاکستان کی اسکیم بنائی گئی ہے، دوسری طرف اس میں پاکستان کی اسکیم کی خرابیاں نہیں ہیں اور اس کی بدولت وہ مسلمان جو اقلیت کے صوبوں میں ہیں خالص ہندو حکومت کے ماتحت نہ ہو جائیں گے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو فرقہ وارانہ تلخی اور اختلافات کی موجودہ کیفیت کو ہندستانی زندگی کا ایک عارضی دور سمجھتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ اختلافات اس وقت دور ہو جائیں گے جب ہندستان پر اپنے مستقبل کی تعمیر کی ذمے داری آجائے گی۔ مجھے اس وقت گلیڈ اسٹون کا ایک قول یاد آ رہا ہے کہ ''جو شخص پانی سے ڈرتا ہو اس کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ اسے پانی میں ڈال دیا جائے۔'' ٹھیک اسی طرح خدشوں اور شبھوں کو رفع کرنے کے لیے ہندستان کو اپنے معاملات کا انتظام وانصرام اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔

جب ہندستان اپنی قسمت کا مالک ہو جائے گا تو وہ فرقہ وارانہ بدگمانی اور کشمکش کی موجودہ کیفیت کو بالکل بھول جائے گا اور دورِ جدید کی زندگی کے مسائل کو جدید نقطہ نظر سے حل کرے

گا۔ بلاشبہ اختلافات باقی رہیں گے مگر وہ معاشی ہوں گے، فرقہ وارانہ نہ ہوں گے۔ سیاسی پارٹیوں کی باہمی مخالفتیں جاری رہیں گی مگر ان کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ طبقہ وارانہ ہوگی، فرقہ وارانہ نہیں ہوگی اور اسی لحاظ سے پالیسی کی تشکیل بھی ہوگی، اگر یہ کہا جائے کہ یہ محض ایک عقیدہ ہے، جو ممکن ہے بعد کے واقعات سے صحیح ثابت نہ ہو تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ بہر حال ۹ کروڑ مسلمان ایک ایسا عنصر ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور حالات چاہے جیسے بھی ہوں ان میں اتنی طاقت ہوگی کہ اپنے مستقبل کو خطرات سے محفوظ رکھ سکیں۔''

لاہور ریزولیشن کے بعد لیگ تقسیم کی راہ پر کچھ قدم اور آگے بڑھا چکی تھی، مگر اس نے یہ بات پوری طرح واضح نہیں کی تھی کہ دراصل اس کا مطالبہ کیا ہے؟ ریزولیشن کے الفاظ مبہم تھے اور اس کی کئی تاویلیں کی جا سکتی تھیں مگر اس کا مفہوم صاف تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو مکمل خود مختاری دی جائے۔ سکندر حیات خان نے اس ریزولیشن کی تائید کرتے ہوئے اس کی یہی تاویل کی تھی، مگر اب لیگ کے لیڈروں نے اپنے مطالبے کے معنی میں بہت زیادہ وسعت پیدا کر دی تھی۔ وہ ملک کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک آزاد ریاست کے قیام کی مبہم باتیں کرنے لگے تھے۔ کیبنٹ مشن اس مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس مشن ایک ایسے حل کے حق میں تھا جو کم و بیش میری تجویز کے مطابق تھا۔

گفتگو کا سلسلہ تقریباً آخر اپریل تک جاری رہا، مشن کے ساتھ ہماری ملاقاتیں ہوئیں اور مشن کے ارکان آپس میں بھی گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران میں مشن نے کام میں وقفہ کیا اور کشمیر چلا گیا۔ اب گرمی شروع ہو گئی تھی اور دہلی کی گرمی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا آرام کر لوں اور اس خیال سے کہ کشمیر جاؤں گا، وہاں کچھ حباب کو لکھ بھی دیا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ مشن کشمیر جا رہا ہے تو میں نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ میں نے یہ سوچا کہ کشمیر جانے کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ میں مشن سے رابطہ رکھنا اور اس کی رائے پر اثر ڈالنا چاہتا ہوں اس لیے میں مسوری چلا گیا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد شری راج گوپال اچاری نے یہ

تحریک شروع کی تھی کہ کانگریس کو مسلم لیگ کے مطالبات منظور کر لینے چاہییں۔ وہ یہاں تک کہتے تھے کہ ملک کی تقسیم کو اصولی طور پر مان لینا چاہیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ورکنگ کمیٹی سے علاحدہ ہو گئے اور عام کانگریسی ان سے خفا ہو گئے۔ گاندھی جی نے بھی راجاجی کی کوشش کو پسند نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ راجاجی ہماری گفتگو کے دوران میں کیبنٹ مشن سے نہ ملیں۔ انھوں نے راجاجی سے کہہ دیا کہ وہ مدراس ہی میں رہیں۔ راجاجی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ مگر کچھ عرصے تک وہ خاموش رہے۔ وقفے کے زمانے میں جب میں مسوری گیا تو میرے پاس ان کا خط آیا۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے ان کو دہلی آنے سے روک دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ گاندھی جی اب بھی نہیں چاہتے کہ راجاجی دہلی واپس آئیں۔ اس لیے ان سے مشورہ کیے بغیر میں نے اپنی ذمے داری پر راجاجی کو لکھا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو آ جائیں۔ راجاجی نے میری بات کو قطعی سمجھا اور آ گئے۔ گاندھی جی کو ان کا آنا کچھ ناگوار ہوا مگر میں نے کہا کہ راجاجی میرے خط لکھنے پر آئے ہیں۔ میں نے گاندھی جی کو یہ بھی سمجھایا کہ راجاجی کا دہلی آنے سے اس طرح روکنا مناسب نہیں تھا۔

مشن ۲۴/اپریل کو دہلی واپس آیا اور وائسرائے کے ساتھ مل کر دستور کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی، اس پر نظر ثانی کی۔ کئی مرتبہ بحث کرنے کے بعد، سر اسٹیفورڈ کرپس مجھ سے ان مسائل کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے آئے، جو اس دوران پیدا ہوئے تھے۔ ۲۸/اپریل کو مشن نے ایک بیان جاری کیا کہ بڑی پارٹیوں کے درمیان باہمی رضامندی سے معاہدہ کرنے کے لیے گفتگو کرنا مناسب ہوگا اس لیے مشن نے کانگریس اور لیگ کے صدور کو دعوت دی کہ وہ اپنی اپنی پارٹیوں کی ورکنگ کمیٹی کے نمایندے شملہ میں مشن سے مل کر گفتگو کرنے کے لیے نامزد کر دیں۔ ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن سے گفتگو کرنے کے لیے نمایندوں کو مقرر کرنے کا اختیار مجھے دے دیا۔ چناں چہ مین نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو اپنے رفیق کار کی حیثیت سے کانگریس کی نمایندگی کے لیے نامزد کیا۔ حکومت نے شملہ میں ہمارے قیام کا انتظام کر دیا۔ گاندھی جی باضابطہ طور پر گفتگو کرنے والوں میں شامل نہیں تھے، مگر مشن نے ان کو شملہ آنے کی دعوت دی تا کہ ضرورت کے وقت ان سے مشورہ کیا جا سکے۔ انھوں نے مشن کی دعوت قبول کر

لی اور آ کر ''مینورولا'' (Manor Villa) میں ٹھہر گئے۔ ہم وہاں ورکنگ کمیٹی کے غیر رسمی جلسے کرتے رہے تاکہ گاندھی جی بھی ان میں شریک ہوسکیں۔

۲رمئی کو شملہ میں گفتگو شروع ہوئی اور ۱۲رمئی تک جاری رہی۔ باضابطہ کانگریس کے علاوہ ہم نے بہت سی بے ضابطہ طور پر بحثیں بھی کیں۔ میرا قیام ''ریٹریٹ'' (Retreat) میں تھا اور مشن کے ممبر کئی موقعوں پر مجھ سے ملنے وہاں آئے۔ میں بھی ان سے ملنے کے لیے گیا، کبھی انفرادی طور پر کبھی اجتماعی طور پر، جیسا بھی مناسب معلوم ہوا۔ ان ملاقاتوں میں آصف علی یا ہمایوں کبیر کبھی کبھی میرے ساتھ گئے۔ کوئی دو ہفتے کے بعد ہم دہلی واپس آئے۔ مشن کے ممبروں نے آپس میں گفتگو کرنے کے بعد اپنی تجاویز مرتب کیں۔ ان کا ۱۶رمئی کو مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں اعلان کیا۔ پارلیمنٹ میں عام اطلاع کے لیے ایک تحریر بھی شائع کی گئی جس میں یہ پلان درج تھا اور یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندستان کا ایک نیا دستور جلد سے جلد تیار کرنے کے لیے برطانوی کیبنٹ اس انتظام کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ میں نے کیبنٹ مشن پلان کو ضمیمہ میں درج کر دیا ہے اور اگر کوئی شخص چاہے تو اس کا میری اسکیم سے مقابلہ کر سکتا ہے جسے میں نے اپنے ۱۵راپریل کے بیان میں پیش کیا تھا۔[۳]

میں چاہتا تھا کہ ہم کیبنٹ مشن پلان پر گفتگو کا سلسلہ شملہ میں جاری رکھیں۔ میں نے لارڈ ویول سے کہا ہمارا شملہ میں اپنی گفتگو کو مکمل کر لینا بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ دہلی کا موسم ان اہم مسائل پر جو زیر بحث تھے ٹھنڈے دل سے اور فکر اور احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ لارڈ ویول نے کہا کہ حکومت کا مرکز دہلی میں ہے اور اگر وہ زیادہ عرصے تک باہر رہے تو کام میں حرج ہو سکتا ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ دہلی میں انھیں تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وائسرائیگل لاج ایئر کنڈیشنڈ ہے اور انھیں باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، مگر کیبنٹ مشن کے ممبروں اور ہمارے لیے صورت کچھ اور ہے۔ دہلی کی کیفیت ایک بھٹی کی سی ہو گئی ہے اور ہمارے لیے اس میں کام جاری رکھنا بہت دُشوار ہوگا۔ لارڈ ویول نے جواب دیا کہ یہ صرف چند دنوں کی بات ہے۔

آخر میں ہوا یہ کہ ہم نے مئی کے باقی دن اور پورا جون دہلی میں گزارا۔ اس سال گرمی

غیر معمولی تھی، کیبنٹ مشن کے ممبروں پر اس کا اثر ہوا اور سب سے زیادہ لارڈ پیتھک لارنس پر، جو ایک روز گرمی کی شدت سے بے ہوش ہو گئے۔ وائسرائے نے میرے لیے ایک ایئر کنڈیشنڈ کمرے کا انتظام کر دیا تھا جس سے مدد ضرور ملی مگر موسم ایسا صبر آزما تھا کہ ہر شخص چاہتا تھا کہ گفتگو کا سلسلہ جلد سے جلد تکمیل کو پہنچ جائے۔ بدقسمتی سے کانگریس اور لیگ کے اختلافات آسانی سے طے ہونے والے نہیں تھے اور ہماری گفتگو سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔

کیبنٹ مشن اور اس کے پلان کی دردسری کچھ کم نہ تھی کہ کشمیر کے واقعات نے ایک اور دردسر کا اضافہ کر دیا۔ نیشنل کانفرنس شیخ عبداللہ کی قیادت میں کشمیر کے عوام کے سیاسی حقوق کی لڑائی لڑ رہی تھی۔ جب کیبنٹ مشن ہندستان آیا تو انھوں نے سوچا کہ اپنے مطالبوں کو منوانے کے لیے اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں۔ انھوں نے ''کشمیر چھوڑ دو'' کا نعرہ بلند کیا اور اپنے معاملے کو کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ کشمیر کا مہاراجا شخصی حکومت کو ختم کر کے عوام کی خودمختار حکومت قایم کرے۔ مہاراجا کی حکومت نے اس کے جواب میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے نیشنل کانفرنس کا ایک نمایندہ حکومت میں شامل کر لیا گیا تھا اور سمجھوتا ہو جانے کا امکان نظر آ رہا تھا۔ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری سے اس اُمید پر پانی پھر گیا۔

جواہر لال نے کشمیر میں جمہوری حکومت قایم کرنے کی جدوجہد میں ہمیشہ دلچسپی لی تھی۔ جب یہ واقعات رونما ہوئے تو انھوں نے سوچا کہ ان کو کشمیر جانا چاہیے۔ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کی طرف سے مقدمے کی پیروی کا کوئی انتظام ہو۔ میں نے آصف علی سے کہا کہ وہ اس کام کو سنبھال لیں۔ جواہر لال نے کہا کہ وہ آصف علی کے ساتھ جائیں گے اور اس طرح دونوں روانہ ہو گئے۔ مہاراجا کی حکومت اس فیصلے پر برہم ہوئی اور کشمیر میں ان لوگوں کے داخلے کی ممانعت کر دی۔ جب یہ لوگ راولپنڈی سے چل کر کشمیر کی سرحد کے قریب پہنچے تو اوری میں ان کو روک دیا گیا۔ انھوں نے امتناعی حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور کشمیر کی حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا۔ ظاہر ہے اس نے ملک میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیا۔

یہ حالات میرے لیے کچھ خوشی کا باعث نہ تھے۔ جہاں مجھے ایک طرف کشمیر کی حکومت کی اس کارروائی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہاں دوسری طرف میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ کشمیر کے متعلق ایک نیا جھگڑا کھڑا کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے وائسرائے سے اس بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ حکومت ہند کو اس کا انتظام کر دینا چاہیے کہ میں ٹیلیفون پر جواہر لال سے بات کر سکوں۔ جواہر لال ایک ڈاک بنگلے میں نظر بند تھے اور مجھے ان سے فون پر گفتگو کرنے میں کچھ دیر لگی۔ میں نے جواہر لال سے کہا کہ میری رائے ہے کہ ان کو جس قدر جلد ممکن ہو دہلی واپس آ جانا چاہیے۔ موجودہ حالات میں ان کا کشمیر میں داخل ہونے پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہے۔ جہاں تک کشمیر کے مسئلے کا تعلق ہے میں نے بحیثیت صدر کانگریس کے، ان کو یقین دلایا کہ میں اس کو اپنے ہاتھ میں لوں گا۔ میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا کرانے کے لیے بھی کارروائی شروع کر دوں گا، مگر جواہر لال کو فوراً واپس آنا چاہیے۔

پہلے جواہر لال نے عذر کیا مگر کچھ بحث کے بعد اور میرے یقین دلانے پر کہ میں کشمیر کے معاملے کو خود اپنے ہاتھ میں لوں گا، وہ واپس آنے پر راضی ہو گئے۔ پھر میں نے لارڈ ویول سے درخواست کی کہ جواہر لال اور آصف علی کو واپس لانے کے لیے ہوائی جہاز کا انتظام کر دیں۔ جب میں نے یہ درخواست کی، اس وقت شام کے سات بج چکے تھے، مگر انھوں نے اسی رات کو ایک ہوائی جہاز بھیج دیا جو سری نگر تقریباً دس بجے پہنچ گیا اور جواہر لال اور آصف علی کو لے کر دو بجے رات کو واپس آ گیا۔ اس پورے معاملے میں لارڈ ویول کا طرزِ عمل انتہائی دوستانہ رہا اور مجھے پسند آیا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ کیبنٹ مشن نے ۱۶ رمئی کو اپنی اسکیم شائع کی۔ بنیادی طور پر یہ وہی تھی جس کا خاکہ میرے ۱۵ راپریل کے بیان، میں تھا۔ کیبنٹ مشن پلان کے مطابق صرف تین محکمے لازمی طور پر مرکزی حکومت کے ماتحت رکھے گئے تھے۔ یہ تھے دفاع، امور خارجہ اور رسل ورسائل، جنھیں میں نے اپنی اسکیم میں تجویز کیا تھا۔

مشن نے اپنے پلان میں ایک نئی تجویز کا اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اے، بی اور سی۔ اس لیے کہ مشن کے ممبروں کا خیال تھا کہ اس سے اقلیتوں کے

دلوں میں زیادہ اطمینان اور اعتماد پیدا ہوگا۔ حصہ ''بی'' پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور برطانوی بلوچستان پر مشتمل تھا۔ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ حصہ ''سی'' جس میں بنگال اور آسام شامل تھے، ایسا حصہ تھا جس میں مسلمانوں کی دوسروں کے مقابلے میں تھوڑی اکثریت تھی۔ کیبنٹ مشن کا خیال تھا کہ یہ انتظام مسلم اقلیت کو مکمل طور پر مطمئن کردے گا اور لیگ کے تمام جائز خدشوں کو دُور کردے گا۔

مشن نے میرے اس خیال کو بھی تسلیم کرلیا تھا کہ بیشتر امور صوبوں کے اختیار میں ہوں گے۔ اس طرح مسلمانوں کو مسلم اکثریت کے صوبوں میں تقریباً پوری خودمختاری حاصل ہو جائے گی۔ محض چند امور بہ شرط اتفاق علاقائی نظام کے ماتحت رکھے جاتے۔ اس لحاظ سے بھی سیکشن بی اور سی میں مسلمانوں کی اکثریت یقینی تھی اور انھیں اس کا موقع تھا کہ اپنی تمام جائز توقعات کو پورا کریں جہاں تک مرکز کا سوال تھا۔ اس کے ماتحت صرف تین امور تھے۔ چوں کہ کیبنٹ مشن پلان کی روح وہی تھی جو میری اسکیم کی تھی۔ صرف تین حصوں یا سیکشنوں کے قیام کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس لیے میری رائے تھی کہ ہمیں اس اسکیم کو منظور کرلینا چاہیے۔

پہلے پہل مسٹر جناح اسکیم کے بالکل خلاف تھے۔ مسلم لیگ ایک الگ اور آزاد ریاست کے مطالبے میں اس قدر شدت دکھا چکی تھی کہ اب اس کے لیے اس سے کم پر راضی ہونا مشکل تھا۔ مشن نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ ملک کی تقسیم اور الگ آزاد ریاست کے قیام کی کسی حالت میں بھی سفارش نہیں کرسکتا۔ لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفورڈ کرپس نے بار بار کہا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پاکستان جیسی ریاست جو مسلم لیگ کے مدِنظر ہے، کیسے زندہ رہ سکتی ہے اور پائیدار ہوسکتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مسئلے کو حل کرنے کا واحد طریقہ میرا فارمولا ہے جس کے مطابق صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل ہوگی اور مرکزی حکومت کے لیے صرف تین امور مخصوص ہوں گے۔ لارڈ پیتھک لارنس نے ایک مرتبہ نہیں کئی بار کہا کہ اس فارمولے کو منظور کرلینے کے معنی یہ ہوں گے کہ شروع میں مسلم اکثریت کے صوبے صرف تین امور مرکزی حکومت کے حوالے کریں گے اور اس طرح اپنی مکمل خودمختاری کا یقین کرلیں گے۔ دوسری طرف ہندو اکثریت کے صوبے خود سے مرکزی

حکومت کوئی اور معاملے منتقل کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ کیبنٹ مشن کا خیال تھا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ سچے وفاق میں شریک ہونے والے ارکان کو طے کرنے کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کتنے اور کس نوعیت کے اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کریں گے۔

مسلم لیگ، کونسل تین روز تک اجلاس کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر پائی۔ آخری دن مسٹر جناح کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

> ''اقلیتوں کے مسئلے کا حل کیبنٹ مشن پلان میں پیش کیا گیا ہے، اس سے زیادہ منصفانہ کوئی اور فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال وہ اس سے بہتر شرطیں نہیں منوا سکتے۔ انھوں نے کونسل سے کہا کہ کیبنٹ مشن نے جو اسکیم پیش کی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ ہے جسے وہ حاصل کر سکتے ہیں۔''

اس بنا پر انھوں نے مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ اسکیم کو منظور کر لے اور کونسل نے بالاتفاق اس کے حق میں رائے دی۔

میں مسوری ہی میں تھا، جب مسلم لیگ کے کچھ ممبر مجھ سے ملے تھے اور اپنی حیرانی اور تعجب کی کیفیت مجھ سے بیان کی تھی۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ اگر مسلم لیگ کو کیبنٹ مشن پلان ہی منظور کرنا تھا تو آخر اس نے فرقہ وارانہ جذبات کو اس درجے کیوں بھڑکایا اور ایک آزاد ریاست کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کو گمراہ کیوں کیا؟ میں نے ان سے اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔ آخر میں ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ مسلم لیگ کا نقطہ نظر جو بھی رہا ہو، ہندستان کے مسلمانوں کو اس سے بہتر شرائط کی توقع نہیں ہونی چا۔ یے تھی، جو کیبنٹ مشن میں پیش کی گئی ہیں۔

ورکنگ کمیٹی میں جو بحثیں ہوئیں ان میں میں نے سمجھایا کہ کیبنٹ مشن پلان بنیادی طور پر وہی اسکیم ہے جو کہ کانگریس منظور کر چکی ہے۔ اس طرح کانگریس کو پلان کے بنیادی سیاسی فیصلے کو منظور کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ البتہ ''کامن ویلتھ'' کے ساتھ ہندستان کے تعلق کا سوال ابھی باقی تھا۔ میں نے مشن سے کہا کہ اس کا فیصلہ وہ ہندستان پر چھوڑ دیں۔ مجھے یقین تھا کہ ہم صرف اسی طریقے سے صحیح فیصلہ کر سکیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میرا خیال ہے کہ اگر یہ سوال ہندستان پر چھوڑ دیا گیا تو یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ ''کامن ویلتھ'' میں

بدستور شامل رہنے کا فیصلہ کرے گا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ چناں چہ کیبنٹ مشن پلان میں یہ معاملہ آزاد ہندستان کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بھی ہمیں کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے میں آسانی ہوگئی۔ سمجھوتے کی طویل گفتگوؤں کے بعد ورکنگ کمیٹی نے اپنے ۲۶/جون کے ریزولیوشن میں کیبنٹ پلان کو مستقبل کے لیے منظور کرلیا، البتہ وہ عارضی حکومت کے قیام کی تجویز کو منظور نہ کرسکی۔[۴]

(میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر کیبنٹ مشن نے جس خوبی کے ساتھ سمجھوتے کی گفتگو کی، اس پر بھی اسے خراجِ تحسین ادا کروں۔ سر اسٹیفورڈ کرپس میرے پرانے دوست ہیں اور ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں۔ لارڈ پیتھک لارنس اور مسٹر الیگزینڈر سے اس سے پہلے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر ان دونوں کے بارے میں بھی میں نے بہت اچھی رائے قایم کی۔ لارڈ پیتھک لارنس نے جس ہمدردی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا، اس سے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ وہ تھے تو بوڑھے مگر ان میں نوجوانوں کی زندہ دلی تھی، ان کا نمایاں خلوص، ہندستان سے ان کی گہری محبت اور ہماری دشواریوں کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت، ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے ہم ان کی ہر رائے کی طرف بہت توجہ کرتے تھے۔ مسٹر الیگزینڈر بولتے کم تھے، مگر جب کبھی وہ کوئی رائے دیتے تو اس میں ان کی قابلیت اور سیاسی بصیرت نمایاں ہوتی تھی۔)

کانگریس اور مسلم لیگ کا کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لینا ہندستانی تاریخ آزادی کا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا تھا کہ ہندستان کی آزادی کا پیچیدہ مسئلہ گفتگو اور مفاہمت کے ذریعے طے پایا، نہ کہ تشدد اور جنگ کے ذریعے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ مشکلات قطعی طور پر ماضی کی داستان بن گئی ہیں۔ سارے ملک میں شادمانی کا احساس تھا اور تمام لوگ آزادی کے مطالبے میں متحد ہوئے تھے۔ ہم خوشیاں منا رہے تھے، مگر اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ ہماری شادمانی قبل از وقت ہے اور تقدیر مایوسی کا کڑوا گھونٹ پلانے کے انتظار میں ہے۔

حواشی

۱- مولانا کا یہ وہی بیان ہے جو ۱۶؍ اپریل کو ایسوسی ایٹ پریس نے جاری کیا تھا اور ۱۷ کو اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ انگریزی متن کے لیے دیکھیے ''سلیکٹڈ ورکس آف مولانا ابوالکلام آزاد'' مرتبہ راویندرا کمار، جلد ۲، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء ڈاکومنٹ نمبر ۹۲، ص ۶۳-۱۶۱ اور اُردو متن کے لیے دیکھیے امام الہند ابوالکلام آزاد (جلد چہارم) مرتبہ سیدہ سیدین، آئی سی سی آر، نئی دہلی، ص ۶۴-۳۶۱۔

۲- بلاشبہ بڑے بڑے لیگیوں نے یہ اندازِ فکر اختیار کر لیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اندازِ فکر نہایت سطحی اور عقل و تدبر کے خلاف تھا۔ اگر ہندوؤں کی مخالفت سے ''مسلمانوں کے لیے پاکستان کی اسکیم کی افادیت'' پر استدلال کیا جا سکتا تھا تو دو درجن سے زیادہ غیر مسلموں کی تقسیم کی تجویز اور پاکستان کی اسکیم کی تائید سے۔ مسلمانوں کے لیے اس اسکیم کی عدم افادیت پر یہ استدلال بھی درست قرار پائے گا کہ اگر ہندو مہا سبھا کا جنرل سیکرٹری اس اسکیم کی تائید کر رہا تھا اور پٹیل جیسا متعصب فرقہ پرست اس اسکیم کے قبول کر لینے پر آمادہ ہو گیا تھا تو ضرور کوئی ایسی بات ہوگی جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف جاتی ہوگی لیکن جیسا کہ عرض کیا، مذکورہ بالا استدلال میں کوئی معقولیت نہ تھی۔

اس طرح لیگیوں کا یہ کہنا کہ جو مسلمان پاکستان کی اسکیم کے مخالف ہیں، وہ ہندوؤں کے ایجنٹ اور ملت اسلامیہ کے غدار تھے! اگر یہ استدلال درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی درست ماننا پڑے گا کہ جو ہندو، عیسائی، پارسی، قادیانی تقسیم ملک اور پاکستان کی اسکیم کے مجوز یا مؤید اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے سابقین اوّلین میں سے تھے، جنھوں نے نظریۂ پاکستان کی بنیاد ڈالی تھی اور راہ ہموار کر دی تھی۔ اس کے لیے ہمیں ان کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس بارے میں کیوں شک کیا جائے کہ وہ بھی اسلام کے خادم اور ملت اسلامیہ کے واقعی بہی خواہ اور محسن تھے اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے سابقین اوّلین میں سے تھے، جنھوں نے نظریہ پاکستان کی بنیاد ڈالی تھی، لیگی رہنماؤں کو حقیقت کی روشنی دکھائی تھی اور راہ ہموار کی تھی۔ اس کے لیے ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے!

واقعہ یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کی تجویز یا پاکستان کی اسکیم ہندستان کے سیاسی مسئلے کے حل کی ایک خالص سیاسی تجویز تھی اور اس کی موافق اور مخالف دونوں جماعتوں میں، مسلم اور غیر مسلم سب شامل تھے۔ (ا-س-ش)

۳- انڈیا وِنس فریڈم کی اب تک کی تمام زبانوں کی تمام اشاعتوں کے ضمیمے میں کابینہ مشن پلان کی جگہ

۳ جون ۱۹۴۷ء کا ماؤنٹ بیٹن پلان چھپتا رہا تھا۔ اس ایڈیشن میں یہ تصحیح کردی گئی ہے۔

اب ٹرانسفر آف پاور کی اشاعت نے مسلم لیگ کے اس فیصلے کے پس منظر سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ ایچ ایم سیروائی اس کی ہفتم (صفحہ ۸۷-۶۸۴، و ۸۳۸) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ کے کابینہ مشن پلان کو قبول کرنے کا ایک مخصوص پس منظر تھا، جسے عام طور پر سمجھا نہیں گیا۔ جناح نے ۲۲ رمئی کو مسلم لیگ کونسل کے فیصلے سے قبل، ایک بیان کے ذریعے پلان پر تنقید کی اور ۲۴ مئی کو سر کرپس کے ہندستان کے دورے کے درمیان پرائیویٹ سیکرٹری میجر ووڈ رویاٹ نے جناح سے ملاقات کی۔ جناح سے گفتگو کے بعد اوران کا موڈ سمجھنے کے بعد ویاٹ نے جناح سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہوگا کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی درج ذیل خطوط پر قرارداد پاس کرے؟

''حکومت برطانیہ نے پاکستان کی خوبیوں پر رائے دے کر غیر مناسب حرکت کی ہے۔ اسے کروڑوں لوگوں کے مطالبے کو مسترد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ان کا پاکستان کے بارے میں تجزیہ نہایت افسوس ناک تھا۔ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی سے یہ توقع نہیں رکھی کہ وہ انھیں پاکستان دے دے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ انھیں پاکستان اپنے زورِ بازو پر حاصل کرنا ہے۔ کیبنٹ مشن پلان میں دی گئی اسکیم نا قابل عمل ہے اور یہ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مشینری کام نہیں کرسکتی وہ پلان کو قبول کریں گے تا کہ وہ ثابت کردیں کہ وہ اسے موقع دینا چاہتے ہیں اور وہ ہرگز اسے ناکام بنانے کی کوشش نہیں کریں گے، لیکن وہ اس پلان یعنی منصوبے کو پاکستان کی راہ میں پہلا قدم سمجھ کر قبول کرلیں گے۔

یہ تجویز سن کر وہ (جناح) خوش ہوگیا اور اس نے کہا کہ تم میرا مدعا اچھی طرح سمجھ گئے ہو اور مجھے یقین ہے کہ مسلم لیگ ایسا ہی کرے گی۔''

''ویاٹ کے جناح کے ساتھ انٹرویو کے بعد مشن اور وائسرائے نے ایک بیان جاری کیا، جس میں انھوں نے کہا کہ کانگریس کی گروپنگ کے بارے میں توضیح مشن کی سوچ کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے یہ نا قابل قبول ہے۔ مشن نے واضح کیا کہ گروپنگ اس منصوبے کا ضروری حصہ ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کانگریس کا عبوری قومی حکومت اور ڈومینین سطح کی کابینہ کا مطالبہ بھی مسترد کردیا جس کا مطلب آزادی نکلتا تھا۔ ۶ رجون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل نے ویاٹ کے اندازے کے مطابق ایک قرارداد کے ذریعے کابینہ مشن قبول کرلیا اور ویاٹ کے بتائے ہوئے خطوط پر یہ ریزولیوشن پاس کیا۔''

سیروائی نے اس کے بعد مسلم لیگ کونسل کے پاس کردہ ریزولیوشن کا ایک حصہ بھی درج کردیا ہے جو ویاٹ کے ہدایت کردہ خطوط کے عین مطابق ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود نے ریزولیوشن کے اس حصے کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''ان وجوہات کی بنا پر مسلم لیگ اسکیم منظور کررہی ہے اور دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرے گی۔ کابینہ مشن پلان میں صوبوں یا گروپوں کی یونین سے علاحدگی کا حق مضمر ہے۔ مسلم لیگ اس کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرے گی۔ مسلم لیگ کے فیصلے اور بالآخر رویے کا انحصار دستور ساز اسمبلی کی کارکردگی اور ان دساتیری

نوعیت (ہیئت) پر ہوگا جو یہ ادارہ مشترکہ طور پر اور اس کے تینوں سیکشن علاحدہ علاحدہ غور وخوض کر کے بنائیں گے۔ مسلم لیگ یہ حق رکھتی ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی کی پیش رفت اور کارکردگی کے پیش نظر کسی وقت بھی اپنے اس رویے پر نظر ثانی کرے یا بدل دے۔ اگر بعد ازاں بھی حالات کا تقاضا ہو، تو مسلم لیگ وفاقی اصولوں کے پیش نظر اور اپنے طے شدہ مقاصد کے حصول کے لیے اپنے رویے میں تبدیلی لا سکتی ہے۔" (تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت: از ایچ ایم سیر وائی۔ ترجمہ و اضافہ: ڈاکٹر صفدر محمود۔ لاہور ۱۹۹۰ء، صفحہ ۷۸)

اس قرارداد کے سرسری مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلم لیگ نے کابینہ مشن پلان منظور کر لینے کے باوجود اس سے فرار کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ "مسلم لیگ یہ حق رکھتی ہے......" اور "بعد ازاں بھی اگر حالات کا تقاضا ہوا تو......" اس کا اس کے سوا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی وقت بھی کوئی بہانہ کر کے اپنی منظوری کو واپس لے سکتی تھی لیکن یہ لیگ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے پنڈت نہرو کے بیان (۱۰/جولائی ۱۹۴۶ء) کا بہانہ مل گیا اور ۲۷/جولائی کو ایک قرارداد کے ذریعے مسلم لیگ نے اپنی منظوری واپس لے لی۔

۴- اس کے بعد کا پیراگراف جو قوسین میں بند کر دیا گیا ہے ۱۹۸۸ء کے ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا ہے۔ (ا-س-ش)۔

اقلیتوں کے متعلق متفقہ منشور کی ضرورت!

حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ۲۹ر جون ۱۹۴۷ء کو دونوں ڈومینیوں کی دستوری اسمبلیوں کو مشورہ دیا کہ وہ مشترک اجلاس کر کے اقلیتوں کے متعلق متفقہ منشور مرتب کر لیں۔

آپ نے فرمایا:

۳ر جون کے اعلان کو منظور کر لینے تک اور اس سے پہلے جو کچھ ہوا اس کو داستان ماضی سمجھنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ اس منصوبے میں بدیہی اور نمایاں خرابیاں موجود ہیں، لیکن موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کوئی شکل ممکن نہ تھی۔

یہ حقیقت کہ اس منصوبے نے ایک ایسے مسئلے کو صاف کر دیا ہے۔ جسے قومی ترقی کے لیے حل کرنا انتہائی ضروری تھا۔ ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم ماضی کو بھول کر مستقبل کی فکر کریں۔

۳ر جون کا اعلان اب مسلمہ حقیقت ہے۔ اس منصوبے کی شرائط کے مطابق بنگال اور پنجاب کی تقسیم بھی ہو چکی۔ ایک مرتبہ جب عوام اور ان کے نمائندے کوئی فیصلہ کر لیں تو پھر ماضی کے متعلق سوچتے رہنا گزشتہ سوالات کو اُٹھانا اور ایک بار پھر تذبذب، تلخی اور تنازعہ پیدا کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اب دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی تمام توجہ مستقبل پر مرکوز کر دیں اور تمام متعلقہ فرقوں کے لیے حفاظت امن اور ترقی کا ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

یہ بات یقیناً قابل افسوس ہے کہ ہندستان کی قوم پروری کی کامیابی کا جب موقع آیا تو

فرقہ وارانہ کشیدگی نے اس کی فتح کو ایک حد تک مسخ کر دیا، لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندستان نے ایسے ماحول اور حالات میں آزادی حاصل کی ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ (قومی آواز مورخہ یکم جولائی ۱۹۴۷ء)

مولانا آزاد کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے دستوری اسمبلیوں نے تو کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ البتہ ۲۲ر جولائی کی شام کو ۵ بجے نئی دہلی میں تقسیم کونسل کا اجلاس زیر صدارت لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند ہوا جو غالباً اسی تجویز کا عملی نتیجہ تھا۔

اس اجلاس میں ہندستان اور پاکستان کی مجوزہ حکومتوں کے دو دو نمایندے شریک ہوئے۔ اس کونسل نے اعلان کیا:

اختیارات کی منتقلی کے بعد اقلیتوں کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ برتاؤ کیا جائے گا۔ کسی علاقے میں کسی قسم اور کسی حیثیت کے تشدد کو برداشت نہ کیا جائے گا۔ ہر شہری کو عام شہری حقوق کے استعمال میں مساوی درجہ دیا جائے گا دونوں حکومتیں اپنے اپنے علاقوں میں بسنے والوں کو تقریر، انجمن سازی، عبادت کی آزادی اور ان کے زبان، کلچر کے تحفظ کا یقین دلا رہی ہیں۔ دونوں حکومتیں اس عزم اور ارادے میں کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھائیں گی۔ یکم اگست سے مشرقی پنجاب کے بارہ اضلاع اور مغربی اضلاع کے لیے ایک مخصوص فوجی کمان مقرر کیا جائے گا۔ دونوں حکومتیں حد بندی کمیشن کے فیصلے کو منظور کریں گی۔

(قومی آواز، لکھنؤ ۲۶ر جولائی ۱۹۴۷ء، بحوالہ ''علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے''، ص ۳۳-۴۳۲)

فرقہ وارانہ فسادات

۲۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں ایک مفصل بیان اخبارات میں شائع کرایا۔ مولانا فرماتے ہیں:

''حال کے افسوس ناک حالات نے لوگوں کو اس قدر تنگ نظر کر دیا ہے کہ غیر جانبدارانہ طریقے پر کوئی رائے قایم کرنا بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ عام طور پر ہر مسلمان ان مصیبتوں ہی کے متعلق خیال کرتا ہے جو مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں پر پڑیں اور ان مظالم کو بھول جاتا ہے جو اس کے ہم مذہبوں نے مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد کے سکھوں اور ہندوؤں پر کیے ہیں۔ اسی طرح سے سکھ اور ہندو بھی صرف انھیں مظالم کا ذکر کرتے ہیں جو مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد میں ہوئے ہیں لیکن مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں کی بابت وہ کوئی ہمدردی محسوس نہیں کرتے۔ احساس کی یہ کمی ملک کے موجودہ حالات میں لازمی ہے۔ صرف وہی لوگ موجودہ مشکلات کو حل کر سکتے ہیں اور کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں، جو غیر جانب داری اور بے تعصبی کے ساتھ واقعات پر غور کریں۔ ایسے وسیع النظر لوگ اگرچہ بہت کم ہیں، لیکن بالکل نایاب نہیں ہیں اور یہی لوگ عام جذبات کے سیلاب میں اپنے قدم قایم رکھ کر مستقبل کے متعلق سوچ سمجھ سکتے ہیں۔ واقعات کے تمام افسوس ناک پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے سکون کے ساتھ غیر جذباتی طور پر سوچنے کی ضرورت ہے۔

پس منظر:

موجودہ افسوس ناک واقعات ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو کلکتہ کے قتل عام سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نواکھالی میں ہندوؤں پر مظالم ہوئے جس کا انتقام بہار اور یوپی کے چند

اضلاع میں لیا گیا اور نواکھالی کے مقابلے میں بہار میں زیادہ اتلاف جان ہوا۔ بہار کا جواب صوبہ سرحد نے دیا اور اس مرتبہ بھی اس ظالمانہ مقابلے میں حصہ لینے والوں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔

اس کے بعد راولپنڈی کے ضلع میں فساد ہوا اور ہر واقعے کے بعد یہ آگ بھڑکتی گئی۔ یہ واقعات اس وقت ہوئے جب ہندستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ہم لوگ تقسیم ہند کے خلاف سات سال سے لڑ رہے تھے لیکن برطانیہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بالآخر ہم نے تقسیم ہندستان کو بھی منظور کر لیا اور اب یہ اُمید تھی کہ تقسیم ہندستان کے بعد قتل وغارت کا زمانہ ختم ہو جائے گا۔ حالات میں کچھ بحالی ہو چکی تھی لیکن ۳ رجون کے اعلان میں لاہور کے متعلق وضاحت نہیں کی گئی تھی، اور حد بندی کمیشن کی رپورٹ سے پہلے یہ نہیں معلوم تھا کہ لاہور پاکستان میں جائے گا یا ہندستان میں رہے گا اور لاہور کو حاصل کرنے کی کوشش میں تینوں فرقوں نے فسادات میں زبردست حصہ لیا۔ ہندوؤں نے بم پھینکے، مسلمانوں نے آتش زدگی شروع کر دی اور مسلمانوں اور سکھوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان حادثات کے باوجود پنجاب کے دوسرے علاقے متاثر نہیں ہوئے۔

جب یہ طے ہوا تھا کہ ہندستان دو سلطنتوں میں تقسیم کر دیا جائے گا تو یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور حالات میں نمایاں تبدیلی ہو جائے گی۔ جو غیر مسلم پاکستانی علاقہ میں رہ جائیں گے وہ پاکستان کی رعایا ہوں گے اور وہاں کی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ان کی پوری پوری حفاظت کرے اور انھیں شہری حقوق سے فایدہ اُٹھانے کا پورا پورا موقع دے۔ اسی طرح جو مسلمان ہندستانی یونین میں رہ جائیں گے وہ یہاں کی رعایا ہوں گے اور انھیں وہی شہری حقوق ملیں گے جو دوسرے باشندوں کو۔ ان دونوں سلطنتوں میں سے کسی سلطنت میں اصول وقانون کی خلاف ورزی کی جائے گی یا اکثریت کی طرف سے اقلیت پر کوئی زیادتی ہوگی تو یہ اس ریاست کا فرض ہوگا کہ غلط کاروں کے خلاف ضابطے کی کارروائی کرے۔

اگر کسی سلطنت کے باشندوں کو یہ شکایت ہوگی کہ دوسری سلطنت میں ان کے ہم مذہبوں کے ساتھ برا سلوک کیا جا رہا ہے تو یہ مسئلہ بھی دونوں سلطنتیں ہی آپس میں طے کریں گی۔

اگر مغربی اور مشرقی پنجاب کی حکومتوں کو اپنے اپنے حدود میں نظم ونسق سنبھالنے کا موقع مل گیا ہوتا اور وہ اپنے اپنے صوبوں میں اقلیتوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہو گئی ہوتیں تو شاید یہ ہول ناک اور روح فرسا حالات پیش نہ آئے ہوتے۔

بہرحال بدقسمتی سے تقسیم کا اصول طے ہوا تھا کہ یہ نئی تحریک شروع ہوئی کہ مشرقی پنجاب کے غیر مسلموں کے جتھے تیار کیے جائیں تاکہ وہ ان حادثات کا انتقام لیں جو تقسیم سے پہلے صوبہ سرحد اور ضلع راولپنڈی میں رونما ہوئے تھے۔ چناں چہ ظلم وتشدد ایسے وسیع پیمانے پر شروع کر دیے گئے جن کی مثال اس سے پہلے نہیں مل سکتی اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اس ظلم و تشدد کی وجہ سے تمام مسلم آبادی سرے سے فنا ہو کر ہی نہ رہ جائے۔ یہ چیز مغربی پنجاب میں تازہ ہنگاموں کے رونما ہونے کا سبب بن گئی اور وہاں مسلمانوں نے خود بدلہ لینا شروع کر دیا اور خوں ریزی کا ایک ایسا سیلاب بہا دیا کہ یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ یہ طوفان پاکستان کے تمام غیر مسلموں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ یہ معاملہ تو وہ تھا جسے دونوں ڈومینیوں کی حکومتوں کو طے کرنا تھا اور اس کے متعلق انھیں دونوں کی مشترکہ ذمے داری تھی، لیکن اس کے بجائے ہوا یہ کہ دونوں طرف کے عوام جمع ہو ہو کر قتل وخونریزی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں پورے پنجاب کی اقلیتیں فنا ہو کر نہ رہ جائیں۔

صورت یہ پیدا ہو گئی کہ جس فرقے نے خود انتقام لیا۔ وہ کچھ دنوں بعد خود ہی انتقام کے جذبے کا شکار بن کر رہ گیا۔ چناں چہ انتقام لینے کے ظالمانہ اصول نے انسانوں کو حیوانوں اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر حالات میں پہنچا دیا۔ تنفر اور قتل وغارت کی لہریں برابر بڑھتی چلی گئیں اور جلد ہی تمام شمال مغربی ہندستان، سرحد سے لے کر یوپی کے مغربی اضلاع اور دہلی تک ان میں گھر کر رہ گیا۔

شہر دہلی میں جو واقعات پیش آئے، انھیں سے ان حادثات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو دوسرے مقامات پر رونما ہوئے۔

دونوں فریق قصوروار:

حالات کے اس جائزے سے اتنی بات واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس وقت ہندو، مسلمان، سکھ سب ہی ایک رنگ میں رنگے دکھائی دے رہے ہیں، خواہ وہ تلوار کو بلند کر رہے ہوں یا اسے اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ان تینوں فرقوں کے لوگوں کے ہاتھ یکساں طور پر خون سے رنگے ہوئے ہیں اور ایسے حالات میں کسی ایک کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو بے قصور اور دوسرے کو ملزم بتائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تینوں مساوی طور پر قصوروار ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور مغربی پنجاب کی حکومتوں میں سے کسی کو دوسرے پر یہ الزام دینے کا حق نہیں ہے کہ اس نے غلطی کی یا غفلت سے کام لیا۔ اس لیے کہ یہ دونوں اپنی اپنی اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت سے قاصر رہی ہیں۔

ہم اپنی زندگی بھر آزادی کے خواب دیکھتے رہے تھے اور آزادی کی قربان گاہ پر ہم نے اپنی عزیز سے عزیز شے کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آزادی حاصل ہوئی۔ آج اس آزادی کی عمر ایک مہینے سے کچھ ہی زیادہ ہوئی ہے۔ ہمارے وہ تمام منصوبے کہ آزادی مل جانے کے بعد ہم ملک کی اقتصادی، ذہنی اور تعلیمی اسکیموں کو پروان چڑھائیں گے، خاک میں مل کر رہ گئے اور اس مختصر سے عرصے میں ہم اب تک کچھ بھی نہ کر سکے۔ ہم نے دنیا کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ جیسے ہی آزادی حاصل ہوگی ہم اپنی تمام تر توجہ ایک نئے ہندستان کی تعمیر میں صرف کر دیں گے۔ اس زمانے میں جو نئے حادثات رونما ہوئے انھوں نے ہمارے تمام خوابوں کی تعبیر اُلٹ کر رکھ دی اور ہندستان اس منزل سے بھی پیچھے ہٹتا ہوا دکھائی دینے لگا جس پر آزادی ملنے سے پہلے پہنچا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اُمید کی کرن:

بہر حال وہ لوگ جنھوں نے حصولِ آزادی کے لیے کوششیں کی تھیں اب بھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ ہماری خوش قسمتی سے مایوسیوں کی ان گھنگھور گھٹاؤں، میں بھی مہاتما گاندھی کی شخصیت

ہمارے لیے مینارۂ روشنی کا کام دے رہی ہے۔ وہ نہایت صبر آزما زمانے میں انتہائی مصائب و آلام کے اندر قوم کی رہنمائی کر چکے ہیں۔ آج بھی جب کہ ان کی قیادت میں ملک کو آزادی حاصل ہو چکی ہے، وہ ان لوگوں میں انسانیت کے اوصاف پیدا کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں جو وقتی حیثیت سے عقل و ہوش اور دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ان کی آواز میں اب بھی غیر متزلزل اعتماد، عزم و ارادہ، ہمت و جرأت کی صفات پائی جاتی ہیں اور وہ ہمیں ایسے راستے پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں پہنچ کر ملک تباہی اور بربادی کی مصیبتوں سے نجات پا سکتا ہے۔

ملک اگر تقسیم نہ ہوتا تو......؟

آزاد بھون (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز۔ نئی دہلی) کے کتب خانے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مطبوعہ تحریروں اور تقریروں کے ذخیرے میں ''نیشنل تحریک'' کے نام سے ایک قلمی رسالہ بھی محفوظ ہے۔ اس کے سرورق پر مرحوم اجمل خاں اور مرحوم غلام رسول مہر کی تحریر بھی ملتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یقیناً غیر مطبوعہ ہے اور اسے چھپنا چاہیے لیکن ان دونوں مرحومین نے اس امر کی تصریح نہیں فرمائی کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ گمان غالب ہے کہ یہ کوئی مقالہ نہیں بلکہ مولانا آزاد مرحوم کی ایک تقریر ہے جو انھوں نے کسی مخصوص مسلم اجتماع کے سامنے تقسیم ہند سے آٹھ نو سال قبل ۱۹۳۸ء/۱۹۳۹ء کے درمیانی زمانے میں کی تھی اور کسی نے اسے قلم بند کرلیا اس کے داخلی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریر کے وقت ہندستان کے سات صوبوں میں کانگریس کی بلاشرکت غیرے اور ایک صوبے (سندھ) میں مخلوط وزارت برسر اقتدار تھی۔

تقریر کا موضوع ۳۹-۱۹۳۸ء کی مسلم سیاست تھی، جس پر اس وقت مسلم لیگ پورے طور پر چھا نہیں سکی تھی۔ بظاہر اس تقریر کی نوعیت صرف تاریخی معلوم ہوتی ہے لیکن اسے سامنے رکھ کر ہم اس کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دو قومی نظریے کے تحت اگر ملک ۱۹۴۷ء میں تقسیم نہ ہوتا تو آزاد ہندستان کی سیاسی وثقافتی زندگی میں مسلمانوں کا درجہ کیا ہوتا۔

تاریخ کے دھاروں نے آج پھر ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے ۳۹-۱۹۳۸ء میں ملک نے عموماً اور مسلمانوں نے خصوصاً تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز کیا تھا اور جو قیام پاکستان کے ساتھ نہیں بلکہ آج آزاد خود مختار جمہوری اور سیکولر بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ختم ہوا ہے۔ اس حقیقت کو ہم جس قدر جلد تسلیم کرسکیں اسی قدر بہتر ہے کہ بنگلہ دیش کا جنم کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ تاریخی عمل کی تکمیل کی طرف پہلا موثر قدم ہے جس کے ساتھ برصغیر کی تاریخ کے نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ حال کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے کے لیے ماضی قریب کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ کام مولانا آزاد کی اس تقریر کی روشنی میں بخوبی انجام دیا جاسکتا ہے اسی خیال کے پیش نظر اس کا عنوان ''نیشنل تحریک'' کی جگہ ''ملک اگر تقسیم نہ ہوتا'' رکھا گیا ہے۔

عتیق صدیقی

نیشنل تحریک

①

حب الوطنی کی تحریک کا آغاز:

غدر ۱۸۵۷ء کے چند سال بعد جب ہندستان میں قومیت اور حب الوطنی کی تحریک کا آغاز ہوا تو یہ صرف ان چند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں تک محدود تھی جو مغربی علوم کے ماہر تھے اور مغربی تمدن اور مغربی تہذیب سے بہت بڑی حد تک متاثر تھے۔ شروع شروع میں یہ لوگ بالکل نیشنلسٹ (قوم پرست) تھے اور ہندستان کی ہر چیز کو ہندستان کی متحدہ قومیت کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جب بیسویں صدی کے اوایل میں تقسیم بنگال کا سوال پیدا ہوا اور مسلمانوں نے اس سے بے اعتنائی کا اظہار کیا تو ہندوؤں کے دلوں میں فطری طور پر اس کا کچھ ردعمل ہونا شروع ہوا مگر پھر بھی یہ چیز زیادہ نمایاں نہ ہو سکی لیکن ۷-۱۹۰۶ء میں جب منٹو مارلے اصلاحات کا چرچا ہوا۔ جداگانہ انتخاب سامنے آیا اور مسلم لیگ بنی تو بعض ہندوؤں کی طرف سے بھی اس قسم کی آواز اُٹھی کہ ہندوؤں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے لیکن ہندستان کے ممتاز ہندو لیڈروں نے اس تحریک کی حوصلہ شکنی کی۔ چناں چہ اسی زمانے میں جب لاہور کانگریس میں پنڈت (مدن موہن) مالویہ صدر ہوئے تو انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ ایک نہایت مہلک تحریک ہے جسے جتنی جلد ہو سکے ختم ہونا چاہیے۔"

منٹو مارلے اصلاحات:

لیکن ۱۹۱۰ء میں منٹو مارلے کی اصلاحات کے نفاذ کے بعد جب جداگانہ انتخاب کی اسکیم عمل میں آئی تو اس کے دوسرے سال ۱۹۱۱ء میں پنجاب کے ہندوؤں نے مسلم لیگ کی تقلید میں ہندوؤں کی ایک جماعت بنائی۔ مگر یہ ایک بے جان سی جماعت تھی۔ ملک کے کسی گوشے سے اس کی تائید میں آواز بلند نہ ہوئی اور یہ صرف چند غیر معروف وغیر ممتاز ہندوؤں کے حلقہ اثر تک محدود رہی۔ خلافت کے زمانے میں جب جمعیۃ العلماء بنی اور علمائے اسلام سیاسی تحریکات میں پیش پیش نظر آئے تو بعض لوگوں نے سوچا کہ اگر ہندو پنڈتوں کی بھی ایک ایسی ہی جماعت بن جائے تو عدم تعاون کی تحریک کو بہت طاقت مل سکے گی۔ اس کی تائید اللہ مغفرت کرے ہمارے حکیم اجمل خاں نے بھی کی۔ چنانچہ جمعیت العلماء کے انداز پر ہندو پنڈتوں کی بھی ایک ایسی ہی جماعت بن گئی لیکن اس وقت ہندو مسلمانوں میں اتنا اتحاد تھا کہ یہ ہندو جماعت کسی طرح بھی مسلمانوں کی حریف نہ سمجھی گئی مگر جب خلافت کا جوش مندا پڑا اور مسلمانوں نے سیاست سے کنارہ کشی شروع کی تو قدرتاً ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد کمزور ہوا۔ اس وقت ہندوؤں کی یہ جدید جماعت ابھری اور ہندو سنگھٹن کے نام سے ملک میں روشناس ہوئی۔ مگر ہے یہ وہی ۱۹۱۱ء والی جماعت!

قومیت اور اسلام:

دفاعی قومیت اسلام کے منافی نہیں ہے۔ البتہ ''ہجومی'' (جارحانہ) قومیت اسلام کے منافی ہے۔ اگر اس وقت ہماری جدوجہد میں سوال جارحانہ قومیت کا نہیں بلکہ دفاعی قومیت کا ہے یعنی اس وقت ہمارے سامنے ہندستان کو غاصبوں سے نجات دلانے کا سوال ہے۔ سو اس امر میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ ایک قوم بن کر دفاع کی کوشش کرنے سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ اس قسم کی قومیت اسلامی توسع کے خلاف نہیں۔ اگر میرے محلے پر ڈاکو حملہ آور ہوں اور میرا مکان بھی اسی محلے میں واقع ہو تو میں یقیناً محلے والوں کے ساتھ شریک ہو کر ڈاکوؤں کا مقابلہ کروں گا اور میرا یہ فعل کسی طرح بھی انسانی برادری کے عام توسع کے خلاف نہ ہوگا۔ یہی

حال اس وقت ہندستان کا ہے اس لیے ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اس فریب میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ حصول آزادی کے لیے آج کل ہندستان میں جو جدوجہد ہے اور جس میں ہندستان کے ہر فرد کو بحیثیت قوم متحد ہو کر دشمن کے مقابلے میں صف آرا ہونے کی ضرورت ہے وہ اسلامی توسع کے خلاف ہے!

ترکی، ایران وغیرہ میں قومیت و وطنیت کے نام پر جو کچھ کیا گیا، اس سے بھی ہمیں متوحش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان ممالک کی نظیر کو سامنے رکھ کر اس کی سو فیصدی تقلید ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے جو کچھ اصلاحات مذہب کو نظر انداز کر کے کیں، وہ مذہبی اصلاح کے راستے سے بھی لائی جا سکتی تھیں۔ مصطفیٰ کمال اپنی قوم کو جس منزل پر لانا چاہتا تھا اس منزل پر لانے کے لیے مغربی نظریہ قومیت کی تقلید کرنا ضروری نہ تھا، وہ ایک دوسرے دروازے سے بھی اس منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ وطن پرستی کے اس نظریے کی بنا پر جو یورپ میں پایا جاتا ہے ان ملکوں میں جو کچھ کیا گیا وہ ہمارے لیے کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں۔

ہمارے لیے یہاں رہ کر ہندستانیت اور اسلام...... دونوں رشتوں کو باقی رکھنا ہے اور یورپ کی قوموں کی طرح ہم ایک لمحے کے لیے بھی اسلام کے اس وسیع رشتے کو جو ہم کو دنیا کے کروڑوں مسلمانوں سے وابستہ کرتا ہے، ہندستانی قومیت کے اندر فنا نہیں کر سکتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت زمانے کی آب و ہوا اسی قسم کی ہے کہ ہر پڑھے لکھے نوجوان کے دماغ میں قومیت کا یہی تصور آتا ہے لیکن ہمیں ہر ہر منٹ ہر ہر سیکنڈ اس کی تردید کرنی چاہیے اور مسلمانوں کے دماغ میں اس غلط نظریے کو ہرگز جڑ نہ پکڑنے دینا چاہیے۔

اگر سمپورنانند جی نے یو پی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ تعلیم کے مسئلے میں ہندو مسلم کا امتیاز دیکھنا نہیں چاہتے اور نہ کلچر و تہذیب کے معاملے میں ہندو مسلم امتیاز دیکھنا پسند کرتے ہیں تو یقیناً انھوں نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

نہ تو کانگریس ہی کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان ہی اس مقصد سے قیامت تک متفق ہو سکتے

ہیں کہ ہندستان سے مسلم تعلیم، مسلم کلچر، مسلم تہذیب اور مسلم زندگی کے امتیازی اوصاف فنا ہو جائیں اور وہ ہندستان کی متحدہ قومیت میں جذب ہو کر جرمن یا انگریز کی طرح ہندستانی قوم کے سوا کچھ نہ رہیں۔

ہاں اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ فرقہ وارانہ اختلافات مٹا دینے چاہئیں تو یہ دوسری بات ہے۔ اس کا مطلب اور ہے! اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت فرقہ وارانہ عناد کی جو فضا پائی جاتی ہے، وہ باقی نہ رہے اور تمام فرقے ہم آہنگی کے ساتھ باہمی تعاون واشتراک کے ساتھ زندگی گزاریں۔

کانگریس نے اقلیتوں کے تحفظ کی جو دفعہ ۱۹۳۱ء کے اجلاس کراچی میں پاس کی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو باقی رکھنے کا یقین دلایا گیا ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس تجویز کو عملی شکل دینے کا ڈھنگ کیا ہو؟ سو اب تک صرف اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیوں کہ ابھی تک تو ہم میدانِ جنگ میں تھے مگر کانگریس کے عہدے قبول کر لینے کے بعد ایک بالکل نئی صورت حال سامنے آ گئی ہے۔ سو اب اس کو سوچا جائے گا۔ کراچی کی اس تجویز کی توثیق مزید کے لیے گزشتہ سال آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ میں جو تجویز پاس ہوئی تھی وہ میں نے لکھی تھی۔ بعد میں جواہر لال نے اس میں کچھ ترمیم کی اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہا گیا ہے کہ ہم نہ صرف اقلیتوں کے رسم خط، زبان اور کلچر وغیرہ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کو ترقی دیں گے اس تجویز کا مقصد صاف طور پر یہ ہے کہ مسلمانوں کی امتیازی ملی حیثیت کو ہندستان کی متحدہ قومیت میں جذب کر دینا کانگریس کا مدعا ہرگز نہیں۔

مثال کے طور پر یہ سمجھیے کہ اگر کسی صوبے میں ہندی (دیوناگری) سرکاری خط ہو تو کانگریس کی اس تجویز کے بموجب وہاں لازمی طور پر اُردو خط کو بھی سرکاری حیثیت سے تسلیم کرنا پڑے گا اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ کانگریس کی اس تجویز کے منافی ہوگا۔

اس تجویز میں اقلیتوں کے رسم خط کے تحفظ کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس کا مطلب وہ برائے نام تحفظ نہیں ہے جو گوالیار وغیرہ، ہندو ریاستوں میں نظر آتا ہے یعنی عدالتوں اور سرکاری

دفتروں میں سب کام تو ہندی میں ہو، صرف اسکولوں اور کالجوں میں اُردو کا مدرس رکھ دیا جائے۔ اس کے برخلاف کانگریس کی اس تجویز کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ہندی رسم الخط رائج ہو وہاں لازمی طور پر اُردو رسم خط بھی سرکاری طور پر مسلمہ سمجھا جائے گا۔ بہار میں اس سلسلے میں حکومت نے جو کچھ کیا وہ اس تجویز کے عین مطابق ہے۔

سی پی کی عدالتوں اور دفتروں میں اگر اس وقت صرف ہندی خط رائج ہے تو کانگریس کی اس تجویز کے بموجب بہار کی طرح وہاں اُردو خط کو رائج کرنا ضروری ہے۔ حکومت کو اس کے لیے باقاعدہ انتظام کرنا چاہیے اگر سی پی کی حکومت ایسا نہ کرے گی تو اس کا یہ عمل کانگریس کی اس تجویز کے سراسر خلاف ہوگا اور سی پی ہی پر کیا موقوف ہے جہاں کہیں بھی اس قسم کی صورت ہو وہاں کانگریس کا یہی طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ اگر اب تک کہیں ایسا نہیں ہے تو اس تجویز کی بنیاد پر ہم اسے تبدیل کرا سکتے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہندو یا تو تجدد پسند، ماڈرن (Modern) ہو سکتا ہے یا قدامت پسند کنزرویٹو (Conservative) اور کمیونل (Communal)! لیکن ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے ماڈرن ہندو زیادہ اچھا ہے یا کنزرویٹو؟ ہمیں جواہر لال اور ساورکر میں انتخاب کرنا ہے! لیکن خیر اس وقت تو ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہندو رجحانات کیا ہیں۔ ہمیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمانوں کے سامنے کیا لائحہ عمل ہو؟

مسلمانوں کو صاف طور پر چلا کر اور پکار کر، یہ اعلان کر دینا چاہیے اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیے کہ وہ ہندویت میں جذب ہونے کے لیے ایک لمحے کے واسطے بھی تیار نہیں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے ان کی جو ملی خصوصیات ہیں ان کو وہ نہ صرف باقی رکھیں گے بلکہ ان کو ترقی دیں گے۔

کانگریس میں شریک ہونے اور آزادی کی جدوجہد میں اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش چلنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مسلمان اپنے امتیازی ملی خصایص کو خیر باد کہہ دیں اور ہندستان کی متحدہ قومیت کے سمندر میں اپنے جداگانہ ملی عنصر کو محو کر کے رکھ دیں، ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے اور نہ ان شاء اللہ ہوگا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہند میں رہنے سہنے کی وجہ سے ہمارے اور ہندوؤں کے درمیان جو چیزیں مشترک ہوگئی ہیں، ہمیں اس کا مقاطعہ بھی نہ کرنا چاہیے جیسا کہ ہندو مہا سبھا نے مقاطعے کی آواز بلند کی تھی کہ ہندو مسلمانوں کے میلوں میں نہ جائیں وغیرہ وغیرہ۔ البتہ وہ خصایص جو ہم کو ہندوؤں سے ممتاز کرتے ہیں ان کو بھی نہ چھوڑ دینا چاہیے۔

ہم کو ہندستان میں ایک ممتاز عنصر بن کر تو ضرور رہنا چاہیے۔ بلکہ ہندستان کی ملی جلی مشترکہ زندگی میں ایک ممتاز مگر ہم آہنگ جزو کی طرح رہنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ گویا قومیت کے نظریے کو اسی حد تک تسلیم کرنا چاہیے جہاں تک ہمارے ملی خصایص کو محفوظ رکھ کر اسے تسلیم کیا جا سکتا ہے!

مسلمان اور تحریک آزادی:

اصل سوال یہ ہے کہ مسلمان اپنی جدوجہد کی بنیاد کس چیز پر رکھتے ہیں۔ آیا ضعف و تذبذب پر یا اذعان ویقین پر؟ اگر خوف وشبہ پر رکھتے ہیں تو سارا راستہ ہی بدل جاتا ہے، منزل ہی دوسری ہو جاتی ہے، اس کے احکام ہی دوسرے ہو جاتے ہیں، لیکن اگر یہ بنیاد اذعان ویقین پر رکھی جائے تو پھر صورت حالات بالکل دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میں نے ابتدا ہی سے مسلمانوں کی جدوجہد کی بنیاد اذعان ویقین پر رکھی، لیکن بعض حالات ومحرکات کی بنا پر عام مسلمانوں نے ضعف وشک کی بنیاد کو پسند کیا۔ انگریزوں نے مختلف ترکیبوں سے ان کو یہ سمجھایا، کہ ہندستان میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے غلبے سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک تیسری طاقت، انگریز کی ضرورت ہے۔ اگر یہ تیسری طاقت نہ رہی تو ہندستان کے مسلمانوں پر ہندوؤں کا غلبہ ہو جائے گا۔ یہ چیز آہستہ آہستہ مسلمانوں کے دماغوں میں جڑ پکڑتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو اس کا یقین ہو گیا کہ ہندستان میں مسلمانوں کی بقا انگریزوں کی بقا پر منحصر ہے اگر انگریز چلا گیا تو ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے بننے کا یہی مقصد تھا کہ انگریزوں سے دوستی کر کے کچھ لیتے

جائیں اور جب ہندستان کا ہندو آگے بڑھے تو ان کے آگے حقوق کے حصول کا دامن پھیلائیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کو بتانے کی ضرورت ہے کہ ہندستان میں ایک تیسری طاقت انگریز کا وجود ہندو اقتدار کے راستے میں مانع نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے اُبھرنے میں حارج ہے۔ اگر مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو پھر ان کے دل میں بھی وہی آگ سلگنے لگے گی جو آج ہندوؤں کے دلوں میں سلگ رہی ہے۔ (مدینہ، بجنور: ۵ مارچ ۱۹۷۲ء)

(۲)

اس وقت تک مسلمانوں کا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ تحریک آزادی ہندوؤں کی تحریک ہے اور اس لیے اگر اس میں وہ شریک ہوتے ہیں تو ہندوؤں پر ایک طرح کا احسان کرتے ہیں۔ چناں چہ اس کا اظہار صاف لفظوں میں تو نہیں، لیکن اشاروں کنایوں میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً

☆ خلافت کے زمانے میں ہم نے کانگریس کو کانگریس بنایا۔
☆ ترک موالات کے زمانے میں سب مسلمان لڑکوں نے پڑھنا چھوڑ دیا مگر بنارس میں ہندوؤں نے کچھ نہ کیا۔
☆ ترک موالات کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کو یہ نقصان ہوا، وہ نقصان ہوا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایسی باتیں ہیں جن کا ہندوؤں پر احسان رکھ کر ان سے ان چیزوں کی قیمت وصول کرنا ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں جو کام کیا اس کا فایدہ ہندوؤں کو پہنچا۔ اس لیے ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ اس کی قیمت ادا کریں۔

اس وقت مسلم لیگ کی طرح جو جماعت بھی جداگانہ سیاسی تنظیم کی آواز بلند کرے گی وہ قدرتاً ہندستان کی جدوجہد آزادی کے راستے میں روڑا ثابت ہوگی اور اس کشمکش کے سارے نتائج بھی ایک تیسری طاقت انگریز کی گود میں جا کر گر پڑیں گے۔ اس لیے یہ طریقہ تو غلط ہے اور اس سے مسلمانوں کو ایک رائی کے برابر بھی فایدہ نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے مسلم لیگ کے ذمہ دار

افراد سے کہا تھا کہ اگر وہ یکے بعد دیگرے یہ تین مقامات مان لیں۔ یعنی

(۱) آزادی کامل

(۲) اس کے حصول کے لیے کانگریس کے دوش بدوش جدوجہد اور

(۳) مسلم حقوق کے تحفظ کے لیے مسلم لیگ کو ایک جداگانہ جماعت کی حیثیت سے قایم رکھنا۔

مگر انھوں نے اسے نہ مانا۔ اصل سوال نصب العین کا بھی نہیں بلکہ جدوجہد کا ہے اور جب تک مسٹر جناح موجود ہیں مسلم لیگ کبھی بھی جدوجہد کے اس طریقے کو پسند نہیں کر سکتی جس کی مدد سے کانگریس نے اس وقت تک طاقت حاصل کی ہے۔

اس وقت مسلم لیگ کا سارا شوروغوغا وزارتوں کے حصول کا شوروغوغا ہے۔ اگر مسلم لیگ کو وزارتیں مل جاتیں تو آج جن شکایتوں کے خلاف غل مچایا جا رہا ہے ان سے دس گنا زیادہ شکایتیں ہوتیں تب بھی کوئی آواز نہ اُٹھتی بلکہ مسلم لیگ کے یہ افراد وزارت کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان شکایتوں کی وہ تاویلیں کرتے جو آج ہمارے ذہن میں بھی نہیں آتیں لیکن اس کے باوجود بھی میں نے کوشش کی کہ مسلم لیگ سے سمجھوتے کی گفتگو کی جائے اور اگر وہ کم سے کم کانگریس کے اسمبلی پروگرام اور ڈسپلن کو مان لے تو پھر ہر صوبے میں لیگ کے ممبر لے لیے جائیں۔ چناں چہ اس چیز کو میں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی اکثریت مسلم لیگ سے گفتگو کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ مجھے اس مسئلے پر کافی لڑنا پڑا۔ صرف گاندھی جی نے میرا ساتھ دیا اور بالآخر مسٹر جناح سے میری گفتگو شروع ہو گئی۔ ہم اس کے لیے بالکل تیار تھے کہ مسلم لیگ کے ممبروں کو وزارتوں میں لے لیں اور اس طرح متحدہ جدوجہد کے راستے سے ایک بہت بڑی رکاوٹ کو رفع کر دیں لیکن افسوس ہے کہ مسلم لیگ نے اسٹیٹس (Status) کے سوال کو بیچ میں ڈال کر سارا معاملہ ہی خراب کر دیا۔ بھلا ہم اسے کیسے مان سکتے تھے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی اور کانگریس کو ہندوؤں کی فرقہ وارانہ جماعتیں قرار دے کر گفتگو کرتے۔ کانگریس ملک میں ایک نیشنل جماعت ہے اور نیشنل ہی رہنا چاہتی ہے۔ پھر وہ اپنے کمیونل ہونے پر مہر تصدیق کیسے ثبت کر دے! علاوہ ازیں ہمیں سوچنا

چاہیے کہ کانگریس کا خود کو نیشنل کہنا ہمارے لیے زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ خود کو کمیونل کہے۔

ہمیں اس وقت مستقبل کا پورا نقشہ ترتیب نہ دینا چاہیے صرف راستے کے پتھر کو ہٹانا چاہیے۔ یہ نہ سوچنا چاہیے کہ پانی جو آ رہا ہے وہ اپنا راستہ کدھر بنائے گا اور کون سا راستہ اختیار کرے گا۔ یہ کام مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیے۔

مسلمان اگر اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندو اقتدار ان کے لیے نقصان رساں ثابت ہوگا تو یہ چیز تو پیکٹ (Pact) کر لینے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ پیکٹ کا کر لینا اس خطرہ کو ہرگز رفع نہیں کر سکتا مگر مجھے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں ذرا بھی مایوسی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو قوم خیبر سے قسطنطنیہ تک لمبی سڑک رکھتی ہے جس میں ایک انچ زمین بھی غیر مسلم اقتدار کے زیر اثر نہیں وہ قوم کبھی نقصان میں نہیں رہ سکتی اور نہ اس کی امتیازی حیثیت فنا ہو سکتی ہے!

وزارتیں اور مسلمان:

آئین جدید کا حصول ہماری جدوجہد کی آخری منزل نہیں۔ اگر یہ آئین ہماری جدوجہد کی آخری منزل ہوتی تو ہم ہر قیمت پر مسلم لیگ کے ممبروں کو وزارت میں لے لیتے لیکن موجودہ حالات میں ہم ایسا نہیں کر سکتے ہم نے اس وقت وزارتیں اس لیے قبول نہیں کی ہیں کہ حکومت کرنا ہمارا مقصود ہے بلکہ ہم نے محسوس کیا اس وقت جدوجہد کے میدان میں ہمارا حربہ یہی ہونا چاہیے۔ وقت کے تقاضے کے بموجب ہمیں اپنی جدوجہد میں کبھی رفتار سست کر دینی پڑتی ہے اور کبھی تیز۔ آج کل ضرورت تھی کہ ہماری رفتار سست ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ کل وقت کا تقاضا یہ ہو کہ ہم اپنی رفتار میں تیزی پیدا کریں اور وزارت کے بوجھ کو کندھوں سے اُتار پھینکیں۔ غرض میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت کانگریس کی وزارتیں محض ان نظریوں کے بموجب حکومت نہیں کر سکتیں جو جمہوریت کے لیے ضروری ہیں۔ ہم اسی حد تک جمہوریت کے اصول پر عمل پیرا رہنا چاہتے ہیں جہاں تک اپنی جدوجہد کی قومی حیثیت کے فنا ہونے کا

اندیشہ نہ ہو۔ ہم نے وزارتیں بناتے وقت اس چیز کو بڑی اہمیت کے ساتھ پیش نظر رکھا تھا اور جب تک ہمارا آخری نصب العین یعنی آزادی کامل ہمیں حاصل نہیں ہو جاتا، یہ چیز ہمارے سامنے رہے گی۔ وزارت کی گدیوں پر بیٹھنے کے باوجود ہم کسی وقت بھی جدوجہد کے میدان کو نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتے۔ خدا جانے ہمیں کس وقت جنگ کا نقشہ بنانا پڑے گا اور ہم وزارتوں کو چھوڑ کر میدان جنگ میں نکلنے پر مجبور ہوں اسی لیے ہم نے وزارتوں کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کسی ایسے شخص کو وزارت میں نہیں لیا جو اعتقاداً یا عملاً ہماری آئندہ جدوجہد میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ غور کیجیے کہ اگر ہم کمزور لوگوں کو لے لیں اور پھر ہمیں جنگ کا محاذ بدلنا پڑے تو یہ لوگ ہمارے راستے میں کتنی بڑی رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ اسی کانگریس نے جہاں کہیں مخلوط وزارتیں بنائی ہیں وہاں یہ کوشش کی ہے کہ صرف وہ غیر کانگریسی ممبر جو کم از کم کانگریس کے اسمبلی پروگرام اور اس کے ڈسپلن کو قبول کریں، ان ہی کو وزارت میں لیا جائے مگر اس میں میری رائے یہ ہے کہ اگر اس طرح کانگریس کو اسمبلی میں ٹھوس اکثریت حاصل ہو تب تو وزارت بنائی جائے ورنہ نہیں!

اسی لیے میں نے آسام میں ترتیب وزارت کی مخالفت کی تھی۔ کیوں کہ وہاں آخر وقت تک کانگریس کو واضح اکثریت حاصل نہ تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ بعد میں اکثریت حاصل ہو جائے گی، مگر اس کا میں قایل نہ تھا۔ میرا اصرار یہ تھا کہ ہمیں دنیا کو یہ بتا دینا چاہیے کہ ہم وزارتوں کے پیچھے دوڑنا نہیں چاہتے۔ لیگ اگر وزارت بنا لیتی ہے تو بنا لے ہم اس سے کیوں ڈریں، ہم نے وزارتیں ایک پروگرام کے تحت قبول کی ہیں۔ آئین کو ہر قیمت پر چلانا ہمارے پیش نظر ہے۔ یہی چیز سندھ میں میرے پیش نظر تھی۔ مسلم لیگ کے اشتعال انگیز رویے نے وہاں کی فضا بہت خراب کر دی تھی۔ (یہاں تک) کہ کانگریسی ممبروں کے پاؤں بھی اُکھڑ گئے۔ وہ اللہ بخش کی وزارت کی حمایت کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگرچہ اسسمنٹ کے مسئلے میں اللہ بخش نے غلطی کی ہے مگر اس وقت تو اس کی حمایت ہونی چاہیے۔ ورنہ لیگ کی وزارت بن جائے گی۔ یہاں تک کہ سردار پٹیل نے بھی اللہ بخش کی حمایت کا وعدہ کر لیا تھا مگر میں نے کہا کہ لیگ ایک نہیں ایک لاکھ وزارتیں بنا لے، ہم نے وزارتیں بنانے کا کوئی ٹھیکا

نہیں لیا ہے۔ اس قسم کے موقعے تو ہمارے امتحان کے موقعے ہیں۔ اس قسم کے موقعوں پر تو ہم دنیا کو یہ بتلا سکتے ہیں کہ کانگریس اصول کی خاطر کتنی قربانیاں کر سکتی ہے۔

بہر حال ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آیندہ جدوجہد کا سوال ہمارے سامنے نہ ہوتا تو ہم مسلم لیگ کے اس رویے کے باوجود بھی جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے ان کے کچھ ممبر وزارت میں لے لیتے مگر بحالت موجودہ ہم ایسا کر سکتے تھے؟ موجودہ حالات میں ہم جتنا آگے بڑھ کر مسلم لیگ سے مصالحت کر سکتے تھے ہم نے اس سے دریغ نہیں کیا مگر افسوس ہے کہ مسلم لیگ نے ہمارے خیر خواہانہ اقدامات کی قدر نہ کی اور ایک ناممکن شرط لگا کر مصالحت کے سارے پروگرام کو ختم کر دیا۔

مسلمان اور جدید حالات کا تقاضا:

مسلمانوں کے سامنے اس وقت بجز اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ آزادی کی جدوجہد میں پورے جوش وخروش کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ مسلم حقوق کے تحفظ کا بھی کوئی اور راستہ ہو سکتا ہے تو ہم ہر لحہ کانگریس سے علاحدہ ہو سکتے ہیں۔ ہم کانگریس میں مسلمانوں کے مفاد ہی کے پیش نظر شریک ہیں۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کانگریس سے باہر آ جانا چاہیے لیکن ایسا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسلمان کانگریس سے باہر رہ کر موثر طریقے پر اپنے حقوق کا تحفظ ہرگز نہیں کر سکتے۔

یہ صحیح ہے کہ غدر کے بعد بعض ایسے حالات وواقعات پیش آئے، جنھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے خائف کر کے آہستہ آہستہ انگریزوں کے دامن سے بندھنا شروع کر دیا، لیکن اب مسلمانوں کو یہ توقع بالکل چھوڑ دینی چاہیے کہ پہلے کی طرح انگریز ان کی ذرا سی بھی مدد کر سکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انگریز کی خوشامد سے انھیں کچھ مل جاتا تھا، مگر اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ اگر ہندستان کے سارے مسلمان مل کر انگریزوں سے یہ کہیں کہ تم ہندستان نہ چھوڑو، ہم تمھاری مدد کریں گے تب بھی وہ یہاں نہ رہے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنی موجودہ حیثیت پر غور کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی دل سے نکال دینا چاہیے کہ اب

انگریزوں کی مدد سے ایک رائی کے دانے کے برابر بھی فایدہ پہنچ سکتا ہے۔ جب خود انگریز کی اپنی ہی کشتی بھنور میں ہچکولے کھا رہی ہے تو وہ کسی دوسرے کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کیسے سہارا دے سکتا ہے۔ چناں چہ یہ اسی کے اثرات ہیں کہ آج بڑے بڑے خطاب یافتہ زمیندار بھی آزادی ہند کے مقصد سے ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ حال آں کہ کل تک ان ہی کے ڈنڈوں سے آزادی ہند کے نام لیواؤں کے سر زخمی ہو رہے تھے اور یہی لوگ محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھ کر قومی تحریکات کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے۔ ہندستان میں قومیت کے نام پر اس وقت تک جو جدوجہد کی گئی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا۔

آپ حقیقتوں کی طرف سے کتنی ہی آنکھیں بند کرنا چاہیں لیکن بالآخر کسی نہ کسی دن حقیقتوں کی چکا چوند آپ کی آنکھوں کو چندھیا دے گی، یہی حال آج مسلمانوں کا ہے۔

ایک غلط اندازِ فکر:

مسلمان آج سے پہلے کانگریس کو باغیوں کی ایک جماعت سمجھتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ بات آتی ہی نہ تھی کہ باغیوں کی یہ جماعت ایک دن حکومت بھی بن سکتی ہے لیکن ان کے نہ سمجھنے سے حقیقتیں تو نہیں بدل سکتیں۔ ہوا وہی جو ہونا تھا اب ان کی آنکھیں کھلیں، لیکن اب بھی وہ اسباب وعلل کے سلسلے کو پوری طرح سمجھنا نہیں چاہتے۔ روشنی کی چکا چوندھ نے ان کی آنکھیں تو ضرور چندھیا دی ہیں، لیکن اب تک وہ محسوس نہیں کر سکے ہیں کہ روشنی کا سرچشمہ کہاں ہے اور اسے کیسے قبضے میں لایا جا سکتا ہے۔ اب تک مسلمان آزادی کی جنگ کو اپنی جنگ نہیں بلکہ ہندوؤں کی جنگ سمجھتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں اگر انھوں نے کبھی کوئی جدوجہد کی بھی تو اسے ہندوؤں پر احسان سمجھا اور اس کے متوقع رہے کہ ہندو اس کی قیمت انھیں ادا کریں گے۔ یہ کہنا کہ ہم نے کانگریس کو بنایا یا ترکِ موالات کے زمانے میں ہمارا یہ نقصان ہوا یا علی گڑھ یونیورسٹی کو ہم نے بند کر دیا مگر بنارس میں ہندوؤں نے کچھ نہ کیا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں، جو اسی جذبے کا اظہار کرتی ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم:

یہ تو طے شدہ ہے کہ ہندستان میں تعلیم کی جو اسکیم بھی تیار ہوگی اس میں مذہبی تعلیم کا خانہ ضرور ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ خانہ بھرا کیسے جائے۔ وردھا کی تعلیمی اسکیم ہو یا کوئی اور اسکیم، مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ البتہ یہ سوال مسلمانوں کے لیے غور طلب ہے کہ آیا اس منزل پر وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا نظام حکومت کے ہاتھوں میں دیں؟ اس مسئلے پر میں خود بھی ابھی تذبذب میں ہوں۔ اب تک تو صورت یہی رہی ہے کہ حکومت کو مذہبی تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ مذہبی تعلیم کا انتظام دیوبند وغیرہ کے مدارس کے سلسلے کے غیر سرکاری مسلم اداروں کے ہاتھ میں رہا۔ اب یہ سوچنا ہے کہ آیا اس نظام کو بدل کر مذہبی تعلیم کے تمام اداروں کو حکومت کے ہاتھوں میں دے دینا ٹھیک ہوگا یا نہیں؟ اور آیا کانگریس نے اس وقت جو حکومت بنائی ہے وہ اتنی مستحکم اور مضبوط ہے کہ اس سے ضروری مسائل کے متعلق ضمانت حاصل کرنے کے بعد اس چیز کو مستقلاً اس کے حوالے کر دیں؟

مسلم لیگ کا جھوٹا پروپیگنڈا:

مسلم لیگ کی جانب سے اتنا جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں جب مجھے بعض واقعات کی اطلاع ملی تو مجھے سخت تشویش ہوئی اور میں نے اس سلسلے میں وزیروں سے سخت باز پرس کی لیکن جب تحقیقات کی گئی تو مجھے سر جھکانا پڑا اور مجھے اس معاملے میں سخت شرمندگی ہوئی۔ پچھلے سال عید سے ایک دن قبل مجھے ایک تار ملا کہ صوبہ بہار کے ایک گاؤں پر جہاں مسلمان ہی مسلمان رہتے ہیں تین ہزار ہندوؤں نے مسلح ہو کر حملہ کیا۔ سارے مسلمانوں کو مار ڈالا ان کے مکانوں کو جلا دیا اور عورتوں کو بے عصمت کیا۔ اس تار کی ایک نقل اسٹار آف انڈیا میں بھی شائع ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی سخت اذیت ہوئی۔ میں نے وزیر اعلیٰ بہار سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی ابھی اس ضلع کے کمشنر سے ٹیلیفون پر بات کر رہا تھا اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہوتا تو وہ مجھے ضرور مطلع کرتا۔ مگر وزیر اعلیٰ کے اس بیان کے باوجود میرے دل سے کھٹک دور نہ ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر محمود سے کہا کہ آپ

خود جا کر اس کی تحقیقات کیجیے۔ چنانچہ عید کے دن کے باوجود بے چارے جائے وقوعہ پر پہنچے مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ واقعہ بالکل بے بنیاد ہے۔ صرف اتنی سی بات البتہ ہوئی تھی کہ اس گاؤں میں کچھ جلاہے رہتے تھے ان میں سے ایک آدمی کسی لڑکی کو اغوا کر لایا تھا۔ اس پر برادری والوں میں سخت برہمی پھیلی، پنچایت ہوئی اور دو ایک روز میں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس واقعے کو معلوم کرنے کے بعد تار بھیجنے والے کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ چند روز ہوئے کوئی صاحب پٹنہ سے آئے تھے۔ انھوں نے اغوا کے قصے کو دیکھ کر یہ سارا افسانہ اپنے دل سے گھڑ لیا اور پھر دو تین تار دے دیے اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مسلم لیگ کے لیڈروں سے جب میں نے اس قسم کے بے بنیاد پروپیگنڈے کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں تو کانگرس کو بدنام کرنا ہے، چاہے سچی خبروں کی اشاعت سے بدنام ہو یا جھوٹی خبروں کی اشاعت سے۔ لیکن ذرا سوچئے! اس طرزِ عمل کا نتیجہ کیا ہوگا کہ پھر مسلمانوں میں صحیح خبریں سننے کے بعد بھی صحیح جوش و جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ حقیقتیں بہر حال اُبھرتی ہیں اگر آج بے بنیاد پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے تو لازمی طور پر کل اس کا پردہ چاک ہو کر رہے گا اور اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے لیکن افسوس ہے کہ مسلم لیگی افراد کو اس کا مطلق کوئی خیال نہیں اور وہ اس طرح خود اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کے سیاسی احساس و سیاسی شعور کو ذبح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (مدینہ۔ بجنور: ۹ / مارچ ۱۹۴۷ء)

(۳)

زبان کا مسئلہ:

شاہ عبدالقادر نے ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں جو قرآن کا ترجمہ کیا تھا اس میں لکھا ہے کہ یہ ترجمہ ہندی زبان میں ہے۔ یعنی ریختہ میں نہیں ہے۔ گویا اس زمانے میں ہندی سے مراد وہ صاف و سلیس زبان ہوتی تھی جو عام لوگوں میں بولی جاتی تھی اور جس کا نمونہ شاہ صاحب کا یہ ترجمہ ہے اور ریختہ سے مراد وہ زبان ہوتی ہے جس میں فارسی کی بکثرت ملاوٹ ہوتی تھی۔ شاہ صاحب کے اس ترجمے کے (۳۵-۳۶) سال بعد آپ کے بھتیجے شاہ اسماعیل شہید نے ایک

کتاب تقویت الایمان لکھی، اس میں بھی یہی لکھا کہ یہ کتاب ہندی زبان میں لکھ رہا ہوں تا کہ عام لوگ اسے سمجھ سکیں لیکن (شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے بھی) کم وبیش چالیس سال قبل غلام علی آزاد نے جو تذکرہ لکھا ہے یعنی اس زمانے میں ہندی کو اُردو نہیں کہا جاتا تھا بلکہ اس سے سخت وثقیل سنسکرت مراد ہوتی تھی۔

ہندی کی موجودہ شکل کا آغاز غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوتا ہے اور اب پچیس تیس سال کی مسلسل کوششوں نے اس کو ایک بناوٹی مگر مستقل زبان بنا دیا ہے جس میں رسالے نکلتے ہیں، کتابیں چھپتی ہیں اور اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اب اس زبان کو مٹایا نہیں جا سکتا کیوں کہ یہ ادب کی ایک شاخ ہوگئی ہے۔

اس وقت بحث یہ ہے کہ زبان کا چوکھٹا کیا ہوا؟ سوا سے یہ سب جانتے ہیں کو جو الفاظ استعمال ہو رہے ہیں اور جن پر رواج کی مہر لگ چکی ہے ان کا مقاطعہ نہ کیا جائے مگر اس بارے میں چوں کہ مینٹل ریزرویشن (ذہنی تحفظات) ہیں اس لیے عمل اس پر نہیں ہوتا۔ آج کل تو حالت یہ ہے کہ فارسی وعربی کے رائج الفاظ کا بھی مقاطعہ ہو رہا ہے۔ ''پرنتو'' کوئی نہیں بولتا ''لیکن'' یا ''مگر'' بولتے ہیں۔ مگر پھر بھی آج کل کوشش کی جاتی ہے کہ پرنتو بولا جائے۔ اس قسم کی کوشش یقیناً معیوب ہے اور ہمیں ہندوؤں کو ایسا کرنے سے روکنا چاہیے اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اسکولوں میں جو کتابیں داخل نصاب کی جائیں ہم ان کی کافی چھان بین کریں اور دیکھیں کہ ان میں اس قسم کی زبان استعمال نہ کی جاسکے نیز کانگریس اس بارے میں ایک واضح تجویز پاس کرے۔

اس وقت حکومت بہار نے لغت کی ترتیب کے لیے جو کمیٹی بنائی ہے اس کا کام ہوگا کہ وہ زبان کا چوکھٹا (فریم) بنا دے یعنی یہ متعین کردے کہ وہ کون سی زبان ہے جو آج کل بولی جاتی ہے۔ جب یہ لغت مرتب ہو جائے گی تو پھر ہم یہ کہہ سکیں گے کہ فلاں شخص نے جو لفظ بولا ہے وہ ''ہندستانی'' ہے یا نہیں، اس لغت کو بناتے وقت نیز اس کے علاوہ اور عام حالات میں بھی ''ہندستانی'' زبان کا کلاسکس عربی، فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں کو ہونا چاہیے۔ ان زبانوں میں سے جس زبان میں زیادہ موزوں لفظ مل سکے اسے لے لینا چاہیے۔

مسلم ریاستیں:

مسلم ریاستوں میں مسلمانوں کو ذمے دار حکومت کے قیام کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ اب یہ چیز روکنے سے رُک نہیں سکتی۔ وقت کی آب وہوا ہی ایسی ہے کہ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ حیدر آباد کے مسلمانوں کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ انھوں نے خود کو سیاست سے علاحدہ رکھا۔ اگر مسلم ریاستوں میں مسلمان خود کو سیاست علاحدہ نہ رکھیں تو بہت سی ایسی ناگوار باتیں نہ ہو سکیں گی جن کے ہونے کا امکان ان کی عدم موجودگی میں ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ذمے دار حکومت (کے قیام کی جدوجہد میں حصہ لے کر) اپنے حقوق اور اپنی تہذیب وغیرہ کے وجود کو قایم رکھنے کی کوشش کریں۔

کانگریس کی مرکزی طاقت:

ورکنگ کمیٹی کے ممبر اُوپر سے بیٹھ کر سب کچھ نہیں کر سکتے۔ اصل سوال کانگریس کے نچلے حصے کا ہے اور یہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ اُوپری حصے میں تو ہندو مسلم سوال نہیں ہے لیکن نچلے حصے میں رفتہ رفتہ پیدا ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ منڈل کانگریس کمیٹیوں میں تو یہ بہت شدید صورت اختیار کر لیتا ہے آج کل کانگریس کے انتخابات ہو رہے ہیں اور مجھے اس قسم کی شکایتیں بکثرت موصول ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں پر طرح طرح کی ترکیبوں سے کانگریس کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جب تک ہندو بالکل مجبور نہیں ہو جاتے اور یہ نہیں سمجھ لیتے کہ اب ہماری چالاکی کھل جائے گی تب تک وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔

لیکن ان تمام تعصبات کے باوجود دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا کانگریس میں کوئی ایسی مرکزی طاقت بھی ہے، جو ان تمام بے عنوانیوں پر غالب آ سکتی ہے؟ مثال کے طور پر سندھ کے معاملے کو لیجیے۔ یہاں اتفاق سے آبادی کی تقسیم اس طرح سے ہے کہ کاشتکار تقریباً سب مسلمان ہیں اور ساہوکار، مہاجن اور شہر کے باشندے سب ہندو۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب سندھ کی علاحدگی کا مسئلہ زیر بحث تھا تو فرقہ پرست ہندو اس کے سخت خلاف تھے ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ صوبہ اپنے مصارف کا بوجھ خود برداشت نہ کر سکے گا لیکن جب

ان کی مخالفتوں کے باوجود سندھ علاحدہ صوبہ قرار دے دیا گیا تو اب جب کبھی مصارف کی کمی کا سوال پیش آتا ہے اور نئے ٹیکس لگانے کی اسکیم زیرِ غور آتی ہے ہندو شہروں پر ٹیکس لگانے سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر سندھ اپنے مصارف آپ برداشت نہیں کرسکتا تو اس کا بھگتان ہم اپنے سر کیوں لیں۔ اسی لیے تو ہم کہتے تھے کہ اسے علاحدہ صوبہ نہ بناؤ۔ اب جب مسلمانوں نے اسے علاحدہ کرلیا ہے تو وہی لوگ اس کے مصارف کا بوجھ اُٹھائیں۔ ٹیکسیشن کا بارہم کیوں اُٹھائیں۔

غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت:

چنانچہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت بنی تو کمیونل ہندوؤں نے ان سے پہلے یہ وعدہ لے لیا کہ صوبہ کی آمدنی کو بڑھانے کے لیے ان پر کوئی ٹیکس نہ لگایا جائے گا۔ بلکہ آب پاشی کے نرخ میں اضافہ کر کے (مصارف کی کمی کو پورا کیا جائے لیکن آبپاشی کے نرخ میں اضافہ کرنے) کا سوال کوئی معمولی سوال نہ تھا۔ اس محصول کے بڑھانے سے کاشتکاروں پر ایک نئے بوجھ کا اضافہ ہوتا تھا۔ حال آں کہ ان کے بوجھ کو کم کرنا چاہیے تھا۔ کچھ دن تک سر غلام حسین کی وزارت نے اس سوال پر سکوت اختیار کیا۔ بالآخر اپنے فرقہ پرست ہندو حامیوں کے اصرار پر اور گورنر کے دباؤ سے اس نے اضافے کا اعلان کردیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد قدرتاً سارے سندھ میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور اس ہنگامے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ سر غلام حسین کی وزارت ٹوٹ گئی۔

اللہ بخش کی وزارت:

غلام حسین کی وزارت کے بعد جو دوسری وزارت آئی اس نے اعلانیہ طور پر یہ یقین دلایا کہ آب پاشی کے محصول میں مطلق زیادتی نہ ہوگی۔ سندھ پراونشل کانگریس پارٹی نے اس یقین دلانے کی بنا پر وزارت کی حمایت کا اعلان کیا، لیکن سندھ کو اپنے مصارف کا کفیل بنانا تو بہر حال ضروری تھا۔ اس لیے کچھ دنوں کے بعد گورنر نے اندرونی طور پر اللہ بخش کی وزارت کو بھی آب پاشی کا نرخ بڑھانے پر مجبور کیا۔ اللہ بخش کو اس چیز نے سخت پریشان کیا مگر اس کے

سامنے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مجبوراً اس نے خفیہ خفیہ بتدریج محصول بڑھانے کی تجویز منظور کر لی اور کانگریس پارٹی یا اپنی پارٹی سے مشورہ کیے بغیر اس کا اعلان سرکاری گزٹ میں شائع کر دیا۔ یہ چیز کانگریس پارٹی کو سخت ناگوار ہوئی۔ چناں چہ کانگریس اور ان کی اپنی پارٹی دونوں نے اس سے جواب طلب کیا۔ کانگریس پارٹی نے ایک جلسہ کر کے یہ تجویز پاس کر دی کہ چوں کہ اللہ بخش کی وزارت نے شرح محصول میں اضافہ کر کے کاشت کاروں پر مصارف کے بوجھ کا اضافہ کر دیا ہے جو کانگریس کے اصول کے منافی ہے اس لیے کانگریس پارٹی اس وزارت کی حمایت سے دست کش ہوتی ہے۔

اللہ بخش کا استعفیٰ اور اس کا ردعمل:

ادھر اللہ بخش کی اپنی پارٹی نے بھی اسے تنگ کیا تو اس نے مجبوراً استعفیٰ دے دیا لیکن فرقہ پرست ہندوؤں نے قدرتی طور پر اس معاملے میں جی کھول کر اللہ بخش کی تائید کی اور اس سے کہا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اب ہرگز (آب پاشی کے نرخ میں اضافے کے) اس اعلان کو واپس نہ لینا لیکن فرقہ پرست ہندوؤں کی تائید سے اللہ بخش اپنی وزارت کو قایم نہ رکھ سکتا تھا۔ مسلم لیگ پارٹی پہلے ہی اس کی مخالف تھی۔ اب کانگریس نے بھی تائید کا ہاتھ کھینچ لیا تو اللہ بخش وزارت کی کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ مسلم لیگ نے جو یہ حال دیکھا تو سمجھا کہ اب اسے وزارت بنانے کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔ چنانچہ کراچی میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ عام کیا گیا اور اس میں اتنی اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں کہ قدرتاً ہندوؤں میں سخت ہراس و اضطراب پھیل گیا۔ اس کا اثر کانگریسی ہندوؤں پر بھی پڑا۔ اگرچہ اب تک وہ اصولی طور پر اللہ بخش وزارت کی مخالفت کا اعلان کر رہے تھے۔ مگر اب وہ بھی کچھ تذبذب میں پڑ گئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ بہر حال مسلم لیگ کی خالص فرقہ پرست وزارت سے تو اللہ بخش کی وزارت ہی اچھی ہے اس چیز نے ایک عجیب و غریب قسم کی فضا پیدا کر دی۔ اب گویا سوال کا پہلو ہی بدل گیا اب تک اصول کا سوال تھا۔

مسلم لیگ کے جلسے نے اس سوال کو ہندو مسلم رنگ دے کر کانگریسی ہندوؤں کو بھی فرقہ

پرست ہندوؤں کی گود میں دھکیل دیا۔

اب ہر ہندو کے دماغ میں یہ چیز پیدا ہوگئی کہ کچھ بھی ہو مسلم لیگ کی فرقہ پرست وزارت تو ہرگز نہ بننی چاہیے۔ چناں چہ کانگریس پارٹی کے ممبروں نے بھی اندرونی طور پر یہ طے کیا کہ اب اللہ بخش کی حمایت ضرور کی جائے گی۔

اس اثنا میں میرے پاس سندھ کے کئی مسلم ممبروں کے تار آئے مگر چوں کہ ان تمام تدریجی تغیرات کی مجھے خبر نہ تھی۔ اس لیے میں یہی سمجھا کہ جو لوگ وزارتوں سے محروم ہو گئے ہیں وہ محض پارٹی بازی کے جذبے میں ایسا لکھ رہے ہیں لیکن جب سندھ پہنچا تو صحیح صورت حال کا علم ہوا۔ سردار پٹیل بھی مجھ سے چند روز پہلے کراچی پہنچ چکے تھے اور صوبہ کانگریس کمیٹی کے ممبروں نے ان کو اس اضافہ محصول کی تائید کرنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ چنانچہ جب میں پہنچا تو میں نے ان کو تائید کی طرف مائل پایا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس اضافہ کا دارومدار روئی کے بھاؤ کے بڑھنے پر ہے لیکن ابھی تو روئی کا بھاؤ دو تین سال تک بڑھتا نہیں اس لیے اگر اس وقت اضافے کو قبول کرلیا جائے تو عملاً دو سال تک تو اس کا اثر کاشتکاروں پر پڑے گا نہیں۔ اس درمیان میں ذرا فضا صاف ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ کوئی اور عمدہ صورت اس اضافے کو منسوخ کرنے کی پیدا کرسکیں۔

یہ بات دل کو کچھ لگتی تھی مگر میں اس سے اتفاق نہ کرسکا۔ میں نے کہا کہ یہ تو گویا اصل سے انحراف ہوا۔ آج مصالحت کی بنا پر کانگریس اصل سے ہٹ کر یہاں تک آئی ہے۔ کل کو چند قدم اور آگے بڑھے گی۔ یہ بات تو میرے دماغ میں نہیں آتی۔

چاروں طرف یہی کہا جاتا تھا کہ اگر اس وقت ہم نے اللہ بخش کی تائید نہ کی تو مسلم لیگ وزارت بنالے گی۔ مگر میں نے کہا "اگر مسلم لیگ بنالیتی ہے تو بنالے ہم نے وزارتیں بنانے کا ٹھیکا تو نہیں لیا ہے۔ مسلم لیگ ہماری طرف سے ایک نہیں ایک ہزار وزارتیں بنالے۔ ہم نے وزارتیں اصول کے تحت قبول کی ہیں۔ جب یہ اصول ہمیں خطرے میں پڑتا نظر آئے گا تو ہم وزارتوں کو ٹھکرادیں گے۔ ہم اپنے اصول کے سوا اور کسی وجہ سے وزارتیں نہیں بنا سکتے۔ کیا اوّل اوّل جب گورنروں سے اور کانگریس سے گفت وشنید ہورہی تھی اور ہم نے عدم دست اندازی

کے تیقنات کا مطالبہ کیا تھا، تو کیا غیر کانگریس کے ممبروں نے وزارتیں نہیں بنالی تھیں؟ پھر کیا ہم اس وقت صرف اس لیے اپنے تمام مطالبات کو پس و پست ڈال دے سکتے تھے کہ چند زمیندار، ساہوکار، مہاجن یا فرقہ پرست افراد نے وزارتیں بنالی ہیں؟ کانگریس جس ترازو میں ہر ہر چیز کو تولتی ہے وہ تو ہر صوبے کے لیے ایک ہی ہونا چاہیے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز یوپی کے لیے ٹھیک ہو، پنجاب کے لیے ٹھیک ہو لیکن سندھ کے لیے ٹھیک نہ ہو؟

الغرض اس مسئلے پر بڑی بحث رہی اور بالآخر طے ہوا کہ اضافۂ محصول کے سوال کو فی الحال ملتوی کیا جائے۔ کانگریس کے اس فیصلے پر فرقہ پرست ہندو سخت چراغ پا ہوئے لیکن افسوس ہے کہ مسلم لیگ کے جلسے میں سخت سے سخت اشتعال انگیز تقریریں تو ہوئیں لیکن یہ جملہ کسی کی بھی زبان سے نہ نکلا کہ کانگریس نے اس فیصلے میں ایمانداری کو پیش نظر رکھا اور نہ اُردو اخبارات ہی نے اس چیز کے مختلف گوشوں کو اُبھار کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح کے عمل سے عوام میں صحیح سیاسی شعور اور صحیح سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی لیکن خیر! اس وقت تو مجھے یہ بتلانا ہے کہ کانگریس کے اس فیصلے سے اس کی مرکزی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پنجاب کا معاملہ:

اسی طرح پنجاب کی مثال ہے۔ یہاں پچھلے دنوں جو چار بل پیش کیے گئے تھے وہ اگرچہ اپنے اندر بہت سی آلودگیاں رکھتے تھے اور کانگریس کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے تھے مگر پھر بھی ان سے کاشت کاروں کو کسی نہ کسی حد تک فایدہ پہنچتا تھا لیکن پنجاب میں بھی صورت حال وہی ہے جو سندھ میں ہے یعنی زراعت پیشہ سب مسلمان یا سکھ اور غیر زراعت پیشہ تقریباً سب ہندو۔ اس لیے اس صوبے میں اگر زراعت پیشہ طبقے کے مفاد کو ترقی دینے اور اسے ساہوکار اور مہاجن کی دست برد سے بچانے کا کام کیا جاوے تو قدرتاً اس کا برا اثر ہندوؤں پر پڑے گا۔ اسی وجہ سے ان چاروں بلوں کے خلاف ہندوؤں نے سخت شور و غوغا برپا کیا۔ سندھ کی طرح یہاں کے کانگریسی ممبر بھی رائے عامہ کے سیلاب میں اپنے قدموں کو ڈگمگانے سے باز نہ رکھ سکے لیکن کانگریس اسے کیسے گوارا کرسکتی تھی کہ کاشتکاروں کے مفاد کے کسی خفیف کام میں بھی روڑا اٹکایا

جائے۔ چنانچہ کانگریس نے ان بلوں کی خامیوں کے باوجود یہی فیصلہ کیا کہ ان کی مخالفت نہ کی جائے۔

ہمارے اس فیصلے پر عام ہندوؤں میں بڑا شور وغوغا بپا ہوا۔ حتیٰ کہ کانگریس کے ذمے دار افراد نے ہم سے آ کر یہاں تک کہا کہ اگر آپ ان بلوں کے خلاف آواز بلند کرنے سے ہمیں روکیں گے تو ہم کانگریس سے بغاوت کریں گے مگر میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ آپ شوق سے بغاوت کیجیے اور اسی سوال پر کانگریس سے استفادہ دیجیے لیکن میں تو وہی کروں گا جو صحیح سمجھتا ہوں۔ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کے ممبروں نے تین بلوں پر رائے شماری (ڈویژن) کا مطالبہ ہی نہیں کیا اور چوتھے پر کیا تو سہی لیکن غیر جانبدار رہے۔

اس کے بعد ایک اور حرکت کی گئی۔ یعنی کہا گیا کہ پنجاب کے وزیروں نے کانگریس کے ذمے دار افراد کو اپنی تقریروں میں بہت سخت وست کہا ہے اور گاندھی جی کو گالیاں بھی دی ہیں اس لیے ہم ان کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس میں صورت یہ تھی کہ کانگریس پارٹی کے ممبر غیر زراعت پیشہ افراد کے ساتھ متحد ہو کر مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کا لازمی اثر عوام پر یہی پڑتا کہ کانگریس بھی غیر زراعت پیشہ افراد کے غرض مندانہ ایجی ٹیشن میں شریک ہے اس لیے میں نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ میں نے کہا کہ اگر مظاہرہ کرنا ہے تو اس کی تاریخ، غیر زراعت پیشہ افراد کے مظاہرے کی تاریخ کے علاوہ کوئی اور ہونی چاہیے۔

بہر حال یہ ایسے واقعات ہیں جن سے ہمیں کانگریس کی مرکزی طاقت کا علم ہوتا ہے اور اس پر ہمیں غور کرنا ہے۔ (مدینہ–بجنور: ۱۳؍مارچ ۱۹۷۲ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کے چند سیاسی انٹرویو

شورش کاشمیری

۱۹۵۶ء میں شورش کاشمیری مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بلاوے پر دہلی گئے تھے۔ ایک ہفتے کے دوران ان کا معمول یہ تھا کہ مولانا کے دفتری اوقات کے سوا ان کا بیشتر وقت مولانا کی صحبت میں گزرتا تھا۔ مولانا دفتر تشریف لے جاتے تو شورش اپنے دوست پر بودھ جی کے ساتھ سیر وتفریح میں یا دوسرے علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتوں میں گزارتے تھے۔ مولانا سے ملاقات میں مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی مولانا ازخود کسی علمی، ادبی، سوانحی تاریخی یا سیاسی موضوع پر گفتگو شروع فرما دیتے تھے اور کبھی شورش مرحوم کوئی سوال پوچھتے تھے اور مولانا اپنے جواب میں مطالعہ ومشاہدہ اور حقایق وواقعات وتجربات کے موتی بکھیرتے تھے۔ کاش آج جیسی سہولتیں گفتگو اور مباحث کو محفوظ کرنے کی ہوتیں تو افکار وبیانات اور آپ بیتی کا کتنا بڑا ذخیرہ خود مولانا کی آواز والفاظ اور اسلوب بیان وطرز کلام میں محفوظ ہو گیا ہوتا! مولانا کے یہ تمام بیانات اور افکار وخیالات شورش مرحوم کی زبان اور اسلوب تحریر میں ہیں۔ شورش پر صرف اس کے مفاہیم کی صحت کی ذمے داری ہے۔ شورش مرحوم نہ صرف اس ایک ہفتے کی صبح وشام کی صحبتوں اور اس سے پہلے کی ملاقاتوں کا تذکرہ سنایا کرتے تھے۔ مولانا آزادؒ سے ملاقاتوں اور صحبتوں سے شورش مرحوم کے فیض یاب ہونے کی مدت گھنٹوں اور دنوں تک محدود نہیں، دہائیوں پر محیط ہے۔ شورش مولانا کے افکار وافادات کے عالم یا حافظ نہیں، ان کے پیکر تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ کتابی صورت میں انھیں مرتب کر کے چھاپ دیں گے۔ معلوم نہیں انھیں ان کے مرتب کرنے کا موقع ملا تھا یا نہیں، البتہ بعض اظہارات کو ہم ''ابوالکلام آزاد......

سوانح وافکار'' میں پڑھ سکتے ہیں۔

یہ تمام بیانات، ملاقات کی رودادیں اور مولانا کے خیالات شورش کاشمیری کی زبان و اسلوب میں ہیں۔ مولانا آزاد کی زبان اور اسلوبِ بیان و گفتگو کا لطف و حسن ان میں تلاش نہیں کرنا چاہیے لیکن مولانا آزاد کے خیالات اور پاکستان کے بارے میں ان کا انداز فکر اور جذبات یہی تھے، جن کا شورش مرحوم نے بیان کیا ہے! (ا-س-ش)

سیاسی انتشار اور پاکستان:

مولانا نے مختلف پہلوؤں سے پاکستان کے بارے میں گفتگو فرمائی تھی۔ شورش کاشمیری مرحوم کے مطابق مولانا آزاد پاکستان میں سیاسی انتشار سے بہت ناخوش (فکر مند) تھے۔ اس لیے سب سے پہلے مولانا نے اسی پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ مولانا کے خیالات یہ ہیں:

> ''پاکستان کو آٹھ سال بیت چکے ہیں۔ اب کہیں چودھری محمد علی نے آئین تیار کیا ہے اور وہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی باہمی مفاہمتوں سے ایک کھچڑی پکی ہے۔ خدا کرے اب اس کے مطابق ہی پاکستان کا سیاسی سفر شروع ہو، ایک آئینی سانچہ بن تو گیا، آیندہ تجربوں سے اس میں اصلاح ہو سکتی ہے، لیکن پاکستان کے اندرونی حالات کا غایر مطالعہ کئی ایک خدشات کی نشان دہی کرتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس آئین کے تحت پہلے انتخابات ہی نہ ہو سکیں گے۔ آئین ختم کر دیا جائے گا۔ اُدھر پاکستان کے سیاست داں غیر تربیت یافتہ لوگ ہیں انھوں نے ملک کی عنان بیوروکریسی کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اسکندر مرزا نہیں چاہتے کہ پاکستان میں انتخابات ہوں، وہ عمر بھر صدارت کی مسند پر رہنا چاہتے ہیں۔ وہ بیرونی مداخلت کے آلہ کار ہیں، انھوں نے آئین توڑ کر مارشل لا نافذ کیا تو قطعی نتائج کے متعلق حتمی رائے دینا مشکل ہے۔ مارشل لا نافذ کر کے وہ کب تک اقتدار میں رہ سکیں گے؟ اس بارے میں کچھ کہنا یا مدت کا تعین کرنا مشکل ہے

لیکن جس فوج کے بل پر وہ مارشل لا لائیں گے، وہی فوج انھیں سبکدوش کر دے گی۔ ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت توڑ کر پاکستان کو غلطیوں کے راستے پر ڈال دیا ہے اور اب آیندہ کئی خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ سیاست دانوں کی جگہ بیوروکریسی نے لی ہے۔ ہوسکتا ہے پاکستان ایک لمبے عرصے کے لیے سیاست دانوں کے ہاتھ سے نکل کر بیوروکریسی ہی کے عسکری ہاتھوں میں چلا جائے، پھر ایک طویل عرصہ مارشل لا کی حکومت ہو، اس کے بعد جو آئین وضع ہو وہ فوج کی ٹکسال میں ڈھلا ہوا اور جمہوریت کے انتخابی مزاج پر پاکستان کی عسکری چھاپ ہو، فوج کے سپہ سالاروں کی جمہوریت پاکستان کے لیے کئی آفتوں کا مجموعہ ہوگی، اور جو تجربہ بھی فوج کی معرفت اس جمہوریت کی آڑ میں کیا جائے گا وہ دیر سویر ناکام ہوگا، چوں کہ فوج مغربی پاکستان کی ہے اور پنجاب کے لوگ عسکری ہیں۔ اس لیے اس خطرے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی پاکستان میں نظریہ پاکستان سے متعلق منفی تحریکیں پیدا ہو کر بالآخر اس کی علاحدگی کا باعث ہوں۔

پاکستان کو محسوس کرنا چاہیے کہ ہندستان کی ایک سیاسی کھیپ کو اس کے معرض وجود میں آنے پر قلق ہے۔ اگر مسلم لیگ کی لیڈرشپ گاندھی و نہرو کی جماعت سے مفاہم کر لیتی تو پاکستان کئی خطروں سے محفوظ ہو جاتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو جذباتی انسان ضرور ہیں وہ بسا اوقات ایک مسئلے پر ضدی ہو جاتے ہیں لیکن انھیں استدلال کی طاقت سے منا لینا مشکل نہیں۔ سردار پٹیل کشمیر کے مسئلے میں پاکستان کی تائید کرتے تھے کہ پاکستان کا اس پر حق ہے اور وہ پاکستان ہی کو ملنا چاہیے، جواہر لال کو راضی کر لینا مشکل نہ تھا۔ وہ لازماً کشمیر پر ہندستان کے قبضے سے دستبردار ہو جاتے لیکن قائداعظم کی رحلت کے بعد لیاقت

علی بھی کسی نیشنلسٹ مسلمان سے گفتگو کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مجھ سے سردار پٹیل نے بیان کیا کہ انھوں نے گورنر ہاؤس لاہور میں لیاقت علی کے اصرار و استفسار پر ان سے کہا تھا کہ وہ پاکستان کے وزیر اعظم ہیں اور پنڈت جواہر لال نہرو ہندستان کے وزیر اعظم ہیں۔ دونوں ہی مجاز و مختار ہیں کسی مسئلے کا حل مشکل نہیں۔ میں استدلال کے طویل چکر میں پڑے بغیر ذمے داری لیتا ہوں اور معاہدہ ابھی ہو سکتا ہے کہ پاکستان، مناودر، جونا گڑھ اور حیدر آباد سے دستبردار ہو جائے ہم کشمیر کو چھوڑ دیتے ہیں، وہ ریاستیں ہندستان کے حدود میں ہیں اور کشمیر پاکستان کی حد سے متصل ہے، سردار پٹیل نے لیاقت علی کو یہ پیش کش بھی کی کہ وہ پاکستان کی ہندو اقلیت کو روکیں میں ہندستان کی مسلم اقلیت کو روکتا ہوں اس کے بعد جو فساد برپا کرے اس کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی جائے۔ اس سے امن دو دن میں قایم ہو جائے گا لیکن لیاقت علی نے مناودر، جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن کے بارے میں پس و پیش کیا۔ نتیجتاً دونوں مملکتوں کے وزرائے اعظم کی پہلی کانفرنس ناکام ہو گئی، لیکن اب وہ سب چیزیں ماضی کی یادگار ہیں، آج پاکستان ہندستان کے داخلی خطروں پر خوش ہوتا ہے اور ہندستان پاکستان کے سیاسی افتراق پر بغلیں بجاتا ہے۔ لیکن دونوں میں سے کسی مملکت کے لیے کوئی فایدہ نہیں۔ پاکستان اور ہندستان کی بساط سیاست پر عالمی طاقتیں اپنے اپنے مہرے لے کر کھیل رہی ہیں، ان طاقتوں کی ذہنی غایت دونوں کے مابین دوستی کی نیو اُٹھانا نہیں بلکہ دوستی کا نام لے کر اپنے ہتھکنڈے جمانا ہے۔ پاکستان ہندستان کے خطرے سے خوف زدہ ہو کر عالمی طاقتوں کی چوکھٹ پر کھڑا ہے اور خود سپردگی میں ذرّہ برابر عیب محسوس نہیں کرتا۔ ہندستان چوں کہ سیاستاً پاکستان کا حریف ہے۔ لہٰذا اس کو بھی عالمی طاقتوں کی معاونت درکار ہے۔ دوسری جنگ

عظیم کے بعد پورے ہندستان کے دفاعی اخراجات سو کروڑ روپے تھے لیکن برعظیم کی تقسیم کے بعد ایک چوتھائی فوج پاکستان کے حصے میں چلی گئی اور تین چوتھائی ہندستان میں چلی گئی۔ اب ہندستان کی فوج کے اخراجات دو سو کروڑ ہیں اور پاکستان کے اخراجات بھی کم سے کم سو کروڑ تک پہنچتے ہیں۔ یہ وہ رقم ہے جو دونوں ملکوں کے عوام حکومت کے واجبات کی شکل میں ادا کرتے ہیں، وہ امداد اس کے علاوہ ہے جو دونوں ملکوں کو ان کے عالمی دوستوں سے ملتی اور اس کی مانگ برابر رہتی ہے۔ یہی رقم دونوں ملک اپنی ترقی وخوشحالی پر صرف کریں اور عوام پر روزمرہ کے ٹیکسوں کا بوجھ ہلکا پڑ جائے تو ہر دو ملک صحیح معنوں میں خودمختار اور آزاد ہو سکتے ہیں اور ان کے وہ خطرات بھی ٹل سکتے ہیں جو فریقین کے دلوں میں بیٹھ چکے ہیں اور دونوں مملکتیں اپنے مسائل کا حل ایک جنگ کی شکل میں دیکھ رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ اندریں حالات پاکستان اور ہندستان دونوں کے لیے مہلک ہے۔

ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ ہندستان سے دوستانہ رشتہ استوار کرنے پر سوچے۔ ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جو ہندستان کے مزاج کی برہمی کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔ پاکستان ایک سیاسی تجربہ ہے، پاکستان کے ارباب حل وعقد کا فرض ہے کہ اس تجربے کو کامیاب بنائیں، ادھر ہندستان کے ارباب بست وکشاد کو لازم ہے کہ پاکستان کو ایک حقیقت مان لیں اور تسلیم کر لیں کہ اب جانبین میں دوستانہ تعلقات اور اشتراک عمل ہی ان کی بقا واستحکام کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اگر نفرت کا شعلہ بھڑکتا رہا تو دونوں ملک عالمی طاقتوں کے مقاصد کی چتا میں بھسم ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا، کوئی سی طاقت اپنے اغراض کی خاطر تضادات سے مصافحہ ومعانقہ کرتی ہے تو اس میں آخر کار خسارا ہی ہوتا ہے۔"

دوقومی نظریہ اور پاکستان:

دوقومی نظریے کے بارے میں پوچھا کہ ہندو اور مسلمان بہرحال دو قومیں ہیں۔ یہ اجتماع ضدین ایک کیوں کر ہوسکتا ہے؟

مولانا نے جواب میں فرمایا:

''یہ ایک پامال بحث ہے، کئی سال پہلے علامہ اقبال اور مولانا مدنی کے مابین اس مسئلے پر جو بحث ہوئی تھی، میں نے بالاستیعاب دیکھی اور پڑھی ہے۔ قوم کا لفظ قرآن میں محض اُمت کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ جماعت انسانی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، آخر ملت، قوم اور اُمت کے الفاظ کی بحث چھیڑ کر ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہندستان میں مذہبا ایک نہیں کئی قومیں بستی ہیں۔ مسلمان ہیں، عیسائی ہیں، پارسی ہیں، سکھ ہیں، مسلمانوں اور ہندوؤں میں دینی اعتبار سے بہت بڑی مغائرت ہے لیکن اس مغائرت کے باعث ہندستان کی آزادی روکی نہیں جاسکتی اور نہ دوقومی نظریہ وحدتِ ہندستان یا ملتِ ہندستان کی نفی کرتا ہے۔ سوال تو آزادی کا ہے کہ ہم ایک غیرملکی طاقت سے کیوں کر آزاد ہوں اور آزادی ایک ایسی نعمت ہے کہ مذہبا تقسیم نہیں ہوسکتی۔ انسان کی مشترکہ میراث ہے۔ مسلمانوں کو محسوس کرنا چاہیے کہ ان کا ملی وجود ایک عالمی دعوت ہے وہ کوئی نسل نہیں جس کی علاقائی حدبندیوں میں کوئی دوسرا داخل نہیں ہوسکتا۔ اپنے حزبی عقاید کی رنگارنگی کے باعث مسلمان ہندستان میں ملت واحدہ نہیں رہے، عملاً کئی قوموں کا منتشر مجموعہ ہیں۔ انھیں ہندوؤں سے عداوت کی اساس پر تو جمع کیا جاسکتا ہے لیکن اصل اسلام پر متحد کرنا مشکل ہے۔ اسلام کے نام پر ان کے اندر بیسیوں فرقے جاگ اُٹھتے اور عقاید کی دھاچوکڑی مچ جاتی ہے۔ وہابی، سنی، شیعہ کے علاوہ دسیوں شاخیں ہیں۔ مثلاً ایک وہ جماعت

ہے جو مغربی افکار سے پیدا ہوئی اور یورپ کے اتباع میں مذہب و سیاست کی جداگانہ ہستی کا ذہن رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے، پھر ہندستان کے اسلامی فرقے یا طائفے ہی نہیں۔ مثلاً بریلوی ہیں چکڑالوی ہیں، دیوبندی ہیں ان کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان فرقوں کے علاوہ بے شمار خانقاہی سلسلے اور مشائخ کی حلقہ بندیاں ہیں۔ ان میں عقاید کی متحارب رنگارنگی ہے غرض ہندستانی مسلمانوں کے عقاید کی سرائے میں داخل ہو جاؤ۔ معلوم ہوگا کہ بھڑوں کا چھتا پھیلا ہوا ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کی تاریخ باہمی نزاع کا ایک وحشت خانہ ہے۔ مشائخ و علماء کی ایک بہت بڑی جماعت نے کیا نہیں کیا؟ جہاد کو منسوخ و متروک قرار دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو مجرم ٹھہرایا کہ وہ فساد فی الارض کے مجرم ہیں، چھوٹے چھوٹے مسئلوں کا طوفان اُٹھا دیا۔ رفع یدین، آمین بالجہر، قبروں پر سجدہ اور اس قسم کے بیسیوں مسائل پیدا کر کے مسلمانوں کو آپس میں بھڑا دیا، علماء کی مختلف شاخوں نے کافر سازی کی تلوار نکال لی، پہلے وہ کافروں کو مسلمان بناتے تھے۔ اب مسلمانوں کو کافر بنانے لگے۔ بڑے بڑے لوگ کافر قرار پائے۔ ان مشکلات کا اندازہ کرنا سہل نہیں۔ ہوشربا حالات سے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہی نمٹ سکتے تھے۔ انھیں بھی ابتلا و آزمائش کی ایک عمر گزارنی پڑی۔ جب عقلیں گمراہ ہو جائیں، دلوں کو تالے لگ جائیں اور طبیعتیں منجمد ہوں تو معلمین و مصلحین کے لیے انسانوں کی اس جماعت سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہوتا ہے۔ آج تو مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ ہماری قوم سیاسی تعصبات میں اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ وہ دین پر سیاست کو ترجیح دیتی اور اپنی ضرورتوں کے انبار کو اسلام سمجھتی ہے۔ المختصر ہر دور میں قوم نے استقامت کی تصویروں کو ہمیشہ اپنے قہقہوں میں اُڑایا۔ قربانی کی شمعیں

گل کیں اور ایثار کے پرچم پھاڑے ہیں۔ ہم تو خیر انسان ہیں، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور آنحضرتؐ (علیہم الصلوۃ والسلام) سے وقت کے انسانوں نے کیا سلوک نہیں کیا، جب اللہ کے پیغمبروں سے جماعت انسانی کی سرکشی کا حال غضب ناک رہا تو کسی اور کے لیے اس غضب سے بچاؤ کا سوال کہاں؟''

ایک دوسری ملاقات میں راقم نے عرض کیا:

آپ نے ''الہلال'' کی دینی آواز غالباً اس لیے بند کردی کہ مسلمانوں کا ذہنی ویرانہ اس کا متحمل نہیں ہو رہا تھا یا آپ محسوس کرتے تھے کہ لق ودق صحرائیں آپ اذان دے رہے ہیں؟

مولانا نے فرمایا:

''میں نے ''الہلال'' کی آواز اس لیے ترک نہیں کی کہ اس آواز کی صداقت سے مایوس ہو گیا تھا، اس آواز نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت میں اسلام کا ولولہ، آزادی کی لگن اور عمل میں استقامت پیدا کی، خود میرے اندر ایک ایسی روح پیدا ہوگئی جو صحبت یافتگان رسالت کا امتیاز و جوہر تھا۔ میں اپنی اس آواز میں ققنس کی طرح مست ہو کر بھسم ہو گیا۔ ''الہلال'' کے مقاصد، جہاں تک ان کے معنوی مضمرات کا تعلق تھا، اپنا اعجاز دکھا چکے تھے اور مسلمانوں کا ایک نیا دور انگڑائی لے رہا تھا، میرے سامنے تجربات کا ایک ڈھیر تھا، میں نے سفر میں ترتیب پیدا کی اور اس صراط مستقیم پر قدم جما دیے جو اس ملک کی آزادی کے حصول کا صحیح راستہ تھا، میرے اعتقاد میں یہ بات داخل ہوگئی کہ ایشیا اور افریقہ کی آزادی کا انحصار ہندستان ہی کی آزادی پر ہے اور ہندستان کی آزادی کا صحیح صحیح نقشہ ہندو مسلم اتحاد ہی سے بن سکتا ہے۔ یہ دونوں جماعتیں ہندو و مسلم، جو مذہب و اعتقاد کے معاملے میں مختلف اوضاع و اطوار رکھتی ہیں جب تک متحد العمل نہ ہوں گی ہندستان کی آزادی میں اُلجھاؤ پیدا ہوں گے اور اس طرح ایک

ایسی برائی راہ پائے گی کہ سیکڑوں خرابیاں یکے بعد دیگرے جنم لیتی رہیں گی۔

میں نے پہلی جنگِ عظیم سے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ ہندستان ضرور آزاد ہوگا اور اس کی آزادی کسی عنوان سے رُک نہیں سکتی، میرے سامنے مسلمانوں کے مقام کا تعین بھی تھا۔ میں ہمہ جہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان اپنے وطنی بھائیوں کے ساتھ چلنا سیکھیں اور تاریخ کو یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ جب اہل وطن ہندستان کی آزادی کے لیے سرگرم عمل تھے تو مسلمانوں نے موجوں سے لڑنے کے بجائے کناروں پر تماشا دیکھنے کی عادت ڈالی اور وہ پر جہد کشتیوں کے ڈوبنے پر خوش ہوتے تھے۔"

پاکستان ناگزیر ہے:

راقم نے عرض کیا:

"پاکستان تو بن کے رہے گا اب سوال وجوہ کا نہیں کہ اس کی تاسیس کے محرکات کیا ہیں؟ سوال اس چیز کا ہے، جو قایم ہو رہی ہے اب اس حالت میں کیا ہونا چاہیے، بالخصوص ان مسلمانوں کا فرض کیا ہو جو قیام پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور کر رہے ہیں لیکن پاکستان کے علاقائی شہری ہیں۔"

مولانا نے فرمایا:

"اس صورت میں میری رائے یہ ہے کہ پاکستان دشمنی سے نہیں دوستی سے قائم ہو اور جب پاکستان بن جائے تو پھر دونوں ملکوں کی باہمی دوستی ہی ان کے استحکام کی ضامن ہو سکتی ہے، جانبین میں کشیدگی رہی تو دونوں کے لیے مضر ہوگی، نہ ہندستان کا اس میں بھلا ہے نہ پاکستان کا! جذبات کا غصہ ایک عارضی چیز ہے لیکن حالات کی ضرورت

ایک اساسی عنصر ہے۔ پاکستان ہندستان ایک دوسرے کے دوست بن کر نہ صرف اپنے اپنے ملک کی خوش آیند تعمیر کرسکیں گے۔ بلکہ ان عالمی طاقتوں کے مخفی عزائم سے بھی محفوظ رہیں گے، جو دنیا کے تمام چھوٹے ملکوں اور نو آزاد ریاستوں کو اپنے تابع رکھنا چاہتی ہیں اور اسی میں ان کے مفادات ہیں۔ پاکستان اور ہندستان کی ذہنی لڑائی خواہ اس کی شکل کوئی سی ہو، دونوں مملکتوں کو مضطرب رکھے گی۔ ہندستان نے پاکستان کو اتھل پتھل کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے عالمی سطح پر بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ پاکستان نے ہندستان سے لڑائی باندھ کے رکھی تو جس غرض سے اس نے تقسیم کرائی ہے، وہ مسئلہ ختم نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی ایک خطرناک شکل پیدا ہوگی، پاکستان کا مطالبہ اگر مسلمان کی انفرادیت کو ایک خود مختار ریاست میں نشو و بلوغ دینے کا نام ہے تو اس غرض سے ایک بے داغ امن کی ضرورت ہے۔ پاکستان اور ہندستان کی کٹا چھنی سے ساڑھے تین کروڑ ہندستانی مسلمان جو ہندستان ہی میں رہیں گے نہ صرف موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں گے بلکہ خود پاکستان کے مسلمان عالمی طاقتوں کی شکارگاہ ہوں گے۔"

تحریک پاکستان میں دین کا استعمال:

ایک سوال قیام پاکستان کے بارے میں تھا۔ شورش مرحوم نے پوچھا تھا:

مولانا! پاکستان اگر سیاستاً قائم ہو جائے تو اس میں عیب کیا ہے؟ اسلام کا نام تو مسلمانوں کی ملی وحدت کو محفوظ رکھنے کے لیے بولا جا رہا ہے!

مولانا ابوالکلام آزاد نے جواب میں فرمایا:

"آپ اسلام کا نام ایک ایسی چیز کے لیے بول رہے ہیں جو اسلام ہی کی رو سے درست نہیں۔ جنگ جمل میں قرآن نیزے پر لٹکائے گئے وہ درست تھے؟ کربلا میں اہل بیت شہید کیے گئے ان کے

قاتل مسلمان تھے، کیا وہ حضور ﷺ کی حلقہ بگوشی کے دعوے دار نہ تھے۔
حجاج مسلمان تھا اس نے بیت اللہ پر پتھراؤ کرایا کیا اس کا فعل صحیح تھا؟
کسی بھی مقصد باطل کے لیے کوئی سا کلمہ درست نہیں ہوتا۔ پاکستان مسلمانوں کے لیے سیاستاً درست ہوتا تو میں اس کی حمایت کرتا لیکن خارجی اور داخلی کسی اعتبار سے بھی اس کے مضمرات مسلمانوں کے لیے خوشگوار نہیں، میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا، لیکن میں جو دیکھ رہا ہوں اس سے پھرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ لوگ طاقت کی مانتے ہیں یا تجربے کی، جب تک مسلمان پاکستان کے تجربے سے نہیں گزریں گے، ان کے لیے پاکستان کے بارے میں کوئی دوسری بات جو اس کی نفی پر ہو، قابل قبول نہ ہوگی وہ آج دن کو رات کہہ سکتے ہیں لیکن پاکستان سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں، ایک بات ہو سکتی ہے کہ سرکاری طاقت پاکستان بنانے سے انکار کر دے اور وہ اس کے پلان پر راضی ہو جائیں یا خود مسٹر جناح ان کے ذہن کو پھیر دیں اور سمجھوتے کی جو صورت سامنے آئے اس پر صاد کر دیں۔

ہندستان تقسیم ہوا، جیسا کہ مجھے ورکنگ کمیٹی کے بعض رفقاء کی ذہنی روش سے محسوس ہو رہا ہے ہندستان ہی کا بٹوارا نہ ہوگا، پاکستان بھی بٹے گا۔ تقسیم آبادی کے اعتبار سے ہوگی، ان میں قدرتی حد بندی کیا ہوگی؟ کوئی دریا، کوئی پہاڑ، کوئی صحرا؟ کچھ نہیں۔ ایک لکیر کھنچ جائے گی۔ کب تک؟ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن جو چیز نفرت پر ہوگی وہ نفرت پر قائم رہے گی اور نفرت ان کے مابین ایک مستقل خطرہ ہوگی، اس صورت میں کسی بڑی تبدیلی، تغیر یا کاٹ کے بغیر پاکستان اور ہندستان کبھی دوست نہ ہوں گے۔ دونوں کے دل میں تقسیم کی فصیل ہوگی تو سارے ہندستان کے مسلمانوں کو سنبھالنا پاکستان کے لیے مشکل ہے کہ اس کی زمین اس کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی لیکن مغربی پاکستان میں ہندوؤں کا ٹھہرنا ممکن نہ

ہوگا وہ نکالے جائیں گے یا خود چلے جائیں گے۔ ان دونوں صورتوں میں ہندستانی مسلمانوں کی نگاہ پاکستان پر ہوگی پھر اس حالت میں ہندستانی مسلمانوں کے لیے تین راستے ہوں گے۔

۱- وہ لٹ لٹایا پٹ پٹا کر پاکستان چلے جائیں، لیکن پاکستان کتنے مسلمانوں کو جگہ دے گا؟

۲- وہ ہندستان میں اکثریت کے بلوائی ہاتھوں سے قتل ہوتے رہیں۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایک طویل مدت تک قہر وغضب کی قتل گاہ سے گزرے گی تا آنکہ تقسیمی تلخیوں کی وارث پود عمر طبعی گزار کر ختم ہو جائے۔

۳- مسلمانوں کی ایک تعداد جو معاشی ابتری، سیاسی درماندگی اور علاقائی غارت گری کا شکار ہو، وہ اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔

وہ مسلمان جو لیگ کے حلقوں میں نمایاں ہیں پاکستان چلے جائیں گے۔ وہاں معاشی مسلمان صنعت وتجارت کو ہاتھ میں لے کر پاکستان کی معاشیات کے اجارہ دار ہوں گے لیکن ہندستان میں تین کروڑ کے لگ بھگ مسلمان رہ جائیں گے، لیگ کے پاس ان کے مستقبل کی ضمانت کیا ہے؟ کیا محض کاغذی معاہدہ ان کے لیے کافی ہوگا؟ ان کے لیے وہ حالت تو اور خطرناک ہوگی جو ہندوؤں اور سکھوں کے مغربی پاکستان سے نکل آنے کے بعد ہندستان میں پیدا ہوگی۔ پاکستان کئی ابتلاؤں کا شکار ہوگا۔ سب سے بڑا خطرہ جو محسوس ہوتا ہے وہ اندر خانہ عالمی طاقتوں کا اس پر کنٹرول ہوگا اور ہمہ قسم تغیرات کے ساتھ اس کنٹرول میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ہندستان کو بھی اس سے اتفاق ہوگا کیوں کہ وہ پاکستان کو اپنے لیے خطرہ گردان کر عالمی طاقتوں سے سیاسی جوڑ توڑ کرے گا، لیکن پاکستان کا خطرہ شدید اور نقصان عظیم ہوگا۔ ابھی تک مسٹر جناح نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ بنگال اپنے باہر کی لیڈر شپ کو کسی نہ کسی مرحلے میں مسترد کر دیتا ہے۔ دوسری جنگ

عظیم میں مسٹر اے کے فضل الحق نے مسٹر جناح سے بغاوت کی اور لیگ سے نکال دیے گئے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی بھی مسٹر جناح کے متعلق چنداں خوش رائے نہیں، لیگ کو چھوڑو، کانگریس ہی کی پوری تاریخ پر نظر ڈالو، سبھاش چندر بوس کی آخری بغاوت سب کے سامنے ہے۔ گاندھی جی ان کی صدارت سے مطمئن نہ تھے۔ انھوں نے راج کوٹ میں مرن برت رکھ کر سارے ملک کو اپنی طرف پھیر لیا، سبھاش بوس لڑ کر کانگریس سے الگ ہو گئے۔ بنگال کی آب و ہوا کا خاصہ ہے کہ وہ بیرونی لیڈرشپ سے گریز کرتا اور اپنی لے پر قایم رہتا ہے اور جب اس کے حقوق و مفادات مجروح ہوں تو بہر نوع بغاوت کے لیے تیار ہوتا ہے۔ مسٹر جناح یا لیاقت علی تک تو مشرقی پاکستان کا اطمینان ڈانوا ڈول نہیں ہوگا کہ پاکستان کی تازگی ان کے اتحاد کا باعث ہوگی لیکن ان کے بعد مشرقی پاکستان میں اس قسم کے آثار کا پھوٹنا یقینی ہے جو مغربی پاکستان سے اس کی بدظنی اور آخرکار علاحدگی کا موجب ہوں گے۔ مجھے شبہ ہے کہ مشرقی پاکستان زیادہ دیر ملک مغربی پاکستان کے ساتھ رہ سکے گا؟ دونوں حصوں میں مسلمان کہلانے کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں، لیکن مسلمان کہلانا کبھی مسلمان ریاستوں کے دائمی اتحاد کا باعث نہیں ہوا۔ عرب دنیا ہمارے سامنے ہے وہاں ایک نہیں کئی چیزیں مشترک ہیں، عقاید میں یک رنگی ہے، تہذیب یکساں ہے، ثقافت ایک ہے۔ زبان واحد ہے۔ حتیٰ کہ جغرافیائی حدود تک مشترک ہیں لیکن ان میں سیاسی وحدت نہیں ان کے نظام ہائے حکومت مختلف ہیں اور اندر خانہ ایک دوسرے سے تصادم کی فضا موجود ہے، مشرقی پاکستان کی زبان، رہن سہن، تہذیب، ثقافت اور بعض دوسری چیزیں مغربی پاکستان سے قطعی مختلف ہیں، پاکستان کا تخلیقی شعلہ سرد پڑتے ہی ان تضادات کا اُبھرنا ایک بدیہی امر ہے۔ پھر عالمی طاقتوں کے مفادات کا

ٹکراؤ ان کی علاحدگی کا متحرک ہوسکتا ہے۔

خدانخواستہ مشرقی پاکستان الگ ہو گیا تو مغربی پاکستان تضادات وتصادمات کا مجموعہ بن جائے گا، پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچی اختلافات وسوالات پیدا کیے گئے تو پاکستان ذہنی انتشار اور عالمی مفاد کی آماجگاہ بن جائے گا۔ آج جو نسل پاکستان بنائے گی، ممکن ہے اس کے اُٹھتے ہی صوبائی عصبیتوں کا سوال اُبھرے اور عالمی طاقتیں پاکستان کی مختلف الفکر لیڈر شپ کو ہاتھ میں لے کر ایک ایسا کھیل رچائیں گی کہ مغربی پاکستان بلقانی ریاستوں یا عرب ریاستوں کی طرح کئی ایک ریاستوں میں بٹ جائے؟ تب یہ سوال ممکن ہے، بعض ذہنوں میں پیدا ہو کہ ہم نے پایا کیا اور کھویا کیا؟

ایک دوسرا سوال جو برعظیم کی تقسیم سے وابستہ ہے وہ افریشیائی ملکوں میں عالمی طاقتوں کی مداخلت کا مسئلہ ہے۔ افریشیائی ممالک زیادہ تر مسلمان ریاستوں ہی کا مجموعہ ہیں ان کے لیے ایک ہندستان ہی زیادہ سے زیادہ مفید ہوسکتا ہے لیکن پاکستان کا ہندستان سے اور ہندستان کا پاکستان سے ٹکراؤ، نہ صرف ہندستانی عوام کو مسلمانوں سے بدظن کردے گا بلکہ مسلمان ریاستوں کے ابتلا میں بھی ہمدردی و اعانت کے وہ جذبات پیدا نہ ہوں گے جو مشترکہ ہندستان میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

اصل سوال دین کا نہیں، معاش کا ہے۔ مسلمان امرا نے اپنی معاشی کمتری اور اقتصادی فروتری کے خوف وانحطاط کو دوقومی نظریے کی شکل دے کر فرقہ وار مسائل کو اس انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ اب انھیں ایک ہندستان میں اپنے معاشی اقتدار کے لیے کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ وہ ایک اسلامی ریاست میں بلاشرکت غیرے معاشیات کے واحد مالک ہوں گے لیکن کب تک مسلمانوں کو نظریاتی سحر میں مبتلا رکھ سکیں گے۔ یہ غور

طلب سوال ہے پاکستان کے سر پہ کئی چیزیں سوار ہوں گی۔ مثلاً:

(۱) سیاست دانوں کی ویرانی پر مسلمان ملکوں کی طرح فوجی انقلاب کے خطرے۔

(۲) غیر ملکی قرضوں کا اندھا دُھند بوجھ۔

(۳) ہمسایہ ملکوں سے جنگ کا خدشہ۔

(۴) اندرونی تضادات کے تصادمات۔

(۵) پاکستان کے نو دولت سرمایہ داروں اور نو ساختہ صنعت کاروں کی لوٹ۔

(۶) اس استحصال سے طبقاتی جنگ پیدا ہونے کے امکانات۔

(۷) اسلام سے نئی پود کا بہمہ وجوہ گریز و فرار بالفاظ دیگر نظریہ پاکستان کا سقوط۔

(۸) عالمی طاقتوں کی پاکستان کے بارے میں مختلف سازشیں۔

ادھر ان حالات میں پاکستان کا استحکام مخدوش ہوگا اُدھر اسلامی ملک اس قابل نہیں ہوں گے کہ پاکستان کی اس طرح مدد کر سکیں جس طرح دوسری جنگ عظیم میں اتحادی ایک دوسرے کے معاون تھے۔ غیر اسلامی ملکوں نے پاکستان کی مدد کی تو وہ ان کے مفادات کا ریلا لے کر آئے گی، جس سے پاکستان میں نظریاتی اور جغرافیائی خلل کا پیدا ہونا یقینی ہے۔